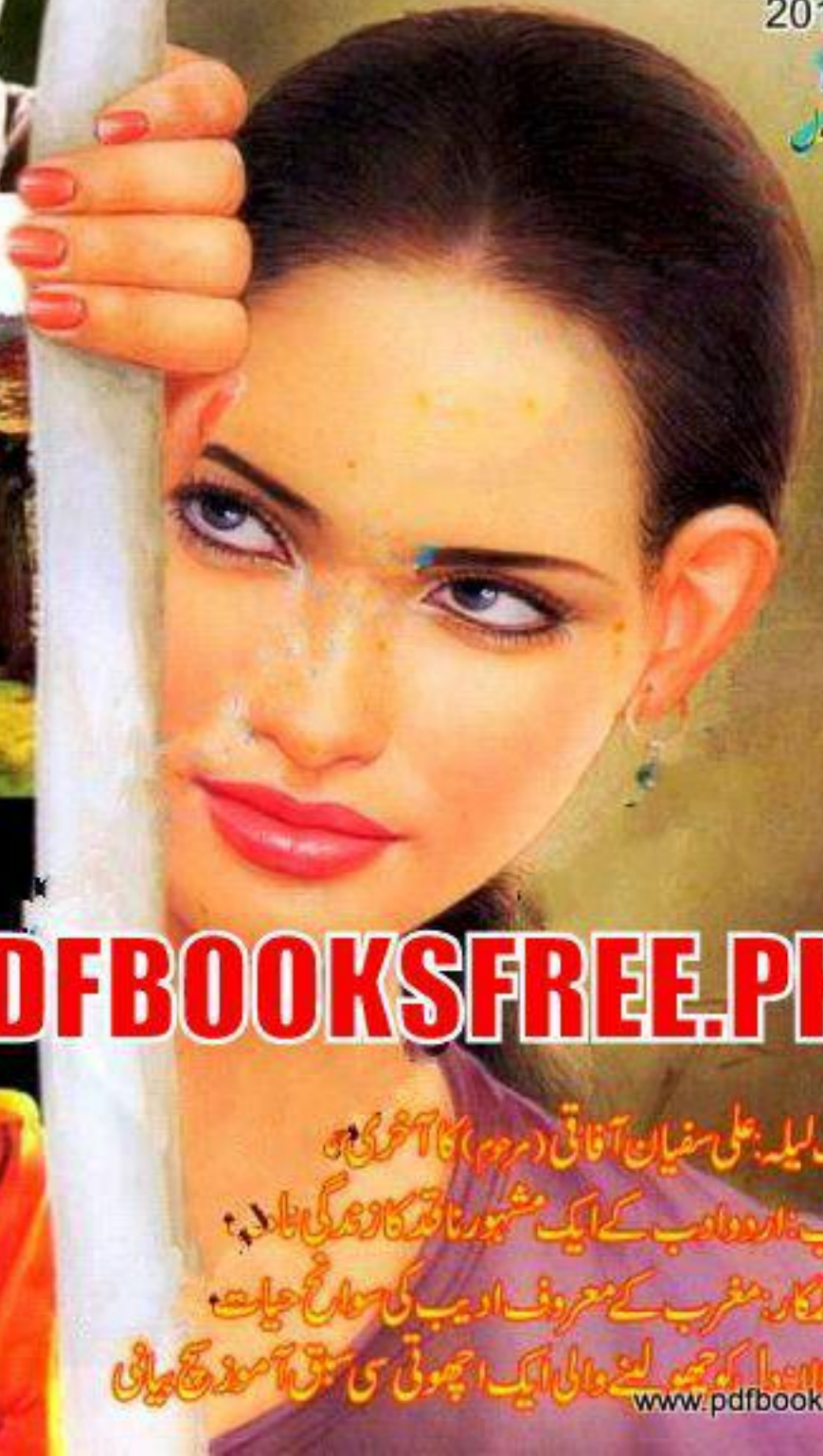
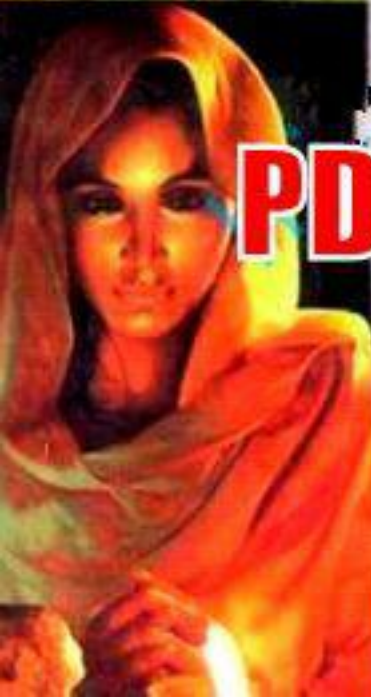


مچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

سنگزشت

مارچ 2015

معارف جہاں



PDFBOOKSFREE.PK

فلمی الف لیلہ: علی سفیان آفاقی (مردم) کا آخری حصہ
استاد ادب: اردو ادب کے ایک مشہور ناقد کا زندگی نامہ
پراسرار قلندر مغرب کے معروف ادیب کی سوانح حیات
جس کا نام ہے لکھنے والی ایک اچھوتی سی سہیلی آصفیہ جہاں

www.pdfbooksfree.pk



آپ کی باتیں آپ کے
مشورے اور آپ کے سوال

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف



مغرب کے ایک
معروف ادیب کا ذکر خاص



سنہی ادیب کو پروان
چڑھانے والے کا زندگی نامہ



اردو ادب کے ایک قابل
تقدیر ادیب کا احوال



اس وقت لوگ
آدھی دنیا سے لاعلم تھے



فلم مصانیت کی کہانیاں
فلم نگری کی باتیں یادیں



مشرق و مغرب کے
خطانگہ شہر کا تذکرہ



بلند حوصلوں اور بے مثل دلوں سے
گندھی سنسنی خیز اور تھمکنے انگیز داستان



ملک ملک میں
مدفون خزانے کا تذکرہ



پی آئی اے کے ایک
ریشٹرا افسر کی خود نوشت

قرآن حکیم کی معجز آہات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
جہل و غیہ سے نجات دہانی کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ طبخا جن صفحات پر
آیات برج و من ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق پڑھنا سے منع ہے۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

عرصہ دراز سے ہم ایک نعرہ سنتے آئے ہیں کہ اس ملک کو سب سے زیادہ خطرہ یہود و ہنود سے ہے۔ وہ سازشیں کر کے ہمارے ملک کو کمزور کر رہے ہیں۔ اس بات میں صداقت کتنی ہے یہ اہل دانش جانیں، ہم تو اپنے اطراف میں کچھ اور دیکھتے ہیں۔ سڑک پر ٹھیکس تو بے ہنگم ٹریفک، ایک دوسرے کو کچل دینے کی طرح اوور ٹیکنگ، پولیس کی کھلے عام رشوت ستانی، کیا یہ یہود و ہنود کی کارستانی ہے؟ پرائیویٹ اسپتالوں میں منہ مانگی فیس، اسپتال کے چارجز دگنا کرنے کے لیے خواہ مخواہ مریض کو لالچنی مرض کا خوف دکھا کر ٹیسٹ کرانے کی ہدایت تاکہ اسپتال کے ٹیکنیشنز کی تنخواہ نکلتی رہے۔ اسپتال کی رونق بحال رہے۔ جعلی دوائیں بنانا، دواؤں کی قیمت کئی گنا زیادہ رکھنا تاکہ دکاندار و دیگر ایجنٹس کو کمیشن زیادہ دیا جاسکے۔ رہ رو کر ایسی دوائیں جو مریض کے لیے انتہائی ضروری ہیں مارکیٹ سے غائب کر دینا، کیا یہ بھی یہود و ہنود کی سازش ہے؟ پینے کے پانی کی لائنوں میں۔ نالے کے قریب سے گزرتے بڑے پائپ میں سوراخ کر دینا تاکہ سیوریج کا پانی بہ آسانی پینے کے پانی میں مل جائے اور بدبودار پانی سے خوف زدہ ہو کر لوگ منرل واٹر کے نام پر صرف کلورین سے صاف شدہ پانی کی بوتلیں خریدنا شروع کر دیں جس کا معقول ٹیکسٹن اداروں کے چند افسران کی جیب میں جائے؟ ملکوں سے کس طرح کا پانی آرہا ہے۔ یہ ہاتھ کراچی بالخصوص بفرزون کے پانی کا تجربہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ کیا یہ بھی یہود و ہنود کی سازش ہے؟ لکھنے بیٹھوں تو ایک طویل فہرست بن جائے گی۔ اگر یہ دشمنان وطن کی سازش نہیں ہے تو پھر ایسی حرکتیں کرنے والوں کو ہم کیا نام دیں؟ اگر اس ذہنیت پر لگام نہ لگی تو اس کا انجام کیا ہوگا اس کا اندازہ بھی ہر ایک کو ہے بقول سید آل احمد پچھن پھیلائے ناچ رہے ہیں پگ پگ کالے ناگ بستی بستی قریہ قریہ آگ گلے ہے آگ ہائے رہے اپنے بھاگ

معراج رسول

جلد 25 ♦ شماره 03 ♦ مارچ 2015ء

ماہنامہ
کراچی

مدیر: عبدالغنی: عذرارسل

شعبہ اشتہارات

نمبر اشتہارات: عذرارسل 0333-2256789

نمایندہ کراچی: محمد منان 0333-2168391

راولپنڈی: 0323-2895528

لہور: فراتل پرنٹرز 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ۱۰۰ زر سالانہ 800 روپے

پبلشر: پرویز انصاری: عذرارسل

مقام اشاعت: سیکٹر II ایکس ٹیشن

ڈیفنس سٹریٹ یارن کورنگی روڈ

کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

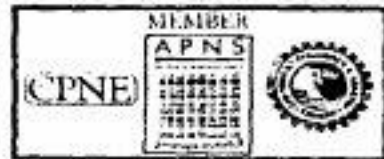
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

ذات کاتب کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551

E-mail: jdggroup@hotmail.com



تربیت کار

سرگزشت

سکندر لودھی کے ساتھ 935 ہجری میں چشت سے ہند آنے والے ابوالاعلیٰ کے گھرانے نے کرنال کے قریب براس کو سکونت کے لیے منتخب کیا تھا لیکن شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں یہ خاندان مستقلاً دہلی آ گیا۔ اس خاندان میں 1857ء کی جنگ آزادی سے دو سال پہلے سید احمد حسن پیدا ہوئے۔ جب سرسید نے علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیا تو اپنے قرابت داروں سے استدعا کی کہ اپنے بچوں کو ہمارے مدرسے میں داخل کراؤ۔ سید احمد حسن کی ماں سرسید کی رشتے دار تھیں۔ انہوں نے سید احمد حسن کو علی گڑھ بھیج دیا۔ انہی وہ وہاں پڑھ ہی رہے تھے کہ دہلی کے ایک شخص کا وہاں جانا ہوا۔ اس نے وہاں کچھ بچوں کو کرکٹ کھیلتے دیکھ لیا۔ ان بچوں میں سید احمد حسن بھی تھے۔ ایک ہی طریقہ کا بیٹا فرنگیوں کا کھیل کھیلتے نظر آیا تو وہ سخت متعجب ہوئے اور دہلی آتے ہی سید سے اس کے والد سے ملے اور بولے۔ ”بھائی صاحب احمد حسن سے تو ہاتھ دھو لیجیے۔ یہ تو گیا کام ہے۔ وہاں علی گڑھ میں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ کافر کرتی (پینٹ شرٹ) پہنے، ہاتھ میں یہ بڑا سا چوڑا ڈنڈا لیے۔ گول گیند کو پیسنے کا کفرانہ کھیل کھیل رہا تھا۔ باپ نے جو یہ سنا تو سخت طیش میں آ گئے کہ ہمارا بیٹا کافروں والا لباس پہنے، انہوں نے اسی وقت اسے واپس لانے کے لیے آدمی دوڑا دیا۔ اس طرح احمد حسن کی انگریزی میں تعلیم حاصل کرنا ترک کیا مگر ذہن میں کشادگی آ چکی تھی۔ اس لیے ماں سے ضد باندھی کہ مجھے الہ آباد بھیجا جائے۔ میں قانون پڑھوں گا۔ ماں نے کسی نہ کسی طرح شوہر کو رام کیا اور احمد حسن کو الہ آباد بھیج دیا۔ وہاں رہ کر اس نے اسکول کی اعلیٰ جماعتیں پاس کیں پھر مختار (قانون) کی تعلیم حاصل کی تاکہ وکالت کر سکے۔ مختار کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کہاں وکالت کی جائے یہ انہی طے نہ کر پایا تھا کہ ریاست دیو گڑھ سے بلاوا آ گیا۔ راجا دیو گڑھ کے ولی عہد کے لیے اتالیقی کی ضرورت تھی۔ وہ وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ اسی اسامی کے لیے ان کے استاد جنہوں نے ایام طفلی میں ابجد سے روشناس کرایا تھا وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ احمد حسن نے اپنے استاد کے آنے کا سن کر راجا صاحب کو کہلوا دیا کہ ”میں اپنے استاد کے مقابلے میں پیش نہیں ہو سکتا اس لیے یہ نوکری انہی کو دے دیں اور مجھے والہی کی اجازت دیں۔“ دوسری طرف استاد نے جب یہ سنا کہ ان کا ایک پرانا شاگرد مقابلے پر ہے تو انہوں نے کہا۔ ”وہ میرا شاگرد ہے۔ بھلا میرے مقابلے میں کیا پڑھائے گا۔“ اخلاق کا یہ نمونہ دیکھ کر راجا صاحب نے کہا۔ ”ہمیں استاد کی ضرورت نہیں، ہمیں تو شاگرد کا اخلاق پسند آیا ہے۔ اسے ہی میں اپنے ولی عہد کا اتالیق مقرر کرتا ہوں۔“ کئی سال تک احمد حسن دیو گڑھ میں رہ کر ولی عہد کو ریور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ پھر وہاں سازشوں کا سیلاب سا آ گیا اور بالآخر ولی عہد کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس سانحے نے اسے صدمے سے دوچار کر دیا اور وہ دیو گڑھ کی ملازمت ترک کر کے واپس دہلی آ گئے مگر دہلی میں دل نہ لگا تو ایک کے بعد ایک کئی شہر گھوم ڈالے۔ کئی شہر تو بھی غازی آباد اور بھی بلند شہر میں وکالت کرتے دن گزارتے رہے۔ 1896ء میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں وکالت کے لیے اورنگ آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ یہاں مولوی محی الدین خان صوبے کے میر عدل (چیف جسٹس) تھے جو احمد حسن کے رشتے میں بچا تھے۔ ان کے ایما پر احمد حسن نے گلبرگ میں وکالت شروع کر دی اور چند ہی ماہ میں خاصی ترقی کر لی۔ اب تک وہ ایک ناکام مختار (وکیل) تصور کیے جاتے تھے مگر گلبرگ میں جلد ہی ان کا توفی بولنے لگا۔ اب ان پر فرکیٹ کے اثرات حاوی ہونے لگے تھے۔ انگریزی خیالات و طرز معاشرت کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ وہ اب پوری طرح فرنگی لباس (کوٹ چٹون) پہننے لگے تھے جب کہ عام مسلمان ایسے لباس سے نفرت محسوس کرتا تھا مگر یہ عرصہ طویل ثابت نہ ہوا۔ ان کے منکسے قدم کو مولوی محی الدین خان نے روک لیا اور وہ پھر سے مذہب کی جانب لوٹ آئے۔ ادھر ادھر کی شہروں میں وکالت کی مگر اب وہ کیس لینے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے کہ کسی جموں یا مجرم کی پیروی نہ کر جائے۔ اس لیے وکالت ناکام ثابت ہونے لگی۔ گوکہ ایک ناکام وکیل تھے مگر بچوں کی تربیت پر خاص نظر رکھتے یہی وجہ تھی کہ بچے کو جہیز بخاتے نظر آ رہے تھے۔ 1920ء میں وہ بھوپال اپنے بڑے بیٹے سید ابو محمد کے پاس گئے ہوئے تھے وہیں ان پر فوج کا حملہ ہوا اور وہ دہلی سے کراچی کر گئے۔ جانتے ہیں یہ سید احمد حسن کون تھے؟ یہ سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی کے والد تھے۔

شہر خیال



ہم شاکت رحمن خٹک کا پشاور سے تعزیت بھرا خط۔ ”محترم آفاقی صاحب کو مرحوم لکھتے وقت دل پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میرے عزیز دوست شاہ جہانگیر شاہد نے میرے بچے کاشف کو فون پر بتایا کہ آفاقی صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، میرے برادر راست خٹک صاحب کو نہیں بتا سکا اس لیے تم اپنے والد کو احسن طریقے سے بتا دو کہ وہ بیمار ہیں کہیں وہ اس بات سے اثر نہ لے لیں۔ میں اس وقت فلمی ایلف لیلہ میں اداکارہ یاسمین خان کے مضمون کے سلسلے میں آفاقی صاحب کو خط لکھ رہا تھا کہ اچانک کاشف میرے کمرے میں آیا، آتے ہی بولا۔ ”کاشف نے کہا۔ ”مگر وہ تو شدید بیمار ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کاشف بیٹے! آفاقی صاحب ہجرتی سالی میں بھی بہت مضبوط ارادوں کے مالک ہیں۔ ان کو جوانی میں طرح طرح کی بیماریاں بھی تھیں مگر وہ مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں، کاشف نے سر نیچا کیا ”مگر وہ تو.....“ مزید اس میں اس ننھوں خبر کے سنانے کی تاب نہ لکھی کہ خبر تاسے کے نبوز کا سفر نے خبر سنائی کہ مشہور ادیب علی سفیان آفاقی کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہیں ماڈل ٹاؤن کے

قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ خبر سننے ہی جیسے بجلی بجھ کر پڑی۔ اب جب میں آفاقی صاحب پر لکھنے بیٹھا ہوں تو میرے سوچنے اور لکھنے کی تمام قوتیں سلب ہو چکی ہیں۔ محترم آفاقی صاحب سے میری پہلی ملاقات 50 سال پہلے ہوئی تھی۔ جب وہ 32 سال کے اور میں 22 سال کا نوجوان تھا۔ 1966ء میں جب میں نے اداکار بننے کی غرض سے لاہور جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے والد صاحب کی قصہ خوانی بازار میں کتابوں کی دکان تھی۔ قریبی دکان صادق کیشن ایجنسی کی تھی جس کے مالک لالہ وزیر محمد صدیقی تھے میں نے ان کو دل کی بات بتائی کہ میں فلموں میں کام کرنا چاہتا ہوں، میری رہنمائی کریں۔ انہوں نے مجھے چند سفارشی خطوط دیے۔ ان میں ایک خط آفاقی صاحب کے نام بھی تھا۔ لاہور پہنچ کر سیدھے ایور نیو اسٹوڈیو پہنچا۔ آفاقی صاحب اپنی کار سے فیک لگائے اداکاروں کے جمعیت میں کھڑے تھے۔ پہلی ملاقات میں آفاقی صاحب کا مجھ پر اچھا اثر پڑا۔ دراز قدم، جاذب نظر، خوش لباس۔ میں نے آفاقی صاحب سے ملنے کی درخواست کی۔ انہیں صدیقی صاحب کا خط دیا۔ انہوں نے خط پر سرسری نظر ڈالی اور خط واپس کر دیا کہ میرے پاس کام نہیں ہے۔ اس غیر متوقع جواب پر ذہنی تکلیف ہوئی مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ لاہور میں شاہ نور اسٹوڈیو سے کچھ فاصلے پر ایک کلاس اداکاروں کے رہائشی علاقے میں اداکارہ اومادیوی کی معرفت ایک مکان کا بیٹھک 20 روپے ماہوار کرائے پر لے کر اس میں رہنے لگا۔ کچھ عرصے میں سے زیادہ فلموں میں کردار کیے۔ آخر کار 1972ء کے لگ بھگ مجھے شاہ کیرانوی نے فلم ”بازار“ میں شائستہ قصیر کے مد مقابل ہیرو منتخب کیا۔ دوسرے دن شاہ اسٹوڈیو میں کنٹریکٹ سائن کرنے جانا تھا مگر میں نے ایک خاص وجہ کی بناء پر ہمیشہ کے لیے فلمی دنیا چھوڑ کر پشاور کا راستہ اختیار کیا۔ بعد میں ہیرو کا بھی کردار عمران کو دیا گیا۔ 2007ء کی بات ہے کہ ایک جاننے والے نے فلمی ایلف لیلہ پڑھنے کو دی۔ یہ ماہنامہ سرگزشت کے فلمی ایلف لیلہ کا انتخاب تھا۔ جب میری نظر لالہ وزیر محمد صدیقی صاحب کے مضمون پر پڑی تو مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے شکوہ شکایت کی صورت میں ایک خط آفاقی صاحب کو لکھا۔ مجھے اس خط کا جواب چند دنوں بعد 8 مارچ 2007ء کو ملا۔ یہ آفاقی صاحب کا پہلا خط تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے خط میں لکھا کہ میں نے بھی اپنے گھر یلو ملازم کو بھی ”تو“ سے نہیں پکارا اور اپنے روپے پرائسوس کا اظہار کیا اس طرح ہمارے مابین خط و کتابت کا سلسلہ چلا رہا ہے میں نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ مجھ میں لکھنے کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں تو انہوں نے مجھے لکھنے کی دعوت دی۔ 7 مئی 2007ء کو میرا پہلا مضمون ”قصہ خوانی“ کے عنوان سے چھپا اور میرے دیگر پانچ مضامین بھی متواتر چھپتے رہے اور ساتھ ساتھ آفاقی صاحب کا ارشاد تھا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

میری فلمی یادداشتوں کو فلمی ایلف لیلہ میں پشاور سے خط کے عنوان سے چھپاتے رہے۔ میں ان کو مزاحیہ انداز سے لکھتا اور میرا یہ انداز آفاقی صاحب کو بہت پسند تھا۔ پہلی ملاقات کو لگ بھگ پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں اب سو کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ الہامی شخص تھے۔ وہ ایک اچھے ادیب اور داستان گو تھے اس کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کرنے والے انسان تھے۔ کیا میری نگاہیں اور دلچسپ شخص تھے۔ مجھے اس بات پر

افسوس نہیں کہ وہ میرے ہم عصر نہ تھے بلکہ میری خوش قسمتی تھی کہ ان کا اور میرا زمانہ ایک تھا۔ محترم آفاقی صاحب خود ایک اچھے قصہ گو تھے لیکن وہ قصہ سننے میں بھی لطف لیتے جیسے پاک و ہند کے غالب، ایران کے خوبصورت حافظہ اور ہمارے پختونخوا کے خوش حال بابا۔

آفاقی صاحب نے قومی زبان اردو ادب کی خدمت میں اپنی زندگی گزار دی۔ پیرانی سالی میں بھی وہ جوانوں کی طرح لکھتے۔ محترم آفاقی صاحب کا تعلق ایک وقت فلموں سے رہا مگر وہ فلمی آدمی نہیں تھے۔ ایک ایسے مسلمان جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ سچے مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ جس کا ظاہر اور باطن ایک ہو وہ اس مقولے پر پورا اترتے تھے۔ ان کا آخری خط 19 اکتوبر 2014ء کو ملا جس میں انہوں نے مجھے خالد نجیب خان صاحب سے رابطہ رکھنے کی ہدایت کی۔ اپنی بیماری کا تذکرہ کیا۔ میرا اور بچوں کا حال احوال پوچھا۔ میں نے آفاقی صاحب پر ایک مضمون لکھا تھا جو انہوں نے بے حد پسند کیا مگر اس مضمون کی اشاعت سے انکار کیا اور لکھا کہ میں اپنی تشہیر پسند نہیں کرتا۔ اخبارات اور ٹی وی کو انٹرویو نہیں دیتا۔ گوشہ نشینی کی زندگی پسند کرتا ہوں۔ آفاقی صاحب جو اس فکر، بلند حوصلہ بزرگ تھے۔ ان کا جس شے سے واسطہ رہا اس کو نمایاں مقام دلایا۔ یہ آفاقی صاحب کا کمال فن تھا کہ اپنے دور کے قابل قدر شخصیات سے ملے اور ان سے شرف دوستی حاصل کی جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ پاکستان کی پہلی مزاحیہ فلم ”ٹھنڈی سڑک“ کے نام سے بنائی۔ اداکار کمال، آفاقی صاحب کی دریافت تھے۔ کئی روز ناموں اور ہفت روزوں کے ایڈیٹر رہے۔ روزنامہ آفاق میں پہلی مرتبہ اداکارہ نگہت سلطانیہ کا انٹرویو کیا۔ انہیں یہ شرف بھی حاصل رہا کہ انہوں نے ہی روزنامہ آفاق سے فلم ایڈیشن کا آغاز کیا اور ان کے نام کے ساتھ آفاقی نام مشہور ہوا۔ (مگر وہ اپنے والد کی وجہ سے آفاقی لکھتے تھے ہفت روزہ فیملی میگزین کے اجراء کے ساتھ بطور ایڈیٹر مرتے دم تک رہے اور بانی ایڈیٹر کا شرف حاصل کیا۔ 1990ء سے ماہنامہ سرگزشت میں اپنی یادداشتوں کو فلمی الف لیلہ کے عنوان سے ترتیب دیتے رہے جس نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں، ایوارڈز حاصل کیے اور فلمیں بنائیں مگر سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم انسان تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزا اور دھما۔

جنم انجم فاروق ساحلی کا مکتوب لاہور سے۔ ”ہمارے والد صاحب کے دوست اور ممتاز قلم کار علی سفیان آفاقی وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ شاید فلمی الف لیلہ کی جگہ اب کچھ اور شروع کیا جائے گا۔ میں آپ کی توجہ کا طالب ہوں۔ غوغا و شیرینیاں کے بعد ابھی تک ”سنگم پور کا آدم خور“ شائع نہیں ہوئی۔ (الفاظ کے برتنے پر توجہ دیں)۔ اُمید ہے ”تذکرہ“ چین کے بعد ”تذکرہ کھان“ محترم اعلیٰ علم صاحب کے ذریعے سے آپ تک پہنچ گئی ہوگی۔ (دونوں ہی سرگزشت کے انداز کی نہیں ہیں)۔“

جنم ڈاکٹر قمر العین نے اسلام آباد سے لکھا ہے۔ ”پشاور میں آرٹی پبلک اسکول کے واقعے نے پوری قوم کو صدمہ پہنچایا۔ ہمیں بھی اس واقعے نے متاثر کیا ہے کیوں کہ میرے کزن کا بیٹا بھی اس سانحے میں شہید ہوا ہے۔ چار بہن بھائی اس اسکول میں پڑھتے تھے۔ تین چھوٹے بہن بھائی جو جوئیر سیکشن میں تھے پیدل ہی مگر بھاگ گئے جب کہ یہ بڑا بھائی اسی کلاس میں تھا جس کے سب بچے شہید ہوئے۔ معصوم بچے تو ایک گولی سے مر سکتے تھے لیکن ان ستاک درندوں نے ان کو چھلنی کیا۔ میرے کزن کے بیٹے کے سر پر بہت سی گولیاں لگیں۔ (پھر بھی بہت سے لوگ ان درندوں کو برا نہیں کہتے) سلیم قیصر صاحب نے مجھ سے مدد کی درخواست کی ہے۔ آپ کی مدد تو قانون کا کوئی ماہر ہی کر سکتا ہے۔ یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔ سرگزشت کا فروری کا شمار بھی ہمیشہ کی طرح بہترین رہا۔ فلمی مضامین بہت اچھے رہے۔ پاکمال میں آئن اسٹائن کے متعلق معلومات میں اضافہ ہوا۔ خلا میں نماز، بابائے فارسی، سمندر کے بھید، خون کے آنسو بہت پسند آئے۔ سچ جانیاں بہت اعلیٰ درجے کی تھیں۔ سرگزشت نے اپنا معیار نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ روز بروز بہتر ہو رہا ہے۔ رانا محمد شاہد صاحب کی والدہ کی وفات کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔“

جنم طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ”میں علی سفیان آفاقی انگل کے بارے میں کچھ لکھتا جا رہی ہوں۔ علی سفیان جیسا درخشاں باب بند ہو گیا لیکن کیا ہم ان کو بھول پائیں گے؟ کیا فلم انڈسٹری ان کی خدمات بھول جائے گی؟ شاید بھول جائے کیونکہ ہم بہت بے وفا اور بے حس لوگ ہیں، ہم اپنے محسنوں کو بہت جلد بھولتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے بہت سے حساس بھی موجود ہیں جن کے دل میں درد اور آنکھوں میں سوز کے آنسو مسلسل جھپکتے ہیں اور علی سفیان صاحب کے لیے ہل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ ان جیسے نفیس، شائستہ اور دوستوں کے غم خوار انسان کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا کرے اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ میں نے 27 جنوری کو ہی فیس بک پر علی سفیان آفاقی صاحب کے لیے سب دوستوں سے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ ”ایک گروپ میں بحیثیت عشق، JDP، فن کلب، سرگزشت، جاسوسی اور سپنس گروپ اور چینی نکتہ چینی اور مشہور رائٹرز باصر ملک، امجد جاوید اور طاہرہ گلزار نے علی صاحب کو فون کر کے بتایا تو وہ سب بہت دکھی ہو گئے اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتے رہے۔ آفاقی صاحب کے جانے سے جو کمی ہمارے دل میں ہوئی ہے وہ شاید کہ پوری نہ ہو۔ یہ دیکھ تو ہمارا مشترکہ ہے جو بھی ختم نہیں ہوگا۔ نہ بھلا پائیں گے۔ ادارے میں معراج رسول انگل کی پُرسوز بانی پڑھ کے بہت دکھ ہوا کہ ہم سب مسلمان اتنے کمزور ایمان کے کیوں ہو گئے ہیں۔ کیوں اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ واقعی آج ہم تمام پاکستانی یکجا نہ ہوئے تو پھر قیامت ہم یک جا نہیں ہوں گے۔ اللہ ہم سب پاکستانیوں کو اتفاق اور اتحاد سے رکھے۔ یک جہتی پہ بابائے فارسی جناب پروفیسر ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی کے بارے میں پڑھا۔ علم کی

کمی تھوڑی اور کم ہوگئی دل سے سرگزشت اور ادارے کے لیے دعا نگی کہ ہمارے اتنے پیارے پیارے سرگزشت میں ہم طرح طرح کی معلوماتی تحریریں پڑھتے ہیں اور اپنی علمی طاقت میں اضافہ کرتے ہیں ویلڈن معراج رسول صاحب ادارے کی خدمات دینے کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ دن دن کی اور رات چٹکی ترقی کریں، آمین۔ چلتے ہیں اب ذرا دوستوں کے خطوط پر کی طرف پہلے نمبر پر ہمارے پیارے دوست رانا محمد جواد صاحب آئے۔ سچ کہتے ہو جواد بھائی میرا دل کرتا ہے کہ میں سراپا پارو دین جاؤں اور ان تمام آدم خور جو انسانیت کے روپ میں چھپے درندے ہیں ختم کر دوں۔ ظالموں نے نہ صرف معصوم بچوں کو آنکھوں اور سر میں گولیاں ماری ہیں بلکہ چھری سے ان کے گلے بھی کاٹے ہیں۔ میرے کانچ سے صرف 15 یا 20 منٹ کے فاصلے پر یہ افسوس ناک حادثہ ہوا ہے۔ ہمارے کتنے اسٹاف ممبر کے رشتہ داران میں شامل تھے کچھ شہید ہو گئے کچھ زخمی ہوئے۔ ابھی تک پورا پشاور سو گوار ہے اور بچے اور ان کے والدین ذاتی مریض بن گئے ہیں۔ شکر یہ جواد بھائی آپ نے مجھے تبصرہ کرنے کے قابل سمجھا۔ بھائی محمد انور مردان والسلام شکر یہ کہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔ بھائی سہیل احمد عباسی صاحب آپ کس برابری کی بات کرتے ہیں، میں نے کوئی نامناسب بات نہیں کی۔ ارے بھر میرے پیچھے پڑ جاؤ گے برابری تو بڑے بڑے تبصروں سے نہیں ہوتی تو تم عام مرد کیا کر سکو گے۔ جب عورت ایک ظالم شوہر کے ساتھ یا مغرور شوہر کے ساتھ رہ سکتی ہے تو تم مردوں کا گزرا ایک عورت کے ساتھ کیوں نہیں ہونکتا؟ عمران جوانی بھائی آپ کا خط اچھا اور دلچسپ لگا۔ بشری افضل جی چھوڑے لوگوں کو، ان کو تو حسد اور کینہ کے مرض نے مارا ہے۔ بشری جی ڈٹ کر مقابلہ کریں میری طرح، کمزوری نہ کامیابی اور شہرت کہاں برداشت ہوتی ہے۔ آپ لکھا کریں کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔ بشری جی ڈٹ کر مقابلہ کریں میری طرح، کمزوری نہ دکھائیں لکھا کریں۔ سرگزشت ہم عورتوں کا بھی ہے۔ ہم باون فیصد ہیں۔ ہمارا زیادہ حق بنتا ہے۔ مگر ہمیں تو ہم جیتیں لیں گے۔ اویس شیخ صاحب کا خط بھی کافی دلچسپ اور شاندار تھا۔ قیصر خان بھائی آپ نے میری تعریف کی شکر یہ لیکن آپ مجھے آپا طاہرہ گلزار اور باجی گل صاحبہ بھی کہتے ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں مجھے میرے بہن بھائی اور کزن باجی گل کہتے ہیں۔ اب تو بھابھیاں اور بھتیجے بھتیجیاں باجی گل کہتے ہیں۔ آپ کا انداز تحریر بہت پیارا ہے قیصر بھائی۔ سید انوار عباس شاہ کا طرز تحریر بہت اچھا ہے۔ بہت دلچسپ ہوتا ہے آپ کا خط لکھنا مجھے بہت پسند ہے شکر یہ بھائی۔ رانا محمد شاہد بھائی اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ہر رشتے کا اپنا مقام ہے لیکن ماں کا تو مقام ہی اعلیٰ ہے آپ کا تحریر کردہ خط بہت اچھا لگا ہے اور بات کہ بھائی مجھے آپ نے یاد ہی نہیں کیا۔ منشی محمد عزیز مئے کا غلوں نامہ بھی واقعی غلوں سے پر تھا۔ سب کو یاد کیا لیکن مجال ہے کہ اس ناتواں بوڑھے عزیز مئے نے مجھے یاد کیا ہو۔ ویسے بڑا تفصیلی اور کھن لگانے والا خط تھا۔ ویلڈن۔ ناصرہ احمد آف امریکا ویکم آپ کی تجویز بہت عمدہ ہے کاش کہ ہم قدم بڑھا سکیں۔ احمد خان توحید بھائی آپ کا یوں بے بی گڑیا بہن کہنے سے میں شرمائی۔ ہائے بھائی اتنا پیارا اللہ آپ کو خوش اور سلامت رکھے آمین۔ آپ کا خط ہمیشہ کی طرح دلچسپ رہا۔ محمد خوجہ بھائی آپ کا خط بھی کافی دلچسپ لگا۔ کہ انہوں پر آپ نے زبردست تبصرہ کیا ہے۔ آخری خط رانا فضل جاوید کا خط بھی کافی بہتر تھا۔ آتے رہے (پلیز ذرا مختصر لکھا کریں تاکہ دوسروں کو بھی موقع مل سکے)۔“

بھلا محمد احمد رضا انصاری نے کوٹ ادو سے لکھا ہے۔ ”میں سرگزشت کا تھوڑا پرانا قاری ہوں۔ پچھلے دو سال سے پڑھ رہا ہوں مگر پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں۔ اب بات ہو جائے فروری کے سرگزشت کی۔ ادارہ یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ انکل جی یہ دہشت گرد کیا مسلمان ہیں؟ شہر خیال میں سارے خط اچھے تھے۔ آئن اسٹائن کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ دوسری تحریریں بھی اچھی لگیں۔ اس کے بعد سیدھے اپنے پسندیدہ سلیپ ”سراب“ کی طرف لپکے۔ انکل جی یہ تو طویل ہوتا جا رہا ہے میں سمجھا تھا کہ شاید چند اقساط باقی ہیں۔ پہلی سچ بیانی جاسوسی قسم کی مگر بہت اچھی تھی۔ دوسری سچ بیانی بھی اچھی تھی۔“

بھلا سید انور عباس شاہ نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے۔ ”فروری 2015ء کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو رانا محمد شاہد کی والدہ کے انتقال کی خبر پر نظر پڑی۔ دل افسردہ تو بہت ہوا لیکن کیا کریں ایک نایک دن ہم سب کو اس دنیا سے جانا ہی ہے۔ بہر حال رانا صاحب کے اس دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ رانا محمد جواد اپنے خوب صورت قلم کے ساتھ کرنی صدارت کی زینت بنے بہت بہت مبارک نواں فرمائیں۔ ملک محمد ظفر اللہ، محمد انور اور سہیل احمد عباسی مختصر لیکن معنور کن تبصروں کے ساتھ ”عمر خیال“ کی زینت بنے۔ محمد عمران جوانی کراچی سے تشریف لائے، خوب مزے مزے کی باتیں کیں۔ بشری افضل صاحبہ بھی اس دفعہ مختصر خط کے ساتھ حاضر ہوئیں لیکن کچھ ناراض ناراضی لگ رہی تھیں۔ ہمیں لوگ آپ کے لکھنے پر کیوں حسد کرنے لگے۔ کم از کم میں نے تو سرگزشت میں کسی بہن بھائی کو آپ پر تنقید کرتے نہیں دیکھا۔ نہ پڑھا بلکہ آپ کی تعریف کرتے ضرور پڑھا ہے۔ آپ آتی رہا کریں۔ آپ تو ہماری عظیم بہن ہیں۔ اویس شیخ نے بھی خوب لکھا۔ قیصر عباس خان حسب دستور اپنے سابقہ خطوط کی طرح خوب صورت انداز میں جلوہ افروز ہوئے۔ رانا محمد شاہد سے بھی ملاقات ہوئی۔ منشی محمد عزیز مئے کا خط بھی شاندار اور مفصل تھا۔ ناصرہ احمد بہت دور سے تشریف لا کر شہر خیال پر چھا گئیں۔ فقیر غلام حسین ضیا اور خالد علی بھکر سے تشریف لائے۔ ان کا خط دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلومات کا خزانہ لیے ہوئے تھا اس دفعہ کے شمارے میں ہم بھکر کے چار قاری شامل ہیں خیال ہوئے بہت خوشی ہوئی۔ درود دل رکھنے والے رحم دل انسان احمد خان توحید یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ بھائی سلیم قیصر کے لیے روزانہ دعا لکھیں پڑھتے ہیں۔ خداوند کریم آپ کی دعائیں

قبول فرمائے۔ اس کے علاوہ عزیر اللہ محمد خواجہ اور رانا فیصل جاوید کے خطوط بھی شاندار تھے۔ ایک دفعہ پھر چند عظیم ہستیاں بلیک لسٹ کی نذر ہو گئیں جن کا انفسوس ہے۔ قاتل احرام و معزز شخصیت شاہد جہانگیر شاہد اور ہرملیز بہن طاہرہ گلزار نہ تو شہر خیال کی زینت بنے اور نہ ہی بلیک لسٹ میں ان کا نام شامل تھا۔ خدا خیر کرے ان دونوں کو محفل میں نہ پا کر ہمارے ہاتھ خود بخود ان کی سلامتی کے لیے اٹھ گئے۔ خداوند کریم ان کو بھی مع اہل و عیال اسے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ میں ایک دفعہ پھر اپنے ان تمام بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری سلور جوبلی والی تجویز کو پسند کیا اور کبھی رہے ہیں۔ انشاء اللہ سلور جوبلی نمبر سچ دج کے ساتھ اپنے وقت پر ضرور خوشبو نکھیرے گا۔ اس دفعہ ”فلمی الف لیلا“ کو پڑھتے ہوئے آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ ماضی کے لاہوری سیر اور بارہ دروازوں کے بارے میں معلومات مع ان کی تصاویر۔ واہ کیا لا جواب خزانہ تھا۔ کون سی کمی تھی جو اس مضمون میں رہ گئی تھی۔ بہر حال ہر لحاظ سے یہ مضمون اپنی مثال آپ تھا۔ ”حوادث زمانہ“ ایک بے مثال تحریر تھی۔ مجبور یاں بھی انسان کو کہاں سے کہاں تک لے جاتی ہیں۔ مجبور انسان بالکل بے بس ہوتا ہے لیکن خدا کی ذات کہیں نہ کہیں سے کوئی راہ نکال ہی دیتی ہے۔ زیادتیاں نصرت کے ساتھ بھی ہوتی رہیں۔ نعمان سے شادی والی خواہش بھی پوری ضروری ہوئی مگر کچھ دیر کے لیے۔ واقعی قدرت کے بھید بھی نزلے ہیں۔ بچوں کے بارے میں مختار رویے اور ظالموں کے گھناؤنے کرتوتوں پر مبنی کہانی ”شیطان، فرشتہ“ اپنی مثال آپ تھی۔ عبدالجیسے درندہ مفت انسان اب بھی ہمارے ارد گرد وندتے پھر رہے ہیں۔ ہمیں ان پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ ”سفاک محسن“ واقعی ایک دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ اس عجیب و غریب واقعے نے پڑھتے وقت ہمیں پوری طرح اپنی گرفت میں لپیٹ لیا۔ ہوش میں تب آئے جب کہانی ختم ہو چکی تھی بالکل فلمی پمپشن تھی اس واقعے میں۔ اس کہانی کا عنوان یعنی سفاک محسن مکمل طور پر واقعے سے مطابقت رکھتا تھا جس سے اس کی شان میں مزید اضافہ ہو گیا۔“

پہلا اولیس شیخ کا غلوں نامہ نوے ایک سنگھ سے۔ ”ادارہ پڑھائی تھا کہ سانحہ شکار پور ہو گیا۔ مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آئی ایس آئی اور ان سے مسلک ادارے آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ دوسرا یہ کہ ایک طرف پوری قوم دہشت گردی کے خلاف نکلیا ہو مگر لیکن ہمارے سیاستدان آپس میں اتحاد پیدا نہ کر سکے۔ کوئی جوڈیشل میشن کاروبار نہ رہا ہے تو کسی فوجی عدالتوں پر تحفظات ہیں۔ ہر کوئی اپنے مفادات کے پیش نظر کام کرتے نظر آتے ہیں اور عوام دہشت گردی کا شکار ہو رہی ہے۔ ری سی سی کسر پیروں، بحران نے پوری کردی ہے۔ ”بابائے فاری“ پڑھ کے ایک اور شخصیت کا تعارف ہوا۔ ”شہر خیال“ کی جانب کا مزن ہوئے۔ جو ماضی صاحب کا ”ایک فلمی سرگزشت“ متعلق جملہ شاندار تھا۔ سدرہ بانو ناگوری اور طاہرہ گلزار غیر حاضر ہیں۔ ”عہد خیال“ کے خطوط نگاروں سے گزارش ہے اگر کوئی ”بیٹا بیٹا“ نمبر کی ایک عدد کا پی رکھتا ہے تو مجھے دے دے۔ بہت اشد ضرورت ہے۔ میرے پاس پہلے شمارہ تھا۔ ایک جاننے والے نے مجھ سے مانگا۔ جب میں لینے گیا تو اس نے شمارہ کھوجانے پر انفسوس کا اظہار کیا۔ وہ مجھے پیسے دیتا رہا لیکن میں نے کہا جو چیز کھو گئی وہ ان پیسوں سے کئی گنا اہم تھی۔ ”باکمال“ تحریر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں لیکن یاد اور محفوظ ہمیشہ کے لیے ہو گئی۔ ”خون کے آنسو“ ایک بار پھر رلا گئے۔ منظر امام کا مضمون پابندی کا شکار کتابوں کا ذکر مختصر اور جامع تھا۔ سمندری شیروں کا تذکرہ بس ٹھیک لگا۔ ”فلمی الف لیلا“ کے معنف علی سفیان آفاقی رحلت فرما گئے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ لاہور کے بارہ دروازوں کا تفصیل سے ذکر بہت خوب لگا۔ ”الوداع“ سفر تھما س دفعہ دلچسپ تھا۔ ”عیار عظیم“ کی عیاری نے شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ سچ بیانیوں میں ”سفاک محسن“ ایک معاشرتی کہانی تھی۔ پاکستان کا ”بٹی پاکستان“ بنائیں گے اس کی نظر لگتی تھی۔ وہ بھی ایک وقت تھا جب امریکی سفارت کار کہتے تھے کہ ہم 60 کی دہائی میں سوچتے تھے کہ 80 کی دہائی میں کون سا شہر نمبر ایک ہو گا۔ واشنگٹن، لندن یا پھر کراچی۔ ”قسمت“ ایک لائف کونسلنگ تحریر تھی۔ ”سوکن“ سچ بیانی میں حد سے بڑھا ہوا غلط فہمی کا نظریہ۔ ”سنہری دھوپ“ پڑھی گئی کیوں کا الیہ یہ ہے کہ ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھتی ہیں۔“

پہلا وحید ریاست بھی کا محبوب کمر سیداں سے۔ ”ماہ فروری کا سرگزشت ابھی موصول نہیں ہوا تھا کہ دل دہلا دینے والی خبر ملی کہ سدا بہار شخصیت جناب علی سفیان آفاقی اس جہان غالی سے انتقال فرما گئے۔ حق مغفرت کرے، موجب آزاد مر د تھا۔ ابھی پچیسے شمارے ماہ جنوری میں آفاقی انگل لاہور کے قبرستانوں کا تذکرہ فرما رہے تھے، کچھ عرصے کے بعد خود بھی ہر قبرستان ہونے والے ہیں۔ معراج انگل یقین مانیں انگلوں کا سبیل رواں ہے جو تھنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اللہ پاک ان کے عزیز و اقرباء ان کے چاہنے والوں اور آپ تمام حضرات کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ معراج انگل آپ سے ایک پر زور گزارش ہے کہ آپ فی الفور موجود و مغفور جناب علی سفیان آفاقی صاحب پر ایک شاندار مقالہ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب یا انور فراد صاحب سے قلمبند کروا کر اگلے مہینے شامل شائع فرمائیں۔ یہ آفاقی انگل کی یادوں اور وقایف کا ادنیٰ ترین صلہ ہو گا اور ان کے عہد پر احسانِ عظیم (آفاقی صاحب نے اپنے بارے میں اتنا مفصل لکھا کہ کوئی اور لکھ ہی نہیں سکتا)۔ روز اول کی طرح سب سے پہلے فکر انگیز ادارہ پڑھا جو کہ آپ نے حزن دل سے تحریر فرمایا تھا، خاص کر انتخاب شعر میں تو آپ کو ملکہ حاصل ہے۔ ماہر بلاغ کی طرح آپ نے شعر بھی درست تجویز فرمایا۔ یک فلمی سرگزشت میں پروفیسر ڈاکٹر سید سلیم حسن رضوی صاحب کے متعلق بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ سید سلیم حسن رضوی صاحب میرے استاد و گرامی پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی صاحب کے استاد و گرامی تھے۔ ”عہد خیال“ میں کرسی صدارت پر ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب رانا محمد سجاد صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کے خیالات کو پڑھ کر لطف آ گیا۔ انہوں نے میری سالانہ رپورٹ کو بے حد سراہا۔ فقیر جذبات احسان مندی کا اظہار کرتا ہے۔ محترمی جناب محمد عمران جو ماضی صاحب، بشری افضل صاحبہ، قیصر خان صاحبہ، سید انوار عباس شاہ صاحب نے ہماری

سالانہ رپورٹ کو سراہا۔ شکر یہ ادا کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں۔ فنی عزیز مئے، احمد خان قحیدی اور رانا فیصل جاوید کا بھی بے حد شکر یہ جو انہوں نے سالانہ رپورٹ کو سید قبولت بخشی، دوستوانہ اللہ اگلے سال کوشش ہوگی کہ اس سے بھی بہتر انداز میں رپورٹ مرتب کی جاسکے۔ اس ماہ شاہد جہانگیر شاہد، طاہرہ محترمہ صاحبہ، ایچ اے حسین سٹار، سدرہ بانو ناگوری، انجم فاروق ساحلی وغیرہ غائب تھے۔ اللہ خیر کرے (خطوط طے مگر تب تک پرچا پر لیس جا چکا تھا) میرے خیال ناقص میں اس ماہ کا سب سے تعمیری خط محترمہ ناصرہ احمد فرام امریکا تھا۔ کتنی انسانیت بھر دتجا ویز ان کے تحفل میں اقامت پذیر ہیں۔ اللہ پاک انہیں حسن نیت راجز عظیم عطا فرمائے ویسے بھی حدیث شریف ہے کہ سرکاری کریم نے ارشاد فرمایا۔ ”مومن کی نیت اس کے عمل سے بڑھ کر ہوتی ہے۔“ معراج انکل، ہم رانا محمد شاہد صاحب کی والدہ محترمہ کے وصال پر ان سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اللہ پاک مرحومہ کو اپنی خصوصی رحمتوں، شفقتوں کے سائے تلے جگہ عطا فرمائے، آمین۔ ڈاکٹر ساجد احمد صاحب انسانی تاریخ کے سب سے بڑے سائنس دان آئن اسٹائن کے حوالے سے زبردست تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے آئن اسٹائن کو اعلیٰ اردو کے لیے دوبارہ زندہ کر دیا۔ ویلڈن ڈاکٹر صاحب۔ معراج انکل سے ایک التماس کرنا چاہوں گا اگر ہو سکے تو معروف صوفی شاعر بیہم شاہ وارثی کے حوالے سے کوئی تحریر شائع فرمادیں تو از حد مہربانی ہوگی۔ منظر امام صاحب پڑھنا منع ہے کے باوجود پڑھنے کے لیے مجبور کرتے نظر آئے۔ بہت قابل قدر سٹائٹس مضمون جناب منظر امام صاحب کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔ ویسے بھی میں کتابوں کے حوالے سے جانکاری کو پسند کرتا ہوں۔ ہمارے ہر وزیر جناب انور فرہاد صاحب شہداء کے حوالے سے تاثرات جمع کرتے نظر آئے۔ انور صاحب کا یہ پہلو بھی دل کو بھا گیا۔ محترمی ابن کبیر صاحب خلا میں نماز کے حوالے سے ایک یادگار تحریر لے کر حاضر تھے۔ بہت خوب ابن کبیر جی۔“

☆ بشری افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ”سرگزشت ملا۔ واہ جی واہ تین تین صنف کرخت تا نخل پر براجمان ہیں۔ صعب نازک حیران و پریشان ہیں اپنی مغل میں پہنچے کسی صدارت رانا محمد سجاد کے حصے میں آئی۔ خاصا فصیح تبصرہ تھا۔ رانا محمد سجاد مابدولت تو ہر ماہ حاضری دے رہی ہیں۔ رانا محمد شاہد کی والدہ کے انتقال پر دکھ ہوا۔ خدا ان کو جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ قیصر خان آپ کی دعائیں ہی تو ہیں کہ دشمن سے بچی ہوئی ہوں۔ میری پیاری بہن، ہم کو 16 جنوری کو تنہا چھوڑ گئیں۔ ان کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا وہ وفات پا گئیں ہیں، بہت یاد آتی ہیں ان کے لیے دعائے مغفرت کریں سب ساتھی۔ میگزین لیٹ ملا اس لیے کہانیوں پر تبصرہ نہ کر سکی۔ انشاء اللہ اگلے ماہ ضرور لکھوں گی۔“

☆ خرم علی راؤ کا ای میل۔ ”محترم آفاقی صاحب کی وفات پر تعزیت قبول کریں۔ میں اولین شماروں سے ہی سرگزشت کا قاری ہوں۔ اسی سے آفاقی صاحب سے شناسائی ہوئی۔ (آپ کا مضمون سرگزشت کے مزاج کا نہیں تھا۔ آپ اس قسم کی تحریر بھیجیں جو سرگزشت کا حصہ بنتی رہی ہیں)“

☆ عبدالقیوم انک شہر ہے۔ ”میں رسالے کا سالانہ خریدار نہیں لیکن انک میں ایک دوست کی شاپ سے سرگزشت مل جاتا ہے۔ کچھ تحریریں تو ادبی لحاظ سے قابل قدر ہوتی ہیں اور کچھ اتنی دلچسپ کہ ہر ماہ رسالے کا انتظار رہتا ہے۔ مضمون کی شکل میں ایک مزاحیہ ”فلمی ایکٹرز سے مختصر انٹرویو“ ارسال ہے۔ (اس قسم کی تحریر سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے) تین سال کی عمر سے نصف صدی کراچی میں گزار کر گیارہ سال سے بنجر قسم کے ماحول میں سسک رہا ہوں۔ فلمی جماعت سے سیکنڈ ایئر ایل ایل بی تک تعلیم پائی۔ کراچی کی فلمی صنعت میں سالوں گزارے۔ پراسن کراچی کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ ہمارے دوست کچھ منوں مٹی تلے جاسوئے کچھ ہجرت کر گئے۔ یاد آتے ہیں تو دل اداس ہو جاتا ہے۔ دل میں ہو کہ سی اٹھی ہے اور یہ سوچ بے چین کر دیتی ہے کہ نہ جانے کب یہاں سے چھٹکارا پا کر اصل وطن یعنی کراچی کو دیکھنا نصیب ہوگا۔“

☆ اشفاق احمد ڈرائیور، حفر ضلع انک سے لکھتے ہیں۔ ”میں گزشتہ پندرہ سال سے سرگزشت کا قاری ہوں اور 2000ء سے لے کر اب تک تمام شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ میرے بیٹے جنوٹی جناب اختر رشید کو گھر کے پاس کوئی ماری گئی ہے اسی لیے خط بھیجنے میں تاخیر ہوئی۔ قارئین سے فاتحہ کی اپیل ہے۔ (بہت شکر یہ کہ آپ نے جن لوگوں کے بارے میں اطلاع دی۔ مصنف سے باز پرس کی جارہی ہے)“

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ”میں گزشتہ سرگزشت کا شمارہ ملا اور اسی شام انکل علی سفیان آفاقی انتقال کر گئے۔ فلمی دنیا کا ایک بڑا نام کہ جنہوں نے ہمیشہ اپنے دامن کو فلمی دنیا کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ ”فلمی الف لیلا“ ایسے رازوں سے بھری کھاتھی جو ان کے سینے میں محفوظ تھی۔ ایک دھوپ تھی جو گزشتہ آفتاب کے۔ انکل کے شے میں کیسے کیسے راز تھے کہ ابن مغل کا ایک شعر یاد آ گیا ”جو ہم کہہ گئے وہی ہمارا فن ٹھہرا اسرار۔ جو ہم کہہ نہ پائے نہ جانے وہ کیا چیز ہوگی۔ اور ہم کہتے ہی وہ کہنے کے ”زمانہ تو بڑے شوق سے سن رہا تھا ہم ہی سو گئے داستان کہتے کہتے“ کیم فروری کے ایکسپریس اخبار میں امجد اسلام امجد نے آفاقی انکل کا ذکر کیا اور سرگزشت کو ایک ادبی جریہ قرار دیا جو کہ سرگزشت کے قارئین کے لیے بڑے غری کی بات ہے۔ انکل آفاقی کے لیے ہماری طرف سے ایک چھوٹا سا تذکرہ کہ سرگزشت کے صفحات کی رونقیں بکھر گئیں جن کے دم سے قائم تھیں وہ محفلیں اجڑ گئیں۔ ادارے میں انکل نے ایک خط 16 دسمبر کی یادیں تازہ کر دیں۔

عجب خوف اور کرب کا عالم ہے کہ معصوم بچوں کے پھول سے چہرے بھلائے نہیں بھولتے۔ روتی ماؤں اور اجڑے شہر پشاور کی اداسیاں، راتوں کو سونے نہیں دیتیں اور اس بارشکار پوری امام بارگاہ میں قیامت کا منظر دیکھنے کو ملا۔ آنکھیں نم اور سینہ غم سے بوجھل (اگلے ہی جمعہ کو پشاور کی مسجد پر حملہ ہو گیا) بس خدا ہمارے حالوں پر رحم فرمائے۔ محکمہ ڈاک کی مہربانی سے اس مرتبہ ہم ”شہر خیال“ کی محفل میں شرکت نہیں کر پائے لیکن دوستوں کے خطوط میں ہمارا نام دیکھ کر اچھا لگا۔ طاہرہ ہاجی جنوری کے شمارے میں آپ نے بھاری تعریف کی آپ کا بہت شکریہ۔ رانا سجاد اپنے مکتوب خاص کے ساتھ ”صدارت کی کرسی“ پر نظر آئے اور چھانگے ویڈیو سجاد بھائی رانا شاہد بھائی کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ رب تعالیٰ ان کو اور ان کی فیملی کو صبر دے۔ سکیل احمد عباسی بڑی دیر کردی آپ نے آتے آتے۔ ناصر و احمد آپ کی تجویز تو عمدہ ہے لیکن یہ باتیں صرف کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ عملی زندگی میں ان پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ انور بھائی آپ خود کو نالائق اور کند ذہن کیوں سمجھتے ہیں حالانکہ آپ نے مختصر لیکن بہت بہترین لکھا ہے۔ ویری گنڈ ”باکمال“ میں ڈاکٹر ساجد امجد نے آئن اسٹائن پر لکھ کر کمال کر دیا اور اپنے خوب صورت انداز میں لکھ کر سرگزشت کے صفحات پر چار چاند لگا دیئے۔ منظر امام کی ہدایت کے باوجود ”پڑھنا منع ہے“ ہم نے بڑے شوق سے پڑھا اور متنازع کتابوں کی فہرست کو فوراً اپنی ڈائری میں اتار لیا۔ انور فرہاد ”خون کے آنسو“ لے کر آئے اور اداس لوگوں کی اداسیاں نکھیر گئے۔ ابن کبیر آپ کی تحریر کے ہیرو نے ہمارا سرخسر سے بلند کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو گا کہ چاند پر پہلا قدم رکھنے کا اعزاز امریکیوں کے سر تھا لیکن خلا میں نماز اور روزہ رکھنے کا سہرا مسلمانوں کے سر سجا اور تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ ہمیش کے لیے سنہری الفاظ میں امر ہو گیا۔ ”سفاک محسن“ ایک انوکھی تحریر تھی کہ جس نے لرزاکر رکھ دیا۔ سفاک محسن نے انسانیت کا ثبوت دے کر خود کو تعریف کا حق دار ٹھہرایا لیکن اس کا انجام دکھی کر گیا بہت سے راز فاش کرتی ”سوکن“ میں شہلا صاحبہ نے بروقت ہوش میں آکر اپنے گھر کو نکلنے سے بچا لیا۔ ”حوادث زمانہ“ میں نصرت کے ساتھ قدرت نے بڑا عجب کھیل کھیلایا۔ باپ کے بغیر زندگی کیسے گزرتی ہے اس تحریر میں واضح ہو گیا اور ہمیں بروقت ایک شعر یاد آ گیا کہ شبی ساتھ لاتی ہے زمانے بھر کے دکھ عالی۔ سنا ہے باپ زندہ ہوں تو کانٹے بھی نہیں جیتے۔ آخری جگہ بیانی ”ساحر“ میں ساحر نے عجیب ساحر طاری کر دیا۔ ساحر نے اپنے سحر سے میر کو بڑی اذیت دی اور آخر میں اس کا انجام سارے گناہوں کو جو گویا اچھی تحریر تھی۔

منٹو منشی محمد عزیز نے لندن ضلع ہاڑی سے لکھتے ہیں۔ ”ایک بات کا اعتراف شاید آپ بھی کریں گے کہ جتنی محبت مجھے سرگزشت سے ہے۔ اتنی کسی اور سے نہیں۔ مجھ جیسا مجنوں عاشق شاید ہی کوئی ہو گا اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں ہر ماہ بذریعہ رجسٹری خط آپ کو بھیجتا ہوں اور شاید سب سے پہلا موصول ہونے والا خط۔ ہر ماہ میرا ہی ہوتا ہے۔ ایک اور آپ کی محبتوں کا ثبوت جو آپ نے محترم علی سفیان آفاقی کی وفات سے متعلق ایس ایم ایس مجھے بروقت کر دیا لیکن اسے میں اپنی بد نصیبی ہی کہوں گا کہ میں ابھی تک لاہور نہیں جا سکا۔ بہت افسوس ہوا یہ سن کر اللہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور لوگوں کو نصیحت کرنے کا حوصلہ دے آمین۔ آہ آفاقی انگل! میں نے تین چار مرتبہ مفت

| | |
|---|--|
| <p align="center">سفر در سفر</p> <p>دیسے تو زندگی ایک سفر ہے لیکن کہیں کہیں پڑاؤ بھی آتے ہیں۔ آخری صفحات پر ایک عجیب و غریب پڑاؤ کی داستان منظر امام کے قلم کی روانی</p> <p align="center">درماندہ عشق</p> <p>تاریخ کے اوراق سے ایک اور یادگار داستان۔</p> <p align="center">الیاس سیتا پوری کا سحر انگیز انداز</p> <p align="center">سودائے جنوں</p> <p>ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے ملت اسامیہ کے مصمم ارادوں کا عبرت اثر احوال</p> <p align="center">ماروی</p> <p>کبھی ہمارے جیت، زندگی کے نگین و نگین لحات پر مشتمل</p> <p align="center">موسیٰ الدین نواب کا دلچسپ شاہکار</p> <p align="center">روداد۔</p> | <p align="center">مارچ 2015ء کے صفحات کی بسمت</p> <p align="center">خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ</p> <p align="center">سیرۂ دلگشت</p> <p align="center">لاہنامہ</p> <p align="center">مزید</p> <p align="center">خطوط کی محفل</p> <p align="center">محفل شہرِ سخن اور</p> <p align="center">مرزا امجد جنگ کا مدلل انداز</p> |
|---|--|

ڈاکٹر شیر شاہ سید : کاشفِ فیہر سلیم انور

تویر ریاض اور ڈاکٹر ساجد امجد کی قریب کہانیاں

اس کی جلاو

روزہ فلی میگزین فون کیا تو آپ بٹرنے کہا کہ گیارہ سے تین بجے کے درمیان بات ہو سکتی ہے اور میں..... غم دوران کے چکر میں ان کی آواز سننے سے بھی محروم رہا، آہ۔ فروری کا سرورق خاصا سنسنی خیز تھا۔ یہ غالباً ذکر صاحب کے برش کا کمال ہے ناں؟ ادارہ پڑھ کر ایک بار پھر شہدائشاور کی مغفرت کے لیے بے ساختہ ہاتھ اٹھ گئے۔ یقین کریں اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ اس قسم کا دل دیا ہے کہ بقول شاعر خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ اب بھی اگر کبھی کھانا کھاتے ہوئے مجھے وہ معصوم بچے یاد آجائیں تو خلق سے نوالہ نیچے نہیں اترتا اور کتنا خوب صورت جواب دیا ہے آپ نے سید انوار عباس شاہ کو کہ ضروری نہیں کہ محترم شاہد جہاگیر یا طاہرہ بھرار کے قریبی عزیز بچے ہوں۔ وہ سب بچے ہمارے تھے۔ ہمارا مستقبل تھے اور بزدل دشمن نے ہمارے مستقبل پر حملہ کیا ہے۔ بہر حال ایک بات حوصلہ افزا ہے کہ اس عظیم سانحے نے ایک بار پھر پوری قوم کو متحد کر دیا ہے۔ اللہ کرے ہمارا یہ اتحاد و اتفاق ہمیشہ قائم رہے تو شاید دشمن کو دوبارہ یہ ناپاک جسارت کرنے کا حوصلہ نہ ہو۔ ”عہر خیال“ سے اس بار محترم شاہد جہاگیر شاہد اور طاہرہ بھرار صلبہ غیر حاضر تھے۔ (دونوں کے خط پر چارپائیں جانے کے بعد مجھ تک پہنچے) شاید ان میں حوصلہ نہ تھا کہ وہ اپنے پیارے شہر پر بیٹنے والے اس سانحے کے بعد سرگزشت کے لیے کچھ لکھتے۔ محترم شاہد جہاگیر اور طاہرہ باگئی! آپ دونوں کا غم یقیناً ہم سب سے بڑھ کر ہے لیکن جب مجھے اپنے دل کی کیفیت کا پتا ہے تو آپ کے دل پر بیٹنے والی کیفیت میں بخوبی محسوس کر سکتا ہوں۔ اللہ ہم سب کو یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ دے، آمین۔ رانا محمد سجاد مرے بعد آئے اور خوب آئے۔ کرسی صدارت کے لیے مبارک باد۔ سہیل احمد عباسی و عظیم بیک۔ محترمہ بہن روبینہ نقیس انصاری، ایم اے خالق بھٹی، عبدالرؤف عدم اور دیگر پرانے ساتھی کہاں کہاں غیر حاضر ہیں اور ہاں ہالیوں دین پوری کا کوئی پتا چلا دیکھیے میں نے تو خط لکھ کر رکھ دیا ہے اور تنگ سے کہہ دیا ہے کہ اگر میں مر جاؤں تو وہ خط سرگزشت کو بھجوا دینا۔ کہانیوں پر تبصرہ انہی طرف سے۔ آخری جگہ بیانی ساحر میں احسن کا ایک فقرہ کہا ہوا، ساری کہانی کا نچوڑ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ نیک عورتوں کے لیے نیک مرد اور بد عورتوں کے لیے بدکار مرد۔ دیگر یہ کہ اس ساحر کا انجام اچھا ہوا، خس کم جہاں پاک۔ حوادث زمانہ میں ڈاکٹر عبدالحفیظ نے بے سہارا عورتوں کے جذبات کی اچھی ترجمانی کی ہے۔ چلیے نصرت کو کچھ تو فائدہ ہوا۔ شیطان فرشتہ پڑھ کر دل دہل گیا۔ عبدل جیسے درد مند کو عبرت ناک سزا ملنی چاہیے تاکہ دوبارہ کوئی ایسی حرکت کرنے سے پہلے سو بار سوچے۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا قانون بہت نرم ہے شاید۔ خانہ بدوش رنجیدہ کر مٹی۔ بعض اوقات انسان کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔ ”سنہری دھوپ“ اس ماہ کی بہترین جگہ بیانی تھی۔ یہ ان لڑکیوں کے لیے سبق ہے جو محبت کے نام پر لٹ جاتی ہیں۔ حسی اور اس کی سہیلی کا فعل بہت اچھا تھا۔ صائمہ اقبال کی ”آسیب محبت“ پراسراری عشق و داستان لگ رہی تھی یا شاید یہ سدرہ کی چھوٹی بہن سارہ کی کارستانی تھی۔ ”سوکن“ میں فرزانہ نے بہت زبردست جال بچھا تھا لیکن ثنا کے خاندان کی قسمت اچھی تھی جو ایڈووکیٹ صاحب نے فرزانہ کا سارا کچا چٹھا کھول دیا۔ بہر کیف اپنے شوہر کے معاملات سے لاشعور رہنے والی عورتوں کے لیے اس میں بہترین سبق پوشیدہ ہے۔ ”قسمت“ کو اس ماہ کی دوسری بہترین کہانی کہا جاسکتا ہے۔ نایاب کا جذبہ قابل تعریف ہے کہ اس نے اپنی ہمت کے بل بوتے پر اپنے گھریلو حالات اور مریض باپ کو بھی بھلا چکا کر دیا۔ ”سفاک سخن“ بیانی جگہ بیانی تیسرے نمبر پر رہی۔ تنویر کی قسمت دھینا اچھی تھی جو وہ نک گیا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ ”غلامی نماز“ اس شمارے کی بہترین تحریر ہے دیگر تحریروں میں باکمال، خون کے آنسو، پڑھنا منع ہے اور سمندر کے مجید پڑھ چکا ہوں۔“

ہمنا ناصر حسین رند ہلاولپور سے قطر از ہیں۔ ”سب سے پہلے آپ کا اظہار یہ پڑھا۔ آپ کے خیالات اور قلم کے جہاد پر ہمارے دل سے یہ دعا نکلے اللہ تعالیٰ آپ کا ہر کام پر سلامت رکھے آمین۔“ خون کے آنسو“ انور فرہادی 16 دسمبر کے سانحے پر غور طلب تحریر تھی جس میں انویم کھیر اور سلمان خان نے ہمارے مجید جی کے لیے جن عظیم خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے دل سے خود بہ خود یہ دعا نکلے کہ رب العالمین انویم کھیر کو اسلام کی دولت نصیب فرمائیں اور سلطان خان کے ایمان کی حفاظت فرمائے، آمین۔ ”غلامی نماز“ ابن کبیر کی عمدہ تحریر تھی۔ شیخ مظفر نے جب غلامی زمین کی طرف نگاہ کی تو سورہ رحمن کی آیات کا ترجمہ پڑھ کر تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو بھٹاؤ گے۔ دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ ”پڑھنا منع ہے“ مظفر امام دیری گڈ۔ ہمیشہ کی طرح الٹ سی تحریر لائے۔ ایسی کتابیں جن کا پڑھنا ممنوع ظہر اگر مظفر امام صاحب ان کتابوں کا ذکر بھی کر دیں جو پاکستان اور دنیا میں بام عروج تک پہنچیں تو ہم ان کے شکر گزار رہیں گے۔ ”سمندر کے مجید“ عائشہ جونجو ہاتھی والے کی طرح سمندر کے مجید لیے حاضر تھیں۔ وہ پہلے کی طرح انوکھی اور حیرت میں لیے تحریر لاتی ہیں۔ ان کی چوٹیں شاندار ہے۔ نئی کہانیوں میں آخر میں کبھی جانے والی تحریر ”ساحر“ نے واقعی بحر میں جٹا کر دیا۔ حیرت انگیز اور اپنے بحر میں جکڑے رکھا۔ اس طرح کے شیطانی قوتوں کے لوگ دنیا میں اتنی طاقت رکھتے ہیں تو اللہ کے رحمانی بندے تنہی طاقت رکھتے ہوں گے۔ آخر میں کہ ان کی اس آیات سے صد فی صد ہم متفق ہیں کہ نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بدکار مردوں کے لیے بدکار عورتیں۔ آخری کہانی ”ساحر“ اول رہی۔ ”روم“ ”آسیب محبت“ صائمہ اقبال ہمیشہ کی طرح سنسنی تجسس سے بھرپور شاہکار لیے حاضر تھیں۔ اگر اس تحریر کو نفسیاتی مسئلہ سمجھیں تو پھر فلم ”مدھن“ جان ابراہیم اور پاشا باسو کی دیکھیں اور اگر روحانی نظر سے دیکھیں تو پھر تنویر کی ”ہوایا داگئی“۔ تیسرے نمبر پر ”قسمت“ رہی۔ ”سنہری دھوپ“ افسانوی رنگ لیے ہوئے تھی۔ رانا محمد سجاد اتنا عمدہ لکھنے اور صدارت کی مبارک۔ رانا محمد شاہد کاش ایسے موقع پر جب آپ کی والدہ ماجدہ دارقانی سے رخصت ہو گئی ہیں ہم آپ کے گلے لگ کر افسوس

کرتے، کیا کر سکتے ہیں ہر کسی نے جانتا ہے، اللہ تعالیٰ مہربان رحم آپ کی والدہ کو فرودوں بریں میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ سہیل احمد عباسی! بھائی آپ کی غیر حاضری دل کو پریشان کر دیتی ہے کیا کریں آپ 1991ء میں ”عصیر خیال“ میں داخل ہوئے اور ہم 1992ء میں۔ آپ سے تعلق ہی ایسا ہے بہر حال ہمارے بلانے پر آنے کا شکریہ۔ ڈیڑھ معراج رسول صاحب ہم نے سلور جوبلی کی تجویز نومبر 2012ء اور پھر دوبارہ مارچ 2014ء کو دی پھر وہ ٹافو فٹا توجہ دلاتے رہے۔ سب سے پہلے ہماری تجویز کی تائید خود آپ نے کی۔ 2012ء کو ہم نے لکھا کہ آپ کے پاس صرف دو سال کا وقفہ ہے اس لیے کام شروع کر دیں آپ نے لکھا انشاء اللہ ہماری تجویز پورے ساٹھ سال تک چلے جائے گی۔ خیال بہت اچھا ہے۔ پھر منشی محمد عزیز مئے نے اور جاوید خان درانی سرکافی نے سب سے پہلے بھر پور تائید کی تھی۔ لکھنے کا مقصد یہ ہے جب آپ نے ہماری تجویز قبول کر کے تیاری شروع کر دی تو ایک موصوف فرما رہے ہیں کہ ہماری تجویز ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے شاہد جہانگیر شاہد کی تحریر شاعر اعظم کو سال دو سال بعد ہم شاعری کے نام سے سرگزشت میں شائع کروادیں تو شاہد جہانگیر شاہد اور ادارہ کا ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ جو ضرور بیان کر دیجیے گا۔ بہر کیف ان خطوط کی فوٹو کاپی ثبوت کے ساتھ خط کے ہمراہ ہے۔ برائے مہربانی توجہ دیجیے گا۔ ان دنوں خونی چاند کا بہت زیادہ تذکرہ ہے۔ یہودی کہتے ہیں جب آگے پیچھے 4 دفعہ خونی چاند بلند مون دنیا میں نظر آئے تو پھر ہمارا عظیم بادشاہ کا ظہور ہوگا۔ یعنی ”خروج و جال“ ہوگا۔ جن کا وہ پانچ صدیوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ پہلا خونی چاند 15 اپریل 2014ء کو نظر آیا۔ دوسرا خونی چاند 18 اکتوبر 2014ء کو ہوا۔ اب تیسرا خونی چاند 4 اپریل 2015ء کو نظر آئے گا۔ چوتھا اور آخری خونی چاند 28 ستمبر 2015ء کو نظر آئے گا۔ سلور جوبلی میں یا اس سے پہلے اس پر تحقیقی اور معلوماتی تحریر لکھیں۔ جنوری کے شمارے میں شیراز خان، تاشا، لے نے اب حیات لکھی۔ تلاش کی طرح عجیب زبردست تحریر تھی۔ ہمارے خیال میں وہ حیرت انگیز اور عجیب و غریب کہانیاں لکھنے پر ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ سرگزشت میں اچھا اور خوب صورت اضافہ ہیں۔ ان کو سرگزشت سے نہ جانے دیجیے گا۔ آئی طاہرہ بھگزار آپ نے اتنی محبت سے پی پی برتھ ڈے کی مبارک باد دی کہ دل چاہا کہ پشاور پہنچ کر آپ کا منہ میٹھا کر واؤں۔ سدرہ بانو ناکوری کہاں تم ہو گئیں؟ عمران جوانی آپ کا انتہائی مشکور ہوں۔ بشری افضل بہت ہمیشہ خوش رہیں۔ منشی عزیز مئے، احمد خان توحیدی اچھا لکھ رہے ہیں۔ عزیز اللہ کانی عرصے بعد ”عصیر خیال“ میں آئے۔ انہوں نے مایا تحریر سے نہیں ہن کھن اور کالے بچھو کے بارے میں جو معلومات دی ہے تو ہم عرض کریں جناب وہ کام تو ”وگرا“ بھی کر دیتا ہے۔ یہ کوئی اور چکر ہے۔ یا تو کینسر والا معاملہ ہے یا کوئی اور۔ معراج رسول صاحب سے گزارش ہے کہ ہن کھن (زہر بلا چھپکلا) اور کالے بچھو پر معلوماتی تحریر شائع کریں۔ سلور جوبلی نمبر غالباً اگست میں شائع ہوگا؟ ”باکمال“ آئن اسٹائن کا اس خط کے بعد مطالعہ کریں گے۔ اس تحریر کا شدت سے انتظار تھا۔ شکریہ۔

شاہد جہانگیر شاہد کا مختصر مگر بھرپور خط پشاور سے۔ ”سرگزشت چند ماہ سے حالات کچھ ایسے ہیں کہ کچھ لکھنے کوئی نہیں چاہتا جس کی وجہ چند بہت ہی عزیز ہستیوں کا دنیا سے کوچ کر جانا ہے۔ سب سے بڑھ کر جس واقعے نے خون کے آنسو رنائے ہیں وہ آری پبلک اسکول کے معصوم بچوں اور اساتذہ کا انتہائی بے دردی سے قتل ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت سب سے سستی چیز انسانی جان ہے۔ ماضی میں ہمارے حکمرانوں نے حماقتوں سے جو فصل بوئی وہ آج ہم کاٹ رہے ہیں۔ زخم زخم پشاور آج بھی سو گوار ہے۔ اللہ رحم کرے۔ اسکول کا ٹم تازہ ہی تھا کہ حیات آباد کی مسجد میں عین جمعہ کی نماز میں حملہ ہو گیا۔ وہ بھی تو گلہ گو ہیں۔ عین نماز میں خود کش حملہ، اف خدا یا۔ سرگزشت کے دیرینہ کالم نگار، قلم ساز و کہانی نویس علی سفیان آفاقی بھی ہمیں کو چھوڑ گئے۔ ہیر خیال کے ساتھی رانا محمد شاہد کی والدہ کے انتقال پر تعزیت۔ اس سے زیادہ اور کچھ لکھنے کی تاب نہیں۔ آئندہ ماہ پھر پور تبصرہ کے ساتھ حاضری دوں گا۔“

ہمایہ مجید احمد جانی ملتان شریف سے رقمطراز ہیں۔ ”بندہ ناچیز کو مجید احمد جانی کہتے ہیں۔ منشی عزیز مئے کی دعوت پر ہم بھی شامل حال ہونے کی جسارت کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے جگہ عنایت فرمائیں گے۔ آپ سب کے لیے نیا ضرور ہوں لیکن ملے ہیں تو ساتھ رہے گا۔ معراج رسول کا ادارہ پڑھتے ہی دل خون کے آنسو روہنے لگا۔ شہد پشاور کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ دشمنوں کو نیست و نابود کرے۔ مقبول ترین سلسلہ ہیر خیال میں قدم جمائے تو رانا محمد سجاد کو صدمات کی کرسی پر براجمان پایا۔ تفصیلی تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس کے علاوہ پیارے دوست منشی محمد عزیز مئے اور رانا محمد شاہد پورے والے جن کو جانتا بھی ہوں بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ملک محمد ظفر اللہ، سہیل احمد عباسی، محمد عمران، اولیس شیخ، بشری افضل، قیصر خان، سید انوار عباس شاہ، ناصرہ احمد، فقیر غلام حسین، فیاض، خالد شفیع، احمد خان توحیدی، عزیز اللہ، رانا فیصل جاوید شاندار تبصرے فرما رہے تھے۔ سبھی کو مبارک باد قبول کیجیے۔“

بہدافسوس مندرجہ ذیل قارئین کے خطوط تاخیر سے موصول ہوئے۔

ارباز خان، ذہیب، اچکڑی (پشاور)، نادر مرزا (اسلام آباد)، مسیح اکرام (مظفر گڑھ)، دوپٹے حسن (ساہیوال)، نازش صدیقی (کراچی)، فتح دین (سکسر)، ارشد علی وارث (جہلم)، مانی (دینہ)، اکرم ترمذی (ملتان)، عباس علی خان (وہی۔ جالے ای)

استادِ ادب

آزادی کے بعد اردو ادب میں ایسے گنتی کے نام ابھرے جنہیں ہم معمارِ اردو ادب کہہ سکتے ہیں۔ انہی نابغہ روزگاروں میں ایک نام ابواللیٹ صدیقی ہے جنہیں ہم فخریہ پاکستان کا اہم قلم کار کہہ سکتے ہیں۔ ان کے کات دار جملے، پینی نظر، الفاظ کی پرکھ اور جملوں کی مضبوط ساخت اپنی مثال آپ ہے مگر ان کی زندگی کتنے عجیب انداز میں گزری، کن مصائب کا سامنا رہا۔ یہ بلند مقام کس جہد مسلسل کے بعد حاصل ہوا اسے یاد رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کی زندگی سے ہی سبق بہ آسانی حاصل ہوتا ہے۔

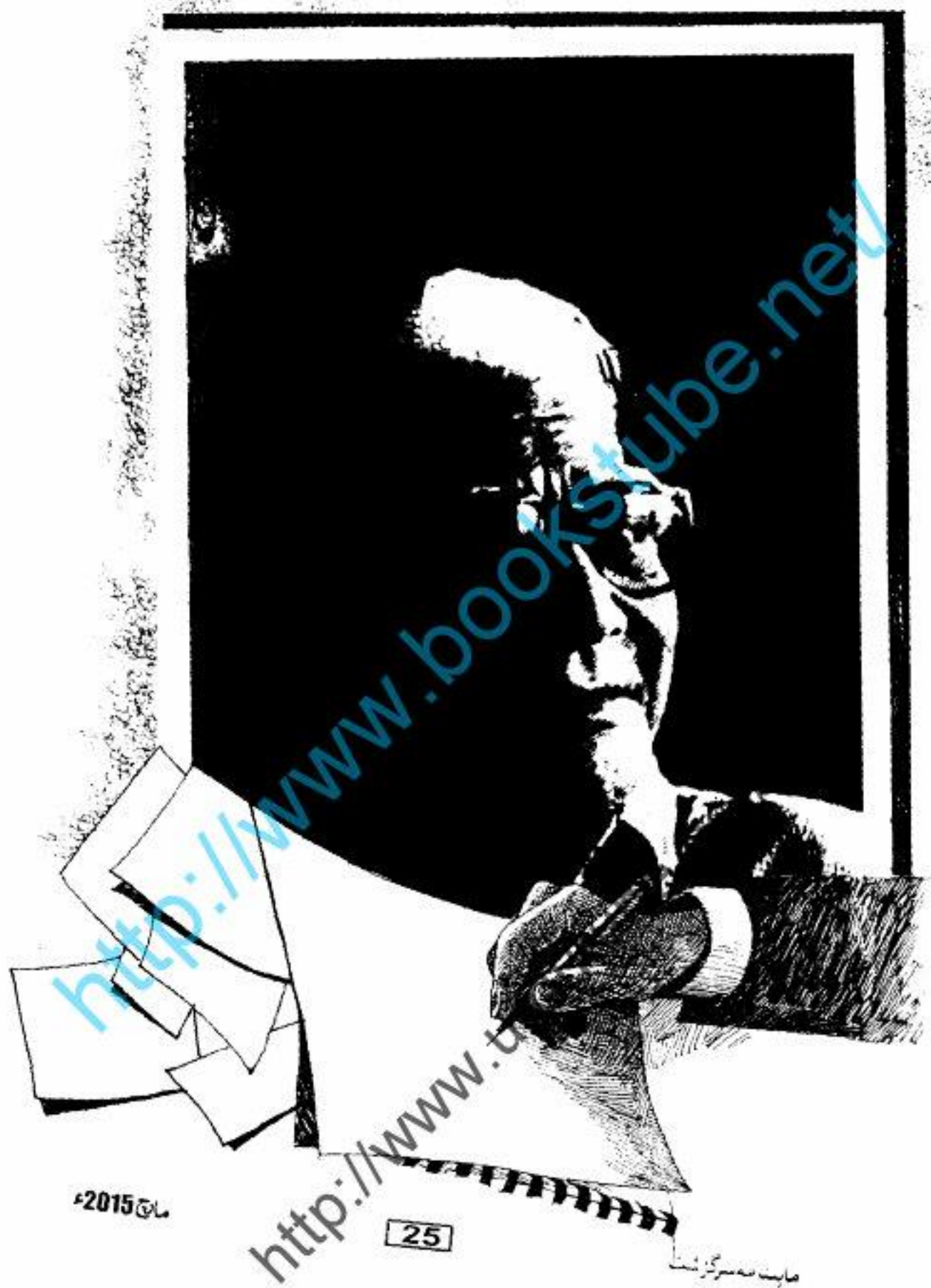
انہی کی دختر سے شادی کی۔ جب انہوں نے اتنی ترقی کر لی تو ان کے والد ملک حمید الدین بزرگوار نے بھی رخصت سفر باندھا، بزرگوار کو خیر باد کہا اور بدایوں آگئے۔ یہ بزرگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آل میں سے تھے۔ ان کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے دربارِ دہلی سے انہیں اعلیٰ منصب عطا ہوئے۔ انہی بزرگ کی مناسبت سے یہ خاندان ”حمیدی“ کہلانے لگا۔ قاضی صدر الدین کے تعلق سے اردگرد کے علاقے کو قاضی محلہ کہا جانے لگا۔

اس خاندان کے شجرِ سپاہ دار کی شاخیں پھیلیں تو حمیدیوں کے بہت سے مکانات تعمیر ہو گئے۔ اس خاندان کے فرزندوں نے بدایوں کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی میں ایسے نمایاں کردار ادا کیے کہ بزرگوں کی عزت و عظمت و جلال کا اندازہ لگادے۔

وقتِ ادا آگے بڑھا۔ ضرورتوں نے پاؤں پھیلائے۔ دلوں میں وطنی محاسنوں نے پاؤں سمیٹ لیے۔

کہانیاں جھوٹ بول سکتی ہیں، آنکھوں دیکھی کو جھوٹ کون کہے۔ ماضی نے حال کے بستر پر کئی شکنیں ڈال دی تھیں لیکن اب وہاں بھی اتنا تھا کہ جس دروازے پر بچ بچ کا ہاتھی جھوماکرتا تھا اب دو گھوڑوں کی بھی آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس حویلی نما مکان کے ایک کین منشی مظفر علی اس بھی پر سوار ہو کر شام کی سیر کے لیے نکلتے تو کئی کہانیاں ان کے آگے آگے چلتی تھیں۔ ایک کہانی سب سے زیادہ برعزت تھی۔ وہ یہ کہ یہ صاحب جو بھی میں بیٹھے ہیں اور جن کے چہرے پر نری اور جلال کے طے جلتے تاثرات نمایاں نظر آرہے ہیں۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے لیے ان کے اجداد نے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا۔

اس سے بھی پیچھے چلے جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادے کے ایک بزرگ قاضی صدر الدین بہ عہد سلطان غیاث الدین بلبن بزرگوار سے ہندوستان آئے اور بدایوں پہنچے۔ بدایوں کے قاضی سعد الدین کے جانشین ہوئے اور



©2015

25

صاحب نام سرگزشت

تا اتفاقیوں نے زور باندھا تو آنکھوں میں دیواریں اٹھنے لگیں۔ جسے بخرے ہونے لگے جن کی دسترس میں تھا انہوں نے اپنے رہنے کے لیے الگ مکان بنوا لیے۔ مظفر علی نے بھی اپنے رہنے کے لیے الگ مکان بنوایا۔ یہ مکان بھی کسی حویلی سے کم نہیں تھا۔ اتنا خوب صورت بنا تھا کہ ماضی کی شان و شوکت کو حال کی آنکھوں سے دکھارہا تھا۔

☆.....☆

دیوان خانے میں چار دوست سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک نظام الدین نظامی، نظامی پریس ہدایوں کے مالک تھے۔ دوسرے اختر الاسلام تھے جو جیلر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ تیسرے دوست مولوی ہیہ احمد صاحب تھے اور چوتھے خود منشی مظفر علی تھے۔

گفتگو کے دوران میں نظامی صاحب خاموش بیٹھے رہے تھے لیکن جب سب اپنی اپنی کہہ چکے تو نظامی صاحب نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

”میرے خیال میں تو آپ کو یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ ہمیں آپ سے چھڑنے کا دکھ ضرور ہوگا لیکن ہدایوں سے آگرہ دور ہی کتنا ہے۔ آپ کے دل میں اگر ہماری محبت ہوگی تو ہفتہ پندرہ دن میں ہدایوں کا پھیرا لگا سکتے ہیں۔ میں تو اکثر آگرہ جاتا رہتا ہوں۔ اگر آپ نہ آئے تو اپنے اخبار میں اشتہار چھاپ کر آپ کو بلا لوں گا۔ غرض ملاقات ہوئی جایا کرے گی۔ ترقی کا ایک موقع ہاتھ آ رہا ہے تو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے نظامی صاحب۔“ منشی مظفر علی کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

”جب ٹھیک سے تو پھر کیا ہے؟“

”سوچنا ہوں دوستوں کی جو کڑی ختم ہو جائے گی۔ دو شہروں کا فاصلہ بہر حال فاصلہ ہوتا ہے۔ یوں شام کو روز کیسے مل سکیں گے۔ نوکریاں ہزار مل جائیں گی دوست کہاں ملتے ہیں۔“

”مظفر علی! بعض فیصلے جذبات سے نہیں عقل سے کیے جاتے ہیں۔ لوگ سرکاری نوکری اس لیے کرتے ہیں کہ ترقی کریں۔ اس کے لیے سفارشیں کراتے ہیں آپ کو بھی سفارش کے بغیر ہی ترقی مل رہی ہے۔ ہدایوں نہ سہی آگرہ سہی۔ میری تو یہی رائے ہے دیسے آپ ہم سب سے زیادہ عقل مند ہیں۔“

اختر الاسلام صاحب نے بھی اس وقت یہی رائے دی۔ ”مظفر علی، یہ انگریز کا دور ہے انگریز کا۔ کسی ہندوستانی

کو ترقی ایسے ہی نہیں مل جاتی۔ میں جیلر رہا ہوں، مجھے معلوم ہے لوگ اس ترقی کے لیے کیسے کیسے پاڑ بیٹے ہیں اور یہ بھی یاد رکھیے یہ قوم بڑی ظالم ہے جسے انگریز کہتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ آپ نے ان کے احکامات ٹھکرا دیے تو زندگی بھر کے لیے ترقی کے خواب دیکھنا چھوڑ دیجیے گا۔ رجسٹرار خفیہ عدالت کوئی معمولی عہدہ نہیں ہوتا، آگرہ بڑا شہر ہے بچوں کو اچھے اسکول بھی میسر آئیں گے۔ میں بھی نظامی کی طرح یہی مشورہ دوں گا کہ آگرہ چلے جاؤ۔“

مظفر علی سر جھکا کر سن رہے تھے۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن تو ہو گئے ہیں لیکن ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں۔ ابھی ان کے دل و دماغ نے کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا ہے۔

دوست رخصت ہوئے تو وہ غالباً کچھ مزید سوچنے کے لیے اپنے کتب خانے میں چلے گئے۔ ان کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ وہ شرفا کے مشغلے شاعری پر بھی کار بند تھے اس لیے ان کے کتب خانے میں شعرا کی دوا دین کثرت سے تھے۔ ان میں بھی زیادہ تعداد شعرا کے لکھنؤ کے دوا دین کی تھی۔ نثر کی کتابیں بھی اچھی خاصی تھیں۔ طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ سے لے کر شعرا کے تذکرے تک، سب کچھ تھا۔

ملازم نے حقہ تازہ کر کے رکھ دیا تھا۔ حقہ کی گڑ گڑاہٹ میں ان کا ذہن بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ ہدایوں چھوڑ کر آگرہ چلا جاؤں یا اسی ملازمت پر گزرا رہ کر تار ہوں؟ دوستوں کی باتیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ کبھی ایک فیصلہ کرتے تھے تو بھی دوسرا درمیان میں کتابوں کی ورق گردانی بھی کرتے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے کم از کم ایک فیصلہ کر لیا۔ آخری مرتبہ بیوی سے اور پوچھ لوں پھر جو وہ کہیں گی وہی کر لوں گا۔

وہ کتب خانے سے نکل کر اپنی بیوی فاطمہ صغرا کے پاس پہنچ گئے۔ فاطمہ صغرا کا شمار صرف خاندان ہی میں نہیں شہر بھر میں تعلیم یافتہ اور ذہین خواتین میں ہوتا تھا۔ ان کے خاندان میں عورتوں کے لیے لکھنے پڑھنے کا رواج ممنوع نہیں تھا البتہ لکھنے لکھانے پر پابندی تھی۔ اکثر عورتیں فارسی، اردو، روانی سے پڑھتی تھیں لیکن انہیں لکھنا نہیں سکھایا جاتا تھا۔ ان میں یہ نکتہ پوشیدہ تھا کہ لڑکیاں کسی کو عشقیہ خطوط نہ لکھ سکیں۔ اس وقت کی تہذیب کا یہی تقاضا تھا۔ اس پابندی کے باوجود فاطمہ صغرا نے اپنی تعلیم کو اس حد تک کھل کیا تھا کہ

نہ صرف اردو بلکہ انگریزی میں بھی دسترس حاصل کی تھی۔
فاطمہ صغرا اس وقت کسی کتاب کے مطالعے میں
مصروف تھیں کہ شوہر کی آہٹ سن کر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بڑا بیٹا
ابوظفر بھی قریب بیٹھا تھا۔ فاطمہ صغرا اٹھ کر بیٹھیں تو ابوظفر
باپ کی شکل دیکھ کر وہاں سے کھٹک گیا۔

فاطمہ صغرا بلا کی چہرہ شناس تھیں۔ شوہر کو دیکھتے ہی سمجھ
گئیں کہ وہ اس وقت کسی الجھن میں ہیں۔

”خیر تو ہے آج دوستوں کے ساتھ بڑی لمبی نشست
ہوگئی؟“ فاطمہ صغرا نے پوچھا۔

”وہ تو کب کے رخصت ہو گئے۔ میں تو کتب خانے
میں تھا۔ وہیں سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔“

”ایسا کیا سوال انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کتابوں
کی ضرورت پڑگئی۔“

”سوال ایسا ہے کہ جواب کتابوں میں بھی نہیں مل
سکا۔ سوچا استانی جی سے پوچھا جائے۔“

”چھوڑیے بھی کیوں مذاق کرتے ہیں۔ میں کہاں کی
عالم فاضل ہوگئی۔“

”میں اس وقت مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ میں واقعی الجھ
گیا ہوں۔ آپ ہی کچھ بتا سکتی ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“

”اللہ خیر کرے۔ ایسا کیا معاملہ پیش آ گیا۔“

”بیگم بات یہ ہے کہ میری ترقی کے احکامات آئے
ہیں۔ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے۔“

”افو، مجھے تو آپ نے ڈرا ہی دیا تھا۔ یہ تو خوشی کی
خبر ہوئی اس میں الجھن کیسی۔“

”آگے تو سنو۔ وقت یہ ہے کہ میری تعیناتی آگرہ
میں ہوئی ہے۔“

”آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے ولایت جانا ہے۔
آگرہ، بدایوں کا ایک محلہ ہی تو ہے۔“

”ہم نے کس چاؤ سے یہ مکان ہو گیا تھا۔ اب اسے
چھوڑنا پڑے گا اور سچی بات تو یہ ہے کہ بدایوں سے جانے کو
جی نہیں چاہتا۔ یہاں احباب ہیں، اجداد کی قبریں ہیں۔

رشتے دار بھی سب قریب قریب ہیں اب تم بتاؤ مجھے کیا کرنا
چاہیے؟“

اب فاطمہ صغرا سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ سمجھ گئیں کہ معاملہ
سنجیدہ ہے۔ ترقی کا ایک موقع ملا ہے اور مظفر علی اس سنبھری
موقع کو ٹھکانے کے لیے موقع ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس موقع

پر انہیں سمجھنا ضروری ہے۔

”دیکھیے انسان اور پتھر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ پتھر
ایک جگہ پڑا رہتا ہے جب کہ انسان آگے بڑھتا ہے۔ آپ
کے عہدے میں اضافہ ہو رہا ہے تنخواہ بھی بڑھے گی۔ ابوظفر
کو ہم اچھی تعلیم دلا سکیں گے۔ چار دن کی زندگی عیش و عشرت
میں بسر ہو جائے تو کوئی حرج ہے کیا؟ میرے خیال میں تو
ہمیں آگرہ چلے جانا چاہیے۔“

”اور یہ مکان؟ اور بدایوں؟“

”ہم یہ مکان فروخت تھوڑی کر رہے ہیں۔ بدایوں
آنا جانا لگا رہے گا۔ اسی مکان میں ٹھہریں گے اور پھر ہمیشہ
کے لیے تھوڑی جائیں گے۔ مدت ملازمت ختم ہونے کے
بعد بدایوں ہوگا اور ہمارا یہ گھر۔“

”تو آپ کی رائے بھی یہی ہے۔“

”صرف میری رائے نہیں میرا اصرار بھی یہی ہوگا۔“

”اب کسی اور سے کیا پوچھنا جب آپ نے بھی
میرے دوستوں کی رائے سے اتفاق کر لیا تو اب آپ تیاری
کریں۔ میں آگرہ جا کر رہائش کے لیے کوئی اچھا سا مکان
دیکھتا ہوں۔“

وہ آگرہ گئے۔ پتھیل منڈی وہاں کا ایک مشہور محلہ
تھا۔ اس محلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی
تھی۔ ایک گھر کسی ہندو کا تو اس کے برابر کسی مسلمان کا ٹھکانا
اور لطف یہ کہ سب اس محبت سے رہتے تھے کہ مذہب کی کوئی
تفریق ہی نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سب پڑھے
لکھے لوگ تھے، کیا ہندو کیا مسلمان۔

اسی محلے میں مظفر علی نے بھی رہنے کے لیے مکان
لے لیا۔ مکان کے سامنے ایک ہندو وکیل رہتے تھے۔ مظفر
علی کا تعلق بھی چونکہ عدالت سے تھا لہذا وہ سب سے پہلے
اس وکیل سے ملے اور اپنے آگرہ آنے کی نوید سنائی۔

مکان کا بندوبست ہو جانے کے بعد مظفر علی بدایوں
آئے۔ بیوی اپنی ضرورت کی چیزیں سمیٹ ہی چکی تھیں۔
زائد سامان گھر میں بند کیا۔ ضروری سامان کے ساتھ گھر
سے باہر نکل آئے۔ پلٹ کر گھر کے دروازے کی طرف
دیکھا۔ دروازے پر لگی سنگ مرمر کی تختی پر نظر پڑی جس پر

ان کا اپنا کھانا ہوا شعر کندہ تھا

محل کی طرح رکھا ہے نکلوں کو نشیمن کے
پہلے سے لے کرے اللہ شاخ آشاں میری

☆.....☆

آگرہ کوئی معمولی شہر نہیں تھا۔ دہلی سے پہلے بھی

دار الخلافہ تھا۔ میر تقی میر، مرزا غالب اور نظیر اکبر آبادی کے نام یاد دلانا تھا۔ ادبی فضا بھی مظفر علی کے حسبِ مشائخ۔ وہ بہت جلد یہاں کے ماحول میں ڈھل گئے۔ فطرتاً مجلسِ مزاج کے حامل تھے۔ بہت جلد احباب کا کثیر حلقہ جمع کر لیا۔ اس حلقے میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ کیا گری کا شوق رکھنے والے بھی اور موسیقی کی تانوں پر سرو دھننے والے بھی۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے تھے جو اپنا تمام وقت اسی وسیع و عریض گھر میں گزارتے تھے۔ غائب ہوئے تو ہفتوں غائب آکر پڑے تو جانے کا نام نہ ارد۔

مظفر علی نے اپنی ملازمت میں بھی خوب ترقی کی۔ مختلف عہدوں سے ہوتے ہوئے آخری منصرفی تک پہنچے اور ”منصرف صاحب“ کہلانے لگے۔

مظفر علی نے بھی کہا تھا۔ ”پہلے پھولے مرے اللہ شاخ آشیاں میری“ شاید اس کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ فاطمہ صغرا نے شوہر کو خوش خبری سنائی کہ شاخ آشیاں میں ایک پھول کا اضافہ ہونے والا ہے۔

آگرہ کی سردیاں عروج کو چھونے کے بعد بہار کے موسم کی طرف راغب تھیں کہ پتیل منڈی کے اس مکان میں نو مولود کے رونے کی آواز سنائی دی۔

مظفر علی نماز فجر ادا کرنے کے بعد گھر لوٹے تھے کہ اس خوش خبری نے ان کی سماعت کو شاد کام کیا۔ اس بچے کا تاریخی نام ابواللیث صدیقی دانش مند تجویز ہوا جس کے اعداد سے 1335ھ برآمد ہوتا تھا۔

اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ بچہ آسمانِ ادب پر ستارے کی طرح چمکے گا محقق، مدبر، مدرس، نقاد، صحافی اور ماہرِ لسانیات ہو گا اور فی کل ابواللیث صدیقی کے نام سے نامور ہو گا۔

اس کا بچپن گھنٹوں چٹا ہوا بچہ بیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ چار سال کا ہو گیا تھا۔ اس وقت کے مسلمان گھرانوں میں اور تقریباً اب بھی یہ عمر ایسی ہوتی ہے جب بسم اللہ کے بعد بچے کی تعلیم کا آغاز کیا جاتا ہے۔

وہ اس عمر کو پہنچا تو مظفر علی کو شوق ہوا کہ بسم اللہ کی تقریب دھوم دھام سے کی جائے۔ دوستوں کا بھی اصرار ہوا کہ اس بہانے مل بیٹھنے کا موقع مل جائے گا۔ مظفر صاحب کا بیٹا پڑھنے کی عمر کو پہنچے اور تقریب نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مظفر علی نے فاطمہ صغرا سے ذکر کیا کہ گھر کی منتظم تو وہی تھیں اور اس اعتماد کے ساتھ ذکر کیا کہ یہ خبر سننے ہی

بیوی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہے گا۔
”لیٹ میاں خدا کے فضل سے چار سال چار ماہ کے ہو گئے ہیں۔“
”اللہ رکھے۔“

”اب اس کی رسم بسم اللہ ہونی چاہیے۔ بچہ ہے خوش بھی ہو جائے گا اور دوستوں کو جمع کرنے کا موقع بھی ملے گا۔“ بات خوشی کی تھی لیکن فاطمہ صغرا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”میں نہیں چاہتی کہ میرا یہ بچہ بھی کسی حادثے سے دو چار ہو۔ ہمیں یہ رسم راس نہیں آتی۔ میں اس تقریب کے حق میں نہیں۔“

”وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ ضروری تو نہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔ اس وہم کو دل سے نکال دو۔ کوئی حادثہ زندگی کو آگے بڑھنے سے روک نہیں دیتا۔“

”جانتی ہوں لیکن کیا کروں۔ میرا دل نہیں مانتا۔ ابواللیث کی بسم اللہ کا سن کر مجھے اپنا پہلا بچہ یاد آ گیا۔ اس کی بھی بسم اللہ ہوئی تھی لیکن کیا ہوا چند دنوں بعد ہی میرا بچہ کس بے بسی کی موت مر گیا۔“

مظفر علی نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانیں۔ یہ تقریب نہ ہو سکی۔

اس کا پس منظر یہ تھا کہ ابواللیث کا بڑا بھائی جس کی رسم بسم اللہ ہوئی تھی اس کے چند دنوں بعد جل کر فوت ہو گیا تھا۔ فاطمہ صغرا اس صدمے سے نکل نہیں سکی تھیں بلکہ ایک وہم سا ہو گیا تھا۔ وہ اسی لیے ایسی کسی تقریب سے گریزاں تھیں۔

مظفر علی کو تو سرکاری کاموں سے فرصت نہیں تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری فاطمہ صغرا پر ہی تھی۔ خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ پڑھی لکھی تھیں۔ بڑے بیٹے ابو ظفر کو بھی وہی پڑھانی تھیں۔ اب ابواللیث بھی پڑھنے کے لائق ہو گیا تھا۔ کسی مدرسے میں بھیجنے سے پہلے وہ خود اسے لے کر بیٹھ گئیں۔

چند روز ہی میں انہیں اندازہ ہو گیا کہ ابواللیث پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ بھی ہے اور ذہین بھی۔ متین ایسا بچہ تھی دے دی جاتی اور وہ گھنٹوں بیٹھ کر لکھتا رہتا۔ کھیل کود سے بھی سروکار تھا۔ چند مہینے نہیں گزرے تھے کہ وہ اردو قاعدہ خوانی سے پڑھنے لگا۔ اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اسے کسی مدرسے میں داخل کرا دیا جائے۔

انہیں محلے کے قریبی مکتب میں بھیج دیا گیا۔ عمر ایسی نہیں تھی کہ کبھی دور بھیجا جاتا۔ فاطمہ صغرا اسے اپنی آنکھوں کی چھاؤں میں رکھنا چاہتی تھیں۔

اس مکتب کے استاد مولوی سلامت اللہ تھے۔ نہایت بھاری بھر کم، کھنٹی داڑھی، چہرے سے غصہ ٹپکتا تھا۔ شاید ہی کوئی بچہ ہو جو ان کی مار کھانے سے بچا ہو لیکن ابواللیث ایسا خلیق و متین تھا کہ وہ دو سال ان کے مدرسے میں رہا لیکن کبھی مار نہیں کھائی۔ جو سبق ملتا فرسنا دیتا۔ لکھنے میں وہ مشاق، ہم جویوں کی شرارتوں سے وہ دور پھر سزا ملتی تو کیوں۔

وہ صرف دو سال یہاں گزارنے کے بعد اس قابل ہو گیا کہ اسے کسی دوسرے اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ نگاہ انتخاب اسلام یہ ہائی اسکول پر پڑی اور اسے یہاں داخل کرا دیا گیا لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ یہ انتخاب غلط تھا۔ یہ اسکول گھر سے بہت دور تھا۔ آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ فاطمہ صغرا نے محسوس کیا کہ وہ اسکول سے آتا ہے تو بہت تھک چکا ہوتا ہے اگر کسی قریبی اسکول میں داخل کرا دیا جائے تو گھر پر پڑھنے کے لیے بہت وقت مل جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر کسی اچھے اسکول کی تلاش شروع ہوئی۔ قرعہ فال و کنوڑیہ ہائی اسکول کے نام نکلا۔ اس کا تبادلہ کرایا گیا اور وہ کنوڑیہ ہائی اسکول میں داخل ہو گیا۔ وقت پر لگا کر اڑنے لگا لیکن چھین کی بنسری بجاتے صرف دو سال گزر سکے۔

مظفر علی منصر جی کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی دیانت داری کے چرچے پورے شہر میں تھے۔ مزید ترقی کے دروازے بھی ملے ہوئے تھے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک مختصر سی علالت کے بعد مظفر علی کا انتقال ہو گیا۔ یہ اس خاندان کے لیے معمولی عہدہ نہیں تھا۔ بقول شخصے کچا ساتھ تھا۔ بچے ابھی چھوٹے تھے۔ ابواللیث کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس سے بھی دو چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے بھائی ابو ظفر کی عمر بھی زیادہ سے زیادہ چودہ سال کی تھی۔ ان کی موت کا صرف گھر میں ہی کہرام نہیں تھا۔ شہر بھر میں سوگ کا عالم تھا۔ ایسی مقبول شخصیت تھے کہ جس کے سنا افسوس کیا۔ جس دن تدفین تھی عدالتیں ان کے سوگ میں بند ہو گئیں۔

جنازہ اٹھنے ہی والا تھا کہ بعض قریبی عزیز جو بدایوں سے آئے تھے انہوں نے اصرار کیا کہ تدفین بدایوں میں ہوئی جائے۔ خاندانی قبرستان بدایوں میں ہے۔ وہاں

سب بزرگوں کی قبریں ہیں۔ مظفر علی بھی اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ بدایوں کی سرزمین اولیاء اللہ کی سرزمین ہے۔ مظفر علی کو اسی پاکیزہ زمین میں سپرد خاک کرنا چاہیے۔

جنازہ تیار تھا اور یہاں یہ بحث ہو رہی تھی۔ فاطمہ صغرا تو ایسی بے حال تھیں کہ کوئی رائے دینے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ بہر حال یہی طے ہوا کہ تدفین آگرہ میں نہیں ہوگی بلکہ میت بدایوں لے جانی جائے گی۔

اتنا وقت کس کے پاس تھا کہ گھر سمیٹا جاتا۔ بھرا پرانے آگرہ میں موجود بعض عزیزوں کے سپرد کیا۔ جلدی جلدی میت کوثرین سے بدایوں لے جانے کا بندوبست ہوا۔

میت بدایوں پہنچ گئی۔ ظاہر ہے بچے اور بیوہ بھی ساتھ تھے۔

خاندانی قبرستان میں جو حوض قاضی قبرستان کہلاتا تھا منصر مظفر علی کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا گیا۔

چند دن کی تعزیت اور رسم دنیا داری نبھانے کے بعد جب اعزہ رخصت ہوئے تو فاطمہ صغرا کو یوں محسوس ہوا جیسے سارے جہان کی دھوپ ان کے گھر میں اتر آئی ہے۔ وہ جو سایہ تھا جو دھوپ سے بچائے رکھتا تھا سردی سے ہٹ گیا ہے۔ انہیں وہ دن یاد آئے جب وہ بدایوں سے آگرہ جا رہی تھیں۔ انہوں نے مظفر علی سے کہا تھا ہم ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہے ہیں۔ مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد اسی گھر میں چلے آئیں گے۔ پھر وہی بدایوں ہو گا وہی گھر۔ گھر وہی تھا مگر والا چلا گیا تھا۔ مدت ملازمت ختم نہیں ہوئی تھی کہ زندگی کی مدت ختم ہو گئی۔ گھر کے دروازے کھلے ضرور لیکن میت وصول کرنے کے لیے۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ عزیز واقارب تو جاہلاد پر نظریں گاڑے بیٹھے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میری آنکھیں بھی بند ہو جائیں اور بچے بے سہارا رہ جائیں۔ مجھے جلد از جلد بچوں کو کسی قابل بنانا ہو گا تاکہ باپ کی چھوڑی ہوئی جاہلاد کی حفاظت کر سکیں۔ انہوں نے اس وقت بڑی ہمت سے کام لیا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پہلے بھی انہی کے ہاتھ میں تھی اب ذمہ داری اور بڑھئی۔ انہوں نے مظفر علی کے دوستوں سے مشورہ کیا اور ابواللیث کو مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس نیک دل خاتون نے یہ مشن اسکول کے قریب بھی تھا اور تعلیمی معیار بھی بہت اچھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر ایک انگریز تھے۔ اساتذہ کی اکثریت بھی عیسائی تھی لیکن ہندو، مسلمان اور سکھ بھی تھے۔

مشن اسکول سے آٹھویں پاس کرنے کے بعد اسے یہ اسکول چھوڑنا پڑا کیوں کہ یہ اسکول آٹھویں تک ہی تھا۔ اب اسے میٹرک کرنے کے لیے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ لینا پڑا جو گھر سے خاصا دور تھا۔

وہ صبح ناشتا کر کے اسکول کے لیے نکلا تھا۔ فاصلے کا اندازہ کیا تو اسکول تک پہنچنے پہنچنے تین چار میل کا فاصلہ طے کر لیا ہوگا۔ ناشتا ہضم ہو چکا تھا اور اب باقی وقت خالی پیٹ اسکول میں گزارنا تھا۔ کچھ پہلے دن کی اجنبیت کچھ بھوک، بڑی بے چینی سے وقت کٹتا۔ چھٹی ہوئی تو پیٹ میں کچھ ڈالنے کی فکر ہوئی۔ باہر نکلا تو اسکول کا منٹائی فروش راجا رام نظر آیا۔ اس سے منٹائی لی اور گھر کی طرف واپسی کے راستے پر چل پڑا۔ تین چار میل پھر چلنا تھا۔

کچھ دن اور گزرے تو اسکول کا گراؤنڈ بھی دیکھ لیا جہاں اسکول کے طلبہ چھٹی کے بعد مختلف کھیلوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ وہ بھی ان کھیلوں میں حصہ لینے لگا۔ اب معمول یہ ہو گیا کہ صبح گھر سے ناشتا کر کے اسکول کے لیے روانہ ہو جاتا اور شام کو کھیل سے فارغ ہو کر گھر کو لوٹتا تو مغرب کی اذان ہو رہی ہوتی۔ جیب میں پیسے ہوتے تو اسکول کے منٹائی فروش سے کچھ لے کر کھالینا ورنہ واپسی پر شام کا کھانا ہی نصیب ہوتا۔ ریڈیوئی وی وغیرہ قسم کی چیزیں تو آئی نہیں تھیں وقت گزاری کے لیے یہی ایک ذریعہ تھا کہ پڑھنے پڑھا جائے۔

اسکول میں کچھ دن گزارنے کے بعد جب وہ میٹرک میں آیا۔ تعلیمی شعور بڑھا اور اچھے برے اساتذہ کی تمیز ہوئی تو اس نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی۔ اسے اپنے استاد سبطین احمد کی ذات میں نہایت کشش معلوم ہوئی۔ وہ اسے انگریزی اور تاریخ پڑھاتے تھے۔ محل گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ گریجویٹ بہت سے ہوتے ہیں لیکن وہ تو علم کا بحر ذخائر تھے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بھی اس قابلیت کے لوگ نہیں ہوتے جس پائے کے وہ تھے۔

ان کی قابلیت اور شخصیت دیکھ کر کسی طرح ان سے راہ و رسم پیدا کی جائے۔ کلاس میں سبطین صاحب کا رویہ بہت تھا۔ بچے ان سے بہت ڈرتے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں کی کہ پڑھائی کے علاوہ ان سے کوئی بات کر سکے لیکن جب وہ ان کے قریب گیا تو معلوم ہوا وہ جتنے سخت نظر آتے ہیں اندر سے اتنے ہی نرم ہیں۔

سبطین صاحب، ابواللیث کے گھر کے قریب ہی

رہتے تھے لہذا جب ایک مرتبہ وہ وہاں گیا تو بار بار جانے لگا۔ وہ اسکول نمچر تھے لیکن اپنی علمیت کے اعتبار سے اپنی ذات میں علمی و تحقیقی ادارہ تھے۔ اعلیٰ پائے کے کتنے ہی لوگ تھے جو ان کی ذات سے فیض اٹھا رہے تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر ابواللیث کا ادبی ذوق پروان چڑھنے لگا۔ اس کا شوق دیکھ کر سبطین صاحب کی مہربانیاں بھی اس پر بڑھنے لگیں۔

ابواللیث کے دل میں جب ادبی ذوق نے جگہ بنائی تو اس نے والد کے کتب خانے کا رخ کیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کا کتب خانہ تقریباً بند پڑا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ والدہ کا حکم تھا نصاب کی کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب کو پڑھنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔

وہ ڈرتے ڈرتے کتب خانے میں داخل ہوا اور پھر جیسے وہ کسی نمائش میں آگیا ہو جس میں نادرا و نوجود اشیاء بھی ہوئی ہیں۔ تمام شعرائے لکھنؤ کے دوادین الماریوں میں ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔ پھر وہ نثر کی کتابوں کی طرف گیا۔ اس نے محسوس کیا یہ اس کا خاص ذوق ہے۔ اس نے خود ہی طے کر لیا کہ کچھ لکھنے کے لیے لکھنا آنا چاہیے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ لکھا کیسے جاتا ہے۔ کون سا اسلوب اختیار کیا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ نثر کی کتابیں پڑھی جائیں۔ طلسم ہوشربا کی جلدیں رکھی ہوئی تھیں اس نے ایک جلد اٹھائی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے پڑھا کیسے جائے۔

اس نے ماں کی نظروں سے چھپ کر ان کتابوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ ”طلسم ہوشربا!“ ختم کی تو وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔

اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ”اردو“ کیا ہوتی ہے۔ نئے نئے الفاظ سے آشنائی ہوئی جو نصاب کی کتابوں سے میسر نہیں آسکتی تھی۔ بعض الفاظ اس کے لیے اجنبی تھے۔ لغت کی مدد سے اس نے ان محمول کو حل کیا۔

داستانوں کی جتنی کتابیں مہیا تھیں ایک ایک کر کے سب پڑھ ڈالیں۔ پھر وہ شعراء کے تذکروں کی طرف مائل ہوا۔ ان کو پڑھ کر تو وہ یہ سوچنے لگا کہ اس کی اصل منزل تو یہ ہے۔ تذکرے لکھنے والوں نے کیسی جانفشانی دکھائی ہے۔ شعراء کے حالات کس محنت سے جمع کیے ہیں۔ انہیں کتنی تحقیق کرنی پڑی ہوگی۔ اسے شاید پہلی مرتبہ معلوم ہوا ہوگا کہ ادب میں تحقیق کی اہمیت کیا ہے۔ لاشعوری طور پر وہ تحقیق کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا۔ ان تذکروں میں جو اشعار تھے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو اشعار سمجھ میں نہ آتے انہیں سبطین

تھا اس لیے کسی عزیز قریب سے بھی کسی قسم کی مدد ان کو گوارا نہ تھی۔ دوسرے قرض لینا ان کی شریعت میں حرام تھا تیسرے مکان، جائیداد اور زمینداری کو بیچ کر کھانا انہیں قبول نہ تھا۔ کئی سال ہم نے ایسی سختی میں گزارے کہ میں ان کو لکھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا، نہ اس سے کوئی فائدہ۔ اپنے زخموں کو ہرا کر کے بہت سے عزیزوں کو اب کیا مطعون کروں۔“

1932ء میں جب اس نے میٹرک پاس کر لیا تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے۔ بدایوں میں کوئی کالج (رفعت و بود، ابواللیث صدیقی) نہیں تھا کہ مزید تعلیم کے لیے وہاں داخل ہوا جاتا۔ قریبی ضلع بریلی میں کالج تھا لیکن وہ وہاں جاتا نہیں چاہتا تھا۔ بچپن میں بھی بریلی کے پاگل خانے کا تذکرہ سنا تھا۔ یہ تصور اس کے ذہن میں کچھ ایسا جاگزیں ہو گیا تھا کہ جیسے بریلی میں ہر طرف پاگل ہی گھوم رہے ہوں گے۔

سبیلین صاحب کی زبان سے اس نے علی گڑھ کے ایسے قصے سنے تھے کہ وہ علی گڑھ جانے کے لیے بے قرار تھا۔ اس کے خاندان کے اکثر و بیشتر افراد نے علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔ خود اس کے بڑے بھائی ابو ظفر علی گڑھ کے طالب علم رہے تھے۔ ان سب باتوں نے مل جل کر اسے علی گڑھ کی طرف راغب کیا لیکن والدہ کی اجازت کے بغیر وہ یہ قدم کیسے اٹھا سکتا تھا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر والدہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”ای جان! کالج میں میرے داخلے کا مسئلہ ہے۔“
”بدایوں میں کوئی کالج ہے نہیں۔ بریلی تم جانا نہیں چاہتے تو کیا بدایوں میں کالج کھلنے کا انتظار کرو گے۔“
”میں چاہتا ہوں آپ علی گڑھ کالج میں میرے داخلے کا بندوبست فرمادیں۔“

”ابو ظفر کو میں علی گڑھ بھیج کر دیکھ چکی۔ اس میں جو بگاڑ پیدا ہوئے ہیں وہ وہاں کے ماحول ہی سے ہوئے ہیں۔ اب میں تمہیں وہاں بھیج کر دوسرا زخم نہیں کھا سکتی۔“
”بھائی کے بگڑنے میں ان کے اپنے مزاج کا قصور ہو گا۔ ورنہ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے والے تو بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں کے ماحول میں ایسی کوئی خرابی نہیں۔ وہ تو مسلمانوں کا واحد ادارہ ہے جہاں قابل ترین اساتذہ ہیں۔ طلبہ کو نماز تک کی تلقین کی جاتی ہے۔ اب میں صاحب ہی کو دیکھ لیں۔ وہ بھی تو وہیں کے کریم جویت ہیں۔“

صاحب کی خدمت میں لے کر پہنچ جاتا وہ نہ صرف شعر کا مطلب سمجھاتے بلکہ اس شاعر کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات کرتے جو تذکروں میں بھی درج نہ ہوتے تھے۔ اس طرح نہ صرف اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہا بلکہ سبیلین صاحب کی علمیت کا سکہ بھی دل پر بیٹھتا رہا۔

ان تذکروں کے عمیق مطالعے کے بعد جب وہ شعرا کے دواوین کی طرف راغب ہوا تو منظر نامہ بالکل صاف تھا۔ کس شاعر کا رنگ سخن کیا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا نظام کیا ہوتا ہے۔ آتش و تاج میں فرق کیا ہے۔ لکھنوی شعرا کن معنی میں دہلوی شعرا سے مختلف ہیں۔

اس کے والد کے کتب خانے میں لکھنوی شعرا کے دواوین کثرت سے تھے لہذا پہلے پہل وہ غالب سے نہیں آتش، تاج، امیر مینائی وغیرہ سے واقف ہوا۔ وہاں کی زبان، وہاں کا طرز کلام، وہاں کے ادبی مناقشے سب اس کی یادداشت میں محفوظ ہو گئے۔

اس کے ادبی ذوق کو ہمیز دینے کے لیے بدایوں کا شاعرانہ ماحول بھی موجود تھا۔ یہاں شعر و شاعری کا ایسا چچا تھا کہ کم و بیش ہر پڑھا لکھا آدمی دو چار شعر تو کہہ ہی لیتا تھا۔ جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ اچھے بیٹے شاعری ہوتی تھی۔ اس کے محلے میں بھی کئی شاعر تھے جن کے پاس اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا تھا۔

سبیلین صاحب سے علمی بحثیں ہونے لگیں۔ انہیں تعجب ہوتا تھا کہ اس کم عمری میں ابواللیث ادب کا ایسا پارکھ بن گیا ہے۔ وہ اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ ”شاعری کے حلقے میں مت پڑنا۔ تمہارا مزاج علمی و تحقیقی ہے اس پر کار بند نہ ہونا۔“

وہ یہ مشورہ دے رہے تھے اور ابواللیث سوچ رہا تھا کہ تعلیمی سلسلہ چلے گا کیسے۔ یہ دن اس کی زندگی کے سخت آزمائش کے تھے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتا ہے۔
ذرائع آمدنی محدود کیا مفقود ہو گئے تھے۔ والد کی وفات کی وجہ سے اور کچھ برادر بزرگ کی نادانی کی وجہ سے۔ ریمسوں کی اولاد کو نالائق مصاحب جس راستے پر لگاتے ہیں وہی راستہ بھائی صاحب نے دیکھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سال میں والدہ صاحبہ سخت پریشانوں میں مبتلا ہو گئیں۔ ان کے چند اصول تھے جن میں ایک یہ تھا کہ وہ اس بھرم کو قائم رکھنا چاہتی تھیں جو والد مرحوم کی زندگی میں قائم

”بجھلو بٹیا! مجھے تجھ سے بڑی امیدیں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو وہاں سے کچھ بن کر رہی لوگے گا لیکن حالات تیرے سامنے ہیں۔ میں ابو ظفر کی تعلیم پر اتنا خرچ کر چکی ہوں کہ اب مزید خرچ کرنے کی سکت نہیں۔ کسی سے قرض لینے کی میں روادار نہیں۔“

گھر کے حالات ابواللیث سے چھپے ہوئے نہیں تھے اور پھر اس کی ماں نے ایسی درد بھری آواز میں اپنی بے بسی کا ذکر کیا کہ وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ بس جسے کہتے ہیں دل سوس کر رہ گیا۔

اسے علی گڑھ نہ بھیجا جائے لیکن کچھ نہ کچھ تو اسے کرنا ہو گا۔ گھر میں کئی دن تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر بڑے بھائی نے ایک تجویز پیش کی کہ اسے ہومیو پیتھک ڈاکٹری کرنی چاہیے۔ ابواللیث ظاہر ہے اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ بسطین احمد اور میر محفوظ علی سے ملاقاتوں کے بعد اس کا ذہن ادب کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ وہ تو اردو ادب میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دیتا چاہتا تھا۔ ہومیو پیتھک اس کے بس کی کہاں تھی لیکن اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ یہی ہوا۔ اس کے ایک عزیز معین احمد حمیدی تھے جو تھے تو سرکاری ملازم لیکن ہومیو پیتھک سے شوق رکھتے تھے۔ ان سے بات کی گئی اور ابواللیث صدیقی کو ان کی شاگردی میں دے دیا گیا لیکن قدرت کچھ اور ہی سوچے ہوئے تھی۔

معین احمد حمیدی کے مشورے سے بذریعہ خط کتابت کلکتہ کے ایک ہومیو پیتھک کالج سے ہومیو پیتھک کی کچھ کتابیں اور ایک عدد ”سند“ منگوائی گئی۔ دواؤں کے پکے بنوائے گئے۔ دوائیں خریدی گئیں اور ڈاکٹری کا کاروبار شروع کر دیا گیا۔

اس خفیل کو ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ بدایوں میں بیٹے کی وبا پھیل گئی۔ استاد صہب صاحب کے دل میں خدمتِ خلق نے جگہ بنائی۔ اس وقت خالقِ خدا کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ جب ہم ڈاکٹر ہیں تو بیٹے میں جتنا لوگوں کا مفت علاج کرنا چاہیے۔ انہوں نے دواؤں کا کبس اٹھایا۔ ابواللیث کو ساتھ لیا اور ان محلوں میں پہنچ گئے جہاں اس وبا کا زور تھا۔

یہ سلسلہ کئی دن چلتا رہا۔ فاطمہ صفر کو معلوم ہوا تو انہیں ابواللیث کی فکر ہوئی۔

”آپ اسے احتیاطی تدابیر کے بغیر ایسے مریضوں کے پاس لے جاتے ہیں۔ میں اپنے بچے کو آپ کے پاس

نہیں جانے دوں گی۔“ انہوں نے نہ صرف اسے حمیدی صاحب کے ساتھ جانے سے روک دیا بلکہ ابواللیث کو ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا۔ آہستہ آہستہ قدرت اسے اس مقام پر لاتی جا رہی تھی جو اس کا اصل مرکز تھا۔ وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بننے سے بال بال بچ گیا۔

اسی دوران میں کچھ ایسے خاندانی مسائل سامنے آئے کہ اس کا نکاح ضروری ہو گیا۔ یہ عمر شادی کے لیے ہرگز مناسب نہیں تھی۔ ابھی نہ کوئی روزگار تھا نہ آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ۔ پھر شادی کیسی لیکن مجبوری تھی پھر یہ طے ہوا کہ نکاح ابھی کر دیا جائے۔ رخصتی بعد میں کسی وقت دیکھی جائے گی۔ خالہ زاد ریحان فاطمہ شریک سفر بنیں۔ یہ نکاح نہایت سادگی سے ادا ہو گیا۔

نکاح کے بعد ذمہ داری کا احساس خود بخود ہونے لگا۔ ہومیو پیتھک بھی ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ اس نے سوچا اس سے پہلے کہ کسی اور کھیتوں میں پھنسا دیا جاؤں علی گڑھ جانے کا کوئی بندوبست کر لیا جائے۔ علی گڑھ میں داخلے ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ لہذا موقع اچھا تھا۔ یہ مسئلہ پھر بھی درپیش تھا کہ کسی سفارش کے بغیر داخلہ ممکن بھی ہو سکے گا؟ اگر کہیں سے سفارشی خط مل جائے کم از کم اتنا ہی ہو کہ علی گڑھ پہنچ کر کوئی کالج تک پہنچانے والا مل جائے۔ گھوم پھر کر اس کی نظر اپنے ایک عزیز مولانا یعقوب بخش راغب کی طرف گئی۔ مولانا نہایت عالم فاضل تھے۔ علی گڑھ میں ان کے بہت سے شناسا تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔

”میرے ایک دوست ہیں پنڈت حبیب الرحمن شامری علی گڑھ میں شہرکت کے استاد ہیں۔ ان کے نام خط لکھے دیتا ہوں علی گڑھ جا کر ان سے مل لیتا۔ وہ تمہاری ضرورت مدد کریں گے۔“

ابواللیث نے وہ خط ان سے لے لیا اور گھر چلا آیا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی اور گھر والوں کی مرضی کے خلاف علی گڑھ جانے کا فیصلہ کر رہا تھا۔ یہ اس کا شوق علمی ہی تو تھا۔

20 ستمبر 1932ء کی رات کوثرین میں بیٹھ گیا۔ جب میں صرف اتنے میسے تھے کہ ریل کے کرائے کے بعد شاید دو چار دن کا خرچ نکل آتا۔

وہ علی گڑھ انٹیشن پر اترا تو ایسی خوشی ہوئی جیسے چاند پر پہلا قدم رکھ دیا ہو۔ اپنی خوشی کو چھپاتا ہوا۔ انٹیشن سے باہر

سوانحی خاکہ

نام: ابو الیث صدیقی

والد: منشی مظفر علی

والدہ: فاطمہ صفرا

وطن: بدایوں (بھارت)

پیدائش: آگرہ

تعلیم: ایم اے (اردو)، پی ایچ ڈی (علی گڑھ)

یونیورسٹی کا پہلا پی ایچ ڈی

ملازمت: علی گڑھ کالج، علی گڑھ یونیورسٹی،

اورینٹل کالج، لاہور۔ جامعہ کراچی۔

اہلیہ: ربیحان فاطمہ

اولاد: زہرا صدیقی، پروین صدیقی، ثریا

صدیقی، ابراہیم مظفر، مظفر صدیقی۔

تاریخ پیدائش: 15 جون 1916ء

وفات: 7 ستمبر 1994ء

مدفن: اشاف قبرستان، جامعہ کراچی۔

وہ ڈیپارٹمنٹ میں تو مل نہیں سکتے تھے اور کیے والا آگے جانے کو تیار نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں تو پھولنے ہی تھے۔ اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ یونیورسٹی آ رہا تھا تو ڈاک خانے کے قریب سے گزرا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس کے رشتے کے ایک چچا یونیورسٹی کے ڈاک خانے میں ملازم ہیں۔ اس نے کیے والے کو راضی کیا اور ڈاک خانے پہنچ گیا۔ دل میں ڈرتا بھی جا رہا تھا کہ اگر وہ بھی نہ ملے تو کیا ہوگا۔ کسی ہوٹل یا سرائے میں ٹھہرنے کے لیے توجیب میں پیسے بھی نہیں ہیں۔ شکر ہوا کہ اس کے چچا کرم احمد سے ملاقات ہوگئی۔ اس کی کیے والے سے اور کیے والے کی اس سے جان چھوٹ گئی۔ کرم احمد نے اس کی داستان سنی اور وعدہ کر لیا کہ ڈاک خانے سے اٹھنے کے بعد وہ اسے لے کر پنڈت حبیب الرحمن شاستری کے پاس جائیں گے چنانچہ اس دن سہ پہر کو وہ چچا کے ساتھ بالائے قلعہ پہنچ گیا۔ ڈاک خانے والوں کو پتا تلاش کرنے کی کیا دقت۔ ذرا سی دیر میں مکان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ پنڈت جی گھر سے نکلے۔ دیکھا تو بڑے تپاک سے ملے۔ یہ سن کر سخت افسوس کرنے لگا۔ مکان ڈھونڈنے میں اتنی دقت اٹھانی پڑی۔ ”مولانا! یہ تپاک بخش کو تو میرے گھر کا پتا معلوم تھا۔“

ماہ 2015ء

آیا تو علی گڑھ کے مشہور کیے نظر آئے۔ اس نے کیے والے کو یونیورسٹی چلنے کے لیے کہا۔ اس کے پاس تعارفی خط تو موجود تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یونیورسٹی میں حبیب الرحمن شاستری کا مکان کہاں ہے۔ یہ کوئی مشکل نہیں تھا۔ یونیورسٹی پہنچ کر کسی سے بھی معلوم کیا جاسکتا تھا۔ یکہ جوئی یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوا ایک صاحب سائیکل پر جاتے نظر آئے۔ اس نے ان سے پوچھا۔ حبیب الرحمن کا مکان کدھر ہے۔ نہ ان صاحب نے تفصیل پوچھی نہ اس نے بتائی۔ ”یکہ واپس سڑک پر لے جائیں۔ کوئی دو تین سو گز چلو گے تو حبیب الرحمن کا مکان نظر آ جائے گا۔“ ان صاحب نے کہا۔

ابو الیث نے یکہ واپس مڑوایا اور ان صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر چلتا ہوا مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھٹ کھٹایا تو جواب میں ایک لڑکا باہر آیا۔

”حبیب الرحمن صاحب کا مکان یہی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”ان کے نام خط ہے اسے اندر پہنچا دیجیے۔ شاید وہ

مجھے بلوالیں۔“

وہ لڑکا خط لے کر چلا گیا اور جلد ہی واپس بھی آ گیا۔

خط اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ خط پنڈت حبیب

الرحمن شاستری کے نام ہے۔ یہاں تو شعبہ تعلیم کے استاد

حبیب الرحمن رہتے ہیں۔“

”حبیب الرحمن شاستری کہاں رہتے ہیں آپ کو

معلوم ہے؟“

”جی نہیں۔ یونیورسٹی میں کہیں رہتے ہوں گے۔“

صاحب زادے نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے پوچھنے

والے سے حبیب الرحمن کا پتا پوچھا تھا۔ پنڈت حبیب الرحمن

کا نہیں۔ اسی لیے یہ خواری اٹھانی پڑی۔ وہ پھر یونیورسٹی

کے احاطے میں کہیں رہتے ہوں گے۔ وہ پھر یونیورسٹی

آ گیا۔ پنڈت جی کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ پتا تو معلوم

نہ ہو سکا البتہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ شہر میں کہیں محلہ بالائے قلعہ

میں رہتے ہیں۔ دل کو کچھ اطمینان ہوا کہ چلو اتنا تو معلوم

ہوا۔ ”بالائے قلعہ“ میں پہنچ کر مکان مل ہی جائے گا۔ یہ

اطمینان اس وقت غارت ہو گیا جب کیے والے نے آگے

جانے سے انکار کر دیا۔ یونیورسٹی میں تعطیلات تھیں اس لیے

آپ کو بتا دیتے تو یوں خوار کیوں ہوتے۔ خیر جو ہوا سو ہوا
میں کل ڈاک خانے آؤں گا تمہارے داخلے اور اقامت کا
انتظام کرتا ہوں۔“

جب تک داخلہ نہیں ہو جاتا اور ہاسٹل میں جگہ نہیں
مل جاتی اسے ان عزیز کے گھر رہنا تھا جو ڈاک خانے میں
ملازم تھے۔

دوسرے دن حبیب اللہ شاستری حسب وعدہ ڈاک
خانے آ گئے اور اسے لے کر یونیورسٹی چلے گئے۔ یہ زمانہ
داخلوں کا تھا اور قدرتی طور پر پورے ملک سے امیدوار
اپنے والدین کے ساتھ علی گڑھ پر حملہ آور ہو گئے تھے۔
یونیورسٹی کا اسٹریچی ہال کھینچ بھرا ہوا تھا کیوں کہ تمام
داخلوں کے لیے ایک ہی مرکز تھا۔ اسے اپنی قابلیت اور
شانداز رزلٹ کی وجہ سے یقین تھا کہ داخلے میں کوئی رکاوٹ
نہیں آئے گی لیکن پھر بھی اتنے جھوم کو دیکھ کر اس کا دل
دھڑک رہا تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ سرسید کا دم کتنا غنیمت
تھا کہ یہ ادارہ قائم کر دیا ورنہ یہ مسلمان لڑکے کہاں جاتے۔
ایک خیال یہ بھی آیا کہ میرا داخلہ ہو نہ ہو ان بہت سے
مسلمان لڑکوں کا داخلہ تو ہو جائے گا۔ مسلمانوں کو اس وقت
تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔

اس کے اندیشے اس وقت خوشی میں بدل گئے جب
اکتوبر 1934ء میں اس کا داخلہ علی گڑھ کالج میں ہو گیا۔
داخلہ فارم کے ساتھ اقامتی ایوانوں میں بھی داخلے
ہوتے تھے کیوں کہ بنیادی طور پر یہ ایک اقامتی ادارہ
تھا۔ صرف دس فیصد طلبہ کو اقامتی ایوان سے باہر رہنے کی
اجازت تھی۔ وہ باہر رہتا تو کہاں رہتا۔ اس نے حبیب
شاستری کے مشورے سے اقامتی ایوان کے خانے میں
آفتاب ہال لکھوا دیا۔

آفتاب ہوشل اس سال بنا تھا بلکہ بن رہا تھا۔ اس
ہوشل کی دو خصوصیات تھیں ایک تو یہ کہ اس میں داخلے کے
لیے شرط بہترین تعلیمی ریکارڈ تھا۔ خرچ دوسرے ہوشلوں
کے مقابلے میں بہت کم تجویز ہوا تھا اور اس میں بھی کھانے
کے علاوہ منج کا ناشتا شامل تھا جب کہ دوسرے ہوشلوں میں
طالب علموں کی اپنی ذمہ داری تھی۔ دوسری خصوصیت یہ تھی
کہ ہر کمر صرف ایک طالب علم کے قیام کے لیے بنایا گیا تھا
تاکہ پڑھائی سکون سے ہو سکے۔

اس کے شاندار تعلیمی ریکارڈ نے اس کی مدد کی اور
اسے ہوشل کا کمر نمبر 62 دیا گیا۔

آفتاب ہوشل طالب علموں کو سستی تعلیم فراہم کرتا تھا
لیکن پھر بھی یہ تعلیم مفت نہیں تھی۔ کچھ نہ کچھ تو خرچ ہوتا ہی تھا
یہ مسئلہ ایسا تھا جو داخلہ لیتے ہی سامنے نظر آنے لگا۔

سرسید احمد خان کے پوتے سرراس مسعود اس وقت
وائس چانسلر تھے۔ اسے کسی نے بتایا کہ ایک درخواست لکھ کر
ان سے ملو۔ انہوں نے اپنی تنخواہ سے ایک فنڈ قائم کر رکھا
ہے جس سے وہ مستحق طلبہ کی مدد کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے
تمہاری درخواست قبول کر لی تو تمہاری مالی مشکلات کا حل
نکل آئے گا۔ کسی وائس چانسلر سے ایک طالب علم کا ملنا مذاق
نہیں تھا۔ اس کے لیے ہمت درکار تھی۔ بہت سے طلبہ تو
ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی ان سے ملاقات کی ہمت
نہیں کر پاتے تھے لیکن وہ ضرورت مند بھی تھا اور باہمت
بھی۔ ایک صبح ان سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ ان کا قیام
یونیورسٹی کے احاطے میں بنی کوشی میں تھا جو ”سرسید ہاؤس“
کہلاتی تھی۔ اس نے اسے آنے کی اطلاع دی اور اسے بلا
لیا گیا۔ وہ سرراس مسعود کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ نہایت
خوب صورت بلند و بالا قد کا انسان سفید براق کرتہ پا جامہ
پہنے ایک تخت پر بیٹھا تھا اور بہت سے کاغذات اس کے
سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ یہی سرراس مسعود تھے۔ ان کا
سیکرٹری ان کے قریب بیٹھا تھا۔ ابواللیث نے اپنی
درخواست سیکرٹری کے حوالے کر دی۔ اس نے درخواست
پر ایک نظر ڈالی اور سرراس مسعود کی طرف بڑھادی۔ انہوں
نے بھی اسے پڑھا۔ کچھ سوالات اس کے خاندانی پس منظر
کے بارے میں کیے اور ایک ایسی معقول رقم کی منظوری
دے دی جو اس کے اخراجات کا کچھ ازالہ کر سکتی تھی۔

ابواللیث نے جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ
اردو میں داخلہ لیا (1932ء) تو یہ یونیورسٹی میں شعبے کے
قیام کا پہلا سال تھا۔ اس سے پہلے شعبے میں صرف لازمی
اردو کا ایک نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کالج الگ
تھا۔ اس سال انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کو یونیورسٹی میں منتقل
کر دیا گیا اور اسی سال اردو اختیاری کے نصاب کا نفاذ ہوا۔
وہ گویا شعبہ اردو کا پہلا طالب علم تھا۔ اس وقت شعبہ اردو
میں صرف دو اساتذہ تھے۔ رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن
دہلوی۔ ایک مزاح نگار ایک شاعر۔ وہ ان دونوں
اساتذہ کی آنکھ کا تار بننا ہوا تھا۔ اس کے ذوق تحقیق کو دیکھ کر
رشید احمد صدیقی کو تعجب ہوتا تھا۔ اس جیسے ماہر تعلیم نے اینڈ
میں یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابواللیث اردو تحقیق میں بڑا

ڈویژن میں پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں سائنس و آرٹس کو ملا کر دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اختیاری مضامین میں منطق اور نفسیات میں اس نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے جو ایک عرصہ تک ریکارڈ رہے۔

اسی سال یونیورسٹی میں اردو میں بی اے آنرز کے سال اول کا آغاز ہوا۔ اب وہ دور ہے پرکھڑا تھا۔ سوچ رہا تھا بی اے پاس میں داخلہ لوں یا آنرز میں۔ امتیازی نمبروں میں پاس ہونے کی وجہ سے وہ یونیورسٹی کی طرف سے ملنے والے وظیفے کا حقدار ہو گیا تھا۔ آنرز میں داخلہ لینے کی صورت میں وہ تین سال تک اس وظیفے کا حقدار ہو سکتا تھا۔ دوستوں کا خیال تھا کہ اسے فلسفے میں آنرز اور ایم اے کرنا چاہیے لیکن وہ عرصہ دراز تک اردو کی تحقیقی کتب پڑھتا چلا آیا تھا۔ ایک بے نام سی کشش تھی جو اسے اردو کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس نے اردو میں آنرز کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لوگوں کے خیال کے مطابق اردو کی کوئی مانگ نہیں تھی۔ نہ کوئی ملازمت ڈھنگ کی مل سکتی ہے نہ کوئی احترام ہے۔ خود شعبہ اردو کا حال یہ تھا کہ یہاں صرف دو استاد تھے۔ رشید احمد صدیقی اور احسن مارہروی اور دونوں صرف لیکچرار تھے۔

وہ اپنے آپ سے لڑنے میں مگن تھا کہ خاندانی بھگڑوں نے پھر سراٹھایا۔ بدایوں سے تار آیا کہ دو سال پہلے تمہارا نکاح ہوا تھا۔ کب تک انتظار کیا جائے۔ تم بدایوں فوراً آؤ تاکہ رخصتی عمل میں آئے۔ اسے جانا پڑا اور رخصتی بھی کرنی پڑی حالانکہ نہ ابھی کوئی ایسی عمر تھی نہ موقع۔ وہ تعلیم بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

شادی کے بعد اس نے کچھ دن بدایوں میں گزارے اور پھر علی گڑھ آ گیا۔ اب صورت یہ ہو گئی تھی کہ جمعہ کی شام کو وہ علی گڑھ سے بدایوں چلا جاتا اور دو دن تعطیل کے گزارنے کے بعد پیر کی صبح علی گڑھ پہنچ جاتا۔

ابھی اس نے آنرز کا ایک ہی سال گزارا تھا کہ بعض پے چیدگیوں کی وجہ سے اسے گھر والوں سے الگ ہونا پڑا۔ اس کا گزر اس وقت صرف اس لیاقت کے وظیفے پر تھا جو یونیورسٹی کی طرف سے اسے ملتا تھا۔ یہ اس کے اپنے خرچ کے لیے تو کافی ہوتا لیکن ایک گھر کی ذمہ داری اس کے لیے بڑی ہوتا مشکل تھی۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ کچھ ملازمت کر لے اور تعلیم کا سلسلہ پرائیویٹ طور پر جاری رکھے۔ اس مرتبہ وہ بدایوں گیا تو

نام پیدا کرے گا۔ خود اسے اپنے آپ سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ لیکن ذرائع آمدن نہ ہونے کے سبب پریشان رہتا تھا۔ کتابوں کو اڑھتا بچھوتا بنا لیا تھا۔ کئی مضامین مقامی رسائل میں شائع بھی ہو چکے تھے جو کسی طالب علم کے نہیں بلکہ کسی استاد کے قلم سے تحریر کیے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

یہ سب تو تھا لیکن سوچنا تھا کہ آئندہ کا تعلیمی سفر کیسے جاری رہے گا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت قدم قدم پر اس کی مدد کر رہی تھی۔ ایسے لوگوں سے ملوا رہی تھی جو اس کی انگلی تھام سکتے تھے۔ پہلے ہی سال بعض ایسی شخصیتوں کی شفقت اسے نصیب ہو گئی جو اپنے علم و فن اور کردار کے باعث قد آور لوگوں میں شمار ہوتی تھیں۔ سر اس مسعود نے اس کا وظیفہ جاری کیا تھا۔ پروفیسر محمد حبیب جو آفتاب ہوسٹل کے پروفیسر تھے اور تاریخ پڑھاتے تھے اس پر مہربان ہوئے۔ اس کے حالات معلوم ہوئے تو اس کی مدد کرنے کو جی چاہا۔ یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ خود دار ہے۔ براہ راست اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دن اس سے کہنے لگے۔

ابواللیث میاں پڑھنے لکھنے سے کچھ وقت بچ جاتا ہے؟
ابواللیث نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں کھیل کود کا شائق نہیں ہوں۔ دیگر تفریحات بھی نہیں ہیں۔ وقت اتنا ہے کہ پڑھائی کے بعد بھی بہت سا وقت بچ جاتا ہے۔“
”اگر کچھ وقت تم ہمارے لیے پس انداز کر سکو؟“

”آپ میرے استاد ہیں اگر وقت نہیں بھی ہوگا تو آپ کے لیے نکالوں گا۔“

”میاں کچھ زیادہ کام نہیں ہے کچھ علمی کام ہے کچھ انتظامی۔ وہ تمہیں کرنے ہوں گے، کتابوں کے نشان زدہ حصے کو ایک کاپی میں اتار دیا اور طلبہ کی حاضری کا رجسٹر درست کر دینا وغیرہ بس یہ کام ہیں۔“

انہوں نے ایک قسم کا پرائیویٹ ٹیچنگ سے مقرر کر لیا۔ اس پر یہ عقدہ اس وقت کھلا جب پروفیسر صاحب کو تنخواہ ملی اور انہوں نے کچھ رقم جیب خرچ کے نام پر اپنی جیب میں ڈال دی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک اس نے انٹرمیڈیٹ پاس نہیں کر لیا۔ یا شاید اس کے بعد بھی۔

ان مہربان اساتذہ کے سائے میں وہ اپنا تعلیمی سفر جاری کیے رہا۔ دو سال بعد یعنی 1934ء میں انٹرمیڈیٹ کی جو پہلی جماعت اردو کی اس یونیورسٹی سے کامیاب ہو کر نکلی اس میں وہ بھی شامل تھا۔ اس نے یہ امتحان فرسٹ

اس نے بیوی سے مشورہ کیا۔

”قسمت نے ہمیں ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کیا ہے جہاں میں گھر چالوں یا ہوسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کر لوں۔ علی گڑھ اسکول میں استاد کی ایک اسامی خالی ہوئی ہے سوچ رہا ہوں وہاں ملازمت کر لوں اور تعلیم کا سلسلہ پرائیویٹ طور پر جاری رکھوں۔“

بیوی کو اس اطلاع پر ایسا افسوس ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں آپ کو ہرگز ملازمت نہیں کرنے دوں گی۔ مجھے یاد ہے آپ کتنے شوق سے علی گڑھ گئے تھے۔ مجرم میں ہوں سزا آپ کو کیوں ملے۔“

”نہ تم مجرم ہو نہ مجھے سزا مل رہی ہے۔ یہ تو حالات ہیں جن سے ہمیں نمٹنا ہے۔ جو وظیفہ مجھے ملتا ہے اس سے گھر کا خرچ اچھی طرح نہیں چل سکتا۔ دنیا کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔“

”آپ بے فکر رہیں میں آپ کو شرمندہ نہیں کروں گی۔ جتنی چادر ہوگی اتنے پاؤں پھیلاؤں گی۔ تنگی ترشی میں گزارہ کر لوں گی آپ اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔ اللہ نے چاہا تو اچھے دن بھی آئیں گے۔“

بیوی نے ایسی ہمت بندھائی کہ اس نے ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا اور پوری طرح تعلیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ابھی وہ آنرز کے پہلے سال میں تھا کہ اسے نواب حیدر یار جنگ رئیس حبیب رنج کا کتب خانہ دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ بات یہ تھی کہ اسی وقت ان کے کتب خانے کی بڑی دھوم تھی۔ ابواللیث کے تحقیقی مزاج نے شور مچایا کہ اس نادر کتب خانے کی سیر کی جائے جو کتابیں وہاں ہیں ان کی فہرست مرتب کی جائے۔ حوالے لیے جائیں تاکہ اگر کسی وقت کسی کتاب کی ضرورت پڑے تو اس کتب خانے سے رجوع کیا جاسکے۔ سوال یہ تھا کہ کتب خانے تک رسائی کیسے حاصل ہو۔ اس نے نواب صاحب کو یونیورسٹی کے مختلف جلسوں میں دیکھا ضرور تھا لیکن ان سے تعارف نہیں تھا۔ ہر مشکل کا حل رشید احمد صدیقی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ رشید صاحب نے احسن مارہروی کی نگرانی میں اسے حبیب رنج جانے کی اجازت دے دی۔

وہ قبلہ احسن مارہروی کی ہمراہی میں علی الصباح علی گڑھ سے روانہ ہوا اور دوپہر سے پہلے حبیب رنج پہنچ گیا۔ احسن مارہروی ساتھ تھے اس لیے تعارف کے لیے کسی لمبی چوڑی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ نواب صاحب نے مولانا

احسن کو دیکھا تو ایک خندہ زیر لب سے استقبال کیا اور گلے ملنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ مولانا نے اس کا تعارف کرایا۔ یہ سن کر بہت خوش ہوئے تو ایک طالب علم کو ایسا شوق ہے کہ بعد اصرار کتب خانہ دیکھنے حبیب رنج چلا آیا۔ نہایت مہربانی سے کتب خانہ دیکھنے اور حوالے لینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

یہ کتب خانہ قدیم و نادر مخطوطات و کتب کا خزانہ تھا۔ یہیں سے اس نے اپنے مقالے ”پندنامہ شغلی“ کے لیے مواد حاصل کیا۔ یہ گویا اس کی تحقیقی زندگی کا آغاز تھا۔ اس نے اپنے مقالے کو مکمل کیا اور جامعہ دہلی میں شائع کرا دیا۔ اس سے قبل اس تصنیف پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ یہ مضمون اتنا بھرپور تھا اور ایسے پختہ اسلوب کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ کسی استاد کے قلم کا شاہکار معلوم ہوتا تھا۔ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی طالب علم کے قلم کی کاوش ہے تو وہ داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے کئی مضامین اس سے پہلے بھی شائع ہوئے تھے لیکن اس مضمون کے ذریعے تو اس نے ایک کم شدہ تصنیف کی بازیافت کر کے دنیائے ادب سے متعارف کرایا تھا۔ یہ تنقید نہیں تحقیق تھی جس کی اُمید ایک طالب علم سے کم ہی کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ خود اس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی اس نے قدرت اللہ شوق کے تذکرے کی تلخیص، تذکرے اور مصنف کے تعارف اور تذکرہ نویسی کی تاریخ تفصیل کے ساتھ علی گڑھ میگزین میں شائع کی۔ علی گڑھ میگزین ہی میں ایک طویل مضمون ”تذکرہ حالی“ کے نام سے لکھا جس میں حالی کی حیات اور تصانیف پر روشنی ڈالی اور حالی کا مقام تحسین کیا۔ ”شبلی اور اردو“ کے عنوان سے ایک مضمون میں شبلی کی تصانیف اور اسلوب کا تجزیہ کیا۔ ”امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر“ کے نام سے ایک مضمون شائع کرایا۔ احسن کا کوروی کی نعت گوئی پر ایک مضمون لکھا۔

یہ اس کی وہ خدمات تھیں جو وہ کلاسیکی ادب کے سلسلے میں انجام دے رہا تھا۔ یہ خدمات یونہی ادا نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ اس کا جنون تھا جو ہوش مندی کی باتیں کر رہا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کھلندروں اور رئیسوں سے آباد تھی۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا لیکن ایسے طلبہ کی بھی کمی نہیں تھی جو تعلیم سے محبت رکھتے تھے۔ ابواللیث کا شمار ایسے ہی طلبہ میں ہوتا تھا لیکن ان کی کتابی کیزرا بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں وہ بھرپور حصہ لے رہا تھا لیکن اس کا میلان

چند تصانیف

لکھنو کا دبستان شاعری، مصحفی اور ان کا کلام۔
جرات ان کا عہد اور شاعری۔ نظیر اکبر آبادی کا عہد اور
شاعری۔ اردو قواعد، جامع القواعد، ہندوستانی گرائمر
(ترجمہ) ملفوظات اقبال، اقبال اور مسلک تصوف،
اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، تاریخ زبان و ادب اردو،
رفت و بود اور ڈیڑھ سو سے زائد مضامین و مقالات جو
مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ نیز نصابی کتب۔

میں کہ گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ کسی کے گھر اس خوف
سے جاتی نہیں تھیں کہ ہم کسی کے گھر جائیں گے تو کوئی
ہمارے گھر بھی آئے گا۔

ابوالیث بھی اسی کفایت شعاری سے گھر چلا رہا تھا۔
اس نے بھی اپنے سب شوق ختم کر دیے تھے۔ طالب علمی کی
شرارتوں میں بھی کوئی نہ کوئی علمی پہلو نکال لیتا تھا۔

علی گڑھ کے طلبہ کی شرارتوں میں ایک مشغلہ یہ بھی تھا
کہ بغیر ٹکٹ دہلی کا سفر کرتے تھے اور محکمہ پھر کر واپس
آ جاتے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی دوست تو دہلی کی رنگینیوں میں گم
ہو جاتے اور وہ کباڑیوں کی دکانوں کا رخ کرتا اور پرانی
کتابوں کی تلاش میں وقت گزارتا۔ ان ہی قلمی نسخوں کی
بدولت اسے خطوط شناسی سے لگاؤ پیدا ہوا۔ فارسی اور اردو کی
بہت سی کتابیں اس نے انہی کباڑیوں کی دکانوں سے
خریدیں اور انہیں کا در آمد بنایا۔ ان کی مدد سے مضامین تحریر
کیے۔ انہی دکانوں سے اس نے قدرت اللہ شوق کا تذکرہ
طبقات الشعرا باز یافت کر کے اس کی تلخیص علی گڑھ میگزین
میں شائع کی۔ ان پرانی کتابوں کی دکانوں ہی کی یہ دین بھی
کہ وہ ”لسانیت“ کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتا چلا
گیا۔ اردو زبان کی تاریخ اور صوتیات پر اس کے مضامین علی
گڑھ میگزین اور ”سمیل“ میں شائع ہوئے۔

علی ذہن رکھنے والے طلبہ کی معراج یہ تھی کہ وہ مجلہ
علی گڑھ کے مدیر بن جائیں۔ یہ صرف ایک یونیورسٹی کا
میگزین نہیں تھا بلکہ اس کا شمار ادبی مجلوں میں ہوتا تھا بلکہ
بہت سے ادبی رجحانوں سے زیادہ وسیع ہوا کرتا تھا۔ اس کا
ایڈیٹر بننا نہایت خوش نصیبی کی بات سمجھا جاتا تھا اور یونیورسٹی
بھر میں اس کے ایڈیٹر کا احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔
ابوالیث کو اپنی ایسے کا مکمل عرفان تھا۔ اس کے

تقریری مقابلوں اور مضمون نویسی کے مقابلوں کی طرف
تھا۔ میگزینوں تقریری مقابلے جیتے، انعام پائے اور میڈل
حاصل کیے علی گڑھ میگزین میں اتنے مضامین و مقالات کسی
ایک طالب علم کے شائع نہیں ہوئے۔ جتنے اس کے ہوئے
خاص طور پر لسانیات پر بلا مبالغہ میگزینوں صفحے لکھے۔ اس
زمانے میں لسانیات اور اس کے مباحث سے دلچسپی بہت کم
تھی۔ وہ ابھی طالب علم ہی تھا کہ اس نے اس مشکل میں
ہاتھ ڈال دیا تھا۔

علی گڑھ میگزین میں لکھنے والے طالب علموں میں
ایک طالب علم کو بہترین علمی و ادبی مقابلے پر انعام ملا تھا۔
1936ء میں یہ انعام اسے ملا۔

وہ خود تعلیم کی غرض سے علی گڑھ میں تھا اور بیوی
بدایوں میں تھی۔ اسے ہر ہفتے دو دن کی چھٹیوں میں
بدایوں جانا پڑتا تھا۔ کرایہ بھی خرچ ہوتا تھا اور سفر میں جو
وقت خرچ ہوتا تھا وہ ضائع بھی ہوتا تھا۔ جب رشید احمد
صدیقی سے اس کی بے تکلفی بڑھی اور وہ ایک طرح سے
ان کا پرائیویٹ سیکریٹری بن گیا اور وہ اس کی قابلیت سے
متاثر بھی ہو چکے تو رشید صاحب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ
اہلیہ کو علی گڑھ لے آئیں۔

”میاں تمہارے چھن یہ بتا رہے ہیں کہ اب تم علی
گڑھ سے جانے والے نہیں۔ تعلیم بھی یہیں حاصل کرو
گے اور ملازمت بھی یہیں کرو گے اور اس میں ظاہر ہے
ابھی بہت وقت درکار ہوگا کب تک چوہے بلی کا کھیل کھیلتے
رہو گے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ہماری بہو کو بھی علی گڑھ
لے آؤ۔“

وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ صدیقی صاحب نے ہمت
بندھائی تو وہ اہلیہ کو علی گڑھ لے آیا۔ دو گھنٹے پور سے میرس روڈ
کو ملانے والی سڑک پر نور منزل کے محل وقوع وارث
منزل میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔

بیوی کو علی گڑھ لانے کے بعد ذہنی فراغت کی کمی تھی
لیکن مانی تنگی کا وہی عالم تھا۔ یونیورسٹی کی طرف سے سب سے
والے وظیفے پر گزر رہے ہوئے تھے اگر بیوی معقول نہ ملی ہوتی
تو یہ دن کاٹنے مشکل ہو جاتے۔ وہ اللہ کی بندی ایسی صابر
شاکر تھی کہ حرف بگڑا زبان پر آتا ہی نہیں تھا۔ کسی فرمائش کا تو
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا حالانکہ یہ شادی کے شروع کے
دن تھے۔ یہ بڑا جذباتی دور ہوتا ہے۔ وہ اس سلیقے سے گھر
چلا رہی تھیں کہ شوہر کو یہ احساس ہی نہیں ہونے دے رہی

لا تعداد مضامین شائع ہو چکے تھے لہذا وہ بجا طور پر یہ خواہش رکھتا تھا کہ اسے ایڈیٹر بنایا جائے لیکن وہ ادبی سیاست کا شکار ہو کر پچھلے دو سالوں سے اس اعزاز سے محروم ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اس وقت ترقی پسند ادب کا زور تھا بلکہ ترقی پسند کہلوانا فیشن بن گیا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی ترقی پسندوں کا ایک گروہ بن گیا تھا۔ جوان کے ہم خیال نہیں تھے وہ رجعت پسند کہلاتے تھے۔ ابواللیث ترقی پسند ادب کے خلاف تھا۔ اس کی تحریر و تقریر سے ترقی پسندوں کی مخالفت ظاہر ہوتی تھی لہذا وہ ان کی نظر میں رجعت پسند تھا۔ لہذا اس کی مخالفت کی جارہی تھی۔

میگزین کا نگران کوئی استاد ہوا کرتا تھا۔ پچھلے دو سالوں سے خواجہ منظور حسین نگران تھے۔ یہ انگریزی کے استاد تھے۔ ابواللیث نے بھی ان سے انگریزی پڑھی تھی۔ ان کا جھکاؤ ترقی پسندوں کی طرف تھا لہذا وہ ابواللیث کو اس منصب کے لیے پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ معین الدین دروائی اور دوسری مرتبہ جاں نثار اختر کو نامزد کر دیا تھا۔ ابواللیث اسے اپنی حق تلفی سمجھتا تھا۔

اس نے آنرز پاس کر لیا تھا۔ وہ نہ صرف فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا بلکہ اپنا معیار برقرار رکھتے ہوئے یونیورسٹی بھر میں اول آیا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔

اس کا میاں بی نے نہ صرف اس کے اعتماد میں اضافہ کیا بلکہ اب اسے یہ خیال ہونے لگا کہ طالب علمی کا صرف ایک سال رہ گیا ہے۔ اگر اب بھی اس نے کوشش نہ کی تو اس سعادت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا۔ اس نے آخری سال میں آخری معرکہ لانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے بی حلیم اس وقت پر وہ انہیں چائلر تھے۔ میگزین کے نگران کی سفارش پر وہ بی مدیر کی عمری کرتے تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ اپنے ساتھ ہونے والی حق تلفی کی روئیداد بیان کی۔ حلیم صاحب نے اس کی باتوں کو سمجھ سے سنا اس کے تعلیمی ریکارڈ پر نظر ڈالی۔ اس کی ادبی خدمات کی حمان جین کی۔ اس کے لیے انہیں کہیں دور جانا نہیں پڑا۔ ابواللیث اپنے ساتھ تراشے لے کر گیا تھا۔ حلیم صاحب نے ہر خاموشی کو غور سے دیکھا اور حیرت کا اظہار کیا کہ اب تک اسے مدیر بنایا کیوں نہیں کیا جب کہ وہ کوشش بھی کرتا رہا۔

ابواللیث نے اپنا کیس کچھ اس طرح لڑا کہ اسے بی حلیم نے اس سال کے لیے اسے مدیر مقرر کر دیا۔ یہ خبر خواجہ منظور حسین پر بجلی بن کر گری۔ ابواللیث سمجھ رہا تھا کہ معاملہ

نٹ گیا لیکن معاملہ طول پکڑ گیا تھا۔ خواجہ منظور کو اس کی تقرری پر اعتراض تھا۔ انہوں نے اسے بی حلیم کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ رشید احمد صدیقی ان کے دوست تھے۔ انہوں نے ابواللیث کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنا نام واپس لے لے لیکن وہ نہیں مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خواجہ منظور حسین نے میگزین کی نگرانی سے استعفیٰ دے دیا۔

اس نے میگزین کی ادارت چیلنج کے طور پر قبول کی تھی۔ اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ اس کی تقرری غلط نہیں ہوئی ہے۔ اس نے مجلے کی ترتیب کے لیے سخت محنت شروع کر دی۔

اسے احساس تھا کہ وہ جس دعوے کے ساتھ مدیر بنا ہے اس کے لیے اسے سخت محنت کرنی پڑے گی۔ اس کے ذہن میں جو خاکہ تھا اس کے لیے مواد جمع کرنا شروع کر دیا۔ بطور صحافی اس کا یہ پہلا تجربہ تھا لیکن جب علی گڑھ نمبر کے نام سے اس مجلے کا ضخیم نمبر نکالا تو اس سے قبل اردو رسالوں کی تاریخ میں اتنا ضخیم نمبر کوئی نہیں نکلا تھا۔ اس رسالے میں اس نے سرسید اور علی گڑھ تحریک سے متعلق ایسی نادر تصاویر پیش کیں جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئی تھیں اور بہت سے بزرگوں کی تحریروں کے عکس بھی شامل کیے۔ کئی تحریریں خود لکھ کر دوسروں کے نام سے شائع کیں۔ مدیر کی حیثیت سے اس کا لکھا ہوا ”شذرہ“ بھی قابل تعریف تھا۔ اس مجلے کی دوسری خاص اشاعت ”اقبال نمبر“ کی تھی۔ ایک نمبر وہ تھا جو علامہ کی زندگی میں ”نیرنگ خیال“ نے نکالا تھا۔ اس کے بعد کسی بھی اردو رسالے کا یہ دوسرا اقبال نمبر تھا۔ اس میگزین میں مدیر کے شذرات، اقبال کے گرامی نامے، مولانا کی سیرت و فلسفے پر مضامین کے علاوہ فارسی قطعات بھی شامل تھے جن میں اقبال کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ وہ جو کام کرتا تھا بے مثال کرتا تھا۔ یہ دونوں شمارے بھی ایسے ہی بے مثال کارنامے ثابت ہوئے۔ اقبال نمبر جیسا کارنامہ کسی ادبی پرچے نے بھی انجام نہیں دیا تھا اور بہت بعد تک اس معیار کا کوئی پرچہ نہیں نکلا۔

اس کی ادارت میں چار مجلے شائع ہوئے تھے کہ اس کا آخری تعلیمی سال ختم ہو گیا۔

ایم اے کا امتحان دینے کے بعد وہ گھر بیٹھا تھا مگر کب تک بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے مالی حالات اس کے تحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ گھر بیٹھ کر نتیجے کا انتظار کرتا جب کہ وہ

دوران طالب علمی دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ اس نے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور ہدایوں پہنچ گیا۔
”بیگم بات یہ ہے کہ اگلے چند ماہ میں مولانا احسن مارہروی سبک دوش ہونے والے ہیں۔ اس وقت تک میں ایم اے کر چکا ہوں گا۔ مجھے اپنی لیاقت پر پورا بھروسہ ہے۔ رشید صاحب نے بھی اُمید دلائی ہے کہ ان کی جگہ میرا تقرر ہو جائے گا۔“

وہ ہدایوں میں بے کاری کے دن گزار رہا تھا۔ زیادہ وقت بسطین صاحب کے در دولت پر یا میر محفوظ علی کے ساتھ گزارتا تھا۔ یہ دونوں حضرات علم کے سمندر تھے۔ وہ ان کی صحبت میں بہت کچھ سیکھ بھی رہا تھا اور یہ ثابت بھی کر رہا تھا کہ علی گڑھ سے بہت کچھ سیکھ کر آیا ہے۔ ان صحبتوں میں بھی کبھی شیخ وحید احمد بھی شریک ہو جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یوپی میں پہلی کانگریس حکومت قائم ہوئی تھی۔ گوبند بلہ پٹھ وزیر اعلیٰ تھے۔ شیخ وحید احمد اس وزارت میں پارلیمنٹری سیکریٹری تھے۔

ایک روز وہ بسطین صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میر محفوظ علی وہاں تشریف فرما تھے۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایم اے کرنے کے بعد کیا پروگرام ہے۔ تعلیمی سلسلہ آگے رکھنا ہے یا ملازمت کا ارادہ ہے۔ اسی دوران میں شیخ وحید احمد بھی آگئے۔ وہ ابواللیث سے بھی واقف تھے اور اس کی لیاقت کے بھی قائل تھے۔ اس کی تحریر و تقریر سے بھی آشنا تھے۔ ادبی شخصیت تھے لہذا ادب شناس تو تھے ہی ابواللیث کی تحقیق و تنقید کے کمالات سے واقف تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں فارغ بھی ہے اور ملازمت کا خواہاں بھی تو انہوں نے پیشکش کر دی۔

”مجھے آج کل ایک ایسے مددگار کی ضرورت ہے جو مجھے اپنے متعلقہ محکمے سے متعلق تحریر و تقریر کے لیے مواد جمع کرنے میں مدد دے سکے۔“

کچھ تو ملازمت کی کشش کچھ شام اودھ کے نظاروں سے فیض یاب ہونے کا شوق۔ وہ شیخ احمد کے ساتھ لکھنؤ چلا گیا۔ شیخ وحید احمد کا قیام کونسلر بریڈنی یعنی اراکین اسمبلی کی قیام گاہ میں تھا وہ بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔

اس کا قیام اور اس کی ملازمت کی نوعیت دونوں سیاسی تھیں۔ یہاں وزراء، اراکین اسمبلی اور سیکریٹریوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان لوگوں کے پاس بات کرنے کے لیے سیاست کے سوا کوئی اور موضوع تھا ہی نہیں اور سیاست

بھی تعصب اور منافقت سے لبریز۔ اسے چند روز ہی میں یہ تجربہ ہو گیا کہ یہاں حکومت کا کاروبار کم اور اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے جوڑ توڑ کا بازار زیادہ گرم ہے۔ چند دن بعد ہی اس کا دم ٹھننے لگا۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے لکھنؤ کی گلیوں میں نکل جاتا۔ وہاں کی ریوڑیاں کھانا کسی سڑک کے کنارے چائے خانے میں بیٹھ کر لکھنؤ کے ماضی پر غور کرتا رہتا۔

یہ ملازمت ہرگز اس کی طبیعت کے مطابق نہیں تھی۔ اس دوران میں اس نے ایم اے بھی کر لیا تھا۔ وہ علیگڑھ کا منہ دیکھ کر یہاں پہنچا تھا۔ وہ کسی ایسے ادارے میں کام کر رہی نہیں سکتا تھا جس میں ہندوؤں کا غلبہ ہو اور وہ زبردستی اپنا غلبہ منوانا چاہتا ہو۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر مجھے سرکاری نوکری ہی کرنی تھی تو اعلیٰ سول سروس کے امتحان میں بیٹھتا۔ اس کی تربیت اب تک ایسی ہوئی تھی کہ لکھنؤ پڑھنا ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا۔ اسے بہت جلد احساس ہونے لگا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ پھر اگر ضرورتوں نے گلے پر پاؤں نہ رکھا ہوتا تو وہ یہ ملازمت بھی نہ کرتا۔

اسے لکھنؤ میں رہتے ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے کہ رشید احمد صدیقی کا خط آ گیا۔ انہوں نے یہ اطلاع دی تھی کہ مولانا احسن مارہروی ریٹائر ہو گئے ہیں۔ اب ان کی جگہ کسی کی تقرری کا مسئلہ ہے۔ تم فوراً علی گڑھ آؤ اور قسمت آزمائو۔ جو کچھ مجھ سے ہوگا میں بھی کروں گا۔ وہ اس وقت میدان میں اکیلا تھا۔ آل احمد سرور اس کے مقابلے میں آسکتے تھے لیکن وہ اس سے ایک سال پہلے شعبہ اردو میں آچکے تھے۔ اب کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ وہ میدان میں تنہا تھا۔ اسے اپنی تقرری کی اتنی اُمید بھی کہ بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا اور علی گڑھ پہنچ گیا۔

چند روز بعد اس تقرری کے لیے ایگزیکٹو کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ وہ کونسل ہال کے باہر ایک کمرے میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا یہ انتظار کر رہا تھا کہ کب اجلاس ختم ہو اور کب اس تک خوش خبری پہنچے۔ ناکامی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے اجلاس ختم ہوا۔ کونسل کے ایک ممبر عبد المجید قریشی بھی تھے جن سے اس کی قربت تھی۔ وہ ان کے قریب پہنچا۔ ان کے تیور دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کیا ہوا ہے۔ وہ پھر بھی ان کے قریب پہنچا۔ اس کی تو صورت سوال بنی ہوئی تھی۔ قریشی صاحب اسے دیکھتے ہی بول پڑے۔ ”جاؤ میان دار ہے گئے۔ کچھ نہیں ہوا۔“

میں چھوڑا اور اکیلا علی گڑھ آ گیا۔ اسے اے بی حلیم پر دو وائس چانسلر کی مہربانیوں کا اس وقت تجربہ ہو چکا تھا جب وہ علی گڑھ میگزین کی ادارت کا حق مانگنے ان کے پاس گیا تھا۔ وہ پھر ان کے پاس پہنچ گیا اور اپنے ساتھ ہونے والی حق تلفی کا پورا ماجرا کہہ سنایا۔ انہوں نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن ان کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

”جنس شاہ محمد سلیمان وائس چانسلر میں۔ تقرری کا اختیار ان کے پاس ہے۔“ اے بی حلیم نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔ آپ بی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرالیں۔ ریسرچ اسکالرش کے لیے 75 روپے ماہانہ وظیفہ جاری کرنا میرے اختیار میں ہے۔ میں وہ وظیفہ جاری کر سکتا ہوں۔ اس طرح آپ یونیورسٹی سے وابستہ رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت مستقل ملازمت کی کوئی صورت نکل آئے۔“

”ابھی تک علی گڑھ کیا کسی اور یونیورسٹی سے بھی کسی نے اردو میں بی ایچ ڈی نہیں کیا ہے۔ کیا یہاں میرا رجسٹریشن ممکن ہوگا؟“

”یہ اس یونیورسٹی کے لیے اعزاز ہوگا کہ پہلا بی ایچ ڈی یہاں سے ہو رہا ہے۔ رشید احمد صدیقی آپ کے ٹراں ہوں گے۔ ان سے مل کر تحقیق کے لیے کسی موضوع کا انتخاب کر لیں۔“

وہاں سے اٹھ کر اس نے جس کے سامنے بھی اپنے اس ارادے کا ذکر کیا اسے تعجب ہوا۔ بی ایچ ڈی اردو میں اور وہ بھی علی گڑھ سے۔ اس سے پہلے علی گڑھ میں کسی نے اس کی ہمت نہیں کی تھی۔

رشید احمد صدیقی نگران مقرر ہوئے اور موضوع ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ قرار پایا۔

یہ ماننا پڑتا ہے کہ اداس عمری کے تاثرات تمام عمر انسانی ذہن پر مرتسم رہتے ہیں۔ اس نے نوعمری میں اپنے والد کے کتب خانے میں لکھنؤی شعرا کے بہت سے دوادین دیکھے تھے اور ان کا بہ غور مطالعہ کیا تھا۔ یہ اثرات اس وقت ابھر کر سامنے آ گئے اور اس نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔

دوسرے یہ کہ لکھنؤ سے اصلا ح زبان کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ لسانیات ابواللیث کا خاص میدان تھا۔ ایم کرنے سے پہلے ہی وہ علی گڑھ میگزین میں کئی سو صفحات کا ”اصلا ح“ سلسلہ مضامین کا لسانیات کے حوالے سے شائع کر چکا تھا۔ اس لیے بھی لکھنؤ کا دبستان شاعری اس کی

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ رشید صاحب نے مجھے خود بلایا تھا۔ میری لیاقت و قابلیت میں بھی کوئی کلام نہیں۔ میرا مطبوعہ کام بھی سب کے سامنے ہے۔ ڈویژن بھی میری فرسٹ ہے۔ آل احمد سرور اور میرے سوا کوئی دوسرا فرسٹ ڈویژن نہیں۔ پھر جس کی تقرری ہوئی۔“

”ظہیر الدین علوی کی تقرری ہوئی ہے۔“

”ان کی تقرری کس خوشی میں ہو گئی۔ انہوں نے تو پرائیویٹ ایم اے کیا ہے اور ڈویژن میں فرسٹ نہیں۔ کوئی ایسا ادبی کام بھی ان کی پہچان نہیں بن سکا ہے۔“

”ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی سفارش تھی۔“

عبداللہ قریشی تو اپنے راستے چل دیے۔ ابواللیث غصے میں بھرا ہوا سیدھا رشید صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ غصے میں تو تھا ہی ڈاکٹر ذاکر حسین کی شان میں جتنی گستاخیاں کر سکتا تھا کرتا رہا۔ خوب برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس نکال کر گھر واپس آ گیا۔ بیوی قیافہ شناس تھیں۔ صورت دیکھتے ہی ناکائی کی تحریر پڑھ لی۔ کچھ پوچھنے سے پہلے ہی غم زدہ ہو گئیں۔ وہ ابھی غصے میں تو تھا ہی ایک مرتبہ پھر ذاکر حسین کے خلاف زہرا بھگنے لگا۔

”میری حق تلفی ان کے ہاتھوں ہوئی ہے جو عوام کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کے بارے میں اتنی خوش فہمی ہے کہ ان کی دیانت داری کی قسمیں کھاتے ہیں۔ وہاں اور لوگ بھی تھے۔ مجھے نہیں معلوم کس نے اور کیا کردار ادا کیا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ میری تقرری نہیں ہو سکی۔“

”آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ اللہ سب دیکھ رہا ہے۔ آپ کا حق آپ کو مل رہا ہے گا۔“

”تمن بچیوں کا ساتھ ہے۔ گھر چلانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں ہی نوکری کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں اب کیا ہوگا۔“

”چلیے بدایوں چلتے ہیں۔ وہاں عوامی وقار ہیں۔ نہیں ہوا تو دوبارہ لکھنؤ چلے جائے گا۔“

اب وہ اسے کیا بتاتا کہ لکھنؤ کی مسوم فضا کے بھاگ کر ہی تو وہ یہاں آیا تھا۔ اس نے سامان باندھا اور بدایوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد اسے مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن شکست ماننا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اب بھی اس نے شکست قبول نہیں کی تھی۔ اس نے بیوی بچوں کو بدایوں

دلچسپی کا باعث تھا۔

اسے یہ مقالہ رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں لکھنا تھا اور مصیبت یہ تھی کہ رشید صاحب تحقیق کے آدمی نہیں تھے۔ وہ مزاح نگار تو بہت اچھے تھے لیکن تحقیق سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے پہلے دن ہی فرما دیا تھا کہ مواد کی فراہمی اور تحقیق و تفتیش تم جانو اور تمہارا کام۔ مقالہ لکھ لو تو مجھے دکھا دینا، نوک، پلک درست کرو، گا اور کوئی بات نامعقول ہوئی تو خارج کردو گے۔ تحقیق کے آدمی نواب صدر یار جنگ ہیں ان سے مشورہ کر لیتا۔ ان کا کتب خانہ بھی تمہارے بہت کام آئے گا۔

اس کے سامنے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اس وقت تک لی ایچ ڈی کے لیے اردو کا کوئی مقالہ ہندوستان بھر میں نہیں لکھا گیا تھا جس کو نمونہ بنا کر کام کا آغاز کیا جاتا۔ بہر حال اس نے بھاری پتھر سمجھ کر اسے اٹھا لیا۔ مگر ان مقالہ نے تو بالکل ہی ہاتھ اٹھا لیے تھے۔ لے دے کے نواب صدر یار جنگ تھے جن سے وہ مشاورت کر سکتا تھا۔ انہوں نے بھی اسے مایوس نہیں کیا۔ اسے مشوروں سے نوازتے رہے۔ اپنے کتب خانے کے دروازے بھی اس پر کھول دے۔ یہاں سے اسے وہ مواد میسر آیا جو کہیں اور دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اتنے پھیرے لگائے کہ علی گڑھ اور حبیب منج ایک ہو کر رہ گیا۔

مالی اعتبار سے یہ دور اس کے لیے سخت آزمائش کا دور تھا۔ وہ بیوی بچوں کو علی گڑھ لے آیا تھا۔ آمدنی وہی پچھتر روپے ماہانہ کی تھی جو ریسرچ اسکالر کے طور پر اسے مل رہے تھے۔ اس کی بیوی کے لبوں پر یہ ستور کوئی شکایت نہیں تھی لیکن خود بھی کبھی ضرور سوچتا تھا کہ اس کی طور پر پچھتر روپے ہوتی تو کم از کم ایک سو پچیس روپے ماہانہ تنخواہ ضرور ہو جاتی۔

وہ دن بھر شعبہ اردو میں مصروف کار رہتا۔ رشید صاحب کی طرف چلا جاتا یا حبیب منج جاتا یا نہ تھا ہارا گھر پہنچتا۔ بیوی کی ایک مسکراہٹ اس کی محکم دور کر کے لیے بہت تھی۔ کچھ دیر اپنی بچیوں کے ساتھ کھیلتا۔ پھر دن بھر محنت سے جو مواد جمع کیا ہوتا اسے ترتیب دینے بیٹھ جاتا۔ صبح اٹھتا، ناشتے کے نام پر جو ہوتا، کھاتا اور کسی مزدور کی طرح پھر گھر سے نکل جاتا۔

ایک دن وہ شعبے میں پہنچا تو اسناف روم میں ایک اجنبی صورت نظر آئی۔ کوئی ملنے والے بھی نہیں ہو سکتے تھے

ماہنامہ سرگزشت

کیوں کہ ان کے ہاتھ میں طالب علموں کی حاضری کار جڑ تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ مہمان نہیں بلکہ شعبہ اردو کے کوئی استاد ہیں لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا تھا کہ ان کا تقرر کب ہوا اور یہ صاحب ہیں کون۔ علی گڑھ کے طلبہ میں سے تو نہیں ورنہ صورت آشنا ہوتے۔ اس نے معلومات کیں تو پتا چلا کہ ان کا نام محمد عزیز ہے۔ یہاں آنے سے پہلے دارالمصنفین اعظم گڑھ میں تھے اور تالیف و تصنیف کا کام کر رہے تھے۔ ابھی حال ہی میں اردو میں ایم اے کیا ہے اور اب عارضی طور پر چھ ماہ کی مدت کے لیے پھر اقرار کر دیے گئے ہیں۔

یہ سنتے ہی اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کے زخم تازہ ہو گئے۔ میرے لیے اسامی نہیں اور ان صاحب کو رکھ لیا گیا۔ کوئی اشتہار نہیں درخواست نہیں انٹرویو نہیں۔ معلوم ہوا وائس چانسلر کو کسی بھی جگہ پر خواہ جگہ ہو یا نہ ہو بجٹ میں ہونہ ہو، اپنی صوابدید پر چھ مہینے کے عارضی تقرر کا اختیار ہے۔

”یہ تو چور دروازہ ہوا۔ جو صدر دروازے سے داخل نہ ہو سکے اسے عقبی دروازے سے داخل کر لو۔ بعد میں یہ اسامی مستقل بھی ہو سکتی ہے۔“

یہ چوٹ ایسی تھی جسے وہ آسانی سے نہیں سہہ سکتا تھا۔ ابھی پہلی چوٹ کی دھن کم نہیں ہوئی تھی کہ دوسرا زخم لگ گیا۔ اگر یہ چور دروازہ کھلتا ہی تھا تو میرے لیے کھلنا چاہیے تھا۔ اس کا حقدار تو میں تھا۔ وہاں کیا شور مچاتا۔ اٹنے پاؤں گھر لوٹ آیا۔ ابھی دن بھی نہیں گزرا تھا کہ دو پہر کو ملنے والی گاڑی میں بیٹھا اور دہلی پہنچ گیا۔

جسٹس سر شاہ سلیمان وائس چانسلر تھے۔ دو دن علی گڑھ میں گزارتے تھے اور پانچ دن دہلی میں رہتے تھے۔ گویا جزوقتی وائس چانسلر تھے۔ وہ ان کے علی گڑھ آنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے دہلی آ گیا تھا اور اب ان کی قیام گاہ پر پہنچ کر ان سے ملاقات کی کوشش کر رہا تھا۔ کوشش اس لیے کہ ان کا سیکریٹری ملاقات کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

جسٹس صاحب، یونیورسٹی سے متعلق کام صرف علی گڑھ میں دیکھ کر کرتے ہیں۔ یہاں وہ آپ سے نہیں مل سکتے۔ ”سیکریٹری نے بتایا۔“

”کام کی نوعیت ایسی ہے کہ میں ان کے علی گڑھ پہنچنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔“

2015ء

41

وہ اس خط کو لے کر باہر نکلا۔ بے تاب اتنا تھا کہ راستے ہی میں لفافہ چاک کیا۔ اس میں صرف دو سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

”ابواللیث صدیقی کا تقرر چھ ماہ کی عارضی مدت کے لیے وائس چانسلر کے خصوصی اختیارات کے تحت کیا جاتا ہے اور اسی تاریخ سے جس سے محمد عزیز صاحب کا کیا گیا ہے۔“ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سڑک پر ہی سجدہ کر لے۔ اللہ نے اس کی کسی سنی تھی۔

علی گڑھ پہنچنے کے بعد اگلے ہی دن اس نے اے بی حلیم کی خدمت میں پیش ہو کر وہ خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے خط کو پڑھا اور اس وقت رجسٹرار سے حکم نامہ لکھوا کر شعبہ اردو کو روانہ کر دیا۔

اس کا تقرر تو ہو گیا لیکن شعبے میں گرم جوشی سے اس کا استقبال نہیں ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ بن بٹایا مہمان ہے۔ اس کے تقرر میں نہ صدر شعبہ کی سفارش تھی نہ کوئی درخواست نہ اسامی نہ بجٹ لیکن کوئی کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کے مخالفین اسے پچھتر روپے کے وظیفے سے ایک سو پچیس روپے ماہانہ کا پیکر ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے نکال نہیں سکتے تھے لیکن یہ تو کر سکتے تھے کہ اسے اتنا پریشان کیا جائے کہ وہ خود ہی چھوڑ کر چلا جائے لیکن وہ تو کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ غالب کے الفاظ میں ہوا یہ کہ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں۔

نقلی اداروں میں کسی استاد کو پریشان کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ٹائم ٹیمبل ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ اس کے لیے ایسا ٹائم ٹیمبل بنایا گیا کہ صبح پہلا گھنٹا بھی اسے لینا پڑتا اور سہ پہر میں آخری گھنٹا بھی۔ نہ صبح دیر سے آ سکتا تھا نہ شام کو جلدی جا سکتا تھا اور پھر مرے یہ سو درے اور بھی۔ ایک گھنٹا (پیریڈ) سائنس میں دوسرا آرتھس میں۔ ان دونوں شعبوں کے درمیان فاصلہ کافی تھا۔ سارا دن اسی بھاگ دوڑ میں گزر جاتا۔ گھر سے یونیورسٹی بھی دور تھی۔ سواری کی استطاعت نہیں تھی پیدل آنا پڑتا تھا۔ آتے ہی بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی۔ آرتھس سے سائنس میں۔ پھر سائنس سے آرتھس میں۔ سائنس ابھی قابو میں نہیں آتی تھی کہ کلاس شروع ہو جاتی تھی۔ کلاس بھی ایسی دی مٹی جو تعداد کے اعتبار سے کسی نو وارد کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں تھی۔ آرتھس میں بی اے کی کلاس اتنی بڑی ہوتی کہ کوئی بڑے سے بڑا کمرہ کافی نہ ہوتا۔ اس کلاس کو اسٹریچی ہال میں لینا پڑتا تھا اور وہ

”انتظار تو آپ کو کرنا پڑے گا۔“

”میں نے علی گڑھ سے دہلی تک کا سفر یہ سننے کے لیے نہیں کیا ہے کہ وہ نہیں مل سکتے۔ مجھے آج اور ابھی ان سے ملنا ہے۔“

”میں آپ کو ان سے ملوا بھی دیتا لیکن ان کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ کسی سے نہیں مل سکتے۔“ سیکریٹری نے پینترا بدلا۔

”اگر آپ نہیں ملوائیں گے تو میں کوٹھی کے دروازے پر اس وقت تک بیٹھا رہوں گا جب تک وہ باہر آ کر مجھ سے مل نہیں لیں گے اور جو کچھ مجھے کہنا ہے ان سے کہہ نہیں لوں گا۔“

سیکریٹری نے اس کے یہ تیور دیکھے تو اندر جا کر اطلاع کی اور جسٹس صاحب نے اسے بلوایا۔ وہ اندر گیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے اس نے اپنی داستان بیان کرنے کے لیے الفاظ تراش لیے۔

”میرا نام ابواللیث صدیقی ہے۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ آنرز اور فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے کیا ہے۔ میرے علاوہ اس وقت تک کسی کو یہ اعزاز نہیں ملا ہے۔ میں پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام بھی کر رہا ہوں۔ یہ ہندوستان میں کسی بھی یونیورسٹی میں ہونے والا پہلا پی ایچ ڈی ہو گا۔ میں ایک نوکری چھوڑ کر تدریس کے جنون میں علی گڑھ آیا تھا۔ چند ماہ پہلے مجھے نظر انداز کر کے ایک تقرری عمل میں آئی جس کا فیصلہ میرٹ پر نہیں کسی اور معیار پر ہوا۔ یہ کہا گیا کہ امیدوار ضرورت مند ہے۔ ضرورت مند تو میں بھی تھا۔ میں اس وقت خاموش ہو گیا لیکن اب ایک نیا تقرر ہو گیا۔ اس کی بنیاد بھی میرٹ نہیں۔ دروغ بر گردن (داکی)، سنا یہ ہے کہ وہ آپ کے کوئی عزیز ہیں۔ بس یہی میرٹ ہے۔ بے شک یہ میرٹ ہے لیکن بہر حال حق میرا ہے۔ اب آپ کی صوابدید پر ہے کہ آپ کیا حکم صادر فرماتے ہیں۔“

جسٹس صاحب نے خاموشی سے اس کی باتیں سنیں۔ ”اچھا آپ ملاقاتیوں کے کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“

وہ باہر آ کر ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جسٹس صاحب کا سیکریٹری اندر آیا اور ایک بند لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا یہ اسے بی حلیم پرو وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی کے نام ایک خط تھا۔

بھی مانگیر دفون کے بغیر۔ دوسو کی کلاس اور وہ بھی علی گڑھ کے طالب علموں کی جو ذرا سی دیر میں آدمی کو اس کی حیثیت یاد دلا دیں۔ مضمون بھی اردو جس کی لڑکوں کے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

یہ بھی اسی سازش کا حصہ تھا کہ وہ چھوڑ بھاگے یا لڑکے اسے بھاگ دیں۔

اس کی عمر بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ پہلے دن کلاس میں جانے سے پہلے خود بھی سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی کلاس کا مقابلہ کربھی سکے گا۔ اس کا قد ذرا کم تھا۔ اس وقت دبلا پتلا بھی تھا۔ جنہیں بڑا حار ہا تھا ان سے بھی چھوٹا نظر آ رہا تھا۔ بڑھانے کو بھی ملا تو اقبال کی باجگ درا اس میں پہلا سبق ”خضر راہ“ کا تھا۔ سب سے پہلے صرف نظم کے عنوان خضر راہ پر گفتگو شروع کی اور کم از کم دو ہفتے اس کی علامتی اہمیت پر بات کرتا رہا۔ اس عرصے میں یہ نظم اسے زبانی یاد ہو گئی۔ کلاس میں جاتا اور کتاب کھولے بغیر زبانی پڑھانا شروع کر دیتا اور ایسا تجزیہ کرتا جو شاید بی اے کی سطح کے لیے ضروری بھی نہیں تھا لیکن طلبہ پر اس کا اچھا اثر پڑا اور وہ اسے توجہ سے سننے لگے۔ گویا وہ کامیاب ہو گیا۔ وہ قدرتی طور پر بلند آواز تھا۔ یہ خوبی بھی اس کے حق میں گئی۔

ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کی آواز گونجنے لگتی۔

وہ ان کلاسوں سے نمٹ ہی رہا تھا کہ اسے ایم اے میں تاریخ زبان و ادب کا پرچہ پڑھانے کو ملا۔ یہ اس وقت بھی ایم اے کے سات پرچوں میں سب سے مشکل تھا۔ اس نے اس پرچے میں لسانیات کا ایک جزو داخل کر لیا اور اس کی تدریس شروع کی۔ یہ اس لسانیات کے شعبے کی داغ بیل تھی جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک مستقل، مضبوط اور الگ شعبہ ہے۔

اب وہ اپنی جگہ بناتا جا رہا تھا۔ شروع میں اس کا حال ناخواہ مہمان کی طرح رہا لیکن اس نے تدریسی مہارت اور حسن اخلاق سے سب کے دلوں کو فتح کر لیا۔ کم از کم شعبے میں کوئی مخالفت نہ رہی۔

اس زمانے میں یونیورسٹی گریجویٹ میں بی اے کی اردو کلاس شروع ہوئی۔

اچھے خاصے تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسکول یا کالج بھیجتا تو درکنار لڑکوں کی تعلیم بھی عام نہیں تھی تو لڑکیاں بے چاری کس گنتی

میں۔ بہر حال بعض احباب کی کوششوں سے گریجویٹ کالج کے قیام کی نوید ملی۔ ابتدا میں صرف دو لڑکیاں تھیں۔ 1936ء میں اس کا الحاق یونیورسٹی کے ساتھ ہو گیا۔ صرف دو سال ہوئے تھے کہ ”خواتین کالج“ کے لیے جواب یونیورسٹی کا حصہ تھا اردو کے استاد کی ضرورت پیش آئی۔ لڑکیوں میں تعلیم کا رواج ہی نہیں تھا تو کسی خاتون لیکچرار کا ملنا کسے ممکن ہوتا۔ اس کے لیے ابواللیث کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ اعزاز بھی اس کی قسمت میں تھا کہ وہ گریجویٹ کالج میں اردو کا پہلا استاد ہوا۔

ان دنوں مخلوط تعلیم کا رواج تو ہوا نہیں تھا۔ وہ پہلے دن کلاس میں گیا تو اسے ایک پردے کے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ پردے کی دوسری جانب علی گڑھ کی وہ لڑکیاں تھیں جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے علی گڑھ کے طلبہ سائیکلوں پر پردے لگے تاگوں کا چچا کیا کرتے تھے یا علی گڑھ کی نمائش میں کالے برقعوں کی دھوم ہوا کرتی تھی۔ اس وقت کے نوجوان شعراء اس نادر دیدہ مخلوق پر نظمیں لکھا کرتے تھے۔

وہ بھی بائیس سال کا نوجوان، دھڑکتے دل سے پڑھانا شروع کیا۔ دوسری طرف سے کسی نسوانی آواز نے سوال پوچھا۔ اس نے مسئلہ سمجھا دیا۔ کسی عاشقانہ شعر پر دہلی دلی کسی کی آوازیں آئیں۔

کلاس ختم ہوئی۔ وہ ”بڑی مشکل سے دل قابو کیا ہے۔“ کہتا ہوا کلاس سے باہر گیا۔

پردے کی دوسری جانب بیٹھی ہوئی لڑکیاں سوچ ضرور رہی ہوں گی کہ موصوف نوجوان ہیں، کچھ دنوں میں کھلیں گے ضرور لیکن موصوف کا حال یہ تھا کہ شروع سے اتنی سختیاں جھیلی تھیں کہ عشق کرنے کی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔

قطب سالی کے وہ ایسے دن گزار رہا تھا کہ جس میں عشق کرنے والے بھی عشق فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اس نے عشق کیا ہی نہیں تھا تو فراموش کیا کرتا۔ یہ احساس بھی تھا کہ وہ شام آوارہ میں ”استاد“ ہے۔ پردے کے کونے اٹھتے کرتے

ہے۔ عشقیہ اشعار کے مطلب بار بار پوچھے جاتے رہے۔ اسے خوشی تھی تو یہ کہ اب تنخواہ ایک سو پچیس سے بڑھ کر ایک سو پچیس ہو گئی۔ پچاس روپے تنخواہ بڑھ گئی۔ اس پچاس روپے کے اعزاز میں اسے ہفتے میں چار روز دو دو گھنٹے کا اس میں پڑھانا تھا۔

اسے دوسری خوشی یہ تھی کہ اس کالج میں برصغیر پاک و ہند کی نہیں بلکہ کبوتریا، شمالی ہند، مصر، عراق اور سری لنکا

تک سے مسلمان لڑکیاں آتی تھیں اور اس طرح سرسید کے خواب کا دوسرا حصہ یعنی تعلیم نسواں بھی شرمندہ تعبیر ہو گیا تھا۔

خواتین گرلز کالج اس کے گھر "وارث منزل" سے قریب تھا ہذا پیدل ہی آ جاسکتا تھا۔

پچاس روپے کی اس اضافی آمدنی کے بعد اس کا ہاتھ کچھ کھل گیا تھا۔ اس نے ایک ڈیپارٹمنٹ سے دوسرے ڈیپارٹمنٹ تک جانے کے لیے ایک سائیکل خرید لی۔ یہ پرانی سائیکل تھی بعد میں نئی سائیکل خرید لی جو 1947ء میں علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت تک اس کے پاس رہی۔

اس نے درس و تدریس کے ساتھ یونیورسٹی کے سب سے بڑے ہوشیار عائدہ کے گھراں کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ دس چائیلڈ کے دفتر میں ان کے معاون کے طور پر بھی کام کیا۔ اس دوران میں شعبہ اردو سے بدستور منسلک رہا اور کوئی اضافی تنخواہ نہیں لی۔

اس نے عروج کی کئی منزلیں دیکھیں لیکن یہ سب دیکھنے کے لیے اس کی والدہ زندہ نہیں رہیں جو اسے علی گڑھ بھیجے کی مخالفت کرتی رہی تھیں۔ جن کا خیال تھا کہ علی گڑھ میں رئیسوں کے بچے پڑھ سکتے ہیں۔ ہم وہاں کے اخراجات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ علی گڑھ کا ماحول بچوں کو بگاڑ دیتا ہے۔ والدین سے دور رہ کر بچوں کو بگڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ خیالات ان کے ذہن میں یونہی جاگزیں نہیں ہو گئے تھے۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کو علی گڑھ بھیج کر دیکھ چکی تھیں۔ جنہوں نے اپنی نادانیوں اور شاہ خرچیوں سے گھر میں مفلسی کا پہرا بٹھا دیا تھا۔ ابواللیث والدہ کی مرضی کے خلاف علی گڑھ گیا اور اسی عمر میں گیا کہ خرابی کا کوئی بھی دریا اسے تنکے کی طرح بہا کر لے جاسکتا تھا لیکن اس نے اپنی محنت اور لگن سے اپنا مقام بنایا مگر افسوس! یہ سب دیکھنے کے لیے اس کی والدہ اب اس دنیا میں نہیں رہی تھیں وہ اگر ہوتیں تو وہ محنتیں کہ انسان اپنی محنت سے جو چاہے کر سکتا ہے۔

☆.....☆

اس کا قیام وارث منزل میں تھا۔ اس میں دو بڑے کمرے تھے۔ ایک بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم۔ یہی کمرے وہ اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ دونوں اطراف برآمدے تھے۔ اندر کی طرف برآمدے کے ایک پہلو میں اسٹور اور دوسرے میں غسل خانہ تھا۔

اس وقت رات کے تقریباً دو بجے ہوں گے کہ پیاس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اندر کے برآمدے میں صراحی رکھی تھی اور اس پر چاندی کا کٹورا ڈھکا ہوا تھا۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو کٹورا غائب تھا۔ اس نے منظر جو اٹھائی تو اسٹور کا دروازہ جو مقفل رہتا تھا چو پٹ کھلا پڑا تھا۔ حیرانی ہوئی کہ دروازہ کھلا کیوں ہے۔ ذرا اور آگے بڑھا تو محسن میں لحاف، گدے اور کپڑے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ یہ خیال آتا لازمی تھا کہ چوروں نے گھر کا صفایا کر دیا ہے۔ وہ گھبرا کر اندر کی طرف بھاگا۔ بیوی کو اٹھایا۔ اٹھایا کیا سمجھوڑ کر رکھ دیا۔

"اٹھ کر دیکھو تو گھر میں چوری ہو گئی ہے۔"

وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھیں۔ محسن میں گھرے ہوئے سامان کو دیکھ کر انہیں بھی شک نہیں رہا کہ گھر کا صفایا ہو گیا ہے۔ چور کو لحاف گدوں سے غرض نہیں تھی۔ وہ بیٹیں چھوڑ گیا۔ اپنے کام کی چیزیں لے گیا ہوگا۔ اب دونوں نے تلاشی لیتی شروع کی کہ کیا چیزیں گئی ہیں۔ صبحے کا آغاز تھا جو پیسے صبحے بھر کے خرچے کے لیے رکھے تھے اب اپنی جگہ نہیں تھے کچھ تھوڑا بہت زیور تھا وہ بھی غائب تھا۔ چاندی کے کچھ برتن تھے وہ بھی چوروں کی نذر ہو گئے تھے۔ بستر کی چادریں تک کوئی لے گیا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ یہ سارا سامان سائیکل پر رکھ کر لے گیا تھا کیوں کہ سائیکل بھی نہیں تھی۔

سامان کو تلاش کرتے اور تخمینہ لگاتے لگاتے صبح ہو گئی۔

بیوی پولیس کہ پولیس میں رپورٹ درج کرا کر آؤ۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن اس نے تھانہ جا کر رپورٹ درج کرا دی۔

گھر میں جتنی رقم تھی سب جا چکی تھی۔ سرہانے رکھی شیر وانی کی جیب میں تھوڑی سی ریز گاری رہ گئی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھی کہ اس سے دوپہر کی ہنڈیا کا انتظام ہو سکتا تھا۔ بیوی باورچی خانے میں گئیں تو وہاں رکھا ہوا مٹی کا بڑا کنستر بھی نہیں تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"میاں ہم تو بری طرح لٹ گئے۔ چوروں نے کچھ بھی تو نہیں چھوڑا۔ برتن تک نہیں چھوڑے۔ میں نے پائی پائی جوڑ کر کتنا کچھ جمع کر لیا تھا کچھ بھی تو نہیں رہا۔ ابھی تو پورا مہینہ چھپا لے کیا ہم دانے دانے کو ترسیں گے۔ آپ کی سائیکل بھی چلی گئی۔ اب آپ کو پھر یونیورسٹی پیدل جانا

پڑے گا۔“

وہ سچ مچ رورہی تھیں اور ابوالیث انہیں تسلی دے رہا تھا۔

”اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ یہ بھی ہمارا امتحان ہے۔ تم دیکھنا زندگی میں تمہیں اللہ اتنا دے گا کہ سنبھالا نہیں جائے گا۔ پوری دنیا دیکھے گی۔ جانے والے پرتوں کی حیثیت کیا ہے۔ دنیا بھر کی نادرا و قیمتی اشیاء ہوں گی تمہارے پاس۔“

یہ وقت ایسی قبولیت کا تھا کہ یہ دعا حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ اللہ نے دولت، شہرت سب کچھ دیا۔ دنیا بھی ٹھہری اور وہاں سے لائے ہوئے نادرا تحفوں سے گھر بھی بھر گیا۔

وہ بیوی کو تسلی دینے کے بعد یونیورسٹی گیا اور رشید صاحب کو اطلاع دی۔ انہیں بھی سن کر افسوس ہوا تسلی دی اور بڑی محبت کا برتاؤ کرتے ہوئے فوری خرچ کے لیے کچھ رقم بھی دی۔

چوری ایسی تھی کہ گھر میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس کم آمدنی میں گھر کو دوبارہ بنانا پڑ گیا۔

وہ تو مضبوط اعصاب کا تھا اس صدمے کو سہہ گیا۔ عورتیں گھرداری کی طرف سے بہت حساس ہوتی ہیں۔ ریحان فاطمہ کو ایسا دھچکا لگا کہ کئی دن بخار میں پڑی اپنی کم شدہ چیزوں کو یاد کرتی رہیں۔

اس حادثے سے ایسا دھچکا لگا تھا کہ اس گھر سے جی اچاٹ ہو گیا۔ بیوی نے اپنی ذات کے لیے کبھی کوئی تقاضا نہیں کیا تھا لیکن اب کہتی تھیں کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ یہ گھر بدل لو۔

ابوالیث کا بھی اس گھر سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ بیوی بچوں کو لے کر ایک اور گھر ”مسرت منزل“ میں منتقل ہو گیا۔ اس مکان میں انہوں نے دو سال گزارے اور پھر یونیورسٹی کے مکان مارین روڈ میں منتقل ہو گئے جہاں پاکستان آنے تک مقیم رہے۔

☆.....☆

اس کا رجسٹریشن پی ایچ ڈی کے لیے ہو چکا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہیں تھا جسے بنیاد بنا کر وہ کام کا آغاز کر سکتا کیوں کہ اس وقت تک اردو کا کوئی مقالہ ہندوستان بھر میں نہیں لکھا گیا تھا۔ مگر اس رشید احمد صدیقی مقرر ہوئے تھے۔ ان کا تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں

تھا۔ انہوں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ مواد کی فراہمی اور تحقیق تمہیں خود کرنی پڑے گی۔ مقالہ لکھ لو تو مجھے دکھا دینا میں نوک پلک سنوار دوں گا۔ اس سلسلے میں نواب صدر یار جنگ بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ وہ صرف اتنا کر سکتے تھے کہ اپنے کتب خانے کے دروازے اس پر کھول دیں اور وہ انہوں نے کھول دیے۔ اس نے خود ہی کمرہت باندھی۔ اپنے مقالے کے لیے خاک تیار کیا اور مواد کی فراہمی کے لیے کوشاں ہو گیا۔ جو ملا سب محفوظ کر لیا۔ تذکروں، تاریخوں اور دوسری کتابوں میں جہاں کہیں لکھنؤ اور لکھنوی شاعری کا ذکر آیا اسے محفوظ کر لیا۔ شعر کا کلام محفوظ کر لیا۔ سیکڑوں صفحوں کے حوالے جمع ہو گئے۔ اتنا مواد جمع ہو گیا کہ وہ گھبرا یا۔ اتنا مواد کتنے صفحات گھیرے گا اور اسے کون سیٹے گا۔ اب اس کے ذوق تنقید نے خود اس کی رہنمائی کی۔ میں لکھنوی شاعروں کا تذکرہ مرتب نہیں کر رہا ہوں بلکہ لکھنوی شاعری کے دبستان کا تجزیہ کرنا مقصود ہونا چاہیے۔ اس تجزیے کے بعد یہ ثابت کرنا ہے کہ بعض خصوصیات کی وجہ سے لکھنویک ”دبستان“ ہے۔ وہ مواد پیشتر بے کار ہوا۔ محنت کا رت مٹی۔

اب اسے لکھنوی شاعری کا مطالعہ ایک دبستان کی حیثیت سے کرنا تھا اور اس میں سلطنت اودھ کے قیام وہاں کی مخصوص معاشرت اور اس میں ابھرنے والی شاعری اور اصلاح زبان کی تحریک کے اسباب و نتائج سے خاطر خواہ بحث کرنی تھی۔ قابل ذکر شعراء کا تعارف کرانا تھا اور ان کے کلام کے رنگ کو متعین کرنا تھا۔ یہ اردو دنیا میں اس کی اولین کوشش تھی۔ اب تک جو تذکرے ملتے تھے ان میں شعراء کا مختصر تعارف ہوتا تھا اور نمونہ کلام۔ لیکن لکھنوی شاعروں کو ایک دبستان کا نمائندہ اور لکھنوی شاعری کو ایک دبستان کی حیثیت سے مربوط کرنے کی تحقیق کاوش وہ پہلی مرتبہ کر رہا تھا۔

اس نے اپنے مقالے کو دس ابواب میں تقسیم کیا اور کام شروع کر دیا۔

اس نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کے ایک خاص دور کو اس کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ لکھنوی تہذیب و معاشرت اور وہاں کے خاص مزاج کو متعین کرنے میں مذہب اور مسلک کو خاصا دخل تھا۔ اس نے اس موضوع کو اجاگر کرنے کے لیے مستند حوالے تلاش کیے اور بہت سا مواد جمع کر لیا۔

افسوس یہ سرمایہ جو میں نے بڑی مشکل اور محنت سے جمع کیا تھا ادبی اور لسانی حیثیت سے نہ کسی تاریخی حیثیت سے محفوظ رہ جاتا۔

اس مقالے کو جانچنے کے لیے تین ممتحن مقرر ہوئے۔ ایک تو خود رشید احمد صدیقی تھے۔ دوسرے مگر اس حسرت موہانی تھے۔ ایک اور ممتحن ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔ ان کو ممتحن اس بنا پر مقرر کیا گیا تھا کہ انہوں نے ایک یورپین ملک سے پی ایچ ڈی کیا تھا اور بیرونی ملکوں میں پی ایچ ڈی کے مقالوں کے لیے جو قاعدے قانون تھے ان سے وہ گزر چکے تھے۔

جب زبانی امتحان کا وقت آیا تو ابوالیث کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ وہ انہیں لینے اسٹیشن جائے۔ وہ ٹرین آنے سے پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹرین نے پلیٹ فارم کے پاؤں پکڑے تو حسرت موہانی اپنی روایت کے مطابق تھوڑا کلاس کے ڈبے سے برآمد ہوئے۔ ان کا بوریا بستران کے ساتھ تھا جس کے ساتھ ری سے ایک لونا بھی بندھا ہوا تھا۔ تعارف کی ضرورت یوں پیش نہیں آئی کہ حسرت موہانی اسے کانپور اور بدایوں میں دیکھ چکے تھے۔

وہ ریل سے اترے اور پیدل یونیورسٹی تک گئے۔ اصرار کے باوجود اس وقت کی علی گڑھ کی واحد محبوب سواری ”کیے“ کا سفر قبول نہیں کیا۔ راستوں سے وہ واقف تھے کیوں کہ یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ ویسے بھی مشاعروں وغیرہ میں آتے رہتے ہوں گے۔

زور صاحب حیدر آباد سے سیکنڈ کلاس میں تشریف لائے۔ انہیں لے کر وہ رشید احمد صدیقی کے مکان تک گیا اور گھر چلا آیا یہ بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ جس طالب علم کا آپ امتحان لینے آئے ہیں وہ میں ہی ہوں۔

اگلے دن صبح شعبہ اردو میں صدر شعبہ کے دفتر میں (رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو تھے) اس کا زبانی امتحان ہوتا تھا۔ اس دفتر کا حال یہ تھا کہ درمیان میں ایک دفتری میز پڑی رہتی تھی اور اس کے ساتھ ایک کرسی جو بظاہر صدر شعبہ کے لیے تھی لیکن رشید صاحب شاذ ہی اس کرسی پر نظر آتے تھے۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی کمرے کے ایک کونے میں ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک اسٹول پر نیل فین رکھا ہوتا اور نیچے ایک اگال دان۔ یہی رشید صاحب کی نشست تھی۔ صدارتی کرسی پر عموماً وہ نیاز مند بیٹا جہاں رشید صاحب کی طرف سے دفتری کام انجام

میری کی صنف کے بیان میں شعرائے لکھنؤ کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ایک باب ہرزہ گوئی پر بھی لکھا۔ مقصد یہی تھا کہ لکھنوی شاعری میں جو کچھ لکھا گیا اسے تاریخی طور پر محفوظ کر لیا گیا لیکن اس کی یہ محنت رائیگاں چلی گئی۔

اس نے مقالے کی تکمیل کے وقت نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن شروانی سے بھی مشاورت کی۔ نواب صاحب نے یہ دونوں حصے قلم زد فرمادیے۔ اس لیے نہیں کہ یہ غلط تھے بلکہ اس کی توجہ پیش کرتے ہوئے فرمایا۔ ”بات ٹھیک تھی مگر یہ اس کے اظہار کا کل نہیں۔ تم مناظرے میں کیوں پڑتے ہو۔ خدا معلوم ممتحن کون ہو، کس مسلک کا ہو اپنے خلاف علمی محاذ کیوں بناتے ہو۔“

وہ ابھی طالب علم تھا۔ نواب صاحب سے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ڈراگ تھا کہ کہیں ڈگری ہی کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔ یہ خیالات پھر کسی وقت کسی تصنیف میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اس نے ایسے تمام حصے قلم زد کر دیے۔ یہ حوالے اس نے بڑی محنت سے جمع کیے تھے۔ وہ سب ضائع ہو گئے۔

نواب صاحب کی منتطیق طبیعت کو ہرزہ گوئی کی ثقالت بھی برداشت نہیں ہوئی۔ انہوں نے اسے بھی اصل مقالے سے خارج کر دیا۔ ”میاں یہ تو گالیاں ہیں۔ ادب کے نام پر کیا گالیاں بھی لکھو گے۔“

اگر یہ باب مقالے میں شامل ہو جاتا تو تاریخ کا ایک اہم گوشہ رقم ہو جاتا اور اس مقالے کی دلچسپی اور انفرادیت میں بھی اضافہ ہوتا۔ یہ سرمایہ بھی جو اس نے بڑی مشکل اور محنت سے جمع کیا تھا ضائع ہو گیا۔

اسے اپنی محنت کے اس طرح ضائع ہونے پر بہت دن افسوس رہا چنانچہ اس نے اپنی خودنوشت میں لکھا۔

”اب سوچتا ہوں کہ اس صنف کے نمونے ہماری کسی ادبی تاریخ میں نہیں ملتے۔ جب ہم نے ”چرکین“ کے دیوان کی اشاعت قبول کر لی۔ کلیات اس مرتب کر ڈالی۔ جان صاحب کا دیوان ایسا محیفہ بن گیا کہ لغت کی کتابوں میں اس سے سندیں اخذ ہونے لگیں تو پھر ہرزہ گوئی کے نمونے محفوظ رکھنے میں کیا تامل تھا۔ آخر گالیاں بھی تو ہماری لغت کا جزو ہیں۔ گالی سے بھی زبان کے ذریعے سے قوم کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کی شرافت کے معیار کا تعین بھی ہوتا ہے۔“

دیتا تھا۔

وہ رشید صاحب کے دفتر میں ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ پہلے قادری صاحب پہنچے پھر حسرت موہانی بھی آگئے۔ قادری صاحب نے بیٹھتے ہی رشید صاحب سے کہا۔ اب امیدوار کو بھی بلا لیجئے تاکہ کارروائی شروع ہو۔ رشید صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ موجود ہیں۔“

”امیدوار یہ ہیں؟“ قادری صاحب نے حیرانی سے

پوچھا۔

”جی ہاں امیدوار میں ہی ہوں لیکن آپ کو اتنی حیرت کیوں ہوئی۔“ ابواللیث نے کہا۔

اب قادری صاحب کو مزید حیرت ہوئی۔ فرمانے لگے۔ ”آپ کے مقالے کا موضوع اور لکھنے کا اسلوب دونوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا تھا کہ اردو پڑھانے والے استادوں کی طرح عام سی ہست ہوگی۔ چہرے پر داڑھی کا نور، میلی کھلی شیردانی، سر پر ٹوپی۔ علی گڑھ کے ہیں تو ترکی ہو گی۔ کناروں پر میل جما۔ منہ میں پان، ہونٹوں اور ہانچوں سے پیک کے چھیننے اڑاتے ہوئے لیکن آپ تو اردو کے استاد سے زیادہ مسٹر معلوم ہوتے ہیں۔“

بہر حال قہقہوں کے بعد زبانی امتحان کا مرحلہ ہوا۔ قادری صاحب نے کم لیکن حسرت موہانی نے بہت تفصیل سے امتحان لیا اور کامیابی کا مژدہ اسی وقت سنا دیا۔

یہ علی گڑھ سے ملنے والی اردو کی پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری تھی جو 1941ء میں عطا ہوئی۔ یونیورسٹی نے اس مقالے کی اشاعت کا ذمہ لیا اور طباعت کی مد میں پانچ سو روپے کی مالی امداد دے کر اسے یونیورسٹی کی مطبوعات کے سلسلے میں شائع کیا۔

”طباعت پر اس وقت بھی پانچ سو روپے زیادہ رقم صرف ہوئی۔ وہ کیسے پوری ہوئی اس میں مجملہ اور حضرات کے سر عبدالقادر کی اعانت بھی شامل تھی۔“

”انہوں نے مقالہ شائع ہونے پر میری بڑی ہمت افزائی فرمائی اور تعریف کا ایسا غلغلہ لکھا جس کا نہ میں اس وقت مستحق تھا نہ اب ہوں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بھی بڑی شفقت فرمائی اور اپنے تبرع سے میری حوصلہ افزائی کی۔“ (ابواللیث صدیقی)

اس وقت سے لے کر اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آج بھی یہ حوالے کی مستند کتاب

کے طور پر جامعات کے نصاب میں شامل ہے بلکہ یہی کتاب اس کی شہرت اور پہچان سمجھی جاتی ہے۔

اس کتاب کی پہلی اشاعت 1944ء میں ہوئی۔

اس کا عظیم سے نمٹنے کے بعد وہ اپنے پرانے ذوق

یعنی لسانیات کی طرف متوجہ ہوا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔

یہ شوق جنون اور دیوانگی میں تبدیل ہو گیا۔ ہندوستان میں رہ

کر اس شوق کی تکمیل کے لیے ذرائع نہ ہونے کے برابر

تھے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ انگلستان جائے گا۔ اس نے

لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز سے خط کتابت شروع

کر دی۔ خیال تھا کہ یونیورسٹی سے تعلیمی رخصت مل جائے

گی۔ تعلیمی رخصت کے دوران میں اسے نصف تنخواہ مل سکتی

تھی۔ اس وقت تنخواہ تین سو نوے روپے ماہوار تھی۔ گویا کم و

بیش دو سو روپے مل سکتے تھے۔ اس میں کچھ رقم اہل و عیال

کے لیے چھوڑنا تھی اور باقی میں لندن میں گزارہ کرنا تھا۔

جب انگلستان میں داخلے کی امید بندھ گئی تو اس نے

تعلیمی رخصت کی درخواست دے دی۔ یہ کوئی انوکھی بات

نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ تعلیمی رخصت پر گئے

تھے۔ انوکھی بات یہ تھی کہ اردو کا آدمی اردو کی اعلیٰ تعلیم کے

لیے لندن جانا چاہتا ہے۔ انتظامیہ کو حیرت تھی کہ لندن میں

اردو کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے کیا معنی۔ درخواست نام منظور ہو

گئی۔ اعتراض یہی تھا کہ آپ کا مضمون اردو ہے لندن کا

اس مضمون سے کیا تعلق؟ اس نے سمجھانے کی کوشش کی کہ

اس کا مقصد اردو کے کسی شاعر پر تحقیق یا تنقید نہیں۔ میں تو

لسانیات کی تعلیم کے لیے جانا چاہتا ہوں۔

”اردو کے تعلق اور پس منظر اور مسائل کو سامنے رکھ

کر لسانی مطالعے کا آغاز ہمارے یہاں نہیں ہوا۔ اس سے

آگاہی لندن جا کر ہی ہو سکتی ہے۔ واپس آکر میں اردو پر

بہت کام کر سکتا ہوں۔“

اس کی یہ بحث بے کار گئی۔ کوئی یہ سمجھنے کو تیار ہی نہیں

تھا کہ لسانیات کا مفہوم کیا ہے اور بہ حیثیت ایک مستقل اور

الگ مضمون کے اس کی افادیت کیا ہے بلکہ یہ ماننے کو تیار

ہی نہیں تھے کہ یہ کوئی الگ مضمون ہے۔

وہ دل برداشتہ ہوتا تھا۔ مایوس ہونا اس نے سیکھا ہی

نہیں تھا۔ لسانا اسے آتا ہی نہیں تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ کی

طرف سے دل برداشتہ ہونے کے بعد وہ اس وقت کے

ڈاکٹر چائسلر نواب محمد اسماعیل خان کے پاس پہنچ گیا۔ نواب

صاحب خاندانی آدمی تھے۔ نواب اعظم خان کے بیٹے اور

نواب شیفت کے پوتے تھے۔ اپنے عہدے کو بالائے طاق رکھ کر نہایت شفقت سے پیش آئے۔ نہایت اطمینان سے اس کی پوری بات سنی۔ وہ انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے نہ صرف مدد کا وعدہ کیا بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ تعلیمی اخراجات کے سلسلے میں بھوپال کے عبید اللہ ٹرسٹ سے بھی مدد دلانے کی کوشش فرمائیں گے۔

اسی سلسلے میں وہ کرنل حیدر خان سے بھی ملا۔ وہ فورا جنگ قسم کے آدمی تھے۔ کیمیا کے صدر شعبہ تھے اور یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ سنتے ہی فرمایا۔ ”ضرور جاؤ گے دیکھوں گا کون روکتا ہے۔“

ان دونوں حضرات کی کوششوں سے رخصت منظور ہو گئی۔ چھٹی منظور ہوتے ہی اس نے لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخلے کی درخواست بھیج دی۔ اس کے کوائف ہرگز ایسے نہیں تھے کہ داخلہ نہ ملتا۔ داخلہ مل گیا۔

اس کی ان کوششوں میں اتنا وقت ضائع ہو گیا کہ سیاسی حالات نے پلٹا کھایا۔ وہ چنگاریاں جو ابھی دہلی و بلی نظر آرہی تھیں۔ شعلہ بن گئیں۔ پاکستان کے قیام کا اعلان ہو گیا اور ساتھ ہی ملک گیر ہنگاموں کا بازار گرم ہو گیا۔ فسادات پھوٹ پڑے۔ مسلمان ہونا جرم ہو گیا۔ اس نے

38ء میں لکھنؤ کی ملازمت کے دوران میں جو صورت حال دیکھی تھی اور جو تیسرے مشاہدہ کیے تھے اب اس کی عملی شکل نظر آرہی تھی۔ علی گڑھ پر ہندوؤں کی خاص نظر تھی۔ یہ ادارہ سرسید کا قائم کردہ تھا اور سرسید نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس میں جانے سے روکا تھا۔ سرسید ہی وہ شخص تھے جنہوں نے یہ بائبل دہلی کہا تھا۔ ”ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ساتھ رہنا ممکن نہیں“ قائد اعظم بھی علی گڑھ یونیورسٹی کو تحریک پاکستان کا اسلحہ قرار دے چکے تھے۔ تحریک پاکستان میں یہاں کے اساتذہ اور طلبہ کے بھرپور حصہ لیا تھا لہذا اس تحریک کے کامیاب ہوتے ہی نظریہ پاکستان سے اختلاف رکھنے والے علی گڑھ سے بدلہ لینے پر تیار تھے۔

اس انتقام کی پہلی شق تو یہ تھی کہ طلبہ اور اساتذہ کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ کم از کم ہندو مخالفین نے حکومت کو یہ یقین دلایا تھا کہ یہاں بہت اسلحہ ہے جو کسی بھی وقت ہندوؤں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے چنانچہ یہ حکم جاری ہوا کہ تمام اسلحہ تھانے میں جمع کر دیا جائے۔ طلبہ کے پاس ریوالور تک نہیں تھا لہذا لکھ کر دینا پڑا کہ اسلحہ نام کی کوئی چیز

یہاں نہیں۔ چند اساتذہ کے پاس شکار کے لیے ہندو قوں کے لائسنس تھے۔ ایسی تمام ہندو قیں رکھوالی گئیں۔

فسادات کی آگ آہستہ آہستہ پھلتی چلی جا رہی تھی۔ علی گڑھ خطرے میں ہے۔ یہ آوازیں روز بلند ہو رہی تھیں۔

یہ باتیں یونیورسٹی میں ہو رہی تھیں بلکہ ہندوؤں کی انتہا پسند جماعتوں نے آس پاس کے دیہات میں حملے شروع کر دیے تھے۔ رات ہوتے ہی کہیں آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے، کسی طرف سے ہیبت ناک چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ صبح ہوتی تو معلوم ہوتا رات کو حملہ کہاں ہوا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بلوائی کس رات یونیورسٹی کو نشانہ بنائیں۔ طالب علموں کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ تو یہاں

تک کہہ رہے تھے کہ قریبی دیہات میں جا کر بے بس مسلمانوں کی ہم مدد کریں گے لیکن اساتذہ انہیں روک رہے تھے۔ ایک مرحلے پر تو یہ سوچا گیا تھا کہ یونیورسٹی کو بند کر دیا جائے لیکن اس کی مخالفت کی گئی۔ اس طرح حملے کا خطرہ اور بھی بڑھ جاتا البتہ یہ طے کیا گیا کہ گشت پارٹیاں بنائی گئیں اور طلبہ سمیت سب کو ہدایت کی گئی کہ راتوں کو جاگ کر پہرا دیا جائے۔ ابواللیٹ نے بھی یہ دعوہ بنا لیا کہ بیوی بچوں کو لے کر عثمانیہ ہوشل چلا جاتا۔ مگر ان اعلیٰ کے دفتر میں بچوں کو

سلاتا اور دونوں میاں بیوی ہوشل کی چھت پر پہرا دیتے۔ عجیب ون تھے عجیب حالات۔ پاکستان بن چکا تھا اور وہ لندن جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ موجودہ حالات میں یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ بیوی بچوں کو ہندوستان چھوڑ کر انگلستان چلا جائے۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ بیوی بچوں کو

پاکستان میں چھوڑ کر خود لندن چلا جائے گا۔ غرض جب لندن جانے کا پورا ارادہ ہو گیا تو اس نے آخری مرتبہ ہدایوں جانے کا ارادہ کیا تاکہ ماں باپ کی قبروں پر آخری مرتبہ فاتحہ پڑھ لے۔ فسادات ختم گئے تھے لیکن نفرتیں ابھی تک قائم تھیں۔ ٹرین کا سفر خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ڈبے میں جو ہندو بیٹھے تھے وہ مسلمانوں کو کھلم کھلا کالیاں دے رہے تھے۔ ہر گالی کے بعد کہتے اوسلے (مسلمان) پاکستان بن گیا تو ابھی تک یہاں ہے کیا ہم تجھے وہاں پہنچا دیں۔

ان خطروں سے بڑتا ہوا وہ بریلی گیا اور وہاں سے ہدایوں۔ اپنے باپ کا گھر دیکھا قبروں پر فاتحہ پڑھی اور عزیز واقارب سے ملنے کے بعد علی گڑھ آ گیا۔

بیوی بچوں کو پاکستان پہنچانا تھا مگر کہاں پہنچایا جائے اور کس کے پاس چھوڑا جائے؟ وہ طالب علمی کے زمانے

میں ایک مرتبہ لاہور آیا تھا۔ وہاں کون ہے۔ اس نے غور کیا تو اپنے ایک شاگرد صابر علی خان کا نام یاد آیا۔ علی گڑھ کے بہت سے احباب کوئٹہ میں تھے۔ اس نے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ پہلے لاہور جایا جائے اور وہاں سے کوئٹہ۔ بیوی بچوں کو کوئٹہ میں چھوڑ کر خود لندن چلا جائے گا۔ اس نے صابر علی خان کو خط لکھ دیا اس خط کا جواب بھی آگیا۔

اس وقت جہاز کی نشستیں ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ یہ کام بھی ایک صاحب کے ذریعے آسان ہو گیا۔ رحم علی الہامی جو ایک زمانے میں علی گڑھ کے شعبہ صحافت سے وابستہ رہے تھے۔ ان دنوں دلی میں تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکریٹری تھے۔ ان سے رابطہ کیا انہوں نے نشستوں کا انتظام کر دیا۔ جہاز میں کتنا سامان جاسکتا تھا جولا کہتے تھے لائے باقی وہیں چھوڑنا پڑا۔

درد و یار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

جہاز کا انتظام ہونے کے بعد علی گڑھ سے دہلی تک ٹرین سے سفر کرنا تھا۔ یہ سفر اس طرح طے کیا گیا کہ بیوی نے ہندو عورتوں کی طرح ساڑی باندھی۔ ماتھے پر بندیا لگا کی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ راستے بھر کچھ نہ بولیں۔ ایسا نہ ہو کہ بلوائیوں پر ان کے مسلمان ہونے کا راز کھل جائے۔ پانچ بچے ساتھ تھے ان سے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ خاموش رہیں۔ بیوی کو زنا نہ ڈبے میں سوار کر کے خود مردانہ میں آگیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹرین چلنے اور دہلی تک پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

خدا خدا کر کے دہلی کے خوش میں نہایا ہوا چہرہ دکھایا۔ چاروں طرف پاکستان سے آنے والے شہر تہیوں (سکھوں) کے ریلے تھے۔ کرپائیں اور سکھارین ہوا میں لہراتے بھر رہے تھے۔ میاں بیوی اور پانچ بچوں کا چھوٹا سا قافلہ ڈراسہا "پالم" کے ہوائی اڈے تک پہنچ گیا جہاں سے ہوائی جہاز کو روانہ ہوتا تھا۔ یہاں عجیب نفساٹسی کا عالم تھا۔ ہر طرف رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آرہے تھے۔ جانے والے آپس میں گل گل مل کر رو رہے تھے۔ جانا نہیں چاہ رہے تھے مگر جا رہے تھے۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ روکنا بھی تو کس امید پر۔ ہر طرف سامان بکھرا پڑا تھا اور تلاشی ہو رہی تھی۔ اس کی باری آئی تو سامان مقررہ وزن سے زیادہ نکلا۔

ماہنامہ سرگزشت

"ہم زائد محصول ادا کرنے کو تیار ہیں۔"

"نہیں جو سامان زیادہ ہے وہ بیٹیں چھوڑ دو۔ یہ احسان کیا کم ہے کہ تم کو یہاں سے صحیح سلامت جانے دے رہے ہیں۔"

ایک اور صاحب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"لاہور چل رہا ہے تم کیا وہاں تماشا دیکھنے جا رہے ہو۔"

اب ان سے یہ بحث کون کرتا کہ ہم اپنے مذہب اور تہذیب کی حفاظت کے لیے پاکستان جا رہے ہیں۔ خون کا دریا پار کر کے جا رہے ہیں۔ جتنا سامان کم کیا جاسکتا تھا کیا۔ حکم ہوا تو ہوائی جہاز میں بیٹھے۔

صابر علی خاں کو خط پہلے ہی لکھ دیا گیا تھا۔ انہیں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہ ایک دن کا وقفہ دے کر کوئٹہ کے لیے ٹکٹ خرید کر نشستیں محفوظ کر لیں۔

جہاز لاہور کے ہوائی اڈے پر اترا۔ صابر علی خاں استقبال کے لیے موجود تھے۔

یہاں کا حال بھی دہلی سے مختلف نہ دیکھا۔ یہ سوچے بغیر کہ لے پنے قافلے کس مشکل سے جان بچا کر یہاں تک پہنچے ہیں ان کے ساتھ ہنگ آمیز سلوک ہو رہا تھا۔ کشم ہال میں اسے سامان کھولنے کو کہا گیا۔ آدھا سامان پہلے ہی "پالم دہلی" کے ہوائی اڈے پر چھوڑ آیا تھا۔ اب بچا ہی کیا تھا۔ اس میں بھی انہیں ایک برائریڈیو نظر آگیا۔

"اس پر ڈیوٹی لگے گی۔"

"کس قانون کے مطابق۔"

"ہم سے زیادہ قانون جانتے ہو۔"

"میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر ہوں۔"

"پھر بھی ہم رعایت نہیں دے سکتے۔ ڈیوٹی تو آپ کو دینا ہی ہوگی۔"

"یہ ریڈیو میرے ذاتی استعمال کا ہے اور دس سال پرانا ہے۔"

"ہم نے آپ سے اس کی عمر نہیں پوچھی۔ پرانا ہے اسی لیے تو کم ڈیوٹی مانگ رہے ہیں۔"

اس نے سمجھ لیا تھا کہ بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ڈیوٹی ادا کر سکتا تھا لیکن غصہ اتنا تھا کہ ریڈیو ہیں چٹا اور بقیہ سامان دھیں چھوڑ کر نکل آیا۔

اس نے لاہور پہنچے ہی شکر ادا کیا تھا کہ جان بچ گئی ایک نظریاتی مملکت میں آگیا۔ ہمارے ساتھ مہمانوں کی طرح سلوک کیا جائے گا۔ ان مہمان کی تنگنوں کر اس کے

تصورات کو سخت دھچکا لگا تھا۔

وہ رات اس نے اورینٹل کالج کے ہوشل میں گزاری۔ اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ دنیا گول ہے اسے محسوس پھر کر یہیں آنا پڑے گا اور اسی کالج میں خدمات انجام دینی ہوں گی۔

علی گڑھ والوں نے کونڈہ میں بھی اپنی ایک برادری بنا رکھی تھی اس میں مقامی اور مہاجر دونوں تھے۔ پرانے لوگوں میں امتیاز احمد خاں تھے جو اس وقت وہاں ڈائریکٹر تعلیمات تھے۔ دوستوں میں صالح محمد خاں تھے جو ڈپٹی اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ کچھ اور شناسا اور نیاز مند تھے خصوصاً محکمہ زراعت میں بہت سے لوگ تھے۔

صابر علی خاں کا تقاضا تھا کہ دو چار روز ٹھہر جاؤں مگر اسے کونڈہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ کیونکہ اسے لندن کا سفر کرنا تھا اور اس سے پہلے وہ چاہتا تھا کہ بیوی بچوں کے لیے کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لے۔

ایک دن کا وقفہ دینے کے بعد وہ کونڈہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہاں کا ماحول یہاں کے لباس چہرے مہرے سب اجنبی تھے۔ آنکھیں ایسے چہرے دیکھنے کی عادی نہیں تھیں لیکن اس اجنبیت کے باوجود ایک قلبی سکون محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جان کا خوف تھا نہ عزت و ناموس کا۔ سب اپنے تھے۔ سب مسلمان تھے۔ زبان مختلف تھی لیکن دین ایک تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہر دکھ بھول کر یہ خوش طاری ہونے لگی کہ ہم پاکستان میں ہیں ایک نظریاتی مملکت میں ہیں۔ آزاد ملک میں ہیں۔

ریگستانوں کا ایک وسیع سلسلہ پار کرنے کے بعد کونڈہ کا اسٹیشن آیا۔ اسٹیشن پر احباب کی ایک جماعت موجود تھی۔ ان ہی احباب کی مدد سے کونڈہ پہنچنے کے لیے مختصر سادہ کمروں کا مکان مل گیا۔ امتیاز صاحب کی مدد سے بچیوں کا اسکول میں داخلہ بھی ہو گیا انہوں نے اور ان کی حکیم نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اس کے چلے جانے کے بعد اس کی بیوی اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔

اس موقع پر اس کا لندن جانا بہت بڑا امتحان تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا۔ یہ بدایوں یا علی گڑھ نہیں تھا۔ ایک اجنبی شہر میں محض دوستوں کے سہارے بچوں کو چھوڑ کر دیار غیر میں جانا اور وہ بھی کمانے کے لیے نہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہمت ہی کی تو بات تھی۔ بیوی کی تابعداری کو داد دینے کی ضرورت ہے۔ اس نے بھی طعنہ نہیں دیا کہ ہمیں

کس کے سہارے چھوڑ کر لندن جاتے ہو۔ یہیں رہ کر ہاتھ پاؤں مارو۔ پہاڑوں سے جھٹسے نکالو اور ہمارے عیش کا سامان فراہم کرو۔ اس کی خوش دامن، ان کی بڑی بیٹی ایک چھوٹا بچہ اور اس کے دو سالے یہ سب لوگ بھی اس کے سہارے کونڈہ آگئے۔ ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ وہ جون میں یہاں پہنچا تھا اور ستمبر کے آخر تک ہر صورت میں لندن پہنچ جانا تھا۔ بڑی جدوجہد کے بعد اسٹرک لائنز کے جہاز برکیشیا میں جگہ مل گئی۔

اس بحری جہاز کو پکڑنے کے لیے کونڈہ سے کراچی جانا تھا۔

معلوم ہوا اور یائے سندھ میں سیلاب آیا ہوا ہے جس نے کونڈہ کراچی ریلوے لائن اور سڑک کاٹ دی ہے۔ ہوائی سروس شروع نہیں ہوئی تھی۔ سفر ایسا تھا کہ ملتوی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر بروقت کراچی نہ پہنچتا تو جہاز نکل جاتا اور لندن میں داخلے کا وقت گزر جاتا۔ مطلب اس کا یہ ہوتا کہ ایک سال ضائع ہو جاتا۔ علی گڑھ واپس کیا جاتا۔ یہاں بھی کسی نوکری کا امکان نہیں تھا۔ غرض اتنے مسائل تھے کہ جن سے بہ یک وقت نہیں نمٹا جاسکتا تھا۔ وہ اللہ کا نام لے کر کونڈہ سے روانہ ہو گیا۔ ٹرین نے اسے شکار پور اتار دیا۔ آگے راستہ بند تھا۔ فوج امدادی کاموں میں مصروف تھی۔ اس نے ایک فوجی افسر سے ملاقات کی۔ اپنا تعارف کرایا اور سفر کے مقصد سے آگاہ کیا۔ اس پر واضح کر دیا کہ اس کا کراچی جانا کتنا ضروری ہے۔ افسر نے اس کی مجبوری کو سمجھ لیا اور اس کی مدد کا وعدہ کیا۔

”آپ رات یہاں گزار لیں۔ صبح کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ آپ کو کسی نہ کسی طرح سکھر پہنچا دیں گے۔ سکھر سے آگے لائن صاف ہے۔ آپ کو کراچی جانے والی کوئی نہ کوئی ٹرین مل جائے گی۔“

صبح ہوتے ہی وہ افسر جیب لے کر آگیا۔ دور دور تک سڑک بند گئی تھی۔ جہاں تک جیب چل سکتی تھی چلی۔ پھر کچھ سفر کشتیوں میں کچھ پیدل طے کیا۔ مختصر سے راستے نے دن بھر کھالیا۔ شام پانچ بجے کے قریب سکھر پہنچا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا پہلی ٹرین صبح روانہ ہوگی۔ وہ ویننگ روم میں بیٹھا تھا کہ اسے اپنے ایک دوست سراج الحق قریشی کا خیال آیا۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ ان کے ایک عزیز ریلوے میں ٹی ٹی آئی ہیں اور سکھر میں ہیں۔ اس نے اسٹیشن سے ان کا پتہ لیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے قریشی صاحب کا نام لیا اور

ہندوستانی زبانوں کی تدریس کا کام انجام دے رہے تھے۔
گجراتی زبان سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔
الفریڈ ماسٹر سے ان کی تفصیلی ملاقات ہوئی۔
”آپ کو جرمن یا فرانسیسی زبان آتی ہے؟“ مسٹر
ماسٹر نے پوچھا۔

”میں نے جب علی گڑھ میں سال اول میں داخلہ لیا
تھا اس وقت جرمن زبان کا ایک اضافی کورس کیا تھا۔ اب تو
دس میں جملے ہی یاد رہ گئے ہوں گے۔“
”یہ تو ناکافی ہوں گے۔ آپ جرمن یا فرانسیسی میں
سے کسی ایک زبان میں مہارت حاصل کریں اس کے بعد
لسانیات پر کام شروع ہوگا۔“

”میں بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ ہندوستان
پاکستان کے سیاسی خلفشار سے بھی آپ واقف ہیں میں تو
جلد سے جلد کام ختم کر کے واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر زبان
سیکھنے میں دو تین دن بھی ضائع ہو گئے تو مجھے بڑی پریشانی ہو
گی۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔“ مسٹر ماسٹر اٹھ کر
کھڑے ہو گئے۔ ”اب ہماری ملاقات تین مہینے بعد ہوگی۔
اس عرصے میں اپنی فرانسیسی ٹھیک کر لیتا۔“
اس نے فرانسیسی زبان ٹھیک کی اور تین مہینے بعد
لسانیات پر کام شروع ہوا۔

لندن اسکول کی مصروفیات سے جو وقت بچ جاتا وہ
برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی لائبریری میں گزارتا تھا۔
یہاں بھی اس نے اپنا شغل جاری رکھا۔ برٹش میوزیم کے
بالکل سامنے پرانی کتابوں کی دکان تھی۔ اس مکان پر برٹش
میوزیم کے بعض خطوط بھی دستیاب تھے۔ فرسٹ کافائدہ
اٹھا کر اس نے کچھ خطوطات پر مضامین لکھے جو بعد میں
اورینٹل کالج میگزین میں شائع بھی ہوئے۔

☆.....☆

شمالی ہند میں آریائی زبانوں کے ارتقا کے موضوع پر
کام کرنے کے بعد وہ مقررہ وقت پر لندن سے کوئٹہ واپس
آ گیا۔ کام ختم کرنے کے بعد اس نے سوچا تھا کہ وہ یہاں
چند ماہ مزید قیام کرے گا لیکن اہلیہ کی شدید بیماری کا خط
موصول ہوا تو وہ پریشان ہو گیا۔ چند دن ہالینڈ میں اور چند
دن مصر میں گزارنے کے بعد وہ کوئٹہ پہنچ گیا۔ بیوی کی صحت
دیکھ کر مزید پریشان ہو گیا۔ بلوچستان کی شدید آب و ہوا نے
ان کی صحت کو صدمہ دیا تھا۔ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ یہ

اپنا تعارف کرایا۔ ان صاحب کا نام یاسین تھا۔ مل کر بہت
خوش ہوئے اور مردانے میں اس کا بستر لگا دیا۔ وہ اتنا تھکا
ہوا تھا کہ یاسین صاحب سے زیادہ دیر باتیں بھی نہ کر سکا اور
سونے کے لیے لیٹ گیا۔ نماز فجر کے بعد کا کوئی وقت ہوگا
کہ یاسین صاحب گھبرائے ہوئے آئے۔

”لیٹ صاحب بہت بری خبر ہے قائد اعظم کا انتقال
ہو گیا۔“

یہ سننا تھا کہ ایک لمحے کے لیے دماغ ماؤف ہو گیا۔
دونوں خاموش بیٹھے تھے جیسے اب کہنے کو کچھ بھی نہ رہا ہو۔
”لیٹ صاحب! اب اس نوزائیدہ مملکت کا کیا ہے
گا۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ ابھی تو پاکستان اپنے
پہروں پر بھی کھڑا نہیں ہو سکا ہے۔ ابھی تو اس عظیم قیادت کی
ضرورت تھی۔ قائد اعظم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میری
جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ یہ کھوٹے سکے کتنے دن اس
مملکت کو چلائیں گے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ جس اللہ نے اس
ملک کو بنایا ہے وہی اسے چلائے گا۔ اے اللہ تو میرے ملک
کی مدد کرنا۔“

دونوں اس خلا کے پیدا ہو جانے کے بعد کے حالات
پر گفتگو کرتے رہے۔

یاسین صاحب نے اسے کراچی جانے والی ٹرین میں
سوار کر دیا۔ ٹرین میں بھی فضا سوگوار تھی۔ ہر شخص کی زبان
پر یہی باتیں تھیں وہ کراچی اسٹیشن پر اترا تو ہو کا عالم تھا نہ قلی نہ
مزدور، نہ رکشا نہ وکٹوریہ۔ خوش قسمتی سے ٹرین میں ایک
صاحب سے دوستی ہو گئی جو ریلوے ملازم تھے۔ اس نے
اپنا سامان ان کے یہاں چھوڑا اور پیدل اسی طرف چل پڑا
جدھر ہر شخص قائد اعظم کے آخری دیدار کے لیے جا رہا تھا۔
اگلے دن وہ جہاز پر سوار ہوئے کے لیے بندرگاہ پہنچ
گیا۔

☆.....☆

داخلے کا انتظام پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب وہ لندن میں
تھا۔ اب اسے لسانیات پر کام کرنے کے لیے موضوع کا
تعیین کرنا تھا۔ اس نے شمالی ہند میں ”ہند آریائی زبانوں کا
ارتقا“ کا موضوع یونیورسٹی کے سامنے پیش کیا۔

انہیں مسٹر ماسٹر کے ساتھ مل کر کام کرنا تھا۔ یہ
صاحب دراصل انڈین سول سروس کے جینشن یافتہ افسر تھے
اور اس زمانے میں جزوقتی طور پر لندن یونیورسٹی میں

فارسی شیعہ میں ملا ہوا تھا۔ اردو پڑھانے والے مستقل اساتذہ میں صرف طاہر فاروقی تھے۔ سید عبداللہ شیعہ فارسی میں استاد تھے اور اردو بھی پڑھاتے تھے۔ باقی اساتذہ کالج سے باہر کے تھے اور جزوقتی یا اعزازی طور پر آتے تھے۔ ابواللیث کے بعد ڈاکٹر عبارت بریلوی، سید وقار عظیم اور شرف انصاری بھی آگئے اور یوں چہار ورثہ اس کالج میں جمع ہو گئے۔

یہ سکون ملنے کے بعد اس نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کرایا اور بیوی بچوں کو کوئٹہ سے لاہور لے آیا۔ ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ کے بعد اس کالج میں رہتے ہوئے اس کی دو اہم تصنیفات سامنے آئیں۔ ”جرات ان کا عہد اور شاعری“ اور ”نظیر اکبر آبادی، ان کا عہد اور شاعری“۔

اس کے دل میں اور نہ جانے کیا کیا ارمان تھے جو وہ تصنیفی دنیا میں رہ کر نکالنا چاہتا تھا کہ بعض احباب نے اسے پیشہ دارانہ سیاست میں گھسیٹ لیا۔ جہاں اس سے محبت کرنے والے موجود تھے وہیں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے اس کی معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ جن لوگوں سے معرکہ آرائی ہوئی ان میں سرفہرست ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی تھے۔ وہ بھی دہنے والا کہاں تھا۔ خوب خوب جھڑپیں ہوئیں۔ پے در پے ایسے واقعات ہوئے کہ وہ کبیدہ خاطر رہنے لگا۔

یہ جنگ اس وقت طول پکڑ گئی جب پنجاب یونیورسٹی میں ایک پروفیسر کی تقرری کا مسئلہ تھا۔ اُمید واردو تھے ایک سید عبداللہ اور دوسرا وہ خود یعنی ابواللیث صدیقی۔ اس اسامی کے لیے وہ خود کو جائز حق دار تصور کرتا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ تقرری اسی کی ہوگی لیکن تقرری سید عبداللہ کی ہو گئی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر وحید قریشی کے نام سے ”لکھنؤ کا دبستان شاعری“ پر ایک طویل تنقیدی مضمون سہمی کے ایک رسالے میں شائع ہوا اور اس کے نسخے پاکستان میں تقسیم کیے گئے۔

ابواللیث کو یہ گمان تھا کہ یہ تنقیدی مضمون سید عبداللہ نے تحریر کیا ہوگا اور وحید قریشی کے نام سے شائع کرایا گیا یا کم از کم ان مضمون کی تیاری میں سید عبداللہ نے مدد کی۔

وہ ان سب باتوں کو ذاتی لڑائی سمجھ کر بھلا بھی سکتا تھا لیکن بعض باتیں ایسی ہوئیں جنہیں وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تمام عمر اردو کی توسیع و ترقی کے لیے گزاری تھی

کمزوری ہی ان کی بیماری تھی۔ ضروری تھا کہ ان کی آب و ہوا تبدیل ہو۔ اب سوال یہ تھا کہ کہاں جائے۔ وہ علی گڑھ سے تعلیمی رخصت پر لندن گیا تھا۔ چاہتا تو علی گڑھ واپس جاسکتا تھا۔ رشید احمد صدیقی ریٹائر ہونے والے تھے۔ ان کے بعد دوسرا نمبر اس کا تھا۔ یہ کھٹکا بھی نہیں تھا کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ تعلیم و تدریس کہیں اور رہتی نہ رہتی علی گڑھ میں ضرور رہتی۔ اس کے ذاتی مستقبل کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ہندوستان میں اس کی نسلوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ انگریزوں کی غلامی سے تو آزادی مل گئی مگر اب کیا ہندوؤں کی غلامی میں رہتا ہوگا۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ یہاں کی قومی زبان اردو ہوگی۔ یہاں اردو کے اساتذہ کی ضرورت بھی ہوگی اور گنجائش بھی، کام کرتے ہوئے یہ احساس بھی ہوگا کہ ہم اپنے وطن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان میں رہ جائے۔ علی گڑھ چھوڑ دے۔ وہ سر عبدالقادر سے مشورہ کرنے کے لیے لاہور گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں اور ملاقاتیوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ وہ ملاقات کے لیے گیا تو بیوی شفقت سے اندر بلوا لیا۔ مشورہ بلکہ حکم دیا کہ ہندوستان جانے کی کوئی ضرورت نہیں یہیں رہ جاؤ۔ اس وقت کام کرنے والوں کی ضرورت ہے اور تم کام کے آدمی ہو یہاں ایسے لوگوں کی بہت ضرورت ہوگی جو اردو کے لیے کام کریں۔

وہ مولانا صلاح الدین (ادبی دنیا والے) سے بھی ملا۔ وہ اردو کے مشاقت زار میں سے ایک تھے۔ انہوں نے بھی سر عبدالقادر کے مشورے کی تائید کی اور مجبور کیا کہ وہ یہیں رہ جائے۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین خان علی گڑھ میں وائس چانسلر ہیں۔ ذاکر حسین خاں سے اس کے تعلقات اچھے نہیں رہے تھے۔ اس لیے اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ان کی موجودگی میں وہ علی گڑھ چلا جائے۔ ان سب باتوں کی موجودگی میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان میں رہ جائے گا اور اپنی روزی یہیں تلاش کرے گا۔

انہی دنوں ایک اسامی مشعیر ہوئی جس کے جواب میں اسے پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں سینئر لیکچرر کی حیثیت سے وابستہ کر لیا گیا۔

کالج کا شعبہ اردو اس وقت صرف کانڈی شعبہ تھا اور

لیکن اب اس کی ناقدری کے جلوے سامنے آرہے تھے وہ ایسے ناقدروں کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشرقی علوم کے سخت مخالف تھے۔ انہی محفلوں میں اکثر کہتے سنائی دیتے تھے۔ ”یہ علوم مرچکے ہیں۔ ان کو دفن کر دیجیے۔“

ان کے حاشیہ نشیں ان سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہیں خوش کرنے کے لیے اور نیشنل کالج اور اس کے اساتذہ کو تضحیک و تذلیل کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ انہی دنوں اس نے ایک مضمون ایک تقریب میں پڑھا۔ یہ مضمون غزل کے موجودہ رجحانات سے بحث کرتا تھا۔ اس مضمون میں ضامن تقسیم ہند، فسادات، ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی قربانیاں اور قیام پاکستان کے بعد کی صورت حال کو بیان کیا گیا تھا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ ان حالات کی روشنی میں غزل کے موجودہ رجحانات پر بحث کرنا تھی۔

اس نے تو صرف حقیقت کی ترجمانی کی تھی۔

”آج بھی قافلے پہلے کی طرح بھٹکتے ہیں۔ آج بھی راہی حیران ہیں۔ افلاس، بھوک، بیماری اور جہالت کے طوق ایک آزاد ملک کے آزاد فرزندوں کی گردنیں اپنے بوجھ سے جھکا رہے ہیں۔ عدل و انصاف کے الفاظ آج بھی شرمندہ معنی نہیں۔ یقیناً یہ وہ منزل نہیں جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ وہ منزل ابھی دور ہے۔ یہ وہ صبح نہیں جس کا انتظار تھا۔ وہ صبح ابھی دور ہے لیکن اُفق کی تاریکی میں دور سے کچھ کرنیں پھوٹی نظر آتی ہیں اور قافلہ اسی طرح رواں دواں ہے۔“

اس نے حقائق کی ترجمانی کی تھی لیکن مایوسی کا اظہار نہیں تھا۔ اسے اندازہ چلے میں کرنیں پھوٹی نظر آ رہی تھیں لیکن اسے اس کی وطن محسوس بھی لایا گیا یا جان بوجھ کر اس کے خلاف محاذ بنانے والوں نے یہ موقع تلاش کر لیا۔ اتنی سخت مخالفت ہوئی کہ اس کا جی اچانک ہو گیا۔

کراچی یونیورسٹی میں ریڈر کی اسامی مستعبر ہوئی تھی۔ اس اسامی کے لیے دو امیدوار تھے ایک ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور دوسرے ابواللیث۔ انٹرویو ہوا اور ابواللیث کی تقریری عمل میں آئی۔ یونیورسٹی اس زمانے میں بلاک وائرہ میں تھی۔

اس نے لاہور کے ماڈل ٹاؤن میں رہنے کا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ ایک موٹر سائیکل خرید لی تھی جس سے وہ یونیورسٹی آتا جاتا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ اب وہ مستقل قیام لاہور میں کرے گا لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ کراچی جانا پڑا۔ گھریا

چھوڑ کر کراچی جانا آسان نہیں تھا۔ اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد ایک ٹھکانا ملا تھا۔ اس کی بیوی کو تو لاہور سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ لاہور چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ کراچی میں قدم جماتے جماتے دیر لگ سکتی تھی۔ اس نے بیوی بچوں کو لاہور میں چھوڑا اور اکیلا کراچی آ گیا۔ انسان جب ہمت کر لیتا ہے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ علی گڑھ کے ایک رفیق کار سے ملاقات ہو گئی۔ کچھ دن ان کے ساتھ رہا۔ کراچی کی سڑکوں پر ہی اس کی ملاقات ابن انشا سے ہو گئی اور وہ ان کے کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ بعد میں وہ پاپوش نگر کے ایک مکان میں رہنے لگا۔

اس وقت شعبہ اردو میں کوئی مستقل استاد نہیں تھا۔ شعبہ اردو کا وجود صرف انتظامی تھا۔ ابواللیث کے آنے کے بعد شعبہ قائم ہوا اور مستقل اساتذہ کا تقرر ہوا۔

وہ جہاں جاتا تھا نئے دوست بنا لیتا تھا۔ طبیعت میں نیاز مندی تھی لہذا بزرگ بھی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ مولوی عبدالحق سے قربت نصیب ہوئی۔ پھر حسام الدین راشدی سے تعارف ہوا اور پھر قربت بڑھتی چلی گئی۔ ڈاکٹر عہاد الرحمن خان تو یونیورسٹی ہی میں تھے۔ ڈاکٹر عہاد الرحمن خان علی گڑھ میں شعبہ جغرافیہ کے پروفیسر اور صدر تھے۔ علی گڑھ سے آنے کے بعد یہ پہلی ملاقات تھی جو ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ڈاکٹر بشیر احمد ہاشمی وائس چانسلر تھے۔ یہ بھی علی گڑھ کی برادری سے تھے۔ کچھ دنوں تک تو ابواللیث کو یہی معلوم ہوتا رہا کہ وہ علی گڑھ میں ہے۔ اس نے یونیورسٹی کی بہتری کے لیے وائس چانسلر کو ایک تجویز پیش کی۔ ”ہم دوران تعلیم اپنے بہترین طلبہ کا انتخاب کریں اور ان کو اپنے شعبوں میں پوری توجہ سے تربیت دیں۔“

”آپ کی یہ تجویز اچھی ہے لیکن اس کے لیے ہمیں اسٹاف کی کمی کا سامنا ہوگا۔“

”اس کے لیے مددگار پروفیسر مقرر کیے جاسکتے ہیں۔“

انہوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور مختلف شعبوں میں اس طرح کے زیر تربیت مددگار مقرر ہو گئے۔ اس کی درخواست پر انہوں نے شعبہ اردو کے لیے فرمان فتح پوری کو مقرر کر دیا۔

یہ منصوبہ بھی تک پہنچا تھا کہ اسے نیویارک کی کولمبیا

چند اہم قومی کام

- 1- حکومت پنجاب کی طرف سے 1952ء میں اسکرپٹ کمیٹی کے کنویز مقرر کیے گئے۔ اردو اسکرپٹ رموز و اوقاف وغیرہ پر ایک رپورٹ تیار کی اور سرکاری تحریروں میں شامل کرنے کے لیے اپنی سفارشات پیش کیں۔
- 2- 1976ء میں ترقی اردو بورڈ کے معتمد اور پھر لغت کے مدیر اعلیٰ بنے۔ لغت کی چھ جلدیں شائع کیں۔
- 3- اردو ٹائپ رائٹر کا کلیدی تختہ (کی بورڈ) تیار کیا۔
- 4- ترقی اردو بورڈ کے لیے ایک ایسا کی بورڈ تیار کیا جو سندھی اور پشتو میں بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔
- 5- مرکزی اردو بورڈ لاہور کے لیے اردو کے بنیادی الفاظ پر مبنی ایک لغت تیار کی جس کے تراجم سندھی، پنجابی، فارسی اور ترکی میں شائع ہوئے۔
- 6- مرکزی اردو بورڈ کے ایک منصوبے کے لیے اردو کے نمایاں رسائل کا ابتداء سے 1960ء تک کے عرصے کا اشاریہ تیار کیا۔
- 7- سائنسی ادب کی کتب کا اشاریہ تیار کیا۔
- 8- اردو قواعد کا حصہ "صرف" تحریر کیا۔
- 9- علامہ اقبال کی صد سالہ جوبلی کے لیے لکھی گئی تمام کتب پر نظر ثانی کی اور ترتیب کی خاص کمیٹی کے رکن بھی رہے۔
- 10- پنجاب یونیورسٹی کے منصوبے کے مطابق ہندو پاک کے مسلمانوں کی ادبی تاریخ تحریر کرنے کے لیے جو پلاننگ کمیٹی قائم کی گئی اس کے ممبر رہے۔
- 11- کراچی یونیورسٹی کی جانب سے فرسٹ ٹیچنگ کالفرنس لاہور کے لیے سرکاری نمائندہ مقرر ہوئے۔

یونیورسٹی سے پیشکش آئی اور وہ مطالعہ پاکستان کے وزٹنگ پروفیسر کے طور پر امریکا چلا گیا۔ اس سفر میں وہ بیوی بچوں کو ساتھ لینا نہیں بھولا۔ اس لیے نہیں کہ وہ امریکا میں تنہائی محسوس کرتا بلکہ اس لیے کہ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ بیوی بچوں کو اب تک سکون کا ایک لمحہ بھی فراہم نہیں کر سکا ہے۔ وہ امریکا پہنچا تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان سے مشورہ کیا کہ رہائش کہاں اختیار کی جائے۔ ان کا قیام "بٹر ہال" میں تھا جو کولمبیا یونیورسٹی میں اکثر ویشٹر مہمان پروفیسروں اور ان کے اہل خانہ ان کے لیے مخصوص تھا۔ انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بھی بٹر ہال میں قیام کرے حالانکہ اس سے صرف چند گھنٹے آگے چلے اس سے بہت کم خرچ میں بھی انتظام ہو سکتا تھا۔ اس غیر ملکی میں کسی شناسا سمائے کی موجودگی نعمت سے کم نہیں تھی۔ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اشتیاق حسین قریشی وہاں کے کئی کوچوں سے واقف تھے۔ سستی وکانوں کے پتے جانتے تھے۔ اس کا فائدہ ابواللیث کو تو کم اس کی بیوی کو زیادہ ہوا۔ وہ ان کے ساتھ خریداری کے لیے نکل جاتی۔ حتیٰ کہ نئے دو ہفتوں میں انہوں نے خود خریداری شروع کر دی۔ اشتیاق حسین قریشی کا اکثر وقت کام کے اوقات کے بعد اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ ایک عظیم مورخ ایک عظیم اردو داں بٹر ہال کی تو جیسے تقدیر ہی بدل گئی۔ ابواللیث تو جہاں جاتا تھا اپنے مطلب کے لوگ ڈھونڈ نکالتا تھا۔ اس نے بہت سے احباب بنا لیے۔ کھانے کا وہ شوقین بھی تھا اور کھلا کر خوش بھی ہوتا تھا۔ تھوڑے ہی دن میں اس کا گھر پاکستانیوں کا کلب بن گیا۔ جب بھی کوئی اچھی چیز پکیتی تو احباب کو مدعو کیا جاتا۔ ان میں پاکستانی بھی ہوتے اور علی گڑھ برادری کے لوگ بھی۔ کولمبیا پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد اس کا لسانیات کا شوق پھر عود کر آیا۔ یہاں وقت بھی تھا اور مواقع بھی۔ اس نے طالب علم کی حیثیت سے باقاعدہ داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ لسانیات میں مشینوں کے استعمال سے وہ یہیں واقف ہوا اور واپس آ کر جامعہ کراچی میں لسانیات کی ایک تجربہ گاہ قائم کی جو پاکستان کی واحد تجربہ گاہ تھی۔ یہ دن اس کے آسٹریل دن تھے۔ وہ صبح یونیورسٹی چلا

- 12۔ لینگو سنک ریسرچ گروپ آف پاکستان کے تاحیات ممبر مقرر ہوئے۔
- 13۔ کولمبیا یونیورسٹی میں 59 تا 60ء وزٹنگ پروفیسر رہے۔
- 14۔ سیٹو (بنکاک) میں ماہر لسانیات کی حیثیت سے 61 تا 63ء کام کیا۔
- 15۔ 1965ء میں مغربی جرمنی، ترکی، لبنان اور سعودی عرب کا مطالعاتی دورہ کیا۔
- 16۔ 1968ء میں فیڈریشن آف کامن ویلتھ لندن یونیورسٹی کی جانب سے سینئر فیلوشپ ملی اور لندن آکسفورڈ، کیمبرج اور اسکاٹ لینڈ کی جامعات کے لیکچرر پروگراموں میں شریک ہوئے۔
- 17۔ سعودی عرب کے لیے ثقافتی اور تعلیمی وفد کے رکن مقرر ہوئے۔
- 18۔ 70ء میں امریکن یونیورسٹی آف بیروت (لبنان) میں اعلیٰ تعلیم کے سینار میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد کے لیڈر مقرر ہوئے۔
- 19۔ برکٹ یونیورسٹی کی امریکن اسکالرشپ لین نے ان کی رہنمائی میں اردو زبان میں قانون بیداری کے موضوع پر تحقیقی کام کیا۔
- 20۔ برطانوی کونسل کی درخواست پر باہر سے آنے والوں کے لیے ایک خاص مختصر المیادار دو نصاب تکمیل دیا۔
- 21۔ باہر سے آنے والوں کی تعلیم کے لیے جامعہ کراچی میں اردو کا خاص سمسٹر و بصری نصاب مرتب کیا اور چینی، جاپانی، فرانسیسی اور امریکی دانشوروں کو تعلیم دی۔
- 22۔ مختلف سیمیناروں اور صد سالہ تقریبات میں سرکاری نمائندے کے طور پر شرکت کی۔

☆☆☆

ٹیکسی کچڑی اور ناظم آباد پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ یونیورسٹی ٹانک واڑہ سے نئی عمارت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یہ عمارت کسی ہوگی کہاں ہے، چل کر اسے دیکھنا تو چاہیے مگر کس کے ساتھ جاؤں۔ خیر کل سچ دیکھا جائے گا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے سبجکٹ آفتاب حسن کی آواز آرہی تھی۔ ”مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ کراچی پہنچ گئے ہیں۔“

”اللہ نے خیریت سے پہنچا دیا۔“

”آپ کو شاید معلوم ہو گیا ہو کہ یونیورسٹی نئی عمارت میں تبدیل ہو گئی ہے۔“

”مجھے نہ صرف معلوم ہو گیا ہے بلکہ وہاں جانے کے لیے بے چین بھی ہوں۔“

”پھر کیا خیال ہے کل چلیں۔“

”بھئی جانا تو ہے جوائننگ تو دینی ہے۔“

”تو پھر اسٹےس ہی چلیں گے۔ تین ہفتی سے ایک بس یونیورسٹی تک جاتی ہے۔ آپ وہاں آجائیں میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا۔ وہ وعدے کے مطابق تین ہفتی پہنچ گیا۔ بس نے چلتا شروع کیا تو راستہ نہیں جنگل تھا جس میں بس چل رہی تھی۔ وہ سبجکٹ صاحب سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ وہ

جاتا۔ سہ پہر کو نیویارک کی سیر ہوئی۔ رات کو اکثر و بیشتر لسانیات کی تجربہ گاہ میں کام کرنے چلا جاتا۔ اس وقت بھی اہلیہ اس کے ساتھ ہوتیں۔ دیر گئے وہ ابھی ہوتی۔

اس طرح دن گزر رہے تھے۔ کولمبیا کی زندگی خاصی پرکشش تھی۔ تفریح کے مواقع بھی میسر تھے اور مطالعے اور مشاہدے کے بھی۔ ڈاکٹر قریشی کی قربت بھی نصیب تھی۔ اس کے باوجود طبیعت اکثر ادا اس ہو جاتی تھی۔ ایک سال ہی گزرا تھا کہ پاکستان بہت شہرت سے یاد آنے لگا۔ قریشی صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ دن گئے جانے لگے کہ تعلیمی سال ختم ہوا اور وہ پاکستان جائیں۔

تعلیمی سال کے خاتمے پر دونوں نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ قریشی نے ہوائی جہاز سے جانا پسند کیا جب کہ بچوں کے اصرار پر ابو الیٹ نے بحری سفر کا پروگرام بنایا اور نیویارک سے کون میری میں اپنی نشستیں محفوظ کرا لیں۔

واپسی میں ایک ہفتہ لندن میں قیام کیا۔ اس کے لیے لندن نیا نہیں تھا لیکن اس کی اہلیہ اور بچوں کے لیے یہ بالکل نئی دنیا تھی۔ ایک مرتبہ پھر پارک میوزیم کتب خانے دیکھے۔ لندن سے کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ اس کی ایک بیٹی ناظم آباد میں مقیم تھی۔ اسے فی الحال وہیں قیام کرنا تھا۔ اس نے

اسے کہاں لے جا رہے ہیں کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ یونیورسٹی جا رہا ہے۔“

یونیورسٹی پہنچ کر وہ مزید حیران ہوا۔ کچھ عمارتیں بن رہی تھیں کچھ بن چکی تھیں۔ بجلی نہیں تھی، پانی کے نلکے نہیں تھے۔ سڑکیں اور دوکانیں نہیں تھیں۔ بیمار پڑ جائے تو اسپتال اور ڈاکٹر کیس۔ باہر نکلے تو کیسپس سے نیوٹاؤن تک ویرانا ہی ویرانا۔ یہ بشیر احمد ہاشمی ہی تھے جو یونیورسٹی کو اس نئے کیسپس میں اٹھالائے تھے۔ وہ پریشان ہو رہا تھا کہ روزانہ یونیورسٹی آنا جانا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ اس ویرانے کو آنکھوں میں بسائے ہاشمی صاحب سے ملنے پہنچ گیا۔ وہ اس عمارت میں مقیم تھے جو یونیورسٹی کے مہمان خانے کی نیت سے بنی تھی۔ اس لحاظ سے وہ کیسپس کے تنہا مکین تھے۔ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

”میں تمہاری کمی بہت محسوس کر رہا تھا۔ اچھا ہوا جلدی چلے آئے۔ دو چار دن آرام کر کے جوائن کر لینا۔“

”آرام کیا کرنا۔ میں تو آج ہی جوائن کرنے کو تیار ہوں۔“

”قیام کہاں رکھا ہے۔“

”ابھی تو ناظم آباد میں بنی کے ساتھ ہوں۔ وہیں کرائے پر مکان لینے کا ارادہ ہے۔“

”وہاں سے آنے میں تو بڑی دقت ہوا کرے گی۔“

”دقت تو ہوگی مگر میں نے بڑے بڑے پہاڑ کاٹے ہیں۔ یہ مشکل بھی گزرا ہی لوں گا۔“

”میں اس کیسپس میں بالکل اکیلا رہتا ہوں۔ تم یہاں کیوں نہیں آ جاتے۔ نہ بس کا بھجوت نہ سواری کی تلاش شہر میں مکان لوگے تو کراہی بھی دینا پڑے گا۔“

”اس ویرانے میں رہنے کی ہمت آپ ہی کر سکتے ہیں۔“

”یہ تو سوچو یہاں کی تنہائی میں کیسے گزارنے کی کتنی سہولت مل جائے گی۔“

”میں اگر آ بھی جاؤں تو اہلیہ کو سخت اعتراض ہوگا۔ وہ تو کبھی نہیں آئیں گی۔“

”تم ہامی بھرو۔ ہم سب انہیں بھی منالیں گے۔“

”انہیں لاہور سے ملحق ہے۔ وہاں میں نے گھر بھی بنالیا ہے۔ انہوں نے اگر لاہور چھوڑا بھی تو کراچی کے کسی اچھے علاقے میں رہنا پسند کریں گی۔ اس جنگل میں کیا آئیں گی۔ اب تو وہ امریکا، انگلستان سب دیکھ چکی ہیں۔“

”آپ تو آجائیں پھر وہ بھی آجائیں گی۔ ہم انہیں منالیں گے۔“

وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ وہ ان کی بات کو ایک حد تک ہی چل سکتا تھا، مان تو گیا لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ اس مکان کو دیکھے جو اسے ملنے والا تھا۔ وہ کیسپس کے اس حصے میں گیا جہاں رہائشی مکان تعمیر ہو رہے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر گھبرا گیا۔ کوئی مکان مکمل نہ تھا۔ نہ بجلی نہ پانی نہ سڑک نہ کموڈ کام کرتے تھے۔

”آپ آتو جائیں۔ سڑکیں تو ابھی نہیں بنیں گی لیکن مکان بہت جلد اس حالت میں آجائے گا کہ آپ آرام سے رہیں گے۔“ ہوں نے اتنا اصرار کیا کہ وہ آ گیا۔ وہ اس بہتی کاپیلا مکین تھا۔

1960ء کے آخر میں اس کی اہلیہ بھی لاہور سے کراچی منتقل ہو گئیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یونیورسٹی کی خدمات سے سبکدوشی کے بعد وہ کراچی میں نہیں رہیں گی۔ لاہور والے گھر میں مستقل قیام کریں گی۔

اس کا تقرر ریڈر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ دو سال بعد اسے پروفیسر کا درجہ دے دیا گیا۔

اس کی علیت اور تنقیدی و تحقیقی کاموں کا اعتراف اب ہر جگہ کیا جا رہا تھا۔ غیر ملکی یونیورسٹیاں اس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بے چین تھیں چنانچہ کاسن ویلچر یونیورسٹی کی تنظیم کی طرف سے برطانوی یونیورسٹیوں میں لسانی تحقیق کرنے اور اپنی پسند کی یونیورسٹیوں میں تدریسی اور توسیعی ٹیکچروں کے لیے اس نے فیلوشپ قبول کر لی۔ ایک مرتبہ پھر لندن یا ترائے کے لیے مکر کس لی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بڑی بیٹی زہرہ لندن میں تھی۔ یہ سفر اس سے ملاقات کا بہانہ بھی بن سکتا تھا۔ جب بیٹی اور نواسی وہاں تھیں تو اہلیہ کو لے جانا بھی ضروری تھا کہ وہ بھی بیٹی سے مل لیں گی لہذا لندن کے اس قیام میں بھی اہلیہ ساتھ تھیں۔

اس نے اہلیہ کو بیٹی کے گھر چھوڑا اور خود انگلستان کے مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں کے جائزے کے لیے نکل گیا۔ کسی یونیورسٹی میں لیکچر دینا تھا، کہیں مختصر تدریسی فرائض انجام دینے تھے۔ یہ لیکچر زیادہ تر لسانیات پر ہوا کرتے تھے لیکن کراہے لسانیات سے عشق تھا۔ پاکستان میں اردو کے پروفیسر تو بہت تھے لیکن ماہرین لسانیات اگلیوں پر مئے جاسکتے تھے۔ وہ اپنی اس حیثیت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا چاہتا تھا۔ اس سلسلے کے لاتعداد مضامین شائع ہو چکے تھے۔

دوسرے یہ کہ انگلستان کی یونیورسٹیاں ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کی طلب گار تھیں لہذا اس کے یہ پتھر اسی نوعیت کے تھے۔

ان پتھروں سے ہٹ کر وہ اپنا وقت انڈین آفس لاہور پر اور برٹش میوزیم میں گزارتا تھا۔ اس نے یہاں کے ذخیرے سے استفادے میں دن رات ایک کر دیے۔ وہ چاہتا تھا پاکستان رواجی سے قبل جتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھا لے۔ اس کی یہ محنت آئندہ لکھے جانے والے مضامین و تصنیفات میں نظر آتی ہیں۔ یہاں کی لسانی تجربہ گاہوں میں وقت گزار کر ان جدید آلات کا جائزہ لیا جو لسانی تجربات میں کام آتے تھے۔ واپس آ کر جامعہ کراچی کے شعبہ اردو میں لسانیات کی ایک تجربہ گاہ قائم کی جو پاکستان میں لسانیات کی واحد تجربہ گاہ تھی۔ یہ ایسی معیاری تجربہ گاہ تھی جس کا اعتراف بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین لسانیات بھی کرتے تھے۔

لندن میں قیام طول پکڑتا جا رہا تھا۔ وہ تو اپنے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ اہلیہ کا دل اب بھر گیا تھا۔ واپس جانے کا ابھی دور دور تک امکان نہیں تھا۔ ایک دن وہ گھر پہنچا تو منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔

”آپ تو اپنے تجربات میں اضافے کر رہے ہیں میرے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں۔“
”یہ کام کیا کم ہے کہ آپ میری واپسی کی راہ بھی رہتی ہیں۔“

”مذاق چھوڑیے میرے لیے کوئی کام بتائیے۔“
”یہ تو آپ پر منحصر ہے۔“
”میں یہ کہہ رہی تھی کہ کہیں داخلہ لے لوں اور انگریزی روال کر لوں۔“

”روال کرنا ہے تو انگریزی روال کیجیے آپ انگریزی کا کیا کریں گی۔“
”آپ کی اردو ہی نے تو میری تھوڑی بہت انگریزی کا بیڑہ غرق کیا ہے۔“

انہوں نے ضد کر کے ایک ادارے میں داخلہ لے لیا اور پاکستان واپس آنے تک انگریزی روائی سے بولنے لگیں۔

☆.....☆

حکومت پاکستان کی ایک قرارداد کے ذریعے 1958ء میں ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک ادارہ وجود

میں آیا تھا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ بورڈ کے ذمے آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے طرز پر اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین کی جائے گی۔

باب لغت کا کام شروع ہوا تو مولوی عبدالحق پہلے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ اسامی تقریباً پندرہ سال خالی رہی۔ اس دوران میں یعنی 1976ء میں وہ جامعہ کراچی کی مدت ملازمت مکمل کر کے ریٹائر ہو گئے لیکن ان کی علمی و ادبی خدمات اتنی تھیں کہ ابھی جامعہ کو ان کی ضرورت تھی لہذا انہیں پروفیسر ایمریٹس (پروفیسر تاحیات) مقرر کر دیا گیا۔ اب وہ کچھ وقت دوسرے کاموں کے لیے بھی دے سکتے تھے۔ محنت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ جوانوں سے زیادہ تیز چلتے تھے لہذا اردو بورڈ کی نظر ان پر پڑی۔ لغت کا کام ادھر اڑا ہوا تھا۔ لغت نوٹس کے لیے ان سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ انہیں مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے متعین کر دیا گیا۔ صبح کیمپس سے نکلتے۔ کچھ دیر شعبہ اردو میں آتے۔ انتظامی معاملات دیکھتے کوئی پی ایچ ڈی کا طالب علم انتظار میں بیٹھا ہوتا تو اس کا کام دیکھتے، کچھ مشورے دیتے، اساتذہ آ کر بیٹھ جاتے۔ ان سے خوش گویاں کرتے اور پھر خود ہی ڈرائیونگ کرتے ہوئے اردو لغت بورڈ پہنچ جاتے اور ایسے تروتازہ جیسے ابھی غسل کر کے نکلے ہوں۔ یہاں پہنچ کر بھی عملے کے ارکان سے خوش اخلاقی سے ملتے۔ اراکین کے ساتھ ان کا رویہ نہایت نرم تھا لیکن کام میں کوتاہی قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ طبیعت میں غصہ بہت تھا لیکن وہ ایسے ہی موقعوں پر نکلتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ طلبہ کے لیے ان کے پاس اس غصے کا ایک فیصلہ بھی نہیں تھا۔

جس طالب علم میں ذرا سی بھی قابلیت دیکھتے اسے اکساتے کہ وہ کسی موضوع پر تحقیق کرے۔ جب وہ کام شروع کر دیتا تو ایسے خوش ہوتے جیسے انہوں نے کوئی کتاب لکھ دی ہو۔ طالب علم سے محنت تو خوب کراتے لیکن اس کے وکیل بن کر مقدمہ ایسے لڑتے کہ ڈگری مل کر ہی رہتی۔ مشہور تھا کہ نمرائیں بنالو پھر ڈگری پکی ہے۔ وراصل بات یہ تھی کہ انتظامی معاملات میں ان کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ سب لوگ ان کی عزت بھی بہت کرتے تھے لہذا جب وہ دیکھ لیتے تھے تو مہینوں کا کام ہفتوں میں ہو جاتا تھا۔ محنت کا انتخاب نہایت امتحان کے لیے محنت کو منتخب کرنا، سنڈیکیٹ کی میٹنگ میں ان کاموں کو پاس کروانا جلد سے جلد انٹرویو کا اہتمام کرانا۔ یہ سب بھانگ دوڑ کے کام تھے اور وہ اس

طرح بھاگ دوڑ کرتے تھے جیسے یہ ان کا اپنا کام ہو۔ وہ علی گڑھ کے اساتذہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے جہاں اساتذہ طلبہ کے دوست بن جاتے تھے۔ ان کے استاد رشید احمد صدیقی کا یہی عالم تھا۔ یہی اثرات ابواللیث صدیقی میں آئے تھے۔ عملے کا کوئی آدمی کتنے ہی ضروری کام سے ان کے پاس آیا ہوتا اور کوئی طالب علم آ جاتا تو اس سے معذرت کر لیتے اور کام چھوڑ چھاڑ کر طالب علم کی مشکلات سننے لگتے۔ ان کی اس مہربانی کا میں خود بخوبی شاہد ہوں۔

یونیورسٹی دور بھی اس لیے انہوں نے مجھے یہ اجازت دے دی تھی کہ میں ان سے اردو بورڈ کے دفتر میں مل لیا کروں۔ جو اس وقت ناظم آباد میں تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ کسی کام میں مشغول ہیں یا بورڈ کا کوئی رکن کسی کام سے آیا ہوا ہوتا اور میں پہنچ جاتا وہ اسے کچھ دیر بعد آنے کے لیے کہتے اور میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ بعض نگران طالب علم کی طرف سے لکھے گئے مواد کو پڑھنے میں کئی کئی ہفتے لگا دیتے ہیں جس سے کام میں دیر لگتی ہے۔ طالب علم بے چارہ انتظار کرتا رہتا ہے کہ نگران کی طرف سے پچھلا مواد جانچ لیا جائے تو وہ اگلا باب شروع کرے۔ مجھے بھی ان کی جانب سے یہ شکایت بھی نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں اسے رات میں پڑھ لوں گا کل آ کر لے جانا۔ مجھے پہلی مرتبہ تو تعجب ہوا تھا کہ اتنی مصروفیت سے وقت نکال کر کس طرح وہ اسے پڑھ لیں گے لیکن دوسرے دن گیا تو میرے لکھے ہوئے صفحات ان کی ٹیبل پر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ یہ صفحات انہوں نے پڑھے بھی ہیں یا یونہی واپس کر دیے لیکن جب یہ نوٹ لکھا ہوا دیکھا کہ اس باب کے لیے فلاں کتاب بھی دیکھ لیتا تو مجھے یقین ہوا کہ صفحات انہوں نے پڑھے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ اس کی دیر ہوئی تو میری طرف سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے بھی کچھ نہیں لکوائے۔ نہ کبھی کوئی ایسی بات کی جس سے میری دل تنگی ہو۔

میں خود استاد تھا۔ استادوں سے واسطہ رہتا تھا لیکن میں نے ان جیسا استاد دوسرا نہیں دیکھا۔ فروغ علم کا ایسا شوق تھا کہ طلبہ کو اس کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ایسی عزت کرتے تھے جیسے ان کا اس سے کوئی مطلب ہو۔ مطلب یہی تھا کہ اس کے علم کا کچھ حصہ اسے منتقل کر دیں اور پھر وہ اسے آگے بڑھائے۔ اس طالب علم سے تو بہت ہی خوش ہوتے تھے جس میں علم کے حصول کی تڑپ دیکھتے تھے۔ اس کے ساتھ جو وہ سلوک کرتے تھے اس کو تو میں ناز برداری کے لفظ سے

تعبیر کروں گا۔ جس بات پر کوئی استاد دکھانے کے لیے ہی کسی بھڑک سکتا ہے اسے بھی وہ تحمل سے برداشت کر لیتے تھے۔

مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آتا ہے اور اب خیال آتا ہے کہ میری طرف سے ہی کچھ زیادتی ہوئی تھی۔ میں مقالہ تحریر کرتے ہوئے کسی جگہ انکس گیا اور اپنی عادت کے مطابق سخت پریشان ہو گیا کہ کس طرح یہ مسئلہ حل ہو۔ میری بے صبری نے رات کا کتنا دو بھر کر دیا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ فجر کی نماز ختم ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میں یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سردیوں کے دن تھے اور اس دن تو سردی معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اتنی سردی کسی کے گھر جانا ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر اور انتظار کر لوں ذرا دھوپ تو چمکنے دوں۔ میں تو خیر جوان ہوں جس سے ملنے جا رہا ہوں وہ تو بوڑھا آدمی ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے سو کر اٹھنے کے معمولات کیا ہیں۔ وہ سو رہے ہیں یا اٹھ گئے ہوں گے۔ فجر کی نماز کے بعد کیا خبر پھر سو گئے ہوں۔ غرض میں نے کچھ نہیں سوچا اور کیسپس چلے گیا۔ دستک کے جواب میں دروازے کی اوٹ سے ایک سر باہر آیا۔ سر پر ایک اس طرح کا اونٹنی ٹوپا تھا کہ پورا چہرہ ڈھکا ہوا تھا صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ یہ تھے ابواللیث صدیقی۔ چند لمحوں تک تو وہ آنکھیں مگھورتی رہیں اور پھر آنکھوں نے مسکراتا شروع کر دیا۔ ان کی فراخ دلی نے دروازہ کھول دیا۔ ”جلدی اندر آ جائیے باہر بہت سردی ہے اور آپ ایک سوئٹرز چلے آئے۔“ انہوں نے چھت پر ایک کمرایا ہوا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے کٹری کا زینہ تھا۔ غالباً گھر میں سب لوگ سو رہے تھے اس لیے وہ مجھے لے کر چھت پر چلے گئے۔ مجھے وہاں بٹھا کر کچھ کہے بغیر خود نیچے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد آئے تو ایک ٹرے میں دو کپ رکھے ہوئے تھے۔

”ساجد میاں اس وقت تو گرم گرم چائے پیو، سردی بہت ہے۔“

مجھے یقین ہے یہ چائے وہ خود بنا کر لائے ہوں گے۔ اس وقت کسی کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا ہوگا۔ گفتگو شروع ہوئی تو جتنے تک کے لیے یہ نہیں کہا کہ یہ کوئی وقت ہے آنے کا۔ کوئی مہربانی نا وقت ہمارے گھر آ جائے تو ہمارا منہ بن جاتا ہے لیکن ان کا چہرہ اسی طرح گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ جو میرا مسئلہ تھا اسے حل کرنے کے بعد جب میں اٹھنے

لگا تو انہوں نے مجھے روک لیا۔ ”سواری ہے؟“

”جی نہیں۔ بس سے آیا تھا۔“

”اب کہاں یہاں سے وہاں تک پیدل جاؤ گے اور پھر بس پکڑو گے۔ میرے ساتھ ہی چلنا۔“

وہ اردو بورڈ جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ ان کے پاس اس وقت ہائی روف تھی۔ مجھے بھی بٹھالیا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ میں نہیں بھولتا۔ اس وقت میں پی ایچ ڈی کر چکا تھا۔ میرا پہلا مجموعہ کلام ”قافیہ پیاکی“

کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی تقریب رونمائی ہونا تھی۔ میں نے جو دعوت نامہ چھپوایا اس میں ابواللیث صدیقی کا نام بطور

مقرر یہ سوچ کر نہیں رکھا کہ انہیں کیوں زحمت دی جائے کہ وہ یونیورسٹی سے اس معمولی سی تقریب میں شرکت کے لیے

آئیں البتہ دعوت نامہ ان کی خدمت میں پہنچا دیا۔ وہ بھی براہ راست نہیں۔ وہ اس وقت یونیورسٹی میں موجود نہیں

تھے۔ میں ان کا دعوت نامہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کو دے آیا۔ کشفی صاحب کو بھی آنا تھا۔ میں نے سوچا اگر یہ آئے تو ڈاکٹر

صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں گے۔ اگر انہیں تقریر کرنی ہوتی تو وہ پابند ہو جاتے۔ اب اگر مناسب سمجھیں گے تو آجائیں گے۔

تقریب شروع ہونے ہی والی تھی۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم (جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے) معلن (انج

سکریٹری) کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ ابھی مہمانوں کو انج پر آنے کی دعوت دے ہی رہے تھے کہ

ابوالخیر کشفی کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب پنڈال میں داخل ہوئے۔ ان پر نظر پڑنے ہی پیرزادہ قاسم نے ڈاکٹر صاحب

کو انج پر آنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب انکار کیے بغیر بہ خوشی انج پر آ گئے۔ مجھ پر ہلڑوں بانی پڑ گیا۔ جب انہیں

خیالات کے اظہار کے لیے دعوت لی گئی تو یہ دعوت بھی قبول کی۔ یہ نہیں کہا کہ مقررین میں میرا ہمتو ہے نہیں۔ یہ

ہوتی ہے بڑے لوگوں کی پہچان۔ میں نے بعد میں معذرت بھی کی اور وضاحت بھی کی کہ میں نے انہیں تقریر کی ہمت

کیوں نہیں دی تھی۔ انہوں نے بڑے تاز سے فرمایا۔ ”ساجد میاں تم میرے شاگرد ہو۔ میرا تمہارا رکن

تعلق نہیں ہے کہ دعوت نامے میں نام لکھنے کی رسم نبھاتے۔ تم نے اچھا ہی کیا۔ اگر میں نہ آتا تو تمہارا ایک مقرر کم ہو

جاتا۔ میں آ گیا میں نے کچھ الفاظ بول دیے۔ مجھ پر تمہارا حق تھا میں نے ادا کر دیا۔“

ایک میں ہی ان کا شاگرد نہیں تھا کہ وہ اتنا خوش ہو رہے تھے۔ ان کی نگرانی میں سینکڑوں لوگوں نے پی ایچ

ڈی کیا ہوگا۔ وہ ہر شاگرد سے اسی طرح پیش آتے تھے۔ وہ اس طرح ملتے تھے کہ طالب علم میں علم کا شوق پیدا ہو

جائے۔ یہ سلوک ان کی تربیت کا حصہ تھا۔ وہ چپکے چپکے طالب علم کی تربیت کرتے رہتے تھے۔ وہ اتنی نرم گردن کے

نہیں تھے۔ جس کے دوست تھے اس کے دوست تھے لیکن جس سے خنن جاتی اس کو گھر تک چھوڑ کر آتے تھے۔ طبیعت

میں غصہ بہت تھا لیکن وہ اس کے اظہار میں بہت محتاط تھے۔ یہ غصہ اس وقت سر اٹھاتا تھا جب ان کے کاموں میں کوئی

بے جا دخل اندازی کرتا تھا۔ ان کے مزاج سے واقف ہو جانے والا بہت فائدے میں رہتا تھا۔

☆.....☆

لغت کے مدیر اعلیٰ ہونے کے بعد اسی سال معتد بنا دیا گیا۔ گویا اس عہدے کے حصول کے بعد وہ با اختیار تھا۔

ابھی تک لغت کی ایک بھی جلد شائع نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ پندرہ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی وجوہات مختلف

تھیں۔ ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ الفاظ کے استمال کے لاکھوں کارڈ ایسے افراد نے لکھے تھے جنہوں نے الما کی غلطیاں کی

تھیں اور اقتباسات میں اپنی مرضی کی تبدیلیاں کر دی تھیں۔ دوسری بڑی وجہ سنسکرت یا پراکرت سے ماخوذ الفاظ کے

اشتقاق کا اندراج اور تکمیل تھی۔ پاکستان میں سنسکرت کے ماہر ناپید تھے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور اختر حسین رائے

پوری نے کام کو آگے بڑھایا مگر تکمیل نہ ہو سکی اور طویل عرصہ گزر گیا۔ ابواللیث کی تقریر نہ ہوتی تو شاید یہ کام یونہی پڑا

رہ جاتا لیکن ابواللیث صدیقی کی بے پناہ قوت ارادی نے اس کام کو ایک سال میں پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ سنسکرت کے

جتنے اشتقاق لکھے گئے تھے تسلطِ رسم الخط میں لکھے گئے تھے جو نہایت غیر علمی صورت حال تھی۔ سنسکرت ناٹب موجود نہیں

تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کوششیں بسیار کے بعد سنسکرت ناٹب مہیا کیا اور سنسکرت کے کل اشتقاق نئے سرے سے لکھے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے سوا یہ کام شاید کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی محنت تھی کہ جو کام پندرہ سال سے رکا ہوا تھا انہوں نے

ایک سال میں مکمل کر کے لغت کی پہلی جلد شائع کر دی۔ لغت میں شامل ابواللیث کا مقدمہ بذاتِ خود ایک علمی

کارنامہ ہے۔ اس کے بعد ان کی ادارت میں پانچ جلدیں مزید

شائع ہوئیں۔ تنقید کرنے والے ہر چیز پر تنقید کرتے ہیں۔ اس لغت پر بھی تنقیدیں ہوئیں۔ یہ تنقید درست ہوں گی۔ اس جلد میں یا اگلی کئی جلدوں میں بہت سی خامیاں رہ گئی ہوں گی۔ تنقید کرنے والے ان مشکلات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے جو ڈاکٹر صاحب کو پیش آ رہی تھیں۔ عرصہ تک بورڈ کی اپنی عمارت نہیں تھی۔ اپنا پرہیز نہیں تھا۔ سسکرت ٹائپ کی سہولت تک موجود نہیں تھی۔

ٹکالنے والے تو خدا کی تخلیق میں بھی عیب نکال لیتے ہیں یہ تو ابواللیث کا کارنامہ تھا۔ انہوں نے آٹھ سال میں چھ جلدیں فراہم کر دیں۔ ان میں خامیاں بھی ہیں لیکن خوبیاں زیادہ ہیں۔ یہ ان ہی کا کارنامہ تھا جس نے بنیاد فراہم کر دی جس پر لغت کی عمارت کھڑی ہوئی اور اب تک بائیس ٹیمیں جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

بورڈ کا کام تدوین لغت کے کام کو جاری رکھنا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب تو جہاں جاتے تھے چند کام ایسے ضرور انجام دیتے تھے جو ہمیشہ کے لیے یادگار رہ جاتے تھے۔ ان کاموں میں ایسے منہمک ہوتے کہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے۔ انہوں نے اردو بورڈ کے لیے ٹائپ مشین کے لیے کلیدی تختے (Key board) کی تیاری کا کام بھی سرانجام دیا جو منظور کر لیا گیا اور اس کے مطابق ٹائپ مشینیں تیار کی گئیں۔

بورڈ کا دفتر اب تک کراچی کے مختلف علاقوں میں کرائے کی عمارتوں میں چلا آ رہا تھا۔ اس طرح بہت سافٹ ویئر بھی ضائع ہوتا تھا اور ضروری نہیں کہ عمارت کی ساخت بورڈ کے کاموں کے عین مطابق ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں کوششیں شروع کر دیں کہ بورڈ کی اپنی عمارت ہو جو اپنے نقشے کے مطابق تعمیر کرائی جائے۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے اور ٹکشن اقبال میں نیا چورنگی کے نزدیک زمین حاصل کر لی گئی۔ تعمیری کام شروع ہوا تو خود کھڑے ہو کر نگرانی فرماتے تھے۔ ایسی دلچسپی لے رہے تھے جیسے اپنا ذاتی مکان بنوا رہے ہوں۔ دو منزلہ یہ عمارت تعمیر ہو گئی تو 1984ء میں بورڈ کا دفتر اس عمارت میں منتقل ہو گیا۔

انہوں نے اس عمارت کی تعمیر کے بعد محیط اردو اور پریس کے نام سے ایک بریس بھی لگوا یا اور اس کے متعلق تمام معلومات خود حاصل کیں تاکہ اس کی کارکردگی پر نظر رکھی جاسکے اور ضرورت پڑنے پر چھوٹی بڑی خامیوں کو از خود رفع کیا جاسکے۔ اس قسم کی کوئی دوسری مثال کیا نظر آ سکتی ہے؟

یہ کام تو کوئی دیوانہ اردو ہی کر سکتا تھا۔

☆.....☆

”میاں، میں نے ایک خواب دیکھا ہے خواب ایسا ہے کہ آپ کو سنانے کو جی چاہتا ہے۔“
”یہ چند کاپیاں ہاتھ میں ہیں۔ انہیں جانچ لوں تو پھر سنتا ہوں۔“

”آپ کی کاپیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے انہیں ہاتھ سے رکھ دیں۔ پھر میں بھول جاؤں گی۔“

”اچھا سناؤ۔“ ڈاکٹر صاحب نے کاپیاں ہاتھ سے رکھ دیں۔

”میاں میں نے دیکھا کہ میں تلاوت کر رہی ہوں، سورۃ کے آخر میں ”کانا تو ابا“ ہے۔“ ابواللیث نے کہا۔
”اذا جالضر اللہ“ کے آخر کا حصہ ہے۔“ قرآن اٹھا کر دیکھا۔

”اس میں تو اسی سورۃ پر نشانی کا ایک کاغذ رکھا ہے۔“

اس دن کے بعد سے ان کی اہلیہ نے اس کی تلاوت کو ورد بنا لیا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ گزرا تھا کہ 24 فروری 1980ء کی رات گیارہ بجے ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ بستر پر ایک کاپی کھلی پڑی تھی جس پر فارسی کے کچھ ادھورے جملے لکھے ہوئے تھے۔ کچھ دن ہوئے انہوں نے فارسی کی معنی شروع کی تھی۔ غالباً اسی کی مشق کر رہی تھیں۔ انتقال کے بعد ایک عزیز بزرگ کے یاد دلانے پر یاد آیا کہ جو صورت انہوں نے خواب میں دیکھی تھی وہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی بشارت تھی۔ ان بزرگ نے یہ بھی بتایا کہ اس سورۃ کے متعلق تفسیر میں صاف لکھا ہے۔ ”اب دنیا کا کام مکمل ہوا۔ سفر آخرت اختیار کر دو۔“

غالباً خواب دیکھنے کے بعد ریحان فاطمہ نے تفسیر بھی دیکھی ہوگی۔ اسی لیے ان ڈیڑھ مہینوں میں وہ عبادت کی طرف شدت سے راغب ہو گئی تھیں۔

یوں تو کسی کی موت ہو صدے کا پہاڑ لے کر آتی ہے لیکن اہلیہ کی موت ان کے لیے قیامت سے کم نہیں تھی۔ اسے اپنی بیوی سے جتنی محبت تھی اس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ یہ وہ ہستی تھی جس نے شدید تنگ دستی میں حرف شکایت نہ اٹھائے بغیر ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ انٹر میں تھے کہ ان کی شادی ہو گئی تھی۔ عرصے تک یونیورسٹی سے ملنے

والے وظیفے پر گھر بھی چلا تے رہے، تعلیمی اخراجات بھی پورے کرتے رہے۔ بیوی کی یہ قربانی انہیں ہمیشہ یاد رہی۔ وہ دل سے ان کی قدر کرتے رہے۔ بعد میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اہلیہ کو دنیا بھر کی سیراکرائی۔ حج، عمرہ سب کرایا۔ اس اعزاز سے بھی آشنا کیا کہ وہ ممتاز ماہر تعلیم اور اہم ترین ادیب و نقاد و محقق کی بیوی ہیں۔ ابواللیث سے ان کی محبت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اب جو اچانک ساتھ چھوٹا اور زوجہ کو یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن کیا تو قبر کی مٹی نے آواز دی۔ ”ہم آپ سے جدا ہو گئے ہیں ہماری محبت کو دل سے مت نکالنا۔“ اس دن کے بعد سے یہ معمول بنایا کہ فجر کی نماز کے بعد اہلیہ کی قبر پر چلے جاتے۔ فاتحہ خوانی کرتے۔ دل کی باتیں کرتے اور لوٹ آتے۔ بیوی کو گلاب کے پھولوں سے عشق تھا۔ گھر میں بھی گلاب کے پودے لگائے ہوئے تھے۔ عمری نماز کے بعد جاتے تو قبر پر گلاب کے پھول بکھیرتے۔ مغرب تک وہیں رہتے۔ پھول والوں سے ہفتے بھر کے پھول خرید کر فرج میں رکھ لیتے۔

”وفاداری بہ شرط استواری اصل ایمان ہے۔“

انہوں نے وفاداری ایسی نبھائی کہ جب تک زندہ رہے (تقریباً چودہ سال) آندھی ہو یا طوفان فجر کے بعد اہلیہ کی قبر پر چلے جاتے۔ پھر عمر کے بعد جاتے۔ قبر پر پھول چڑھاتے مغرب تک وہیں رہتے۔ اپنی وفات سے ایک دن قبل تک بھی یہی معمول رہا۔

”پیدا کہاں ہیں ایسے پر اگندہ طبع لوگ“

کوئی اور ہوتا تو اس صدمے سے دل برداشتہ ہو کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتا لیکن ان کی قوت ایمانی بھی جو موت کو بردھتی جانتی تھی۔ انہوں نے بھی یہی کی محبت کا حق ان کے لیے دعائے مغفرت کر کے ادا کیا اور بہت جلد اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

موت اک ماندگی کا وقت ہے

یعنی آگے چلیں گے دم لے لیں

☆.....☆

اردو بورڈ کی طرف تدریسی سے متوجہ ہوئے۔ اردو بورڈ کی نئی عمارت اہلیہ کی وفات کے بعد ہی تعمیر کروائی۔ پریس لگوایا، اہلیہ کی کئی گھر پہنچنے کے بعد ہی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کا حل یہ نکالا کہ لکھنے پڑھنے کی طرف پہلے سے بھی زیادہ مشغول ہو گئے۔ وہ صرف مدرس نہیں تھے کہ کلاسوں تک محدود ہو جاتے۔ انہوں نے خود کو زیادہ سے

زیادہ معروف رکھنے کے لیے قلم سنبھال لیا۔ یہ نہیں تھا کہ اس سے پہلے انہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ جرات، مصحفی، نظیر جیسے شعرا پر مستقل تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ اقبال شناسی کے سلسلے میں ”ملفوظات اقبال“ اقبال اور مسلک تصوف جیسی کتب پڑھنے والوں کو دے چکے تھے۔ لاتعداد مضامین تھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ زمانہ طالب علمی ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ دو کتابیں لکھ کر ادبی مورخ کا درجہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ ”اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ“ اور ”تاریخ زبان و ادب اردو“ جیسی کتابیں انہیں ادبی مورخ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ”آج کا اردو ادب“ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اہلیہ کی وفات کے بعد مضامین کثرت سے شائع کروائے۔ اقبال اور علی گڑھ کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا جو رسالہ ”تصنیف“ میں قسط وار شائع ہوا۔ حضرت مجدد الف ثانی پر بھی دو مضامین ”تہذیب“ شائع ہوئے۔ ”تہذیب“ ہی میں ”لسان اور مطالعہ لسان میں مسلمانوں کی خدمات“ کے عنوان سے دو مضامین شائع ہوئے۔ ”نگار“ میں ناول فی نقطہ نظر سے شائع ہوا۔

اس وقت تک ان کی علمی خدمات اور کارنامے اس منزل تک پہنچ گئے تھے کہ ان کی سوانح شائع ہو جانی چاہیے تھی کہ لگ اس عظیم ماہر تعلیم کی زندگی سے واقف ہوں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے ہی قلم کو منتخب کیا۔ اپنی خود نوشت ”رفت و بود“ روزنامہ جسارت میں شائع کرانی شروع کی مگر یہ عمل نہ ہو سکی اور یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے اپنا ایک مجلہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ ابواللیث صدیقی بھی مجلس انتظامیہ میں شامل تھے۔ انہوں نے اس مجلے کا نام ”تہذیب“ تجویز کیا۔ انہیں اس مجلے کا مدیر اعلیٰ اعزازی مقرر کیا۔ عام طور پر مدیر اعزازی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا نام چھپتا رہے لیکن وہ تو جو کام کرتے تھے اس کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے ادارے بھی تحریر کیے اور اس کے بعد جتنے مضامین لکھے وہ ”تہذیب“ کے لیے لکھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ تجارتی پرچہ نہیں۔ اس کی سرکولیشن زیادہ نہیں ہو سکتی ایسے مقام پر تھے کہ وہ جس پرچے کے لیے لکھتے اس کی محبت وصول کرتے لیکن انہوں نے اس پرچے کے لیے مفت کام کیا۔ انہوں نے اپنی خود نوشت بھی تہذیب میں شائع کرانی شروع کی۔ اس کا سلسلہ ان کی وفات تک

جاری رہا۔ علمی کاموں سے وقت نکال کر وہ اسے پابندی سے شائع کراتے رہے۔

یہ خودنوشت صرف ان کی سوانح نہیں رہی بلکہ پڑھنے والے کو لگتا ہے جیسے وہ برصغیر کی علمی تاریخ پڑھ رہا ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر اور علمی گزٹھ کی عالم فاضل شخصیات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ خودنوشت ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

ان کے تنقیدی نظریات کی ایک جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے جو انہوں نے مختلف کتابوں پر ”فلیپ“ یا پیش لفظ کے طور پر لکھے ہیں۔ یہ تحریریں بغیر پڑھے نہیں لکھ دی گئی ہیں جیسا کہ اکثر لکھنے والے لکھ دیتے ہیں بلکہ وہ انہیں باقاعدہ پڑھتے تھے۔ انہوں نے خود ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا۔

”میں ان کتابوں پر اس لیے لکھنا قبول کر لیتا ہوں کہ اس بہانے ایک کتاب پڑھ لیتا ہوں۔“

یہی وجہ تھی کہ ان کا مطالعہ کلاسیکی کتب تک محدود نہیں تھا بلکہ عصر حاضر میں شائع ہونے والی کتب سے بلا واسطہ تعلق تھا۔ مبالغہ نہ ان کی فطرت میں تھا نہ اس قسم کی تحریروں میں ملتا ہے۔ بے جا تنقید کا بھی شوق نہیں اس لیے محض تعارف تک محدود رہتے ہیں۔ جب میرا شعری مجموعہ شائع ہونے لگا تو انہوں نے میری درخواست پر یہ فلیپ لکھ کر دیا۔

”.....ساجد احمد اس نئے دور کے نوجوان شاعر ہیں۔ انہوں نے اچھا ہی کیا کہ اپنے پہلے شعری مجموعے کی تدوین اشاعت سے پہلے اپنے دور کی رسمی تعلیم مکمل کر لی اور ادب کے طالب علم کی حیثیت سے اس راہ کی نشیب و فراز سے کچھ واقف ہو گئے۔ اس باضت سے ان کے فن میں نکھار اور اسلوب میں پختگی آئی اور انہوں نے اپنے لیے الگ ایک راہ متعین کر لی۔“

”یہ اشعار ساجد کے جذبات بھی ہیں اور ان کے ماحول کے ردعمل کے تاثرات بھی۔ یہ غزل کے اشعار ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوبی غزلوں کی صدیوں پرانی ایمانی روایت ہے۔ علامتوں اور استعاروں کے بروئے اٹھائیں تو ان اشعار میں الفاظ کے تانے بانے سے آگے بھی کچھ اور ہے۔“

ایک مجھ پر ہی منحصر نہیں۔ انہوں نے جس کے لیے بھی لکھا صاف اور کھری باتیں ہی لکھیں۔ بے جا قدر دانی سے دور مبالغے سے پاک۔

”ارشادی بدایونی کسی نئی طرز کے بانی نہ تھے۔ وہ غزل کے شاعر تھے اور جس کا مزاج کلاسیکی غزل کا مزاج تھا اس میں داستانِ دل اور حکایتِ دروہی۔ غزل کے لیے نئی زبان کی تخلیق جس کا ہمارے اکثر نوجوان شاعروں کو سودا ہے ان کا دستور نہ تھا۔ ہاں زبان صاف اور مستند لکھتے تھے۔“

وہ رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی جیسے اساتذہ کے تربیت یافتہ تھے۔ ان میں ایک ادیب تھا ایک شاعر۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب بھی نثر و نظم کی چھان چٹک میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ وہ خود شاعر نہیں تھے لیکن شاعری کے رموز سے خوب واقف تھے۔ وہ جس فن پارے پر قلم اٹھاتے تھے اس کا خوب اچھی طرح تجزیہ کرتے تھے۔ وہ محقق تھے لہذا تنقید کرتے ہوئے ہوائی باتیں نہیں کرتے تھے۔ نہ بے جا تعریف نہ جانب داری۔ ان کا ذہن کلاسیکی تھا لیکن عصر حاضر سے غافل نہیں تھا۔ پرانی تربیت نے مزاج میں شائستگی پیدا کر دی تھی۔ کسی فن پارے کی خامیوں کی نشاندہی بھی کرتے تو بڑی خوب صورتی سے۔

لسانیات سے خاص شغف تھا اس لیے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی لسانی خامیوں اور خوبیوں کا ضرور ذکر کرتے تھے۔ انہیں صرف وہی تحریریں پسند آتی تھیں جو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ ایسی تمام تحریروں پر بے باک تنقید کرتے تھے جو اردو زبان کے مزاج کے خلاف ہوں تاہم وہ رجعت پسند نہیں تھے۔ ہاں مشرق و مغرب کے توازن کے قائل تھے۔ ان کی تنقید میں مغربی دبستانوں کے اثرات بھی صاف نظر آتے ہیں۔ مثلاً جرأت کی شاعری پر لکھتے ہوئے انہوں نے فرائڈ کے نفسیاتی دبستان سے مدد لی تھی۔ اسی طرح ان کی تحریروں میں مارکسی طرزِ تنقید کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ وہ تنقید کی جمالیاتی قدروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے ترقی پسند تحریک کے خلاف تھے۔ اس تحریک کے تحت لکھے جانے والے ادب پر تنقید کرتے ہوئے ان کی تحریروں میں قدرے غصہ آ جاتا تھا لیکن یہ غصہ صرف اس وقت آتا تھا جب اخلاقیات اور مذہب کا سوال آتا تھا۔ دراصل وہ انتہا پسندی کے خلاف تھے۔ کسی سیاسی نظریے کی تبلیغ کے لیے فن کی جمالیاتی قدروں کو قربان کر دینا ان کے نزدیک مستحسن نہیں تھا۔ ترقی پسند ادب کے خلاف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریوں کو جگہ جگہ رد کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر اشتراکی نظریاتی کے۔ مذہب

کے ساتھ ساتھ پاکستانی قومیت کا بھی انہیں شدید احساس تھا۔

ان کے تنقیدی کارناموں کی اصل اور بنیاد ان کا اسلوب نگارش تھا۔ لکھنؤ کے دبستان شاعری پر کام کرنے کے باوجود اور بچپن سے لکھنؤی شعرا کو پڑھنے کے باوجود ان کا اسلوب نگارش لکھنؤی تکلف پسندی سے پاک رہا۔ ان کے اسلوب کو اگر ہم کسی مثال سے بیان کریں تو وہ ہے سرسید احمد خان۔ صاف سادہ جوں سے نکلے دل میں اتر جائے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے سرسید کی نقل کی۔ ان کی نثر سرسید کی طرح خشک اور بے مزہ نہیں۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ ان کا تعلق سرسید کے مکتبہ فکر سے تھا۔ وہ زبان و بیان سے زیادہ مضمون پر توجہ صرف کرتے تھے۔ اس لیے بھی کہ وہ علی گڑھ کی محبت میں شراہور تھے اور اس لیے بھی کہ وہ محقق تھے افسانہ نگار نہیں۔ وہ فارسی پر عبور رکھتے تھے لیکن ان کی تحریروں کو مغرب نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ایک منفرد صاحب اسلوب تھے۔ یہ اسلوب ان سے شروع ہوا اور ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

☆.....☆

ماہ نامہ ”تہذیب“ میں ان کی خودنوشت ”رفت و بود“ اشاعت کی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ لوگ اسے پسند بھی کر رہے تھے اور اس میں دلچسپی بھی لے رہے تھے۔ یہ احساس بھی تھا کہ لیٹ صاحب کی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کی صحت قابل رشک ہے لیکن عمر آخر ہوتی ہے۔ ان سے تقاضا کیا جائے کہ وہ اس خودنوشت کو جلد از جلد مکمل کریں۔ آئرش کونسل کراچی کے قریب ”انگل“ روڈ پر علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا دفتر تھا۔ یہیں سے تہذیب شائع ہوتا تھا۔ جزل سیکریٹری ڈاکٹر علی خاں کے دفتر میں احباب جمع تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب کی وہاں آگئے۔ علی گڑھ اور رام پور کی باتیں چمڑی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر علی خاں (سابق ایم ڈی واٹر بورڈ) کو خیال آیا اس وقت موقع اچھا ہے۔ قسطوں کا ذکر چھیڑا جائے۔

”ڈاکٹر صاحب آپ کی خودنوشت بے حد پسند کی جا رہی ہے۔ آپ اس کے صفحات بڑھادیں بلکہ اسے مکمل کر کے ہی دے دیں تاکہ ہم اسے چھاپتے رہیں۔ آپ مصروف آدمی ہیں کسی اور کام میں لگ گئے تو یہ ادھوری رہ جائے گی۔ ایسے ایسے واقعات اس میں بیان ہو رہے ہیں جو اب کسی کی یادداشت میں محفوظ نہیں۔ محفوظ ہیں تو انہیں لکھنے

کے لیے وہ قلم کسے ملا ہے جو آپ کو عطا ہوا ہے۔“

”لکھ تو دوں۔“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”مگر اس کے پڑھنے والے کہاں سے لائے گئے۔“

”آپ کو اندازہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب پاکستان سے زیادہ انڈیا میں اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ خدا بخش لاہوری پٹنا سے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے کئی خط آچکے ہیں کہ اس خودنوشت کو کسی طرح بھی ڈاکٹر صاحب سے مکمل کرایا جائے۔“

”فکرت کرو، ابھی میں مرنے والا نہیں۔“

”آپ کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رہے۔ ہم سب تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ایک قسط بھیج کر اس کے چھپنے کا انتظار نہ کیا کریں بلکہ کئی کئی قسطیں لکھ کر بھیجتے رہیں تاکہ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ مواد جمع ہو جائے۔ ہم صفحات بھی بڑھادیں گے جو چیز پڑھی جا رہی ہے اسے شائع ہونا چاہیے۔“

انہوں نے وعدہ کر لیا کہ اب وہ کئی کئی قسطیں ایک ساتھ لکھ کر بھیجا کریں گے۔

وہ دفتر سے اٹھ کر گئے تو دیر تک انہی کی باتیں ہوتی رہیں۔

”ماشاء اللہ 78 سال کے ہو گئے ہیں لیکن نہ ہاتھ میں چمڑی ہے نہ کوئی سہ ارادے کر لایا ہے۔ غالباً گاڑی بھی خود ہی چلا کر لائے ہوں گے۔“

”آواز میں بھی وہی گرج ہے جیسے علی گڑھ میں دوسو لڑکوں کی کلاس لے رہے ہوں۔“

”لسانیات کے طلبہ گھر پر آتے ہیں انہیں پڑھاتے ہیں۔ سینکڑوں پی ایچ ڈی کے مقالے آتے ہیں ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دل گھبراتا ہے تو شعبہ اردو میں چلے جاتے ہیں۔ تمام کام معمول کے مطابق کر رہے ہیں۔“

”سب سے بڑی بات یہ کہ پابندی سے بلاناغہ بیوی کی قبر پر جاتے ہیں۔“

”جی ہاں 80ء میں شاید ان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ ایک دن کی غیر حاضری نہیں ہوئی۔ پابندی سے قبر پر جاتے ہیں۔“

”ایسی وضع داریاں اب کہاں صاحب جس کے ہو گئے جس ہو گئے۔ موت بھی جائل نہیں ہونے پاتی۔“

”لکھا کام کیا ہے اس شخص نے۔“

”حکومت کی بجائے جی دیکھیے آج تک حکومتی سطح پر

انہیں سراہا نہیں گیا۔ کیسے کیسے لوگ حسن کارکردگی کے تمغوں اور تمغائے امتیاز سے نوازے جا رہے ہیں ڈاکٹر صاحب کو کسی نے پوچھا؟

”ان تمغوں سے کیا ہوتا ہے جناب۔“

”ہوتا تو کچھ نہیں لیکن کام کرنے والے کا حوصلہ

بڑھتا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب پر ان چونچلوں کا کوئی اثر نہیں۔ وہ برابر اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔“

”بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کوئی لابی نہیں۔ دربار داری ان کے مزاج میں نہیں۔ کھرے آدمی ہیں۔ جو بات ہوتی ہے منہ پر کہہ دیتے ہیں انہیں نوازاجائے تو کیسے۔“

”وجہ کوئی بھی ہو۔ ہے یہ حکومت کی بے بسی۔“

☆.....☆

سادگی نے کمرہت باندھی۔ پذیرائی کی خوشبو ذہن کے درپچوں کو مہکا نے لگی۔ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں جو باتیں ہوئی تھیں خودنوشت مکمل کرنے کا جو اصرار ہوا تھا وہ ابھی تک ذہن کو مہکا رہا تھا۔ رات ہوئی تو یادوں کا دفتر کھل گیا۔ قلم اٹھایا اور اگلی قسط لکھنا شروع کر دی۔ پھر یہ ہوا

راتوں میں جو چھڑ گئی ہیں باتیں

باتوں میں گزر گئی ہیں راتیں

جان کو کام اتنے لگے ہوئے تھے کہ فراغت کم ہی مل رہی تھی لیکن جب وقت ملتا تھا علی گڑھ کی سیر کو نکل جاتے تھے۔ ماضی کو آواز دیتے تھے اور قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ شاید کچھ ہونے والا تھا کہ دل کہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو یہ کام نمٹا لیا جائے۔

6 ستمبر 1994ء کا دن طلوع ہوا تھا۔ وہ حسب معمول اہلیہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد قبرستان سے واپس لوٹے تھے۔ لکھنے کی میز پر خودنوشت کے لکھے ہوئے صفحات رکھے ہوئے تھے۔ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ یہ کم از کم چھ قسطوں کا مواد تھا جو وہ لکھ چکے تھے۔ انہیں یاد آیا کہ اکتوبر کی قسط چھپنے کے لیے تہذیب کے دفتر میں بھیج دی ہے۔ اتفاق سے ایک صاحب ایسے بھی آگئے جن کے ذریعے یہ صفحات تہذیب کے دفتر بھیجے جاسکتے تھے۔ انہوں نے یہ صفحات ان کے حوالے کر دیے۔ نیلی فون بھی کر دیا کہ کم از کم چھ قسطوں کا مواد روانہ کر رہا ہوں۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ لسانیات کی تعلیم کے لیے آنے والے طلبہ آگئے۔ انہیں پڑھانے بیٹھ گئے۔

دو پہر تک بالکل ٹھیک تھے لیکن شام کو ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ انہیں میڈی کینسر اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے انہیں فوراً طبی امداد دی۔ یہ خوش خبری بھی دی کہ فکر کی بات نہیں البتہ احتیاط کے طور پر داخل کر لیا کہ رات بھر یہ آرام کریں گے اور صبح انہیں چھٹی دے دی جائے گی۔ وہ رات انہوں نے آرام سے بسر کی۔ 7 ستمبر کی صبح وہ سو کر اٹھے تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ خود اٹھ کر غسل خانے میں گئے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ تروتازہ ہو کر باہر نکل آئے۔ چھٹی ہونے والی تھی۔ چھٹی سے پہلے ڈاکٹر معائنے کے لیے آیا اور ان سے بلڈ پریشر چیک کرنے کے لیے کہا۔ انہوں نے کروٹ بدلی لیکن یہ کروٹ آخری حرکت ثابت ہوئی۔ ان کی روح نفیس غصری سے پرواز کر چکی تھی۔

ایسی سہل موت نیک لوگوں کو ہی ملتی ہے۔

یہ خبر جیسے ہی جامعہ کھنچی تمام دفاتر بند کر دیے گئے۔ اساتذہ، طلبہ و طالبات افسر اور ملازم تعزیت کے لیے ان کے گھر پہنچ گئے۔ ہر آنکھ اشکبار ہر چہرہ اداس تھا۔

ان کا جنازہ شام 5 بجے ان کی قیام گاہ سے اٹھایا گیا۔ جامعہ مسجد اسٹاف ٹاؤن میں عصر کی نماز کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی اور جامعہ کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ وہی قبرستان تھا جہاں ان کی اہلیہ دفن تھیں۔ دونوں کی قبریں گلاب کے پھولوں سے چھپی ہوئی تھیں۔

دوسرے دن ملک بھر کے اخباروں نے ان کی تعزیت کی خبریں شائع کیں۔ کئی دن تک اداروں میں ان کی خدمات کو سراہا جاتا رہا۔ ان کی شخصیت پر مضامین شائع ہوتے رہے۔

محشر بدایونی نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا۔ یہ قطعہ جنگ کراچی میں شائع ہوا۔

جہان ادب میں کہاں
وہ دانش ور نکلتے داں
یہی اب ہے دل کی صدا
ہوئے لیٹ جنت نشان

(7 ستمبر 1994ء)

ماخذات

ڈاکٹر ابوالیث صدیقی (علمی و ادبی خدمات)
ڈاکٹر انور زیدی۔ رفت و بود (خودنوشت)

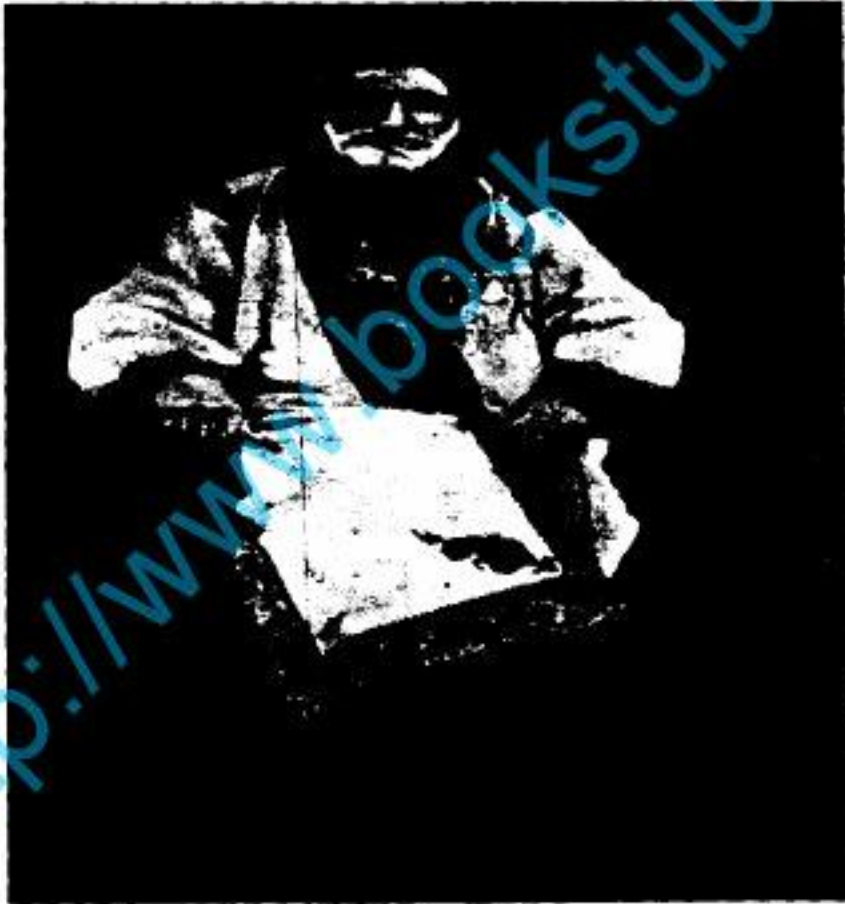
ڈاکٹر ابوالیث صدیقی

شمس العلماء

ابن کبیر

ایک چھوٹے سے انتہائی پسماندہ علاقے میں جنم لینے والے نے
اپنی تحریر اور لیاقت کی بدولت پورے برصغیر میں خود کو
منوایا۔ اس نے سندھی ادب کو نئی زندگی دے کر اس کے خزانے
کو لبالب بھر دیا۔

سندھ کے اس سپوت کا زندگی نامہ جس پر پورا پاکستان فخر کرتا ہے



سورج کی کرنیں نہر کنارے اتری آئیں۔ جاڑے
کی دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی مگر ابھی زمین خوابیدہ تھی۔
سکوت کے اس لمحے کچے مکان میں قلعاری گونجی۔ وہ کسی
ترانے کے مانند تھی۔ دہلیز پر کھڑے آدمی کا دل لشکر سے بھر
اٹا۔ اس نے آسمان پر پھیلے نور پر نگاہ کی جہاں میں ایک
سرکھٹی ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کا نام پال لیا۔ سچ... یعنی تلووار!
یہ سمجھا کہ بے سبب نہیں تھا۔ اس کا ایک پس منظر تھا۔
دریائے سندھ سے نکلنے والی پہیلی نہر کے کنارے کھڑا وہ آدمی

نظ پانچ عشروں میں کئی صدیاں جی چکا تھا۔ طویل جنگوں اور ہجرتوں پر محیط اس کی کہانی افسانوی لگتی تھی۔ اور اُس صبح جب مؤذن قلاچ کی سمت پکارا ہوا تھا، تقاضا کر رہی تھی کہ وہ اپنے سپوت کا نام سنا کر رکھے۔

مرزا فریدوں بیگ گزر بسر کے لیے فوہاں بناتا تھا۔ اُس کی گھڑ بیوی سلائی کڑھائی کیا کرتی۔ بمشکل گزارہ ہوتا۔ مگر کمپری اس کا مقدر نہیں تھی۔ کچھ برس قبل وہ سندھ کا معزز ترین آدمی تھا۔ شاہی قلعے کا ایک با اختیار کمین۔ میروں کی حکومت کا ایک ستون... پر اب وہ ایک کچے مکان میں مقیم تھا۔ اور حالات کے جبر سے بچ جانے والے جواہرات فروخت کر کے اپنی اولاد کے لیے تعلیم خرید رہا تھا۔ یہی زیور نومو لو کے ماتھے کا جھومر بننے والا تھا، جس کی قلعاری سے درختوں پر پھول کھل اٹھے تھے۔

اس کہانی کا آغاز کچھ عرصے قبل ہوا۔

اٹھارویں صدی کا آخری عشرہ تھا۔ ایرانی سلطنت قاچاری بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ انگریزوں نے ابھی سندھ پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ تب مرزا فریدوں بیگ یہاں سے میلوں دور... بحیرہ اسود کے کنارے اُس ریاست میں پیدا ہوا، جو آج جار جیا کہلاتی ہے۔ اس نے شہر کا ختی کے ایک متمول گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، جس کے باسی انجیل کھولنے سے پہلے چوما کرتے اور ہر اتوار باقاعدگی سے گر جا جاتے۔ علاقے کے پادری نے اس کا نام سڈنی تجویز کیا۔

ابھی وہ کم سن تھا کہ بدبختی نے اس کے آبائی وطن پر حملہ کر دیا۔ فارسی اور ترک جب روسیوں کے خلاف صف آراء ہوئے، تو یہ خطہ میدان جنگ بن گیا۔ فارسی غالب آئے۔ اُس کا باپ جنگ میں کھیت رہا۔ جن لوگوں کو جنگی قیدی بنا کر ایران بھیجا گیا، ان میں سے سڈنی بھی شامل تھا، جو ابھی خوف سے تازہ تازہ آشنا ہوا تھا اور ارد گرد کے واقعات کو حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔

شاہی قید خانے میں پہنچنے سے قبل وہ دھڑکتے ہوئے بازاروں سے گزرا۔ آسمان کو چھوتے میناروں، پُر شکوہ تہذیبی والے شہر سامنے تھے۔ پر یہ چمک دمک اُس کا خوف تھا۔ کرسکی۔ زنداں کے ادھر آسمان پیکا اور خاموش تھا۔ ایک چپکلی، اداسی تھی کہ وہ حسین کا مہینا تھا۔

ایران کی سرحدیں سندھ سے ملتی تھیں جہاں کلہوڑوں کا دور ختم ہو چکا تھا۔ میر برسر اقتدار آگئے۔ اب ادھر میر کرم علی خان تالپور کا سکھ چلتا تھا۔ قاچاری بادشاہ محمد کرین خان رند اور

میروں کے روابط مضبوط تھے۔ تحائف کا تبادلہ معمول تھا۔ جار جیا پر غلبے کے بعد فارسیوں نے سندھ کو جو تحائف بھیجے، ان میں ایک نو سالہ بچہ بھی شامل تھا۔

سڈنی نے ایرانی سرحد عبور کی، تو ایک نئی دنیا دیکھی۔ یہ وہ زمین تھی، جس کے بارے میں ہندوؤں کی مقدس کتاب ”رگ وید“ میں درج ہے ”تو کلہوڑوں کی دولت سے مالال ہے، رتھوں کے پیڑوں سے مالامال ہے، زرق برق کپڑوں کی فراوانی سے مالامال ہے۔“ اور اس کے دریاؤں کے بارے میں کہا گیا ہے ”اے سندھو، تو اپنی روانی میں آگے ہی آگے دوڑے چلا جاتا ہے کہ خوشی حالی کے دیوتا نے دھرتی پر تیری گزرگاہ متعین کر دی ہے۔“

فارسی بولنے والے اور سمجھنے والے تو ادھر بھی تھے مگر طرز تعمیر اور رہن سہن خاصا مختلف۔ کشادہ اور ہوادار مکانات۔ دریا کنارے آباد شہروں میں شام اترتی تو ساتھ ٹھنڈی ہوائیں لاتی، جو مزارات کے گنبدوں سے ٹکرا کر بے رونق بازاروں میں گشت کرتی۔ بازار... جہاں خریداروں کا ہجوم ہوتا۔ بھاؤ تاؤ ہو رہا ہوتا تھا۔ اس زمانے کا سندھ معاشی طور پر مستحکم تھا۔ تجارت عروج پر تھی۔ یوں تو یہاں کے زیورات، کپڑوں، منٹش ظروف کا چرچا تھا، مگر سب سے زیادہ مشہور تھے یہاں کے ہتھیار۔ موجودہ حیدرآباد کی کتنی اس وقت ہندوستان میں ہتھیاروں کی بڑی منڈیوں میں ہوا کرتی تھی۔ مورخصن لکھتے ہیں کہ یہاں مکانوں کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے بادگیر لگے ہوتے جو منگ کہلاتے تھے۔ جب انگریزوں نے شہر پر حملہ کیا تو وہ اُسے تو نہیں سمجھ سیکے۔

دانی کی پکار نے فریدوں بیگ کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ سورج کی تازہ روشنی اب مکان کو بھرنے لگی تھی۔ دانی نے بچہ گود میں دے دیا۔ اس نے روشنی کے رخ پر بچے پر نظر ڈالی۔ بچے کی آنکھوں میں وہ چمک تھی، جو اس کے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں ماند پڑنے لگی تھی۔ آدمی دھیرے سے مسکرایا۔

باہر بیٹھ اٹھ رہے تھے۔ اندرونی کمرے میں بستر پر دراز اُس کی بیوی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ چراغ کی روشنی میں اس کی گندی رنگت اور مقامی خدوخال کے پیچھے ایک انجینی رنگ دکھائی دیتا تھا۔ ایسا رنگ جو ہزار میلوں دور واقع ایک سرسبز خطے سے عورت کے تعلق کی کہانی بیان کرتا۔ اُسی خطے سے... جہاں فریدوں بیگ نے آنکھ کھولی تھی۔ اور یہ تعلق کوئی راز نہیں تھا۔ وہ جس شخص کی بیٹی تھی، اس

نے بھی جوڑ جیا میں آنکھ کھولی تھی۔ اسے بھی جنگیں اور ہجرت دریاے سندھ کے کنارے کھینچ لائی تھی۔ وہ بھی شاہی قلعے میں پروان چڑھا تھا... اور اب فریدوں بیک کے مانند بے گھر ہو چکا تھا۔

خسرو بیک نے سندھ کے جلابانی گھرانے کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ جب بیٹی جوان ہوئی، تو اپنے عزیز دوست فریدوں بیک کے نکاح میں دے دیا۔ یہ وہ دور تھا، جب ان دوستوں کو تالپور دربار میں شاہ کی خصوصی شفقت اور توجہ میسر تھی۔ جب وہ شہزادوں کی زندگی گزار رہے تھے، مگر اب... یہ دھرتی غیروں کے قبضے میں تھی۔

باورچی خانے میں کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ فریدوں بیک نے بچہ دانی کو سوئپ کر خاندانی ملازم کو پکارا، جسے اس کچے مکان میں فقط وفاداری کے جذبے نے باندھ رکھا تھا۔ گھر کے مالک کے پاس اتنے وسائل کہاں تھے کہ وہ ملازم رکھ سکے۔ گو اسے نئی سرکار نے متعدد بار ملازمت کی پیشکش کی، مگر اس وضع دار شخص نے بڑی نرمی سے انکار کر دیا۔

اپنا نام سن کر ملازم دوڑا چلا آیا۔ فریدوں بیک اسے اپنے سر کے گھر بیچنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ انہیں خوش خبری پہنچا سکے، مگر کچھ سوچ کر خیال بدل دیا۔ ”میں خود ہوتا ہوں۔“ وہ ان بازاروں، راستوں اور نہروں کے پاس سے ہوتا ہوا گزرا، جہاں کل زندگی چکا کرتی تھی مگر اب اداسی کا راج تھا۔ سب ہوتے ہوئے بھی ایک خلا تھا، غلامی کا پیدا کردہ خلا۔

خسرو بیک نے دروازے پر آکر اس کا استقبال کیا۔ یہ دونوں جوڑ جینا بالسنڈے ادھر کے ماحول سے خوب کھل مل گئے تھے۔ یہاں کی بدولہاں اپنی تھی، مگر لہجوں میں وہ رنگ کچھ کچھ باقی تھا جو ان کی عجیب و غریب کہانی کی جانب اشارہ کرتا۔

مبارک باد کے تبادلے اور ایک دوسرے کا منہ بیٹھا کرانے کے بعد وہ اوطاق میں آن بیٹھے۔ خیر خیریت پوچھ لی تو علم و ادب پر بات ہوئی جو انہیں چپکے سے سیاست پر لے آئی۔

یکدم اپنی ریاست پر قبضے اور قلعے سے بے غلی کا غم تازہ ہو گیا اور ساتھ ہی وہ مشترکہ داستان بھی جس نے انہیں باہم جوڑ رکھا تھا۔

☆☆☆☆

چار عشروں قبل ایک بخ بستہ صبح فریدوں نے پہلی بار

ماہنامہ سرگزشت

اس نوجوان کو دیکھا تھا جس سے اس کی دوستی مرتے دم تک قائم رہنے والی تھی۔

اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ معزز افراد میں بیٹھے نصیب لباس میں ملبوس اس نوجوان میں آخر ایسا کیا تھا جو اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ کیوں وہ اسے اپنا اپنا لگتا ہے۔ مگر جب اس نے سورج کی تیز روشنی میں اس پر دوسری بار نظر ڈالی تو فوراً سمجھ گیا کہ وہ بھی اس کی طرح غیر مقامی ہے۔ البتہ یہ جاننے کے لیے کہ اس کا تعلق بھی گرجستان سے ہے، اسے چند روز انتظار کرنا پڑا، جب دونوں میں ابتدائی جملوں کا تبادلہ ہوا۔

خسرو بیک کے نام سے پکارے جانے والے نوجوان نے جب اس کی مادری زبان میں خیریت دریافت کی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ تاہم یہ پہلا موقع نہیں تھا جب حیرت کی لہر پوری قوت سے اس سے ٹکرائی ہو۔ تحیر کا پہلا تجربہ اس روز ہوا تھا جب ننھے سڈنی کو میر کرم علی خان کے پر شکوہ دربار میں پیش کیا گیا تھا اور بادشاہ اس سے پدرانہ شفقت سے پیش آیا تھا۔

ممکن ہے کہ شفقت کا جذبہ میر میں بہ درجہ اتم موجود ہو، مگر مورخین کے خیال میں اس کا بنیادی سبب بے اولادی کا بے انت کرب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ برس قبل جب قاجاری بادشاہ کی جانب سے بھیجے جانے والے جنگی قیدیوں میں اس کی نظر نیلی آنکھوں والے گرجستانی لڑکے پر پڑی تو یوں لگا جیسے وہ اپنے بیٹے کو دیکھ رہا ہے۔ اور ایسا ہی احساس کچھ برس بعد تب جاگا، جب اس نے دس سالہ سڈنی کو اپنے رو برو پایا۔

میر کرم علی نے نوجوان خسرو بیک کی مانند اس بچہ کی ذمہ داری بھی شاہی اساتذہ کو سونپ دی۔

نئی ثقافت، نئے مذہب سے ہم آہنگ ہونا، نئے طور طریقے سیکھنا یقینی طور پر بچے کے لیے مشکل ہوتا، مگر خسرو بیک کی موجودگی نے مشکل آسان کر دی جو اس نئی دنیا اور گرم موسموں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو چکا تھا۔ اسے سڈنی میں... جیسے اب فریدوں بیک کہہ کر پکارا جاتا تھا، اپنا چھوٹا بھائی نظر آتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فریدوں کی پرورش اور شخصیت سازی میں جہاں دربار کے جید اساتذہ کا ہاتھ تھا، وہیں خسرو بیک نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

وہ پرنعوں کے ساتھ بیدار ہوتے۔ صبح ساتھ نماز ادا کرتے۔ کتب سے لوٹ کر خسرو اسے کموار بازی سکھاتا۔ باغبانی کے عمل طریقوں سے روشناس کرواتا کتب ان کے مطالعے میں رہیں۔ وہ کسی کی سیر کو جاتے۔ دربار میں انھیں بیٹھنے کے آداب بھی وہ سمجھ جان گیا۔ فارسی سیکھنے میں تھوڑا

ماہ 2015ء

67

وقت ضرور لگا، مگر اس کی ذہانت نے یہ پہاڑ بھی سر کر لیا۔
الغرض چند برسوں میں وہ اتنا بدل گیا کہ اگر اسے قاجاری
بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ کبھی پہچان نہ پاتا کہ یہ وہی
جنگلی قیدی ہے جو اس نے اپنے دوست کو گتھے میں دیا تھا۔

مجمودوں اور آدموں کے اس دلیس میں وہ ایسا راج بس
کیا کہ اپنی زمین سے جدائی کا غم ماند پڑ گیا۔ ہاں کبھی کبھی سینے
میں ایک غلا کا احساس ہوتا مگر وقت بڑا مرہم ہے۔

شاہی قلعے میں شہزادوں کے مانند رہنے والے ان
دونوں غیر ملکیوں نے اپنی قابلیت کے وسیلے سے جلد نمایاں مقام
حاصل کر لیا۔ دونوں میر کرم علی کے بے حد قریب تھے، انہیں
مرزا کا خطاب دیا گیا۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد خسرو بیگ نے
سندھ کے ایک معزز قبیلے کی ایک دوشیزہ سے شادی کر لی۔
اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جب
وہ جوان ہوگی، تو اسے اپنے عزیز دوست کو بیاہ دے گا۔

تو 1853 کی اس ٹھنہری صبح خسرو اور فریدوں آمنے
سامنے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جہاں کرب ناک
باضی کی پرچھائیں تھیں وہیں ایک روشن کل کی آس بھی جھلکتی
تھی... کیونکہ بچہ پیدا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

فصل یک کرتیار کھڑی تھی۔ گندم کے کھیتوں میں
لہریں ہی ڈوبتی ابھرتیں۔ کسان بھی کٹائی کو تیار ہو گئے تھے۔
کل تک درایتی چلاتے ہوئے ان کے لبوں پر ایک
لازوال شاعر کے گیت ہوتے:

اجنبی بستیوں سے تو منہ موڑ
آئے دن کا رونا دھونا چھوڑ
جوگ لے آئیں گے گاؤں میں جا کر
توڑ دنیا ہے اپنے ناتے توڑ

پر اب پہلے سا جوش نہیں تھا، وہ خوف زدہ تھے۔ اپنے
حق پر ڈاکے کا خیال انہیں کھائے جا رہا تھا۔ بلی ابھر رہی تھی۔
سندھ جہاں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سکھ اور پارسی
بھی آباد تھے، جہاں فارسی سرکاری زبان تھی، جہاں شاہ لطف
کے گیت گاؤں گاؤں گائے جاتے تھے... دھیرے دھیرے
بدلنے لگا تھا۔ نئے حکمران نے طور طریقوں کے ساتھ
دھرتی پر اترے تھے۔ اور تبدیلی کی ان ہی ہوائیوں میں
نئے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا۔

وہ اور بچوں سے یکسر مختلف تھا۔ جب اس کے بھائی

کھیل کود میں مصروف ہوتے، وہ صحن کے کونے میں بیٹھا
انہیں ہلکتا رہتا۔ اور جب دیگر بچے ضد کرتے، وہ خاموشی کو اپنا
ہتھیار بناتا۔ ایک سہ پہر بڑوس کی ایک بڑی بی بی یہ جاننے کے
لیے کہ فریدوں بیگ کا لڑکا کیلا بیٹھا کرتا کیا رہتا ہے، کئی گھنٹے
نظریں گاڑے بیٹھی رہیں۔

اس تھا کا دینے والی جاسوسی کے بعد ان پر عقدہ کھلا کہ
بچہ تنکے سے مٹی میں لکیریں بناتا ہے۔ جب یہ بات باپ کو پتا
چلی تو ذہن کے پردے پر ماضی کے مناظر کھوٹنے لگے۔ اسے
بھی تو بچپن میں ایسا ہی شوق تھا۔ وہ بھی زمین پر لکیریں بنایا
کرتا۔ مگر پھر اس کی زمین بارود اور خون سے بھر گئی۔ لکیریں
مٹ گئیں۔

فریدوں بیگ نے سر جھٹک دیا۔ اپنے بیٹے کی سمت
دیکھا، جس کے کشادہ ماتھے کے نیچے چھوٹی اور تیز... آنکھیں
خوب جلتی تھیں۔
”یہ مصور بنے گا مصور۔“ آدمی نے تالی بجائی۔ ”میں
اس کے لیے رنگ لیے آتا ہوں۔ ان سے کھیتا رہے گا۔“
رنگوں سے جلد ہی اس نے دوستی کر لی، مگر نئے بچے کو
اصل عشق ان کہانیوں سے تھا جو اس کی ماں اور نانی سنایا
کرتیں۔ جو اتنی پُر جھس ہوتیں کہ راتیں گہری ہوتی جاتیں
اور وہ نیند کے جھوٹوں سے آزاد کہانی سنے جاتا۔

یوں تو کتنی ہی کہانیاں تھیں... اولیاء کے قصے، نیک دل
بادشاہوں کی داستانیں، جنات اور پریوں کی باتیں، مگر جس
کہانی نے اس کے ذہن پر انٹ نفوذ چھوڑے تھے، اسے
سناتے ہوئے نہ جانے کیوں عورتوں کی آواز رندہ جاتی اور
صحن میں کچھ باپ کی چار پائی سے سسکی بلند ہوتی۔

”ایک تھا بادشاہ۔ نیک اور رحم دل۔ علم و ادب کا
دلدادہ۔“ تاروں بھرے آسمان تلے عورت کی آواز سنائی
دیتی۔ ”اس کی سلطنت میں ہر سون چھین چھین ہی تھا۔ گلی گلی
کتب۔ امن و امان۔ بازار پر رونق۔ تمام مذاہب کے لوگ،
تمام قومیں مل جل کر رہتیں۔ کوئی کسی سے نہیں جھگڑتا۔ شہر کیا
تھے، اسلامی طرز تعمیر کے شان دار نمونے تھے۔ بڑے بڑے
روشن اون ہوا دار گھر۔ بزرگوں کے مزارات۔“

”جج اور اس سے بڑے بھائی توجہ سے یہ کہانی سنا
کرتے۔ فریدوں بیگ کے کان بھی ادھر ہی لگے ہوتے۔
”یوں تو خدا نے بادشاہ کو ہر نعمت سے نوازا، مگر ایک غم
اسے کھائے جاتا۔ اس کی اولاد نہیں تھی۔ یہ قلق تھا کہ اس کی
وسیع و وسیع سلطنت کا کوئی وارث نہیں۔ بہت جتن کیے۔

بزرگوں سے دعا کروائی۔ چلے گئے، مگر خوشی پر یاس کا پہرہ رہا۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ بڑی ملک سے کچھ جنگی قیدی آئے، جن میں ایک معصوم بچہ بھی تھا۔ بچے کو دیکھ کر بادشاہ کے دل میں...

فریدوں بیک مسکراتا۔ عورت بولے جاتی تارے بھی جھک کر سننے لگتے۔

تو کہانی آگے بڑھتی ہے۔ زندگی اپنی ڈگر پر جا رہی تھی کہ اچانک بدبختی کے بے انت سلسلے کا آغاز ہوا۔ ایک عفریت نے سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ شیاہین کی فوج بھی اور اس کے ہتھیار آگ اٹھا کرتے تھے۔ اس عفریت نے پہلے ہی اردگرد کی ریاستوں پر قبضہ جمالیا تھا، مگر بادشاہ کی بہادر فوج کے خوف سے دشمن نے براہ راست حملہ کرنے کی بجائے سازشیں شروع کر دیں۔ تجارتی قافلوں کو لوٹا۔ اردگرد کے قصبوں میں کھرام بچایا۔ بالآخر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ 1843 میں انہوں نے قلعے کو جانے والی نہریں بند کر دیں اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ بادشاہ کی فوج نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، مگر عفریت کے پاس جہان بھر کا اسلحہ تھا۔ بالآخر بادشاہ کو شکست ہوئی۔ قلعے پر قبضہ کر لیا گیا۔ بادشاہ کو گرفتار کر لیا گیا اور کئی میل دور بنگال کے ایک شہر بھیج دیا گیا۔

عورت کی آواز یہاں پہنچ کر رندہ گئی۔ سامعین کی کشتی بھی غم کی لہروں میں چپکے لکھانے لگی۔ کہانی کے اس موڑ پر فریدوں کے دل میں اپنے محسن سے جدائی کا غم تازہ ہو جاتا ہے۔ جب میر کرم علی کو جلا وطن کر کے بنگال بھیجا جا رہا تھا، تب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اور خسر و بیک بھی ساتھ جائیں گے، مگر میر کرم علی کو یہ گوارا نہیں تھا۔ فریدوں کی ضد اپنے محسن کے حکم کے آگے ہار گئی۔ اسے جیل میں رکھ دیا گیا۔ جواب نہر کے کنارے کچے مکانات میں آباد تھا۔ قلعے پر لاکھ بڑوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک عرصے سے سندھ کی دولت پر نظریں گاڑے بیٹھے تھے۔

لٹیرے و سائل پر قابض ہو گئے تھے۔ جاگیریں ضبط ہوئیں۔ شاہی گھرانے کے معززین کے پاس فقط شاہ کے عطا کردہ جوہرات تھے، جنہیں فروخت کر کے وہ گزر بسر کا امکان پیدا کرتے، مگر فریدوں بیک کا تعاقب کرتی بد قسمتی اس بچے کچھے اٹاٹے پر بھی حملہ کرنے والی تھی۔ تقدیر اس جری شخص کا امتحان لے رہی تھی۔

ایک رات مکان میں چھائی تاریکی میں دو دہکتی

مرزا قلیچ بیک بلاشبہ جدید سندھی ادب کے بنیاد گزاروں میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ان کی انکیلی شخصیت، محنت اور کام نے جدید سندھی ادب کو جتنا ثروت مند بنایا، اتنا ثروت مند بہت سے ادارے بھی نہیں کر سکے۔ سندھی کے نثری ادب کا قلیچ بیک کے بغیر تصور بھی ممکن نہیں۔

ادبی تاریخ میں کبھی کبھی ایسی حیثیتیں بھی پیدا ہوتی ہیں، جنہیں بیک وقت مختلف تخلیقی صلاحیتیں دوایت ہوتی ہیں، وہ بیک وقت نثر و نظم میں اپنے کمالات کے ایسے جادو جگا جاتے ہیں کہ قاری فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ اپنے ممدوح کا شمار بہ حیثیت شاعر کرے یا انہیں نثر نگار کی حیثیت سے یاد کیا جائے، اردو ادب میں مولانا الطاف حسین حالی اس کی بہترین مثال ہیں۔ بالکل اسی طرح کی شخصیت سندھ ادب میں مرزا قلیچ بیک کی ہے، جنہوں نے نثر کا دامن ڈھالی تین سو کتابوں کے ذخیرے سے پر مایہ بنا دیا ہے۔ ان کا بنیادی کام وراثت جدید سندھی ادب کو عالمی ادب کے منتخب شہ پاروں سے مالا مال کرنا رہا۔

(جدید سندھی ادب از سید مظہر جمیل)

آنکھیں ظاہر ہوئیں۔ پہلے پہل جس نے دیکھا، خیال کیا کہ یہ کوئی ناگ ہے۔ ملازم لاٹھی لے آیا۔ مگر پھر ان آنکھوں کی دہک بڑھتی گئی۔ مکان کے ایک کونے میں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ آگ نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے مکان کو لپیٹ میں لے لیا۔

نصیحت کی سماعتوں سے چھین کر آئیں تو وہ سمجھا کہ کوئی سنا دیکھ رہا ہے۔ جب بڑے بھائی نے جھنجھوڑ کر اٹھایا تو وہ متحیر رہ گیا کہ آخر رات اتنی روشن کیوں ہے اور یہ حدت کیوں

بڑھ رہی ہے؟ اگر کوئی سمجھ کر نہ نکالتا، تو وہ گرتے شہتر کی زد میں آ جاتا۔ کچھ پریشان کن پلوں بعد وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مہبوت لٹا اور اس کا مکان دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ اردگرد کھرام بج گیا۔ لوگ مانی لیے دوڑے۔ کچھ لوگ برتن اٹھائے نہر کی سمت گئے۔ پورا محلہ فریدوں بیک کی مدد کے لیے آگیا، مگر نقصان پر قابو پانا محض آگ نے بڑے جھکے کو اپنی

چپے پر ان کے پیغامات ثبت ہیں۔ ان کا کلام یہاں کے بانیوں کے دل کا تار ہے۔ صوفیانہ گیتوں نے سازوں کو بھی قبولیت و مقبولیت بخشی۔ جب شامیں اترتیں تو کسی خاموش مکان میں سارنگی کے تار چھڑتے، کہیں ستارنج رہا ہوتا۔ کہیں سے بانسری کی مدھر آواز سنائی دیتی۔ یہ وہ موسیقی وہ گیت تھے، جو انسان کو اپنے خالق کی سمت متوجہ کرتے۔ روح کی غذا ثابت ہوتے۔ جب اس سنگیت کی لہریں ننھے بچے کے دل سے نکراتیں تو وہاں جل ترنگ سا بچہ لگتا اور وہ صوفیانہ کلام کی سمت کھنچا چلا جاتا۔

یہ صنم خانے اور یہ ناتوس
کاش بہت جائیں تیری راہوں سے
دیکھ ساجن تجھے بلاتا ہے
اپنا دامن بچا گناہوں سے
تو یہ شاہ لطیف کے جاودہ فیاض تھے جنہوں نے اوائل عمری میں اس کے خیالات کو جلا بخشی۔ ان ہی نغموں کی تاثیر تھی کہ اس نے ستار سے ربط پیدا کیا اور اپنی انگلیوں کی معصومانہ حرکت سے تاروں میں چھپا سر کھوج نکالا۔ ستار سے اس کی دوستی آگے کئی برس قائم رہی۔ جہاں تک شاہ لطیف سے عشق کا تعلق ہے، اس کے اختتام کے لیے خود موت کو حاضر ہونا پڑا۔ مدرسے کے ماحول سے تو ہمارے بچے کی گاڑی چھٹی تھی مگر شہر بھر میں ہونے والی تبدیلیاں اسے متعجب رکھتیں۔

دریائے سندھ کے مہر سکون پانیوں پر تیرتی کشتیوں کے درمیان ہلچل مچاتے تیز رفتار اسٹیمر اس سمیت بہت سے مقامیوں کو متحیر کر دیتے تھے۔ وہ شور مچاتے ہوئے پانی پر اڑتے معلوم ہوتے۔ نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ اس محل میں جدت درآئی تھی۔ دریا عبور کرنے کے لیے قوی الجہ پلوں کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ دیوانے کھٹ پٹ سے گونجا کرتے کہ چھاپے خانے لگ رہے تھے۔ سرکاری دفاتر میں بھی جا بجا نئے آلات۔ زندگی کا پیہر یکدم تیزی سے گھومنے لگا تھا۔

یوں تو ہر نئی شے مقامیوں کی توجہ اپنی جانب کھینچتی اور وہ راہ چلتے اسے مزہ مڑ کر دیکھتے مگر سب سے اہم تھے جا بجا کھلنے والے انگریزی اسکول جنہوں نے اقتدار سے محروم مسلمانوں کو آگ بگولا کر دیا۔ انہوں نے اُسے سازش گردانا۔ اوطاق، قبوے خانوں اور محفلوں میں وہ سائنس کی تعلیم اور نئے علوم سے متعلق کھلے عام اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔

ممکن ہے فریدوں بیک بھی کسی سطح پر اُن درسگاہوں کے بارے میں متذبذب ہو مگر ایک خاص واقعے نے اس

لیٹ میں لے لیا تھا۔ جب آگ بجھی، تو چپے لیے چھوڑ گئی۔ مکان تو کچا ہی تھا، اس کا تم نہیں، وہ تو محلہ داروں نے چند روز میں پھر تعمیر کر دیا، مگر میر کرم علی کے عطا کردہ جواہرات اس آتش زدگی نے نکل لیے۔ انمول موتی اور زیورات جل کر بے مول ہو گئے۔ آسمان تک اٹھتے دھوئیں میں تمام اسباب خاکستر ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو صدے سے ڈھے جاتا مگر اس تاریک جس زندہ رات فریدوں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ صدے دیکھنے کی اسے عادت ہو گئی تھی شاید۔

سرکار نے ایک بار پھر ملازمت کی پیشکش کی مگر اس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ غاصبوں کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کا، جنہوں نے اسے بے گھر کیا۔ اس کی دھرتی پر قبضہ کیا۔ اسے کسمپرسی قبول تھی۔ نوپیاں بنانے میں وہ خوش تھا۔ تاہم نچلا بیٹھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ وہ اپنی اولاد کو ایک جدید ہتھیار سے لیس کرنے والا تھا۔ ایسا ہتھیار، جس کی بابت کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆☆

مسلمان گھرانے میں آنکھ کھولنے والا بچہ خوش قسمتی ساتھ لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ رسمی تعلیم کے آغاز سے قبل ایک ایسی کتاب سے اکتساب فیض کرتا ہے، جو تمام علوم کا منج ہے، کتاب، جو عظیم ترین انکشاف ہے۔

بچے نے سب سے پہلے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔ اس کی قرأت متاثر کن تھی۔ آیات کی ادائیگی کے سے اس کی توجہ دیکھنے کے لائق ہوتی۔ قرآن پاک پڑھنے کے بعد اس کے لیے اچھے استاد کی کھوج شروع ہوئی۔ اس زمانے میں اساتذہ کو معاشرے میں کلیدی درجہ حاصل تھا۔ معززین بھی ان کے استحصال کو کھڑے ہو جاتے۔ یوں تو کئی اساتذہ مشہور تھے، جن میں کچھ اپنا کتب چلاتے اور کچھ گھروں میں جا کر تعلیم دیتے، مگر بچوں کی نظر انتخاب آخوند محمد شفیع کی درس گاہ پر ٹھہری جس کی قابلیت کا ایک زمانہ معترف تھا۔

مدرسہ نہر کے شمالی سمت تھا۔ درختوں میں چھایا ہوا۔ مہر سکون اور کشادہ۔ ماحول نیا تھا مگر ایسا بھی نہیں کہ بچے کو کوئی دقت ہوتی۔ فارسی اور عربی دونوں سے واقف تھا۔ جلد اس کی گفتنی نمایاں طلبا میں ہونے لگی۔ جو دیکھتا یہی کہتا ہے کہ واقعی مرزا فریدوں بیک کا پسر ہے۔

سندھ کو صوفیاء کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ یہاں چپے

سر سید کی تحریک کے آغاز کا زمانہ تھا۔ سندھ کے شہری علاقوں میں دھیرے دھیرے ان کا پیغام قبولیت حاصل کرنے لگا تھا۔ جب گرما کی چٹکی دوپہر فریدوں بیک نے اپنے لڑکوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا اعلان کیا تو احباب نے بہت واویلا کیا۔ ”جناب، آپ خود ان ظالموں کا شکار بنے، اب ان کے بچھائے نئے جال میں کیوں پھنسنے ہیں؟“

جواب میں وہ مسکرایا۔ ”بھائیو، انگریز ظالم، ان کی غلامی لعنت، مگر ان کے علوم سے دشمنی کیسی۔ شیخ سعدی کا قول ہے، علم شیطان سے جنگ میں بہترین ہتھیار ہے۔“

کسی اور نے اعتراض کیا، تو وہ گویا ہوا۔ ”عزیزو، سائنسی ایجادات اور ترقی تو انسانیت کی فلاح کے لیے ہے۔ انگریز ہمیشہ یہاں تھوڑی رہنے والے۔ چلے جائیں گے تو پھر ہم حکومت کریں گے۔“

شاید اس کے احباب دیگر باتیں نہ سمجھ سکے ہوں، مگر انگریزوں کے واپس چلے جانے کی پیشگوئی نے دھڑکن تیز کر دی۔ وہ خواب بھر جگا دیا، جسے وہ بھلا بیٹھے تھے۔

اور اگر ان دلائل سے بھی کوئی نہ مانا، تو اُسے یوں قائل کیا۔ ”اب انگریزوں نے یہ علوم دیکھے کس سے؟ ایک زمانے میں یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا تب مسلمان کیما، طبعیات اور حیوانیات میں نئی نئی جہتیں کھوج رہے تھے۔ فلسفہ اور منطق بھی ہماری دین۔ ریاضی میں ہمارے کارناموں سے ایک عہد واقف۔ ہمارے ہی علم سے اب وہ لوگ استفادہ کر رہے ہیں جناب۔ اور علم تو مومن کی گمشدہ میراث ہے۔“

فریدوں کے دونوں بڑے لڑکوں نے انگریزی اسکولوں سے پڑھا۔ اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے بمبئی کا رخ کیا، مگر اُس کے جس سپوت کو سندھی ادب کو نئی صورت ادا کرنی تھی، اُسے ابھی کچھ انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

”مالی حالت خستہ۔ بیوی سلائی کڑھائی کر رہی، خود نوپیاں بنائیں، ایسے میں کیا ضرورت تھی لڑکوں کو بمبئی بھیجنے کی۔ کیا قرآن، عربی اور فارسی کی تعلیم کافی نہیں تھی؟“

محافل میں تو معززین شہر اس قسم کی باتیں کرتے، مگر دل ہی دل میں اس کی ہمت کی بھی داد دیتے۔ اس کے حوصلے سرخ کرتے۔ شکست خوردگی سے ابھر کر مالی وسائل کے باوجود محسوس کو اعلیٰ درس گاہوں میں تعلیم دلانا واقعی ایک بڑا کام تھا، جس پر فریدوں بیک کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

کے ذہن کی زمین پر تبدیلی کا بیج بویا۔ گو سندھی اس کی مقامی زبان نہ تھی مگر وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتا تھا، جتنا کسان اپنے کھیت سے کرتا ہے۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس زمانے میں سندھی زبان کے بارہ رسم الخط رائج تھے۔ کوئی فارسی خط میں لکھتا تو کوئی دیوناگری میں۔ ہر بڑے شہر کا اپنا رسم الخط۔ اس کی وجہ سے یگانگت کی واضح کمی محسوس ہوتی۔

جب انگریزوں نے اعلان کیا کہ وہ ایک مشترکہ اور متحد رسم الخط لانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو سراسیمگی پھیل گئی اور کھیتوں پر اندیشے اتر آئے۔

بہت سوں نے اسے جدیدیت کی آڑ میں نئی سازش قرار دیا، مگر جب اس عمل کے لیے سندھ کے اسکالرز سے رابطہ کیا گیا اور ان کی تجاویز کی روشنی میں کام شروع ہوا، تو فریدوں بیک جیسے کچھ باشعور افراد کا ذہن دھیرے دھیرے تبدیل ہونے لگا۔ اس نے بلاؤ کے اس عمل کو بے حد قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں تختیوں پر اضافی نکتے لگائے گئے۔ زبان میں موجود تمام آوازوں کو الفاظ میں قید کیا گیا۔

غدر سے کچھ برس قبل یہ رسم الخط سندھ میں رائج ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

اس کی چٹکی اور افادیت نے جلد ہی اسے قبولیت کی سند ادا کر دی۔ انگریزوں سے ہونے والی میل ملاقاتوں نے سوچنے کی نئی جہتیں عطا کیں تاہم فریدوں بیک ہنوز متذبذب تھا۔ مگر پھر جون کی ایک جھپ زوہ دوپہر جب وہ برگد کے نیچے چار پانی ڈالے بیٹھا تھا اور کچھ چھاؤں کی آغوش میں نیند میں اتر چکا تھا، نہر کی سمت سے آنے والی ہوائیں غنوغی کا جھوٹکا لائیں۔ اس نے ایک بار پیش بزرگ کو دیکھا۔ نورانی چہرہ۔ لمبا پنچھ۔ سر پر ٹوپی۔ وہ کوشش کے باوجود شناخت نہیں کر سکا کہ یہ شخص میر کرم علی ہے یا وہ صوفی جسے اس نے کم سنی میں شاہ ایران کے دربار میں دیکھا تھا۔

”اصل غلام وہ ہے، جس کا ذہن غلام ہے، نہ کہ وہ جس کی سلطنت پر غیروں نے قبضہ کر لیا۔“

یہ الفاظ اسے غنوغی سے یکدم باہر لے آئے۔ کچھ دیر وہ سکوت میں سانس لیتا رہا۔ شاید ان کی تفہیم میں کچھ اور وقت لگتا، اگر شام میں خسرو بیک کے ساتھ ہونے والی بیٹھک میں ایک مصلح کا ذکر نہیں چھڑتا، جو برصغیر کے مسلمانوں کو جدید علوم کی جانب راغب کرنے کے لیے خود کو تیج چکا تھا۔ وہ

مطالعے کا حامل یہ نوجوان سمجھ چکا تھا کہ آنے والا زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ انگریزی ہی ابلاغ کی کلیدی زبان ہوگی۔ سو جہاں عربی اور فارسی پر دسترس حاصل کی۔ وہیں انگریزی بھی جم کر پڑھی۔

وہ مزید پڑھنا چاہتا تھا، مگر خزاں کی ایک شام جب تیز جھکڑ کھجور کے درختوں سے ٹکرا کر شور پیدا کرتے اور گلیوں میں دھول اڑ رہے تھے، اسے یکدم ادراک ہوا کہ ماں باپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اس نے باپ کی سمت دیکھا تو ایک جھریوں زدہ چہرہ دکھائی دیا۔ ماں کے ہاتھوں میں رعشا تر رہا تھا۔ مکان کی دیواروں میں بھی دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ چھت بارش میں ٹپکنے لگی تھی۔

خزاں کی اس شام سچ کے شعور نے چھلانگ لگائی۔ وہ اچانک سمجھ دار بن گیا۔ خرد غلامی سے آزاد ہو گئی۔

شام جب اس کے دوست میر خورشید نے دروازے پر دستک دی کہ ان کا ارادہ ایک مشاعرے میں شرکت کا تھا، تو اس نے بڑی محبت سے انکار کر دیا۔ ”مجھے کچھ ضروری کام ہے۔“ حیرت میں غلطاً اس کے دوست کے لیے یہ سمجھ پانا مشکل تھا کہ شاعری کے رسیا سچ کو اچانک کیا ہوا۔

عشائیہ کے بعد جب اس نے فریدوں بیک کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا، تو وہ چونکا ضرور مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ جب عورت اپنے شوہر کی پراسرار خاموشی سے پریشان دکھائی دی، تب اس مرد بحران نے کہا۔ ”نیک بخت اب وہ سیانا ہو گیا ہے۔“

فریدوں نے خود تو سرکاری ملازمت نہیں کی تھی، مگر جب بیٹے نے اپنی خواہش ظاہر کی تو اس کے پاس اعتراض کی کوئی وجہ معقول نہیں تھی۔ اگر اعتراض کرتا، تو لوگ پوچھتے، میاں پھر اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کس لیے دلائی تھی، چھتی باڑی کرنے کے لیے۔

سچ نے عملی زندگی میں قدم رکھنے کا نل فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے کسی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی قابلیت اس کی عرضی تھی۔ یقین محکم اس کی سفارش تھا۔ تو شہر کے ہائی اسکول میں فارسی کا استاد لگنا خاصا سہل رہا۔ اور وہ ایک اچھا استاد ثابت ہوا کہ جہاں فارسی کے معتبر شعرا کا کلام ازبر، وہیں ان میں پنہاں معنی کا بھی ادراک۔ پھر اپنی زمینوں سے بھی گہرا شغف، جس کے طفیل پیغام مقامی مثالوں کے ساتھ طالب علموں کی پہچان اور ان کے ذہنوں پر ثبت ہو جاتا۔ سعدی کی حکایات اُن کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنیں اور حافظ کی شاعری

فریدوں بیک نے پیٹ کاٹ کر اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی اور اس کا سب سے زیادہ احساس اس کے تیسرے لڑکے سچ بیک کو تھا، جو حساس دل اور روشن ذہن لے کر پیدا ہوا تھا۔ گونو جوانی کی دہلیز پر تھا، پر لڑکا خرافات سے دور ہی رہا۔ جب اس کے ہم عمر میلوں ٹیلیوں میں دل بہلا رہے ہوتے، وہ شمع کی مدھم پڑتی روشنی میں مطالعے میں غرق ہوتا۔ جب اوروں کے ہاتھ میں غلیل ہوتی، اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا۔

درمیانہ قد۔ صاف رنگت۔ کشادہ ماتھا۔ روشن مسکراتی آنکھیں۔ لباس سادہ مگر بے داغ۔ باوقار چال۔ سچ اپنے باپ کا عکس تھا اور اس کے مانند علم و ادب کا دلدادہ۔ اینٹلو ورنیکو اسکول میں اساتذہ کا چہیتا تھا وہ۔ ہاں، اپنے عمر کے لوگوں سے ہم آہنگ ہونا اس کے لیے تھوڑا مشکل تھا کہ اس کی پرورش دو بوڑھوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک خسرو بیک اور دوسرا اس کا باپ فریدوں بیک۔

دونوں دوست جب شام میں بیٹھتے تو سچ بھی بڑوں کی اس محفل میں شامل ہو جاتا۔ انہیں سیاسی اور علمی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھتا، جرات کر کے سوالات بھی کر لیتا۔ اسی صحبت نے شعر کہنے کی جوت جگائی۔ ابتدائی سامع اس کے نانا اور والد ہی تھے، جنہوں نے فقط حوصلہ افزائی نہیں کی، غلطیوں کی جانب بھی توجہ دلائی۔

یوں تو سب ہی لوگ دینی رجحان رکھتے تھے مگر انگریزوں کے ہاتھوں شکست نے انہیں مزید مذہبی بنا دیا تھا۔ البتہ صوفیاء کے نقش قدم کا تعاقب کرنے والے سندھ کے باسیوں نے شدت پسندی سے ہمیشہ اپنا دامن پاک رکھا۔ شاہ لطیف کے محبت بھری حکایت ان کی زندگی کا جزو تھے۔ معززین شہر بھی موسیقی کے شغف رکھتے۔ خود سچ بہت عمدہ ستار بجاتا تھا۔ ساز تھامتے ہی وہ خود کو بھول جاتا۔ انگلیاں تاروں سے مل جاتیں اور ماحول پر ظہم طاری ہو جاتا۔

اس کی مہارت دیکھ کر ایک بوڑھی عورت نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کہیں لڑکا تعلیم وغیرہ چھوڑ کر سانپانہ ہی نہ بن جائے۔ یہ اندیشے ماں کے دل پر کسی گھوٹے کی طرح لگے۔ وہ ضد کرنے لگی کہ لڑکا کافی الفور ستار چھوڑ دے۔

جب بات بڑھی تو گھر کے سربراہ کو درمیان میں آنا پڑا۔ ”ایسا ہی ہوگا نیک بخت۔ بس صحیح وقت آنے دو۔“ اب سچ میں تہدیلیاں آرہی تھیں۔ گزشتہ نسل تو انگریزوں سے تعلق قائم کرنے میں متذبذب تھی، مگر وسیع

کلام فلج کے چند نمونے
پردہ اٹھے گا جب جدائی کا
حال کھل جائے گا خدا کی

سے کدے میں میں میا تھا پاک دامن کی طرح
اور لوٹا ہوں وہاں سے چاک دامن کی طرح

آہیں ہوئیں جو بند تو اشکوں کی جھڑی ہے
بڑھ جائے اگر جس تو برسات کھڑی ہے

دریا کنارے جا کے بیٹھا اک دن تو کیا دیکھتا ہوں
دریا کے اندر کشتی ہے اور کشتی کے اندر ہے دریا

بیٹھا ہوں پاس آ کے تو اس پر برا نہ مان
میں خار ہوں اور پہلوئے گل کا نصیب ہوں

(ترجمہ: مسلم شمیم)

کیا نہیں تھا وہاں۔ انگریزوں کی ترقی کے تمام رنگ
ادھر بکھرے تھے۔ منظم ریل کا نظام! جہاز سازی کے بڑے
بڑے کارخانے۔ درس گاہیں۔ نئے نئے اخبارات اور
رسائل۔ بحیرہ عرب کی سب سے بڑی بندرگاہ تصور کیا جانے
والا بمبئی تیزی سے مغربی طرز ثقافت اپنا رہا تھا۔ انگریزوں کی
وہاں بھر مار تھی۔ البتہ ایسا نہیں تھا کہ مقامی زندگی کی دوڑ میں
پچھے رہ گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہی اس نظام کی روح تھے۔
حاجی علی کی درگا۔۔۔ کی وجہ سے معروف اس شہر کی ترقی میں
مقامیوں کا جذبہ اور خلوص شامل تھا۔

یہاں بمبئی ایٹیشن کا بیج تھا۔ ادھر ہی سے سندھی
ادب کو نیاروپ عطا کرنے والے فلج بیک کو اکساب فیض کرنا
تھا۔ اس کے بڑے بھائیوں نے بھی ادھر ہی پڑھا تھا۔

وہ بحری جہاز کے ذریعے اس جادوئی بندرگاہ پر اترا
تھا۔ بندرگاہ پر پھیلیوں کی بو سے زیادہ ان کھانوں کی مہک تیر
رہی تھی، جن کے مسالوں کی شہرت سمندر عبور کر چکی تھی۔ وہ
بازاروں کی چہل پہل دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک نفیس بمبئی
میں سوار اپنے کالج پہنچا۔ وہاں قدم رکھتے ہی یوں لگا، جیسے وہ
کہانیوں کی دنیا میں آگیا ہے۔ ایسی درس گاہوں کا تذکرہ تو فقط
کتابوں میں ہوا کرتا تھا۔ ہرے بھرے درختوں کی اوٹ میں

ان کی تخیل کو پرواز عطا کرتی۔ شاہ لطیف کا تذکرہ یہاں
ضروری نہیں، وہ تو اس خطے کی رگ رگ میں سویا ہوا تھا۔ شاہ
جور سالوین پسند کتاب تھی۔

فریدوں بیک اپنے ہونہار سپوت کو نئی نسل کی تربیت
کرتا دیکھ کر جہاں جی ہی جی میں خوش ہوتا، وہیں اسے یہ قلق
بھی تھا کہ فلج گھریلو ذلتے داریوں میں الجھ کر اعلیٰ تعلیم سے
محروم رہ گیا ہے۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ بھی بڑے
بھائیوں کی طرح بمبئی جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔

یہ خواب پورا تو ہوا، مگر اس کی تکمیل وہ اپنی آنکھوں سے
نہیں دیکھ سکا۔ 1873 میں رومی زار کے دورہ لندن کے چند
روز بعد... جب مہران پر سرما کی اولین دھند چھائی تھی اور
سندھ صوبہ رومی سے بہہ رہا تھا، فریدوں بیک نے دروازے
پر موت کی دستک سنی اور اسے اندر آنے کی اجازت دے
دی۔

یوں وہ باہمت فحش، جو بیڑیوں میں اس خطے میں
داخل ہوا، اپنی خدا داد صلاحیتوں کے ذریعے میروں کے دربار
میں اہم ترین عہدے تک پہنچا اور بادشاہ کی معزوری کے بعد
اس کے خاندان کی دیکھ کر تار پا۔۔۔ بڑی طمانیت کے ساتھ
موت کے ہمراہ چلا گیا کہ وہ اپنا فرض ادا کر چکا تھا۔
وہ ایک حقیقی سوریہ تھا، جس نے شکست خوردہ فحش کی
 بجائے ایک سچے سپہ سالار کی موت قبول کی۔

تدفین والے روز آسمان نے گرج کر فریدوں بیک کی
بلندوصلگی کو خراج تحسین پیش کیا، بارش نے زمین نرم کر دی
اور وہ اپنی دھرتی کے سینے میں سما گیا۔

☆☆☆

کہانی کا یہ ٹکڑا سا حلوں چمکسا گیا تھا۔ اگر سترہویں
صدی کے اواخر میں ایٹ انڈیا جی ایئر لائنز سورت سے ادھر
منتقل کر کے اُسے پرینڈنسی ہیڈ کوارٹر کا درجہ دے دیتی، تو نہ
ہی 1845 میں تمام جزائر جوڑ کر اکائی بنانے کا منصوبہ پایہ
تکمیل کو پہنچتا اور نہ ہی بیسویں صدی کے اوائل میں جارج
چیم کے استقبال کو ادھر گیٹ دے آف انڈیا کی تعمیر کا خیال
سامنے آتا۔ تاہم آخر الذکر واقعہ ابھی چالیس برس دور تھا۔
ابھی فضا صاف تھی۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی کا بمبئی ایک بھر اپرا
شہر تھا۔ بحر ہند کی لہریں اُس کے ساحلوں سے ہم آغوش
ہوئیں تو بانیوں پر پرواز کرتے چھپی عالم مستی میں جست
لگاتے اور سطح پر تیرتی پھلی دیوچ لیتے۔

چھپی عمارتوں میں بے آواز چلتے اساتذہ۔ ٹولیوں کی صورت
بٹھنے طالب علم۔ چھت تک کتابوں سے بھری لائبریریاں۔
تقلص علیہ۔

کچھ خوش ضرور تھا مگر مرعوب نہیں تھا۔ سندھ کی دھرتی
اسے جو اعتماد عطا کر چکی تھی، اس میں لغزش لانا مشکل تھا، مگر
بہمی کو اس کی خواہش نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی فریدوں بیک کے
دو بیٹوں پر اپنی محبت نچھاور کر چکا تھا اور اب اس مسلم نوجوان کا
ہمسفر بننے والا تھا، جس کی مسکراتی آنکھوں میں غصہ کی
قابلیت پوشیدہ تھی۔

کچھ مکان میں آنکھ کھولنے والے کچھ کے یہاں پہنچنے کا
ایک سبب تو اہل عیال ٹھہرے، جن کا اصرار تھا کہ اسے بہمی چا
کر اپنے مرحوم باپ کی آخری خواہش ضروری پوری کرنی
چاہیے۔ جب اس نے ارادہ باندھا لیا، تو پھر راستہ بھی نکل
آیا۔ سیانے کچھ ہی کہتے ہیں، محنت کرنے والوں کی بھی ہار
نہیں ہوتی۔

کالج نے اس کی قابلیت دیکھتے ہوئے بیس روپے کا
وظیفہ جاری کر دیا، جو کہ ضرورت کے لیے کافی نہیں تھا۔ بہمی
مہنگا شہر تھا... مگر قناعت پسند کچھ مطمئن تھا۔

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ کچھ نے جلد بارشوں کے شہر سے
دوستی کر لی۔ چھتری لیے مون سون کی بارشوں میں گھومنے کا
تجربہ اسے بھانپ گیا۔ نیا ماحول اس آگیا تھا۔ جب سینہ برستا
اور وہ ستار کے تار چمڑتا، تو ایک طلسمانی لمحے کا جنم ہوتا اور
ہاسٹل میں اس کے کمرے کے باہر طالب علموں کا ہتھکھا لگ
جاتا، جو حیرت اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس
انجینی کو نکلتے تھے۔ اس کی فطری دانش اور بے ساختگی نے
اساتذہ کے دلوں میں جگہ بنانے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔
مرانچی اور گجراتی بھی اس نے ادھر ہی سیکھی۔ اس روانی سے
بولتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔

چند مورخین محبت کے بے بدول تجربے کا بھی ذکر کرتے
ہیں۔ اور یہ قابل فہم ہے۔ محبت ایک فطری جذبہ جو ہے۔
وجہہ کچھ کا دل کسی دوشیزہ کی سمت مائل ہونا بھی امکانی ہے
کہ آخر وہ بہمی میں تھا، جو آج کے مانند اس زمانے میں بھی
سپنوں کی مگنری تھا۔ لیکن یہ جادو ایسا بھی نہ تھا کہ کچھ کو راء
زیست سے بھٹکا دے۔ دل پر دستک ضرور ہوئی ہوگی، مگر
دروازہ نہیں کھولا گیا۔ بس کھڑکی ہی سے سلام دعا ہوگی۔ کوئی
دوشیزہ ملی ہوگی، تو جاں نثار اختر والا لہجہ اپنایا ہوگا:
تو بھی اک دولہا نایاب ہے، پر کیا کیے

ملہنامہ مسرگزشت

زندگی اور بھی کچھ تیرے سوا مانگے ہے
ماں نے شاہ لطیف کے اشعار کے سائے میں اس لیے
رخصت تھوڑی کیا تھا کہ وہ کسی کی زلف کا اسیر ہو کر تعلیم سے
غافل ہو جائے۔ ادھر بہمی میں جو اساتذہ میسر آئے، ان میں
حیرت دہلوی نمایاں ترین، عالم فاضل آدمی۔ وضع دار،
بااخلاق۔ مون سون کی ایک سہ پہر جب نئی وضع قطع کے ایک
نوجوان کو انہوں نے اپنی کلاس میں دیکھا تو گہری نظروں
سے جائزہ لیا۔ تجربے کا رانکھوں نے پرکھ لیا کہ ماتھا ذہانت
کی گواہی دیتا ہے۔ ایک پریچ سوال اس کی سمت پھینکا، جب
اس نے بڑے اعتماد سے جواب پیش کیا، تو جان گئے کہ شاگرد
مل گیا ہے۔

حیرت دہلوی کی توجہ نے نوجوان کی صلاحیتیں نکھارنے
میں بڑا کام کیا۔ اس کا نقطہ نظر وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ قلم
کی قوت حقیقی معنوں میں آشکار ہوئی اور کتابوں سے عشق گہرا
ہونے لگا۔ یہ خیال بھی راسخ ہونے لگا تھا کہ غلامی مستقل
نہیں۔ آج نہیں تو کل... انگریزوں کو یہاں سے جانا پڑے
گا۔ مایوسی کا کرب جلد چھٹ جائے گا۔ وہ احساسات سینے
میں تھے، جنہیں کئی برس بعد سرور بارہ بنکوی نے الفاظ دیے۔

رات کا انجام بھی معلوم ہے مجھ کو سرور
لاکھ اپنی حد سے گزرے تا سحر، جائے گی رات
کچھ فارسی اور عربی پر تو خوب گرفت رکھتا تھا، انگریزی
سے بھی اچھی سمجھتی تھی، تو استاد نے اسے ترکی زبان سکھانے کی
ٹھانی۔ استاد سیر تو شاگرد سوا سیر۔ ترک گھوڑے پر سواری میں
زیادہ وقت نہیں لگا۔ کچھ ہی روز میں کچھ کے تاج میں ایک اور
پرکا اضافہ ہو چکا تھا۔

نوجوان کا زیادہ وقت اونچے ستونوں والی لائبریری
میں گزرا کرتا۔ وہاں کا سکوت اُسے لطافت کے احساس سے
بھر دیتا۔ اپنے وطن سے دوری کا غم کچھ کم ہو جاتا۔ لائبریری
میں جہان بھر کے موضوعات پر کتابیں تھیں۔ دریائے سندھ
کے کنارے سے آئے نوجوان نے جم کر مطالعہ کیا۔ اور اسی
بے انت مطالعے کے دوران وہ خیال اُس پر اترا، جس نے
اُس کی زندگی کو نئی ترتیب عطا کی۔

ہوایوں کہ کچھ جب بین الاقوامی شعرا کو پڑھتا، تو جہاں
اُن کی تخلیقی جہت اور ادبی گرفت پر عرش عرش کراٹھتا، وہیں یہ
بہمی اُسے تجسس رکھتا کہ ایسا ہی پیغام وہ کہیں اور بھی پڑھ
چکا ہوگا... ایسے ہی احساسات کسی اور نے بھی اس میں
اجاگر کیے تھے۔

اب قاصد نہ نامہ کوئی، آیا نہ پیغام

کوئی تو دیس سے آیا ہوتا، نامہ میرے نام

قید کے ہیں ایام، کون سند یہ لائے

یہ شاہ لطیف کا تذکرہ ہے، جس کی شاعری کے آفاقی رنگوں سے مماثل رنگ اسے بین الاقوامی ادب میں جا بجا نظر آتے تھے۔ اسی تجربے نے پہلے پہل یہ خواہش جگائی کہ وہ اپنے دیس کے اس بظلم جلیل کو دنیا کے سامنے متعارف کروائے۔

اور پھر ایک واقعہ ہوا۔

فلج کے عکیت نے اسے جن معززین کی قربت عطا کی، ان میں سر آغا خان دوم کا گھرانا بھی شامل تھا، جن کے بیٹے آغا اکبر شاہ سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ اس دوستی کا ایک سبب جہاں مشترکہ عالمی مشاغل ٹھہرے، وہیں یہ وجہ بھی تھی کہ آغا اکبر حیرت دہلوی کی شاگردوں میں شامل تھے۔

تو ایک روز علی اکبر کے ساتھ فلج نے ایک اعلیٰ سطح کی تقریب میں شرکت کی، جہاں آکسفورڈ سے آئے کچھ طلباء بھی موجود تھے۔ چائے کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو شاعری کا موضوع نکل آیا۔ ہر کوئی اپنے من پسند شاعر کا کلام پیش کرنے لگا۔ فلج کی باری آئی تو اس نے بھٹ شاہ کے درویش کے اشعار کا ترجمہ پیش کیا۔

روز اول سے روز ابد تک سب ہی پر وہ قادر ہے

جلوے بھی ہیں سارے اس کے اور وہ خود ہی ناظر ہے

سننے والے جموم اٹھے۔ پوچھا کیے، یہ شاعر کون ہے

جناب؟

جب لڑکے نے صوفی کی زندگی کے چند گوشوں پر روشنی ڈالی، تو فرمائش ہوئی کہ کچھ اور اشعار سنائے۔ اس نے گیت چھیڑ دیے۔

گرن چک اور جموم کے آئے بدلا

چم چم چمکے کھن کھن گرجے بر سے میکھ

میرا اثر الفاظ سامعین کے دلوں میں اترنے لگے۔

ہر موضوع چھوڑ کر سندھ دھرتی کے اس شاعر پر مکالمہ شروع ہوا۔ کسی نے کہا ”آج کا فلاں انگریز شاعر بھی یہی کہہ رہا ہے۔“ دوسرا بولا، جناب آج کی کیا بات کرتے ہیں، شیکسپیر نے بھی فلاں فلاں بند میں یہی بات کہیں۔ چند نے غلطی کا ذکر کیا، چند نے کشیش کا۔ ولیم ورڈز تھ کا بھی نام لیا گیا۔

اپنے معشوق کے والہانہ تذکرے نے اس پر سرشاری

ماہنامہ سرگزشت

طاری کر دی۔ لوٹتے سے جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ آغا اکبر نے خوشی دیکھی، تو ٹھوکا دیا۔ ”دوست، آج تو محفل لوٹ لی۔“ پھر کچھ سوچ کر کہا۔ ”تم شاہ لطیف کا انگریزی میں ترجمہ کیوں نہیں کرتے؟“

وقت جیسے یکدم ٹھہر گیا۔ ہوا تھم گئی اور بلند یوں میں پرواز کرتے پرندے منجمد معلوم ہونے لگے۔

”کون میں؟“ وہ ہکلا یا۔

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ تم سے بہتر بھلا کون کر سکتا

ہے۔“ دوست نے دوست کا حوصلہ بڑھایا۔

والہی کا سفر کیسے طے ہوا، دریا خاموش تھا یا منہ زور، تانگے یکدم غائب کیوں ہو گئے تھے، موسم خشک تھا یا جس زدہ... یہ سب باتیں غیر متعلقہ ہو گئیں۔ وہ اپنے تخیل میں دست بستہ کھڑا تھا، ٹیلے پر درویش موجود تھا، ہاتھ میں طنبورہ، جس کے تاروں پر کائناتی ساز چھڑے تھے۔

وہ رات بے حد انوکھی تھی۔ ایک ایک کر کے مقاصد زندگی خود کو منکشف کرنے لگے۔ کلام لطیف کو انگریزی میں ڈھالنا... دنیا بھر کے ادب کا اپنی مادری زبان میں ترجمہ... سندھی ادب کی صورت گری۔

اسے اپنا مقصد مل گیا تھا۔ مگر پھر... ایک حادثہ ہوا۔

☆☆☆

صدیوں قبل، جس زمانے میں فرعون کی فوجیں نیل میں غرق ہوئیں، ہندوستان کی دھرتی پر ایک گیانی نے جنم لیا تھا، جو کہا کرتا تھا ”بھکشو، وابستگی سے یا جنم لیتی ہے اور یاد سے خواہش۔ اور خواہش دکھ ہے۔“

گوتم بدھ کے ان سادہ سے الفاظ میں کتنی گہری حقیقت پنہاں ہے، اس کا مطلب فلج نے تب جانا، جب ایک گرد آلود صبح اسے وطن سے ایک تار موصول ہوا۔ بری خبر کا جھٹکا اس کے دل سے نکل آیا اور روح میں اتر گیا۔

اس کی ماں... وہ مہذب اور ذہین عورت جس نے کنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنے بچوں کی پرورش شہزادوں کی طرح کی، شدید غلیل تھی۔ وہ آواز جس نے سندھو دریا کے کنارے اسے دعاؤں میں رخصت کیا تھا، اب کمزور پڑ گئی تھی۔

کالج کے آخری سال کا وہ طالب علم سب چھوڑ چھاڑ کر اپنے چھوٹ گیا، تاکہ وہ شفیق چہرہ دکھ سکے، جس نے کم سنی کے خوف میں اس پر سایہ کیا اور زندگی کی سیاہ تاریک راتوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

تار موصول ہونے کے بعد جس خطرے نے دل پر

ماہ 2015ء

75

تک دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ ہاپنے لگا۔ جب دھند چھٹی تو اس نے خود کو ایک ریگستان میں پایا۔ دور ایک ٹیلا تھا، جہاں ایک درویش کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں ساز محبت تھا۔ ہرن وادیوں میں رقص کرتے تھے۔

جب وہ پسینے میں شرابور اپنے بستر سے اٹھا، تو جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ اسی شام وہ سامان باندھ کر بندرگاہ کی سمت چل دیا۔

سندھ اپنے سپوت کو پکار رہا تھا۔

☆☆☆

گوٹھ کو بندرگاہ کا درجہ حاصل کیے ایک صدی بیت چکی تھی۔ اقتدار خان آف قلات کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے پاس آئے ہوئے بھی خاصا وقت گزر گیا تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے موقع پر ایک بغاوت ضرور ہوئی، مگر اسے چل دیا گیا۔ جس سے قلات نے اس شہر میں قدم رکھا۔ برصغیر کی سیاست میں مرکزی کردار ادا کرنے والے محمد علی جناح کی پیدائش ہو چکی تھی۔

ساحلی شہر میں نئے جیون کا آغاز کرنے والے مرزا قلیج بیگ نے ابتدا میں بڑے بھائی کے ہاں قیام کیا۔ کراچی کے معتدل موسم نے طبیعت کو سنبھالا دیا۔ اکتاہٹ کچھ ٹوٹی تو شعر کہنے شروع کیے۔ گلستان و بوستان حفظ تھی، تو اظہار فارسی ہی میں کیا، پر انداز صوفیوں سا رہتا۔ موضوع آفاقیت۔ زبان سادہ اور رواں۔ البتہ ہیئت نئی۔

شاعری ادبی ذوق کی تسکین کا تو سبب بنی، مگر ماں کے غم سے ابھرنے کا امکان اس وقت پیدا ہوا، جب فریدوں بیگ کا یہ سپوت بھی بدل کر شہر کی گلیوں میں گھومنے لگا۔ کبھی مزدور، کبھی ماہی گیر، کبھی درویش۔ وہ نئے نئے لوگوں سے ملا کرتا۔ ان کی میٹھک میں جاتا۔ سچ ان کے مسائل سمجھنے لگا، تو دھیرے دھیرے اپنا غم بھی بھولنے لگا۔

دلاور بھائی کے بچے کی تشدد کی کا کرب لیے وہ شہر کی گلیوں میں کئی راتوں گھومتا رہا۔ زلیخا کے جنگ میں کام آنے والے شوہر کی پتا سنتے ہوئے دنیا چپکے سے رات میں ڈھل گیا اور بھوک کا احساس مٹ گیا۔ لکشمی کے گھوڑے کی چوری کی رپورٹ لکھوانے کی کوششوں میں کتنے ہی روز خوار ہوا۔

وہ اپنے دوست ہیرا نند سے کہا کرتا۔ ”برادر۔ ان گلیوں میں تو غم کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ آہ، شرم کی مٹی میرے دل میں کھب گئی۔ کیا میرے یہ زخم بھر سکیں گے برادر؟“

زلزلہ طاری کر دیا تھا، وہ سامان باندھتے ہوئے، بحری جہاز میں سوار ہوتے ہوئے اور طوفانی بارشوں میں سفر کرتے ہوئے قائم رہا، پر جب کراچی کی بندرگاہ قریب آئی... یکدم بچھا ہوا سمندر خاموش ہو گیا۔ ہر طرف اداسی چھا گئی۔

سچ نے سسکی لی۔ حادثہ ہو چکا تھا۔ جس روز اس نے اپنے آبائی وطن میں قدم رکھا، ماں کی تدفین کو تیسرا روز تھا۔ قبر کی مٹی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی اور اس کا امکان بھی نہیں تھا۔ آنسو اس کی نمی میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایک بیٹے کے آنسو، جس کے ماتھے کی کشادگی کچھ ماند پڑ گئی اور آنکھ کی روشنی دھیمی پڑنے لگی۔ یوں لگتا تھا، جیسے کسی نے اُس کا خون نچوڑ لیا ہو۔

آنے والے دن بخیر بستہ ہوائیں ساتھ لائے۔ اتنا پالا پڑا کہ زندگی ٹھہر گئی اور ندی جم گئی۔ رات چاندنی دھندلی سی ہوئی۔ چٹھی، ہجرت کر گئے اور شہر پر ویرانی اتر آئی۔

سچ بیمار پڑ گیا تھا۔ بیمار داروں کی کوششیں کام نہ آئیں۔ حکیموں کے نسخے بے کار گئے۔ افسردگی نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ زندگی سے ناتا توڑنا چاہتا ہے۔ بہمنی سے دوستوں کے خط آئے۔ اساتذہ نے بھی خیریت پوچھی، مگر وہ کسی مکتوب کا جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔

گھر والوں کا خیال تھا کہ اگر وہ یہیں رہا، تو بیماری اور اس کے جسم کے سچ انٹوٹ رشتہ بن جائے گا اور راتوں کو چھایا رہنے والا غبار اُس کا نصیب ہوگا۔ تو انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ بہمنی لوٹ کر تعلیم پھر شروع کرے۔

وہ بہمنی لوٹا ضرور، مگر اب اس شہر کے پاس نوجوان کے درد کی دوا نہیں تھی۔ بحر ہند کی لہریں اپنی موسیقیت سے محروم ہو چکی تھیں۔ ساحلوں پر قدم واز کرتے۔ اکتاہٹ کا شکار نظر آتے۔ ریل کی چمک چمک کا طلسم ماند پڑ گیا۔ بازاروں کا شور اپنا جادو کھو بیٹھا۔

سچ تو یہ ہے کہ بہمنی پہنچ کر اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ یوں لگتا، جیسے ہر منظر دبیز دھند میں گم ہو گیا ہے۔ وہ کئی کئی روز اپنے بستر پر پڑا رہا۔ اداسی کی ایسی ہی ایک رات اس نے خواب میں وہ منظر دیکھا، جو اس نے اپنی ماں کی موت سے ایک رات قبل دیکھا تھا۔

وہ ہولناک طوفان میں گھرا تھا۔ بھید بھری تاریکی۔ ہاتھ کو ہاتھ بچھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں ایک آواز اُسے اپنی سمت پکار رہی تھی۔ وہ آواز کی جانب دوڑتا چلا گیا۔ بہت دیر

کیا آپ لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مقوی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک دی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک
لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

”یہ زخم ہی تمہارے ستارے بنیں گے عزیز۔“ ہیرا مند نے سرخ جلد والی ڈائری بھائی جس میں وہ ٹوٹس لیا کرتا تھا۔ وہ ایک معروف انگریزی اخبار میں رپورٹر تھا اور نچلے طبقات کے مسائل پر لکھا کرتا تھا۔

زندگی کے عیش مشاہدے نے دریائے سندھ کی سبک روی کے بھید اس پر کھولے۔ سرما کی بارشوں نے راز عیاں کیے۔ ساحل اب اس سے کلام کرنے لگا تھا اور شاعری میں نئی جہتیں نکل آئی تھیں۔

اس زمانے میں قلم ”سندھ نیوز“ نامی ایک اخبار سے منسلک تھا۔ وہ تو اتر سے خود پر ہونے والے انکشافات پر مضامین لکھا کرتا۔ کئی ادارے بھی لکھے۔ وہ مطمئن تو تھا، پر خوش نہیں تھا۔ بمبئی سے سندھ پہنچنے والے والا مقصد دھیرے دھیرے ستانے لگا تھا۔

آغاز تراجم کی پُرچہ دنیا سے ہوا۔ سرما کی بخ بست ہوئیں رات کو اس کی کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے ٹھہر جاتیں اور حیرت سے اُسے ہنستی رہتیں۔ سرگوشیاں کرتیں۔ کون ہے یہ دیوانہ۔ ادھر پورا شہر سو رہا ہے اور یہاں چراغ کی مدھم روشنی میں قلم دوات لیے بیٹھا ہے؟

پورا سرما گزر گیا اور وہ کاغذات میں الجھا رہا۔ جب وہ اپنے کمرے سے نکلا... بہار کی ابتدائی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ ناشر صاحب ابھی ابھی مندر سے لوٹے تھے اور بھلتی رس میں ایسے بھیکے تھے کہ نفیس لباس پہنے نوجوان کو اپنے دفتر میں داخل ہوتا دیکھ کر بھی نہ کھڑے ہوئے۔ البتہ جب انہیں پتا چلا کہ نوجوان شیکسپیر کے منتخب ڈراموں کے سندھی ترجمے کا مسودہ بغل میں لے کر کھوم رہا ہے، تو ناشر صاحب اچھل پڑے۔

چائے منگوائی۔ پھر بیڑی پیش کی۔ چند صفحات پڑھ کر اندازہ لگا لیا کہ سامنے گوہر نایاب ہے۔ بڑے رچاؤ سے پوچھا۔ ”ویسے کیا شغل ہے جناب کا؟“

”تحصیل داری کا امتحان دیا ہے قبلہ۔ شغل کا انتظار ہے۔ فی الحال پیشہ ہمارا صحافت ہے۔“

”دام و ام تو اچھل جاتے ہوں گے؟“

قلمچ مسکرایا۔ قناعت پسندی محدود وسائل میں اسکات کو بھونکاتی ہے۔ یہی اُس کے باپ کی نصیحت تھی۔ سمجھ دار ناشر نے گردن ہلائی۔ ”شیکسپیر کا تو ایک عالم معترف ہے جناب، مگر آج کل سر آرتھر کوئن کا چرچا ہے۔ شرلاک ہومز کی کہانیاں تو پڑھ رہی ہوں گی آپ نے؟“

ماہنامہ سہ گزشت

”جی بالکل۔ کس نے نہیں پڑھی ہوں گے۔“ اس نے چائے کی چٹکی لی۔

”تو طے پایا کہ جناب ہمارے لیے سر آر تھر کوئن کے تراجم کریں گے۔ دام کے معاملے میں بے فکر رہیں۔ رام قسم، ہم سے اچھا جواب دہری نہیں ملے گا۔“

سر آر تھر کوئن کا وہ مداح تھا، مگر جب ترجمہ کرنے بیٹھا، ایک ایک سطر کو اپنی زبان میں ڈھالنا شروع کیا تب جانا کہ وہ شخص کیسا فسوس کرتا تھا۔ یکتا اور انوکھا۔ کتنے ہی مقامات پر وہ جھوم اٹھا۔

تھیمیل کے بعد مسودہ لیے ناشر کے پاس پہنچا، تو اس نے مزید چند کتابیں تھما دیں۔ ایک تو وکٹر ہوگیو کا ناول تھا، فرانسیسی لیکن اور گوگول کی کہانیاں تھیں۔ سب ہی اس نے پڑھ رکھی تھیں۔

اُن کتب کی اشاعت نے قلمچے کو راتوں رات مشہور کر دیا۔ یوں تو شہر کی معزز شخصیات اُس کی علیست کی قائل تھیں اس کا احترام کرتی تھیں لیکن اب عوام الناس بھی اُس کے نام سے آگاہ ہو گئے۔ اگلی بار وہ ایک انوکھے خیال کے ساتھ ناشر سے ملا۔

”کیوں ناں دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود یکساں الفاظ پر ایک کتاب مرتب کی جائے۔“

ناشر اچھل پڑا۔ ”کیا خیال سوچا ہے جناب۔ ذرا انتظار مت کیجیے، کام پر لگ جائیں۔“

قلمچے چپ رہا۔ کام شروع ہوئے تو کئی ماہ ہو چکے تھے۔ پورا موسم گرما تب خانوں میں گزرا تھا۔ کتنی ہی زبانوں کی کتب وہ کھنگال چکا تھا۔ وہ متعدد زبانوں پر گرفت رکھتا تھا اور یہ قابلیت خوب کام آ رہی تھی۔

فارسی اور ہندی کا تو ذکر ہی کیا، اسے تو مراٹھی اور گجراتی پر بھی عبور تھا، حیرت و ہلوی جیسے استاد نے ترک زبان بھی سکھائی تھی۔ اور سنیے، وہ تو پشتو اور بلوچی بھی جانتا تھا۔ سندھی اور انگریزی پر گرفت کا تو پہلے ہی تذکرہ ہو گیا۔ تو اس نے بڑی مہارت سے ادب، مذاہب، طب، اخلاقیات، سائنس اور تاریخ پر لکھی معروف کتب کو اپنی مادری زبان کا خرقہ عطا کیا۔ اس کے علاوہ خود بھی کئی کتابیں لکھیں۔

نئی صدی کے آغاز سے قبل مرزا قلمچے بیک نے تحصیل واری کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت حاصل کر لی تھی۔ اس ملازمت نے اسے خاصا مصروف رکھا مگر تحقیق و تصنیف کے لیے وہ وقت نکال ہی لیتا۔ اس کام کے لیے اس

نے اپنی نیند قربان کر دی تھی۔ بھوک پیاس سے ماوراء ہو گیا۔ راتیں جاگتے ہوئے گزاریں۔ دیگر مشاغل بھی ترک کر دیے۔ دوستوں سے بھی کم ہی ملاقات ہوتی۔

جب حلقہ یاراں نے شکایت کی، اس کی بے انت مصروفیات پر ناں بھوں چڑھائیں، تو ان میں موجود ایک معزز صاحب نے قلمچے کا دفاع کیا۔ ”سبائی اپنے مقصد کے لیے سب کچھ کر دیتا ہے۔ ہمارے مرزا قلمچے بیک بھی اپنا سب کچھ کر چکے ہیں۔ ان سے شکوہ کیسا۔“

یہ صاحب حسن علی آفندی تھے۔ وہی جنہوں نے سندھ میں پہلا مسلم اسکول سندھ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت کرنے والے محمد علی جناح نے بھی اسی درس گاہ سے اکتساب فیض کیا تھا۔

تو قلمچے کے قلم کا کھوڑا علمی و ادبی وادیوں میں سر پٹ دوڑ رہا تھا۔ پیشہ وارانہ ذمے داریوں کی وجہ سے اُسے اکثر سفر کرنا پڑتا۔ کبھی بلوچوں کی دھرتی کی سمت، کبھی پشتونوں کے وطن کی طرف۔ اور ہر سفر میں سب سے زیادہ بوجھ کتابوں کا ہوتا۔

اُسے اندازہ تھا کہ اگر سندھ کو جدید دنیا سے روشناس کروانا ہے، تو اُسے نئی نسل پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ اسی خیال نے بچوں کے لیے لکھنے کی تحریک دی۔ اس نے کہانیاں لکھیں۔ ضرب المثال اکٹھی کیں۔ ساتھ ہی سندھی صرف و نحو پر ایک ایسی کتاب تیار کی، جس کی اثر انگیزی دیکھ کر بڑے بڑے باہر لسانیات انجمنیت پندناں رہ گئے۔

قلمچے نے عادت بنالی تھی۔ جس موضوع کا بھی سیر ہو کر مطالعہ کرتا، اُس پر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک معیاری کتاب لکھ ڈالتا۔

ملنے والے کہتے۔ ”میاں شعر بھی کہتے ہو۔۔۔ کہانیاں بھی لکھتے ہوئے، تراجم بھی، تحقیق بھی۔ کیوں خود کو ہلکان کرتے ہو۔ کچھ اپنے بارے میں بھی سوچو۔“ وہ ہنس دیتا۔ ”یہ کام میں نے اپنی زوجہ کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔“

1888 کے موسم خزاں میں قلمچے سندھ کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی کو اپنے کتابوں سے بھرے گھر لے آیا تھا۔ لڑکی مغل تھی۔ اردو اور سندھی پر اچھی گرفت رکھتی تھی۔ قلمچے کو اندازہ تھا کہ تہذیب یافتہ نسل کے لیے ایک تعلیم یافتہ ماں ضروری ہے۔ سو اس نے اپنی بیوی کو فارسی اور انگریزی کی تعلیم دی۔ اس کی بیگم ذہین اور سکھ عورت تھی۔ خوب جانتی تھی

جب یہ موضوع زیر بحث آتا تو وہ اپنی آواز دھیمی کر لیتے۔ اعلیٰ عہدے دار سرگوشیوں میں بات کرتے۔ جب انگریزوں تک خبر پہنچی، تو وہ بھی حیران رہ گئے۔

تو سب متحیر تھے، مگر کوئی شبہات کا شکار نہیں تھا، بلکہ ایک خاص قسم کی طمانیت تھی۔

سچ بیک ایک دشوار گھاٹی میں اتر چکا تھا۔ تاہم اس کے قدر دان خوش تھے کہ انہیں علم تھا، یہ شخص ہمالیہ سا بلند حوصلہ رکھتا ہے۔ دھن کا پکا ہے۔ جو ٹھان لے، مگر گزرتا ہے۔

سچ نے انہیں مایوس نہیں کیا۔ اس نے شاہ لطیف کے ہمہ جہت کلام کو بڑی گرفت اور مہارت سے شستہ انگریزی میں ڈھال دیا۔

جب انگریزوں نے اُسے پڑھا تو سر دھٹا۔ ان کے دل محبت اور عقیدت سے بھر گئے۔ ایسا پڑاثر کلام انہوں نے پہلے بھی نہیں پڑھا تھا۔ جہاں سچ کے ماح تھے، وہیں کچھ ناقد بھی تھے۔ ابتدا میں ان کا خیال تھا کہ اس ترجمے میں کاسٹیت کی کمی ہوگی۔ شاہ کے وسعت کو گرفت میں لانا آسان کہاں۔

مگر کتاب دیکھتے ہی ان کے اندیشے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے، بلکہ اس کی جگہ مسرت نے لے لی۔ دنیا کے سامنے سندھ کا حقیقی اور روشن چہرہ پیش کرنے کے لیے وہ سچ کے شکر گزار تھے۔

یہ اُس کی موسیقی پر گرفت ہی تھی، جس نے کتاب کو نئی جہت عطا کی۔ وہ سُروں میں جیسے بھید جانتا تھا، راگوں کے اسرار سے واقفیت تھی۔ عربی پر گرفت کی وجہ اس کی بھی خبر تھی کہ کہاں شاہ لطیف نے قرآن کا حوالہ دیا ہے، کہاں احادیث کا تذکرہ ہے۔ فارسی اور ترکی زبان و تاریخ پر عبور کی وجہ سے علم تھا کہ کہاں وہ قادر الکلام شاعر اپنے بزرگوں کا تذکرہ کرتا ہے اور کہاں مستقبل کی خبر دیتا ہے۔

جس زمانے میں اس ترجمے کی شہرت نے سندھ کی سرحد عبور کی، سچ اُس شہر میں تعینات تھا، جو ایران اور وسط ایشیا سے براستہ قندھار آنے والے تاجروں کا پڑاؤ ہوا کرتا تھا اور اپنے اچاروں کے لیے پورے ملک میں مشہور تھا۔

یہ شکار پور کا ذکر ہو رہا ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آتے ہیں۔ لوگ ابتدا سے جانتے تھے کہ محکمہ محصولات میں تحصیل دار لگنے والا یہ شخص اعلیٰ عہدے تک جائے گا مگر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ وہ ڈپٹی کلکٹر لگ جائے گا۔ ڈپٹی کلکٹر ہندوستان میں سب سے بڑا سرکاری منصب تھا۔

کہ اس کا شوہر ایک عظیم مقصد کا تعاقب کر رہا ہے۔ سچ نے کتنے ہی علوم حاصل کیے مگر ایک موضوع ایسا تھا، جس بابت مطالعہ تو جم کر کیا، تجربات بھی کیے... مگر قلم نہیں اٹھایا۔ اور یہ تھا موسیقی کا گیان۔

وہ اکثر آسمان کی سمت دیکھ کر خدا سے سوال کرتا کہ اسے یہ صلاحیت کیوں ودیعت کی تھی۔ پرا دھر سے کوئی جواب نہیں آتا۔ آسمان خاموش رہتا۔ دراصل اس منصوبے کے آغاز کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

نئی صدی کے آغاز سے کچھ عرصے قبل... جب وہ منتخب شدہ لمحہ آیا تو سچ کے اس کشادہ مکان میں کتنے ہی پراسرار واقعات ہوئے۔

ایک صبح اُسے اپنی لائبریری کی ترتیب میں کچھ بدلاؤ محسوس ہوا۔ خیال گزرا کہ ملازمہ نے صفائی کرتے ہوئے کتابوں کا مقام بدل دیا ہوگا، مگر پوچھنے پر عورت نے صاف انکار کر دیا۔ دو روز بعد اُسے میز پر کچھ ایسی کتابیں نظر آئیں، جنہیں اُس نے وہاں نہیں رکھا تھا۔ پہلے بیگم سے دریافت کیا، بچوں سے سوال کیا۔ مگر سب نے نفی میں گردن ہلا دی۔

سوموار کی صبح محلے میں درویشوں کی ٹولیاں نظر آئیں جو ساز ہاتھ میں لیے سمندر کی سمت جا رہے تھے۔ اگلے روز اس نے دوات غائب پائی۔

دیگر علوم کے ساتھ وہ تصوف کا بھی درک رکھتا تھا۔ پریشان ہونے کی بجائے مراقبے میں بیٹھ گیا۔ کتب خانے کی بدلی ہوئی ترتیب پر نگاہ کرنے کا اشارہ ہوا۔ اور جب وہ اُس سمت گیا، تو ششدر رہ گیا۔

اس لیے نہیں کہ وہاں ایک پرانی یاد بکھڑ تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ اتنے برسوں تک اُسے بھولا کیوں رہا۔

نئی ترتیب... شاہ جو رسالہ اوّل صدی میں اس پر لکھی کتب کو یکدم سامنے لے آئی تھی۔ مگر قلم اور دوات بھی ادھر ہی ملے۔ کچھ روز قبل لکھنے کی میز پر جو نئی کتب ملی تھیں، وہ ساری لغات نکلیں۔

کلام درویش کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا وقت اس پہنچا تھا۔

☆☆☆

حنبل نے جست لگائی۔ حروف آسمان سے اترے۔ قلم سر پٹ دوڑ رہا تھا۔ دن اور رات اپنی ترتیب بھول بیٹھے۔ جب شہر کو خبر ہوئی کہ فریدوں بیک کا بیٹا کس کام میں مصروف ہے تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ شرفاء کے درمیان

ایک زمانے تک انگریز افسر ہی اُس عہدے پر فائز رہے۔
کچھ مورخین کا دعویٰ ہے کہ وہ سندھ میں یہ عہدہ پانے والا پہلا
ہندوستانی تھا۔

اور اگر ایسا تھا بھی تو اس میں حیرت کیسی؟ اس کے سوا
اس اعزاز کا بھلا کون حق دار ہو سکتا تھا۔ مگر ان کامیابیوں کے
پیچھے جدوجہد اور قربانیوں کی طویل داستان تھی۔ انہوں کی
قربانی کی داستان۔

☆☆☆

دہلاؤتی ہواؤں نے حملہ کیا۔ چوہے اور پسو نکل آئے۔
انسانوں کے بدن سوچ گئے۔ گھٹلیاں پڑ گئیں اور موت کے
پردوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا۔

طاہمون دہشت کا دوسرا نام ہے۔ ایک وبا جس پر قابو
پانے کے دعویٰ ہمیشہ باطل ثابت ہوئے۔ جب بھی یہ ناسور
پھیلا تو بستیوں کی بستیاں چاٹ گیا۔

1855 میں چین کے شہروں سے اٹھتی خوف کی
ابتدائی چیخوں کو دبانے کی سر توڑ کوششیں کی گئیں، مگر طاہمون کا
جراثیم بندرگاہوں کے ذریعے پھیلتا چلا گیا۔ کچھ روز خاموش
رہنے کے بعد پھر یہ کسی نئی جگہ ظاہر ہوتا اور لاشیں بچھ جاتیں۔
یہ نئی صدی کے آغاز تک دہشت پھیلاتا رہا۔ چین کے پڑوسی
ممالک بھی اُس کی لپیٹ میں آ گئے، جن میں ہندوستان بھی
شامل تھا۔ اس وبا نے اتنے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانی کہ
آج تاریخ دان اُسے طاہمون کی مہر کی عالمگیر لہر کے طور پر یاد
کرتے ہیں۔

اسی مرض نے 1903 میں قلعہ کو اس کی بیوی سے
محروم کر دیا۔ یہ ایک بھاری صدمہ تھا۔ زندگی تپت
ہوئی۔ حویلی میں چپ ٹھہر گئی۔ اور درختوں کے پتے گر گئے۔
وہ اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھتا۔ وہ معصوم منسا کا سایہ
بہتے ہی صحرا کی دھوپ میں اکٹھے تھے۔ اس کا دل کٹ جاتا۔

کرب کے طوفان تھمنے کے بعد اُن بچوں کی وجہ سے
وہ زندگی کی سٹ لوٹنے کے قابل ہوا۔ کو بھول کر دفتر جانا
شروع کر دیا۔ تحقیقی کاموں کا بھی آغاز ہو گیا تھا، مگر ایک خطا
تھا۔ جسے زندگی کی چہل پہل بھرنے میں ناکامی دہی۔ ایک
کمی کا احساس تھا۔

احباب اس پر دوسری شادی کرنے کے لیے زور
ڈالنے لگے۔ جب وہ خود سے سوال کرتا کہ کیا وہ اپنی بیوی کی
معنوی صورت کی جگہ کوئی نیا چہرہ قبول کر لے گا۔ تو جواب نفی
میں آتا، مگر جب جس زدہ دوپہر اپنے لڑکوں کو درخت کے

نیچے خاموش بیٹھا پاتا، تو آئین میں چھایا سکوت اُسے توڑ
دیتا۔

اپنے بچوں کو ماں دینے کے لیے اس نے دوسری
شادی کا فیصلہ کر لیا، مگر قدرت مزید امتحان لینا چاہتی تھی۔
دوسری بیوی کو بھی موت کا عفریت لے گیا۔ مگر یہ واقعہ کچھ
برس بعد ہوا۔ اس دوران بچے کچھ بڑے ہو گئے تھے اور قلعہ
نے عظمت کی سمت جانے والے اور کتنے ہی زینے طے کر
ڈالے تھے۔

کلام لطیف کے انگریزی ترجمے کے بعد قلعہ کے جس
کام نے علمی و ادبی حلقوں میں تہلکہ مچایا، وہ سندھ سے متعلق
عربی میں لکھی ایک معروف کتاب تھی، جسے سولہویں صدی
میں علی بن حامد کوئی نے فارسی کے قالب بھی ڈھالا۔ اگلی تین
صدیوں تک محقق اور علماء اسی نسخہ سے استفادہ کرتے رہے،
جو سندھ کے قدیم ہندو راجاؤں سے اسلام کی اس خطے میں
آمد تک کی کہانی تفصیل سے بیان کرتا تھا۔

اس کے کچھ ٹکڑوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا تھا، جو
سندھ کے سنے کشنراج ای ایم جیس کی نظر سے گزرے۔ وہ
ایک علم دوست آدمی تھا۔ کتاب کی اہمیت فوراً بھانپ گیا۔
ارادہ باندھا کہ اس کا مکمل ترجمہ کروائے، مگر یہ سہل نہ تھا۔ یہ
مفروضہ عام تھا کہ عربی سے فارسی میں منتقل کرتے ہوئے
کتاب میں کئی سقم پیدا ہو گئے ہیں۔

کتنے ہی روز وہ پریشان رہا۔ پھر کسی نے مرزا قليچ بیگ
سے متعلق بتایا۔ سیانا آدمی تھا۔ فوراً چائے کی دعوت دے
ڈالی۔

درختوں پر بور آگیا تھا اور شام کے بعد ہی کھلی فضا میں
بیٹھنا ناگوار نہیں گزرتا۔ قلعہ کی بھی کا دروازہ ایک باوردی
ملازم نے کھولا۔ لان میں بیٹھے کشنراج آگے بڑھ کر ملا۔

چائے کے بعد جب اس نے قلعہ کے سامنے اپنی
خواہش کا اظہار کیا، تو مغربی افق پر چند ہی کرنیں بچی
تھیں۔ قلعہ نے آسمان کی سمت دیکھا۔ کشنراج کا خیال تھا کہ وہ
فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت لے رہا ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ
قدرت کے حسین چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا جس نے اسے
جن لیا تھا، ناممکن کو ممکن کر دکھانے کے لیے۔

مون سون کا زمانہ لاہوری میں گزرا۔ جہاں کچھ برس
قبل جب قدرت اُسے کلام لطیف کے ترجمہ کا اشارے دے
رہی تھی، عجیب و غریب واقعات پیش آئے تھے۔

نئے والے دن مصروفیات کے پختہ رنگوں سے رنگے

تھے۔ شمعیں پھلتی گئیں۔ چراغ سیاہ ہوئے۔ کتنی ہی کتابیں کھٹکی گئیں۔ سیکڑوں ورق پھاڑے گئے۔ اس کی بھٹی نے شہر کے کتنے ہی چکر لگائے۔ بارشوں میں اس کے پتے کچڑ میں پھنس پھنس جاتے۔ فرینوں سے بھی سفر کیے۔ پھرے ہوئے سمندر میں اتر پڑا۔ عربی کے علماء کے ساتھ قہوؤں کے کتنے ہی دور چلے۔ فارسی کے ماہر لسانیات کے ساتھ نشستیں ہوئیں، جو کتنی ہی دوپہریں ساتھ لے گئیں۔ انگریزی کے عالموں سے بھی تو اتر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایران کا بھی سفر کیا۔ اور یوں کئی دن کی کڑی تپسیا کے وسیلے محرم سے ذرا پہلے چچ نامہ کا انگریزی میں ترجمہ مکمل ہوا۔

جب اس کا علمی و ادبی حلقوں میں چرچا ہوا، تو قلیچ نے وہی خوشی محسوس کی، جو نسل نئے کے بعد کسان محسوس کرتا ہے، جس نے ہل چلا کر مٹی نرم کی ہو اور اس میں بیج بویا ہو۔ اور پھر کوئیل پھونسنے کا انتظار کیا ہو۔

☆☆☆

مرزا قلیچ بیگ نامی اس نابغہ روزگار نے بطور محقق اور قلم کار اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا کہ تذکرے کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔ اجمالی جائزہ لیا جائے تو سندھ کے اس سپوت کے تراجم اور تصانیف کی تعداد ساڑھے چار سو کے قریب ہے۔ بیشتر کتب سندھی میں۔ اس کے علاوہ ستر کے قریب انگریزی کتابوں کو اپنی مادری زبان کی صورت دی۔ مذہب اور فلسفے کے موضوعات پر لگ بھگ سو کے قریب تصانیف۔ علمی اور درسی کتب کا وسیع ذخیرہ۔ بلوچی، اردو، عربی اور فارسی میں بھی لکھا۔ انگریزی میں تحریر کردہ کتابوں کی تعداد چالیس بتائی جاتی ہے۔ بچوں اور خواتین کے لیے قلیچ بیگ کے قلم سے نکلی کتابوں کا تذکرہ از حد ضروری ہے کہ اس نے وہ زمین تیار کی، جس پر جدید سندھی ادب کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔

شاعر وہ باکمال تھا۔ کتنی ہی رمز تھے اس کے مصرعوں میں۔ کیسی گہرائی تھی شہدوں میں۔ خیال یوں لگا، جیسے غیب سے اتر آتے ہوں۔ محققین کے نزدیک شعری مجموعوں کی تعداد تیس کے لگ بھگ ہے۔

جہاں وہ پختہ شاعر تھا، وہیں فلشن پر بھی خوب گرفت رکھتا تھا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ جدید سندھی فلشن کی بنیاد فریدوں بیگ کے بیٹے ہی نے رکھی۔ سندھ اور یہاں بسنے والوں سے متعلق اس کا ناول ”زینت“ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناقدین اسے رحمان ساز قرار دیتے ہیں۔ ایک عرصے تک یہ مقبولیت کے افق پر جھمکتا رہا۔ کچھ تجزیہ کاروں کے مطابق

سندھی خاندانوں پر تحریر کردہ یہ قصہ سندھی زبان کا پہلا ناول ہے۔ بغیر ٹیک والی کرسی پر بیٹھ کر لکھنے والا قلیچ بیگ وقت کئی کتابوں پر کام کیا کرتا تھا۔ البتہ جب وہ ”زینت“ لکھ رہا تھا، تب اس نے اپنی کل توجہ اس ناول پر مرکوز رکھی۔

شاید قلیچ جیسی اور بھی چند مثالیں ہوں، مگر ایک فرق ہے۔ ان صاحبان علم نے یقینی طور پر خود کو علم و تحقیق کے لیے وقف کر دیا ہوگا، پر اس شخص کا معاملہ الگ تھا۔ وہ سرکار کے انتہائی اہم عہدے پر فائز تھا، جہاں مصروفیات ہمہ وقت تعاقب میں رہیں۔ پھر گھریلو ذمے داریاں کہ دونوں بیویاں داغ مفارقت دے گئیں اور اسے اپنے بچوں کی پرورش اور گھر کی دیکھ ریکھ کے لیے تیسری شادی کرنی پڑی۔ ان تین شادیوں سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔

الغرض مصروفیت رکاوٹ نہیں بنی۔ یا پھر یہ کہہ لیں کہ اس نے ہر رکاوٹ کو شکست دے دی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ زمانہ تجزی سے بدل رہا تھا۔ ہندوستان ذہنی غلامی کی ٹھٹھن سے نکل آیا تھا۔ وہ سیاسی طور پر دھیرے دھیرے مستحکم ہونے لگا۔

اس دھرتی کے ہنرمندوں نے غاصبوں کے تعصب پر غلبہ پالیا تھا۔ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا۔ ادھر اقبال اور ٹیگور کا جھنڈا لہرایا تو ادھر سندھ میں ملیج نے ایک بلند ستون کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کون سا سُر ہوگا، جو اُس کے سامنے احترام سے نہ جھکتا ہو۔ چھٹی جمہوریت میں آنکھ کھولنے والا یہ شخص سندھ کے ماتھے کا جموہور بن چکا تھا۔

اور سندھ ہی کیا، جب بنگال سے نوبل انعام یافتہ ٹیگور نے جسے شانتی نلتین میں سب گرد و پوکہ کر پکارتے، سندھ کا رخ کیا تو سفیدے کے درخت تلے عام سی گریسوں پر بیٹھ کر انہوں نے ان ندیوں کا بہاؤ بازیافت کیا، جو ان کے بچپن کی سب سے حسین یاد تھی۔ بدلتے ہندوستان سے متعلق بھی بات ہوئی۔ قلیچ کے ذہن میں یہ خیال پنپنے لگا تھا کہ انگریز یہ زمین، جسے وہ پھروں کا گھر کہتے ہیں، چھوڑنے کے بجائے میں سوچنے لگے ہیں۔ آفاقی پیغام کو گیتوں کی شکل دینے والا ٹیگور یہ بات سن کر مراقباتی خاموشی میں اتر گیا۔ اس کیالی کی خاموشی ہی مکمل جواب تھی۔

ٹیگور کے قلم سے سندھ میں ایک ڈراما سوسائٹی ہوا کرتی تھی۔ مرزا قلیچ بیگ کا ایک بیٹا بھی تھیٹر کرتا تھا۔ اس عمل میں اُس نے ڈرامے لکھ کر اپنا حصہ ڈالا۔

انگریزی ادب کے دلدادہ جس برٹن سندھ کی کشمیری سنبھالنے سے کل مسٹر جس سے سچ کا تذکرہ سن چکا تھا۔ چونکہ خود بھی قلم کار تھا، اس لیے خوب جانتا تھا کہ سچ نے جو کتابیں لکھیں، ان کے لیے کتنا پتا مارنا پڑا ہوگا۔

اسی نے عہدہ سنبھالنے کے جوابدہائی فیصلے کیے، ان میں مرزا سچ بیگ کو جس العلماء کے خطاب سے نوازنے کا ارادہ بھی تھا۔ سچ بلاشبہ اس کا حقدار تھا۔ اس نے نہ صرف تصنیف و تالیف کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے، بلکہ پیغام صوفیاء کے فروغ اور سندھ میں بسنے والی مختلف قومیتوں کو قریب لانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اپنے عقائد پر اسے کامل یقین تھا، مگر وہ دوسرے کے مذاہب کا بھی احترام کرتا تھا۔ جہاں اپنی روایات سے جڑا رہا وہیں نئے علوم اور افکار بھی قبول کئے۔ نہ ہی مغرب پرست بنا، نہ ہی مشرق کی ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس جھنجھٹ میں پڑا ہی نہیں۔ بس سر پہواڑے کام میں لگا رہا۔ کام... جو اُسے زندہ رکھنے والا تھا۔

سچ نامہ کے انگریزی ترجمے نے انگریزوں کو سندھ اور ہندوستان کی قدیم اور زرخیز تاریخ سے آگاہ کیا۔ احباب کے اصرار پر اس کا ترجمہ سندھی میں بھی کر ڈالا کہ جس خطے کی تاریخ ہے، وہاں کے باسی بھی اُسے پڑھ سکیں۔

سچ کا کمال یہ تھا کہ اس نے ادبی اور علمی سرگرمیوں کے ساتھ پیشہ وارانہ ذمے داریوں سے بھی مکمل انصاف کیا۔ ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ایک بڑا علاقہ اس کے زیر نگرانی تھا۔ اب شہروں میں تو موٹریں اور لاریاں مل جاتیں، مگر دور افتادہ علاقوں کا سفر کھوڑوں اور اونٹوں سے طے ہوتا، جس سے لوگ گھبراتے تھے۔ ایک تو سبکی مشکلات، پھر ڈاکوؤں کا خطرہ۔ مگر سچ کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ رکھ رکھاؤ میں نہیں پڑتا تھا۔ اس نے نہر کنارے ایک کچے مکان میں آنکھ کھولی تھی۔ عسرت میں پلا بڑھا۔ حقیقی مسلمان کی طرح تکلفات سے اجتناب کیا کرتا تھا۔ صحرا پہاڑی سلسلہ یا پھر دلدلی علاقہ جہاں کہیں جانا ہوتا اللہ کا نام لے کر نکل جاتا اور اپنی ذمے داریاں پوری کر کے لوٹا۔ کچھ کتابوں میں ایسے قصے بھی ملتے ہیں کہ دھمکان سراسر اس کے پاؤں تلے کوڑا کوڑوں نے آن لیا مگر جب انہیں پتا چلا کہ وہ مرزا سچ بیگ ہے، تو احترام سے سلام کیا اور پلٹ گئے۔

کوئی مشکل، کوئی پریشانی اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن

سکی مگر پھر... بڑھتی عمر صحت کو متاثر کرنے لگی۔ وہ بیمار رہنے لگا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ہر کوشش ناکام تھی۔ ہاں، بذلہ سخی قائم رہی۔ جب کوئی صحت پوچھتا، تو وہ کھٹ سے کہتا "پروردگار کا کرم ہے۔ آپ سنائیں، کیسی طبیعت ہے۔ ہاں بچے کیسے ہیں؟"

مگر بذلہ سخی وقت کے فیصلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حویلی اب چپ رہنے لگی تھی۔ اور چراغوں کا دھواں کتب خانے سے غائب ہو گیا۔ جو کتاب پڑھنی ہوتی، بستر کے سر ہانے دھری رہتی۔ مگر اب مطالعہ بھی کم ہو گیا تھا۔ نظر جو کمزور ہو گئی تھی۔

سرا کی ایک صبح جب سورج کی پہلی کرن نے دھند کو منور کیا اور نہر کے مشرقی کنارے پر واقع مسجد کا مؤذن اذان دینے کھڑا ہوا، بستر پر پڑے بوڑھے کے کان میں سرگوشی ہوئی۔ "سچ۔"

بخار کا بوجھ پرے کرتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔ ادھر دروازے پر روشنی ابھر رہی تھی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ کون تھا وہ؟

اس کا باپ؟ یا پھر اس کا بھائی یا پھر...
"سچ۔" سرگوشی ہوئی۔

اس نے سنہری نور پر نگاہ کی اور جان گیا کہ دریا اُس کے لیے گارہا ہے۔ لہراتے درخت سلامی دیتے ہیں۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ کلمہ پڑھا۔

دروازے پر ظاہر ہوتی روشنی کچھ دکی اور دھرتی کا یہ عظیم سپوت ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گیا، جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

مدریسا کی کلکتہ آمد اور بریڈمین کی پہلی ٹیسٹ سنچری کے چند ماہ بعد 1929ء کے وسط میں ایک ستارہ ٹوٹا۔ درویش نے آنکھیں موند لیں۔

اب وہ اُس دریا کے گیتوں کی طرح امر ہو گیا تھا جن کے سفید جھگ اڑاتے شفاف پانی کرشماتی کھوڑوں کی طرح تیز و تند تھے۔

اُس کے انتقال کے اٹھارہ برس بعد اس کی پیتھولوجی درست ثابت ہوئی... انگریز ہندوستان سے لوٹ گئے۔

ماخذات

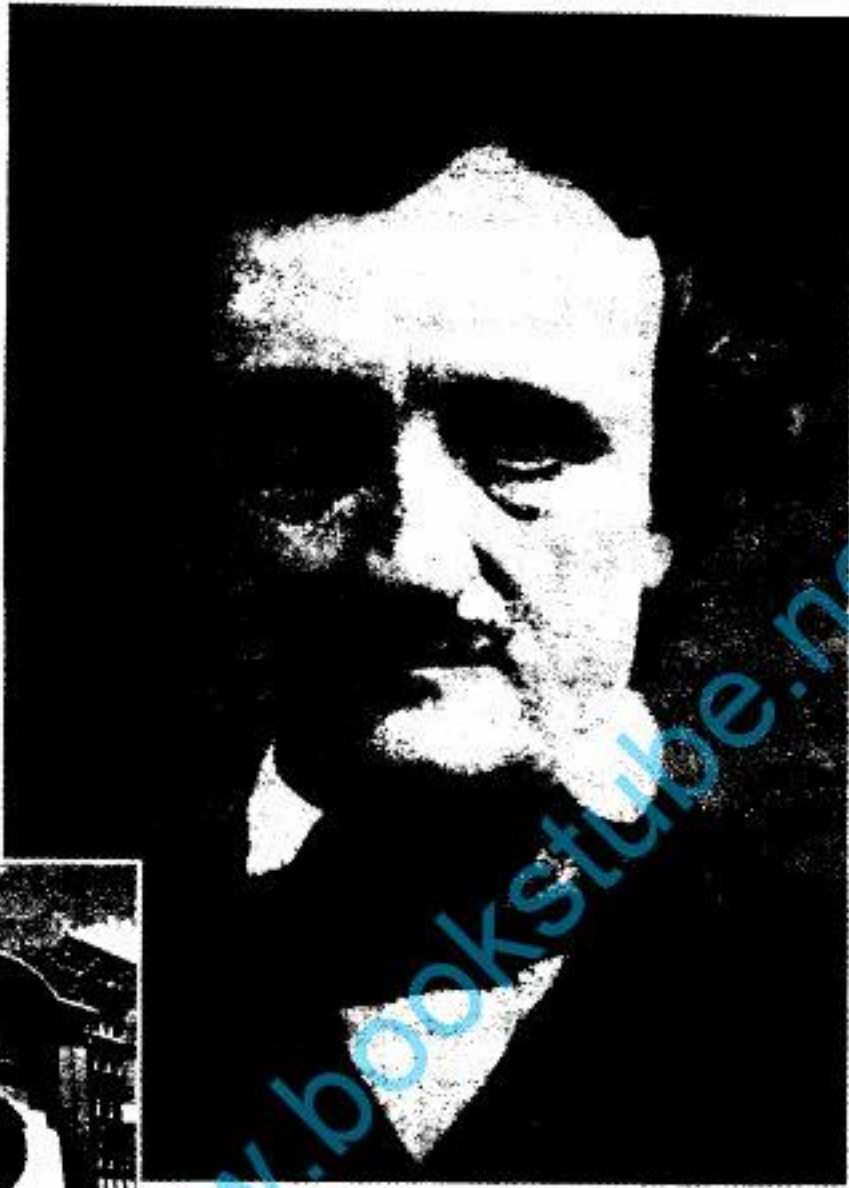
وکی پیڈیا، مرزا قلیچ بیگ از شہناز شورو،

مرزا قلیچ بیگ از فہمیدہ ریاض

مارچ 2015ء

82

ماہنامہ سرگزشت



پراسرار قلم کار

مریم کے خات

لس کے قلم میں پچھلے پہر جیسی گداز و کیف سحر آفرینی ہوتی۔ ہر سطر پر گمان ہوتا کہ پلکوں پر سجے اشکوں کے شبنمی تار جھاملا رہے ہیں جن کی سحر آفرینی قاری کو دم بخود کیے رکھتی اور اختتام پر قاری چونک چونک جاتا۔ اس کی یہی جادو بیانی اسے عالمی شہرت کے معراج پر پہنچانے کا سبب بنی۔

عالمی شہرت کے حامل قلم کار کا زندگی نامہ

13 اکتوبر 1849 کو بالٹی مور، میری لینڈ، پارک کی اس بیچ پر صبح کے ابتدائی وقت میں بیٹھا ہوا وہ شخص یوں لرز رہا تھا جیسے اسے سخت سردی لگ رہی ہو۔ حالانکہ اس نے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے اور موسم بہت زیادہ سرد بھی نہیں

تھا۔ وہ سیدھا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے۔ صبح کا کبر اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ پارک کے بیشتر درخت خزاں کے ہاتھوں اپنے پتوں سے محروم ہو گئے تھے اور ان کی ٹنڈ ٹنڈ شاخوں پر کرخت

ماہ 2015ء

83

ب۔ ماہنامہ سرگزشت

آوازوں والے کو بے برامیان تھے۔ کچھ کو بے اڑے اور انہوں نے کراہتی آوازیں نکالیں تو اس نے سراٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کے سر کے مین اوپر پورا چاند تھا اور یہ سنہری کی بجائے چاندی جیسا ہو رہا تھا۔ اس کا سر چکرانے لگا مگر وہ چاند دیکھتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی رگوں میں بخ بست پانی ہو اور اس کے ہاتھ پیروں کی جان نکل رہی ہو۔ وہ شدید اذیت میں تھا۔ مگر وہ کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ وہ اس بیچ تک کیسے آیا اسے یہ بھی یاد نہیں تھا۔ مگر اسے ایک چیز بہت واضح محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔

بچی ایک بوڑھا آدمی پارک میں داخل ہوا۔ اس نے گرم کوٹ کے ساتھ منظر لے رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چاندی کے منہ والی چمچی تھی۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا بیچ تک آیا اور پھر اسے ساکت بیٹھا دیکھ کر ٹھک گیا۔ وہ چند لمبے اپنی بوڑھی آنکھوں پر زور دیتا رہا اور پھر اس نے حیرت سے کہا۔ ”مسٹر ایڈگر ایلن پو... یہ تم ہو۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بوڑھا گھبرا اٹھا اور مدد کے لیے پکارتا ہوا پارک سے باہر دوڑ گیا۔

ایلن پو تھا کون اگر آپ نے اس کا نام نہیں سنا ہے تو آئیے اس کے بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔

وہ مختلف قسم کا بچہ تھا، اسے بچوں والے کھیلوں، کھلونوں اور چیزوں سے دل چسپی نہیں تھی۔ وہ ایسی چیزوں میں دل چسپی لیتا تھا جن میں عام طور سے بڑے بھی دل چسپی نہیں لیتے ہیں۔ اسے کوئوں سے دل چسپی تھی۔ وہ گھنٹوں بارغ کی بیچ پر بیٹھا آس پاس اڑتے اور درختوں پر بیٹھے کوئوں کو تکتا رہتا تھا۔ وہ گھاس اور پودوں میں رینگنے والے چھوٹے چھوٹے کیڑوں کا چھچھاکرتا تھا اور دیکھتا تھا کہ وہ کہاں سے آتے ہیں اور ان کا طرز زندگی کیا ہے؟ اسے سرجری کے اوزار اچھے لگتے تھے۔ اس نے ایک دور بین، ایک خرد بین اور کمپاس رکھا ہوا تھا۔ اس کے کھلونے تھے۔ جاسوسی ادب کے بانی کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر جان اور فرانسس ایلن سمجھتے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ وہ مشکل سے ایک سال کا تھا جب انہوں نے اسے پیدا کیا۔ اس کا باپ خاندان کو چھوڑ کر کہیں جا چکا تھا اور اس کی ماں سانس اور دل کی بیماری میں زندگی ہار گئی تھی۔

جان ایلن رچمونت درجینیا کا ایک دولت مند اسکالرش نژاد امریکی تاجر تھا۔ وہ بہت سی اشیاء کی تجارت کرتا تھا جیسے تمباکو، کپڑے، گندم اور غلام۔ اس کے پاس ایک عالی شان

گھر تھا اور اس گھر میں سہولت کی ہر چیز تھی۔ مگر وہ اولاد سے محروم تھا۔ اس لیے وہ اور اس کی بیوی کسی بچے کی تلاش میں تھے جسے وہ گود لے سکیں اور انہیں ایڈگر مل گیا۔ ایڈگر کا حلق ایک آئرش خاندان سے تھا۔ اس کا دادا ڈیوڈ پوسٹنر کاوان آئر لینڈ سے 1750 کے آس پاس میں ترک وطن کر کے امریکا آ بسا تھا۔ اس وقت آئر لینڈ برطانیہ کے زیر تسلط تھا اور آئرش بڑی تیزی سے ترک وطن کر رہے تھے۔ وہ ریاست میساچوسٹس کے شہر بوسٹن میں آ بسا۔ اس نے یہیں شادی کی اور اس کے بیٹے ڈیوڈ پوسٹنر نے یہیں جنم لیا۔ اس وقت بوسٹن ایک ترقی کرتا ہوا اور ابھرتا ہوا صنعتی شہر تھا۔ کارخانوں کی چمنیاں سراٹھا رہی تھیں اور چاروں طرف سے مزدور روزگار کی تلاش میں یہاں کا رخ کر رہے تھے۔

مگر ڈیوڈ پوسٹنر نے مزدور یا کلرک کی بجائے اداکار بننا پسند کیا اور اس نے شادی بھی ایک اداکارہ الزبتھ آرٹلڈ ہو چکنر سے کی۔ محبت کی شادی کے باوجود ان کی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ ان میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے تھے اور پہلے بچے کی پیدائش نے انہیں فوری طور پر الگ ہونے سے روکا تھا۔ اس بیٹے کا نام انہوں نے ولیم ہنری لیونارڈ پو رکھا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دونوں میاں بیوی ولیم شیکسپیر کے مداح تھے۔ جب ان کا دوسرا بیٹا ہوا تو ممکنہ طور پر اسے شیکسپیر کے ایک ڈرامے ”کنگ لیئر“ کے کردار ایڈگر سے متاثر ہو کر یہ نام دیا گیا۔ اس وقت اس کا نام ایڈگر پو تھا۔ مگر جب اسے جان ایلن نے گود لیا تو اس نے رواج کے مطابق اس کے نام میں اپنے خاندانی نام ایلن کا اضافہ کر دیا اور یوں وہ ایڈگر ایلن پو ہو گیا۔ آج دنیا اس عظیم مصنف کو اسی نام سے جانتی ہے۔

تقریباً ہر بڑے آدمی نے بہت مصائب کے ساتھ زندگی کا آغاز کیا اور پھر کامیابی نے ان کے قدم چومے لیکن کچھ بڑے آدمی ایسے بھی گزرے جن کی ساری زندگی ہی مصائب کے ساتھ گزری۔ وہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک جدوجہد کرتے رہے تھے۔ ایڈگر بھی ایسے افراد میں سے ایک تھا۔ وہ 19 جنوری 1809 کو بوسٹن میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد اگلے سال اس کی چھوٹی اور واحد بہن روزلی دنیا میں آئی اور اسی سال اس کا باپ ڈیوڈ پوسٹنر اپنے خاندان کو چھوڑ کر چلا گیا۔ یقیناً یہ خود غرضانہ سفاکی تھی کہ وہ اپنے بچے کے لیے، ایک بیمار بیوی کے پاس چھوڑ کر خود کہیں غائب ہو گیا اور پھر ایڈگر یا اس کے بہن بھائی نے کبھی

اپنے باپ کو نہیں دیکھا۔ الزبتھ سانس کی مریض تھی اور اسے دل کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ اگرچہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر بیماری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ مشکل سے تیس سال کی عمر میں دنیا سے گزر گئی تھی۔ ایڈگر کو اپنی ماں اور باپ بالکل یاد نہیں تھے۔ اس نے صرف تصویروں میں انہیں دیکھا۔

الزبتھ کے مرنے کے بعد اس کے بچے بٹ گئے تھے اور انہیں مختلف گھرانوں نے گود لے لیا۔ اس وقت آئرش کمیونٹی کے طور پر منظم ہو گئے تھے اور وہ اپنی کمیونٹی کے غریب اور معیبت زدہ لوگوں کا خیال کرتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ایڈگر خوش قسمت تھا کہ اس نے ایک دولت مند گھرانے میں ہوش سنبھالا۔ اگرچہ وہ جان اور فرانسس کی اولاد نہیں تھا مگر اس گھر میں اسے اولاد کی حیثیت حاصل تھی۔ جان ایلن کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے ضرور تھا مگر اس کی رگوں میں آئرش خون بھی تھا اس لیے وہ آئرش کمیونٹی کا حصہ بھی تھا۔ 1812 میں اسے اس خاندان کے ایپس کوپل چرچ میں بپتسمہ دے کر ایڈگر ایلن پوکا نام دیا گیا۔ بہترین رہائش، لباس اور خوراک کے ساتھ اسے اچھا اسکول بھی میسر آئے۔ مگر حیرت انگیز طور پر یہ اسکول امریکا نہیں بلکہ برطانیہ میں تھے۔ ایلن خاندان 1815 میں تجارت اور سیاحت کے غرض سے برطانیہ گیا۔ پہلے ان کا مقصد قیام کا ارادہ تھا مگر بعض معاملات ایسے سامنے آئے کہ ان کا قیام طویل ہوتا چلا گیا۔

اسکاٹ لینڈ کے شہر ارون کا گرامر اسکول ایڈگر کا پہلا اسکول تھا۔ یہاں اس نے پرائمری کلاس پڑھی۔ اتفاق سے اسی اسکول میں جان نے بھی اولین تعلیم حاصل کی تھی۔ اگلے سال ایڈگر لندن بلا لیا کیونکہ جان اور فرانسس وہیں مقیم تھے۔ اس بار اسے چیمپسلی کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرایا گیا جہاں وہ آنے والے دو سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ یہاں بھی وہ ایلن خاندان سے دور تھا۔ آخر میں اسے برطانیہ کے چند اعلیٰ ترین اسکولوں میں سے ایک اسکول ریمورنڈ جان برسہائے میٹر ہاؤس اسکول میں داخل کرایا گیا اور ایڈگر خاندان کی امریکا واپسی تک یہیں پڑھتا رہا تھا۔ یہ اسکول بھی لندن سے ذرا دور ایک نواحی گاؤں کے پاس واقع تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی پرائمری تعلیم برطانیہ میں ہوئی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں اور شخصیت میں برطانوی رنگ ہمیشہ غالب رہا۔ وہ 1820 میں امریکا واپس آ گئے تھے۔

امریکا واپسی پر اسے ریمورنڈ ہائی اسکول میں داخلہ ملا اور اسکول کی باقی تعلیم اس نے یہیں مکمل کی۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو پہلی بار اس کے منہ بولے باپ جان سے اختلافات شروع ہوئے۔ ایڈگر لاوابالی اور اپنے آپ میں گمن رہنے والا شخص تھا۔ ایک اعلیٰ اور دولت مند گھرانے میں پرورش پانے کے باوجود اس کی شخصیت میں گھردرا پن تھا اور وہ ادب و آداب کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا۔ یعنی خالص امریکی تھا۔ بعد میں آنے والے امریکی نوجوانوں نے اس کی پیروی کی تھی۔ انیسویں صدی کے خاتمے تک شمال مشرقی ریاستوں میں پو اسٹائل معروف ہو گیا تھا۔ مگر اسے روایات کا باغی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ جان چاہتا تھا کہ وہ پرنس بھی سکھے لیکن ایڈگر کو پرنس سے ذرا بھی دل چسپی نہیں تھی اور بعد میں بھی جب اس نے حالات سے مجبور ہو کر کاروبار میں ہاتھ ڈالا تو خسارہ ہی کمایا۔

1824 میں پندرہ سال کی عمر میں اسے لازمی فوجی خدمات کے تحت فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ چھ مہینے تربیت کے بعد اسے فوجی ملازمت کی بجائے اعزازی گارڈ کے طور پر کام کرنے کی پیشکش ہوئی مگر ایڈگر نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور اس نے یونیورسٹی آف ورجینیا میں داخلہ لے لیا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران ایڈگر نے بھی بہت اچھا گریڈ نہیں پایا۔ اس کے ٹیچرز کے خیال میں وہ خیالوں میں گم رہنے والا لڑکا تھا جسے عملی زندگی سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ایڈگر کو روایتی تعلیم سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی وہ مشاہدے کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ البتہ اسے مطالعے کا بے پناہ شوق تھا۔ اس نے چند سال میں اسکول کی ساری لائبریری کاٹ لی تھیں جس میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ شہر کی دوسری لائبریریوں کے چکر لگاتا رہتا اور اسے جو چیب خرچ ملتا اس کا بڑا حصہ بھی کتابوں کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ مگر فوجی تربیت کے دوران اسے ایک لت اور لگ گئی تھی جو اس کی چیب کو ہمیشہ خالی رکھنے کی سب سے بڑی بھی ثابت ہوئی تھی۔ یہ عادت جوئے کی تھی۔

بہ ظاہر تو ایڈگر کی زندگی بڑے عیش و آرام سے گزر رہی تھی۔ کیونکہ اس کا بہتا ہوا باپ جان ذاتی طور پر تو دولت مند تھا ہی۔ ساتھ اسے اپنے اٹھل و لٹھل و لیم گالٹ نے ورثے میں اس کے لیے ہزاروں ایکڑ زمین چھوڑی جس کی مالیت اس زمانے میں لاکھوں سے سات لاکھ ڈالر بنتی تھی۔ جان نے

اب تم اپنے وقت کو دولت میں بدل سکتے ہو۔“
”میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔“ ایڈگر نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے اس صورت میں تم اپنی تعلیم کے اخراجات خود برداشت کرو گے۔“

ایڈگر کا خیال تھا کہ جان عارضی ناراض تھا اور جلد وہ مان جائے گا اور اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر لے گا۔ اس نے اپنی جمع پونجی سے یونیورسٹی آف ورجینیا میں داخلہ لیا۔ یہ یونیورسٹی امریکی صدر تھامس جیفرسن نے قائم کی تھی اور یہاں طلباء کے لیے خاصے سخت رول تھے۔ یہاں جوا، گھوڑے اور ہتھیار، تمباکو اور الکوحل ممنوع تھی۔ مگر ساتھ ہی جیفرسن نے ایک عجیب قانون بنایا تھا کہ طلباء کو پکڑنے کا اختیار انتظامیہ کے پاس نہیں تھا بلکہ ہر طالب علم اپنے بارے میں خود رپورٹ کرتا کہ اس نے مذکورہ قوانین کی کب کب خلاف ورزی کی اور پھر اسے سزا ملتی تھی۔ مزے کی بات ہے اپنے بارے میں رپورٹ کرنے والے طلباء کا تناسب بہت زیادہ تھا اور یہ قانون آج بھی برقرار ہے۔ ایڈگر کو یونیورسٹی سے پہلے ہی شراب اور جوئے کی لت لگ چکی تھی۔ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد بھی اس کے یہ مشاغل جاری رہے۔ مگر اسے اپنے بارے میں رپورٹ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ پہلے سمسٹر کے بعد اسے مالی مشکلات کے سبب یونیورسٹی چھوڑنا پڑی تھی۔

جان کا خیال تھا کہ ایڈگر واپس آ جائے گا اور اب اس کے ساتھ کام کرے گا۔ مگر وہ ایڈگر کی ضدی طبیعت کا درست اندازہ نہیں کر پایا تھا۔ ایڈگر نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے انوکھا فیصلہ کیا اور اس نے فوج میں ملازمت کر لی۔ ہوا یوں کہ یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران اس کا زور غیر نصابی سرگرمیوں پر رہا اور خاص طور سے جوئے کے شوق نے اسے خاصا مقروض کر دیا۔ بعد میں ایڈگر نے اس کا الزام اپنے منہ بولے باپ کو دیا جس نے اسے اتنی رقم نہیں دی جس سے وہ فیس ادا کرتا، کتابیں اور کپڑے خرید سکتا۔ اس لیے اس نے رقم کی خاطر جوا کھلایا اور بد قسمتی سے مزید قرض چڑھا بیٹھا۔ اسے اتارنے کے لیے اس نے فوجی ملازمت کی اور یہاں اس نے ایڈگر اے پیری کے نام سے رجسٹریشن کرائی۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے قرض خواہوں کو علم ہو کہ وہ فوج میں ہے اور وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں چلے آئیں۔ اس نے عمر بھی غلط

اپنی دولت مندی کا جشن منانے کے لیے ایک برک مینشن خریدا اور اسے مولد او یا مینشن کا نام دیا۔ ایڈگر بھی خاندان کے ہمراہ اس مینشن میں منتقل کیا اور یہیں یونیورسٹی جانے سے پہلے اس کی منگنی سارہ الیمیر روسٹر سے ہو گئی۔ لڑکی کا باپ ایرکسن روسٹر بالٹی مور کا ایک معروف بزنس مین اور دولت مند تھا۔ اس نے ایڈگر کو کبھی پسند نہیں کیا اور اس کی پیش گوئی تھی کہ یہ لڑکا ناکام رہے گا اور لوگ اس کا نام تک بھول جائیں گے۔ مگر قسمت کا کھیل دیکھیں۔ ایرکسن کی پیش گوئی اس لحاظ سے درست ثابت ہوئی کہ ایڈگر ہمیشہ ناکام رہا۔ مگر آج لوگ ایرکسن روسٹر کا نام صرف اس کی وجہ سے جانتے ہیں۔

ایڈگر جوانی میں بکھرے بالوں اور بے پروا حلیے والا ایک خوش شکل نوجوان تھا اور اس میں صنف مخالف کے لیے ایک خاص کشش تھی۔ اس کی گفتگو جارہانہ اور کھردری ہونے کے باوجود ایک خاص قسم کی کشش رکھتی تھی۔ اسے الفاظ اور انداز پر عبور تھا۔ بچپن سے اعلیٰ ترین طرز زندگی رکھنے کے بعد وہ اب اس کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ بہترین لباس پہنتا۔ اسے کھانے کا زیادہ شوق نہیں تھا مگر ابتدائے جوانی سے اسے شراب کی لت لگ گئی تھی اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر یہ ایسی کوئی خرابی نہیں بلکہ اس کے طبقے کا خاصہ تھا۔ یہاں نوجوان پندرہ سولہ سال کی عمر تک عادی شرابی ہو جاتے تھے۔ ایڈگر نے اسکول کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس نہیں کیا تھا مگر اس کی معلومات اور علمیت اپنی عمر کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس نے دنیا جہان کا ادب چاٹ ڈالا تھا جو کتاب اس کی دسترس میں آئی وہ اسے پڑھے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ ملنے والا کوئی فرد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جان کے بعد یہ سب ایڈگر کا ہو گا۔ مگر اس موقع پر اس کی افتادہ طبیعت کھلی بار کھل کر سامنے آئی۔ اس نے جان کے بزنس میں شراکت کی بجائے آگے پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پڑھنے اور کوئی علمی کام کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ جان کے خیال میں اس نے جتنی تعلیم حاصل کرنی تھی کر لی تھی اور اب اسے عملی زندگی میں آ جانا چاہیے تھا۔ دراصل جان اپنی ساری دولت مندی کے باوجود ایک سنجوس شخص تھا اور اسے ایڈگر کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات کھل رہے تھے۔ اس نے ایڈگر سے کہا۔ ”تم کیوں رقم خرچ کرنا چاہتے ہو جب کہ

کے لیے بنایا گیا تھا اور یہاں ایڈگر کی تنخواہ دو گنی ہو گئی۔

تقریباً سوا دو سال بعد ایڈگر نے فوج سے نکلنے کا فیصلہ کیا حالانکہ اس وقت وہ سارجنٹ۔ مگر کے عہدے پر پہنچ گیا تھا جو فوج میں تین کیشنڈ افسران کے بعد سب سے ادنیٰ رینک تھا۔ اس کی تنخواہ پچیس ڈالرز ماہانہ ہو گئی تھی۔ اس کا بیشتر قرض اتر گیا تھا۔ مگر وہ فوجی ملازمت سے اکتا گیا تھا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ادب کے میدان میں طبع آزمائی کرے گا۔ لیکن فوج چھوڑنے کی وجہ صرف یہی نہیں تھی۔ شراب اور جوئے سے متعلق اس کی بے اعتدالیاں فوراً میں بھی جاری رہیں اور بالآخر اس کے کمانڈنگ آفسر لیفٹننٹ ہاورڈ نے اس کے سامنے دو آپشن رکھے کہ یا تو وہ عزت سے استعفا دے دے یا پھر احتساب کے لیے تیار ہو جائے۔ لیکن اس صورت میں اسے نہ تو واجبات ملتے اور نہ ہی وہ آئندہ کسی سرکاری ملازمت کا اہل رہتا کیونکہ اس نے فوجی ملازمت کی لازمی مدت پوری نہیں کی تھی۔ ایڈگر نے پہلا آپشن اختیار کیا اور فوج سے نکل گیا۔ اس وقت فوج کی ملازمت عزت اور ناموری حاصل کرنے کا سب سے آسان ذریعہ بھی جاتی تھی اور فوج سے نکالنا بے عزتی کے

نکھوائی۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا مگر اس نے بتایا کہ وہ بائیس سال کا ہے۔

فوجی ملازمت ایڈگر کا ایک غلط فیصلہ ثابت ہوئی۔ وہ کسی طرح بھی فوجی ملازمت کا اہل نہیں تھا۔ اس کی صحت اچھی تھی۔ مگر وہ نازک مزاج ہونے کے ساتھ لا اوبالی طبیعت کا آدمی تھا جس کے لیے نظام الاوقات سے زندگی گزارنا جہنم میں رہنے کے مترادف تھا پھر یہاں شراب اور جوئے پر پابندی تھی۔ یہ دونوں کام چھپ چھپا کر ہی ممکن تھے۔ اس وقت فوجی ملازمت کرنے والوں کو کم سے کم پانچ سال ملازمت کرنا پڑتی تھی۔ اس کی اولین پوسٹنگ بوٹن کے پاس فورٹ اینڈی پینڈیش میں ہوئی اور اسے یہاں کارپول سارجنٹ کے طور پر تعینات کیا گیا۔ اس کی تنخواہ کل پانچ ڈالرز ماہانہ بنتی تھی۔ یہیں اس نے اپنی اپنی کتاب شائع کر رکھی۔ یہ نظموں کا مجموعہ "تیسورنگ اینڈ آور پوکس" تھی۔ چالیس صفحات کی اس کتاب کی کل پچاس کاپیاں شائع ہوئیں اور اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ آج اس کی صرف ایک کاپی دستیاب ہے۔ اسی سال اس کا جدول جنوبی کیرولینا کے فورٹ ملٹریا میں کر دیا گیا۔ یہاں اسے آرٹی آفیسر کے عہدے کی پیشکش ہوئی۔ یہ عہدہ خاص طور سے جدید آرٹلری

موسم بہار کی گلاب دھیں
مارچ کے شمارے کی نذر تیں

ماہنامہ حاسوسی ڈائجسٹ

اولین صفحات ● ذہین و پراسرار لڑکی کی پرتحسں کہانی ... کاشف زبیری کی زبانی

● دکھ سکھ کے مشترکہ ساتھیوں کی ایک زلی اور انوکھی دنیا کی جھلک ... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بسنی کی شہریت

● جواری احمد اقبال کے شہر بارگاہ سے ایک جواری کے کھیل کے تحت: انداز

● مغرب کے نوالے انداز: مغربی دنیا کی تہذیبی حوال کی عکاسی اور محبت کی پورے ماحول فراموش کہانیاں

● سرورق کی کہانیاں

● نیلی موت: ملک کے محض پہلی معنیات کی دریافت و استعمال کا گھناؤنا احوال

● بل صراط: سکون کی خاطر سے بل صراط سے راجا سنگھ جے زندگی کے سبب لکھائی آج مختصر



آپ کے ہمارے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

مترادف ہوتا تھا۔

فوج میں ملازمت کے دوران اس میں خاصی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ اول اس کی منگیت سارہ سے ملگنی ٹوٹ گئی تھی کیونکہ وہ کسی فوجی کی بیوی نہیں بننا چاہتی تھی۔ پھر اس کے قرضوں کی وجہ سے جان اور فرانس سے اس کے تعلقات بھی خراب ہوئے تھے اور وہ اس دوران میں صرف دو بارر چھوٹ گیا تھا۔ دونوں بار اسے جان اور فرانس کا رویہ روکھا لگا۔ فرانس اس سے محبت کرتی تھی۔ مگر وہ اس کے بے پروا رویے کو پسند نہیں کرتی تھی۔ دوسری بار اسے معلوم ہوا کہ اس کی سابق منگیت کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ انہیں خط لکھتا تھا مگر اسے جواب نہیں ملتا۔ پھر فرانس بیمار ہو گئی اور ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا۔ ایڈگر نے خط لکھ کر جان سے اس کے بارے میں پوچھا تب بھی اسے جواب نہیں ملا اور جب اسے علم ہوا کہ فرانس آخری دموں پر ہے تب وہ فوج چھوڑ کر رہوٹ جا رہا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو فرانس کی تدفین ایک دن پہلے ہو چکی تھی۔ ایڈگر کے لیے یہ صدمہ تھا کیونکہ وہ جان کی نسبت فرانس سے کہیں قریب تھا۔ اس نے شکوہ کرنا بیکار سمجھا۔

بیوی کی موت نے جان کا دل نرم کر دیا تھا اور پھر یہ خاندان کی عزت کا معاملہ تھا۔ جان نے ایڈگر کو موقع دیا کہ وہ فوج سے باعزت مستعفی ہو سکے۔ اس کے لیے اسے بقیہ مدت پوری کرنے کے لیے ویسٹ پوائنٹ بھیجا۔ ویسٹ پوائنٹ فوجی تربیت کا بنیادی ادارہ ہے۔ جان نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور ایڈگر کی مالی ضمانت دی یوں بالآخر وہ 15 اپریل 1829 کے دن دوبارہ فوج میں شامل ہوا۔ اس بار اسے کیپٹن آفسر کی تربیت حاصل کرنی تھی۔ ایڈگر ویسٹ پوائنٹ جانے سے پہلے وہ بالٹی مور گیا جہاں اس کی بیوہ خالہ ماریا مین، کنون ور جینیا، اس کا بھائی ولیم اور خالہ کی ساس رہتے تھے۔ اس دوران میں ایڈگر نے اپنی دوسری کتاب ”ال آراف، تیمور لنگ ایڈنگ ڈر پوکس“ چھپوائی۔ مگر اس کا حشر بھی سابق کتاب سے نہیں ہوا۔ ایڈگر کی شاعری سے کسی کو دل چسپی نہیں تھی۔ وہ قیام رجمانات کے تحت شاعری کرتا تھا اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کی نظموں کا مرکز مشرق کے کردار تھے جن سے امریکیوں کو بہت کم دل چسپی تھی۔

جب وہ ویسٹ پوائنٹ میں تھا تو اسے پتا چلا کہ جان ایلن نے دوسری شادی کر لی ہے اور کچھ عرصے بعد اس کی

دوسری بیوی لویسا نے اس کے بچے کو جنم دیا تو ایڈگر کا جان سے رہا سہا تعلق بھی ختم ہو گیا اور اس نے ایڈگر کو باقاعدہ الگ کر دیا۔ اب وہ اس کا لے پا لک نہیں رہا تھا اور نہ ہی اس کی دولت سے ایڈگر کا کوئی واسطہ رہا تھا۔ ایڈگر ایلن پو کے لیے یہ ایک دھچکا تھا کیونکہ فی الحال اس کا کوئی خاص روزگار نہیں تھا۔ فوجی تربیت کے دوران جو وظیفہ ملتا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ قرض میں چلا جاتا اور باقی اس کے اخراجات کے لیے ناکافی تھا۔ جان کا سہارا بھی ختم ہو گیا تھا اس لیے ایڈگر کے لیے فوجی ملازمت اب ایک بوجھ بن گئی تھی۔ جیسے ہی اس کا قرض اتر اس نے فوج سے نکلنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ وہ استعفا نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہنا اور سینٹر کی حکم عدولی کرنا شروع کر دی۔ ساتھ ہی اس نے طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے کلاسز، چرچ اور مشقوں میں جانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ ایک بار پھر فوج سے اس کی برخاستگی کی صورت میں سامنے آیا۔

اگلے سال اس نے نیویارک کا سفر کیا اور یہاں اس نے ایلم پلیس پبلشر سے اپنی تیسری کتاب شائع کرائی۔ یہ بھی نظموں کا مجموعہ تھا اور اس کا خرچ ایڈگر کے ساتھی کیڈٹس نے اٹھایا تھا انہوں نے فی کس پچھتر سینٹ اس مقصد کے لیے دیئے اور کل ایک سو ستر ڈالر جمع ہوئے۔ اس چندے سے کتاب شائع ہوئی اور حسب سابق ناکام ہوئی۔ شاید اس لیے کہ اس میں بھی تیمور لنگ اور ال آراف کی نظمیں موجود تھیں۔ مگر ساتھ ہی اس میں ایڈگر کی جدید کی نظمیں بھی تھیں جو پہلی دو کتابوں میں شائع نہیں ہوئی تھیں۔ کتاب کے اولین حصے میں ویسٹ پوائنٹ کے ان کیڈٹس کو خرچ حسین پیش کیا گیا تھا جنہوں نے اس کتاب کے لیے چندہ دیا تھا۔ دراصل ایڈگر اپنی ان نظموں کی وجہ سے زیر تربیت کیڈٹس میں نہایت مقبول تھا جو اس نے کمانڈنگ آفسرز کے بارے میں کہیں نہیں ظاہر ہے اس نے ان کی جھوکی تھی۔

ناکامی کی ہیٹ ٹرک کر کے دل برداشتہ ایڈگر نے ایک بار پھر خالہ کے پاس بالٹی مور کا رخ کیا۔ یہ وقت اس کے لیے نہایت مشکل تھا۔ کیونکہ ان ہی دنوں ایڈگر کا بڑا بھائی ولیم الکوحل کے بے اعتدال استعمال کی وجہ سے صحت مند بنا بیٹھا تھا اور آخری دموں پر تھا۔ وہ بالٹی مور کے سنی نوڈلج میں داخل تھا اور ایڈگر کے سامنے اس نے آخری سانس لے لی۔ موت ایڈگر کے لیے نئی چیز نہیں تھی اگرچہ اس نے کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا مگر اپنے کئی ساتھیوں کو

مختلف حادثات اور بیماریوں میں مرتے دیکھا تھا۔ البتہ اپنے کسی رشتے کو پہلی بار موت کے گھاٹ اترتے دیکھا۔ ایڈگر کی ولیم سے جوانی تک چند ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ بالٹی مور میں آدھین قیام کے دوران وہ پہلی بار تفصیل سے ملے اور ایڈگر اپنے بھائی سے قریب ہوا تھا۔ جب وہ واپس گیا تب بھی انہوں نے خط پر رابطہ رکھا تھا۔ اس وقت ایڈگر کو خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اتنی جلدی بھائی سے محروم ہو جائے گا۔ اب دنیا میں اس کا خون کا واحد رشتہ اس کی بہن رہ گئی تھی۔

ولیم میں بھی لکھنے کے جراثیم تھے اور اس نے بہت اچھی شاعری کی تھی مگر اس نے کبھی اسے شائع کرانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی شاعری دیکھ کر ایڈگر نے سوچا کہ اگر کبھی اسے مالی فراغت نصیب ہوئی تو وہ اپنے بھائی کی شاعری شائع کرائے گا۔ مگر اسے یہ فراغت کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ بھائی کی موت کے بعد اس نے زیادہ شہود سے بہ حیثیت ادیب اپنا کیریئر بنانے کی سعی شروع کر دی۔ جس وقت لکھنا اور ادیب ہونا یورپ میں نفع بخش پیشہ بن گیا تھا اس وقت امریکا میں اسے صرف ایک جزوقتی پیشے کی حیثیت حاصل تھی۔ کوئی امریکی معنف صرف تحریر کے بل بوتے پر زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ایک وجہ ملک میں کاپی رائٹ کے قوانین کا نہ ہونا بھی تھا۔ امریکی پبلشر اور رسائل کے مالکان نہایت ڈھٹائی سے یورپ کے نامور ادیبوں کی تخلیقات نہ صرف کتابی شکل میں بلکہ رسالوں میں بھی شائع کر رہے تھے۔ اس لیے انہیں نیا امریکی معنف شائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی جسے کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ ایسے میں کون لکھ کر ایسا تھا جو صرف لکھنے کو پیشہ بناتا۔ یہ جرات سب سے پہلے ایڈگر کو لین پونے کی تھی۔

1837 میں آنے والا معاشی بحران بھی بڑی حد تک اس کا ذمے دار تھا۔ اگرچہ پبلشنگ کی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور اس میں نئی ٹیکنالوجی کا اضافہ ہوا تھا مگر دیگر معاشی حالات کی وجہ سے پبلشر نے مصنفوں کو معاوضہ دینے یا وہ معاوضہ دینے سے انکار کر دیا جس کا وہ وعدہ کر چکے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود اس دور میں نئے لکھنے والے امریکی نوجوانوں کی ایک کھپ پرورش پا رہی تھی۔ ان میں سے بیشتر نے آنے والے وقتوں میں خاصی کامیابی حاصل کی اور بہت سارے تو آسودگی اور دولت مندی کی منزل تک پہنچے تھے۔ مگر جس شخص نے سب

سے پہلے یہ کام کیا وہ ساری عمر مالی پریشانیوں کا شکار رہا اور اسے گزارا کرنے کے لیے قرض اودھار سے لے کر مدد مانگنے تک بہت سارے طریقے اپنانے پڑے تھے۔ اکثر پبلشر اس سے لکھواتے ہوئے جو وعدے کرتے تھے وہ وفا نہیں ہوتے تھے۔

شاعری کے میدان میں لگاتار ناکامیوں کے بعد ایڈگر نے نثر کی طرف توجہ دی۔ اس نے شاعری جاری رکھی تھی۔ مگر اپنی آخری کتاب کی ناکامی کے بعد فیصلہ کر چکا تھا کہ اب شاعری کی کوئی کتاب شائع نہیں کرائے گا۔ اسے نثر کی طرف آنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ اس نے فلاڈلفیا پہلی کینسنز کے ساتھ مل کر مختصر کہانیاں لکھنا شروع کیں اور ان ہی دنوں اس نے اپنا واحد ڈراما ”دی پولی ٹیشن“ (سیاست دان) لکھا۔ 1833 میں اس کی ایک چھوٹی کہانی ”مس فاؤنڈ ان بوتل“ کو انعام ملا اور اس کہانی نے ایک معروف دولت مند جان پی کینیڈی کو متوجہ کر لیا۔ کینیڈی مطالعے کا شوقین تھا اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اس نے ایڈگر کو ملاقات کے لیے بلایا اور اسے تھامس ڈبلیو وائٹ سے متعارف کرایا۔ تھامس رچمونڈ کے رسالے ساؤدرن لٹریٹری میسیجر کا ایڈیٹر تھا۔ کینیڈی کی وجہ سے ایڈگر کو یہاں اسٹنٹ ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی جو چند ہفتے سے زیادہ جاری نہ رہ سکی اور اسے نکال دیا گیا کیونکہ وہ اپنے باس کی شراب چرا کر پیتا ہوا پکڑا گیا تھا۔

دل برداشتہ ایڈگر بالٹی مور واپس چلا گیا اور وہاں اس نے اپنی کزن ورجینیا سے شادی کر لی۔ اس وقت وہ چھبیس برس کا تھا اور ورجینیا صرف تیرہ برس کی تھی لیکن شادی کے سرٹیفکیٹ پر اس کی عمر اکیس برس لکھی تھی۔ امریکا میں شادی کی قانونی عمر لڑکیوں کی سولہ سال تھی۔ قانون کی خلاف ورزی اور سزا سے بچنے کے لیے ایڈگر اور اس کی خالہ نے یہ جھوٹ بولا۔ اس کے تین سال بعد ایڈگر نے رچمونڈ میں دوبارہ ورجینیا سے شادی کی اور اس بار یہ تقریب عوامی پیمانے پر ہوئی۔ جب تک لوگ بھی جانتے تھے کہ ایڈگر اپنی بے سہارا خالہ اور کزن کو ساتھ رکھے ہوئے ہے۔ شادی کرتے ہی اس کے حالات میں کسی قدر بہتری آئی تھی۔ معافی طلب کرنے کے بعد وائٹ نے اسے واپس رسالے میں بلا لیا اور اسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ سری ادب لکھے کیونکہ اس میں اس کی صلاحیت تھی۔ ایڈگر نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور یہاں آنے والے چار سالوں تک کام

کرتا رہا۔ یہ سب سے طویل عرصہ تھا جو اس نے کسی ایک جگہ کام کرتے ہوئے گزارا۔ ایڈگر کا دعویٰ تھا کہ اس کے آنے سے رسالے کی اشاعت سات سو سے بڑھ کر ساڑھے تین ہزار ہو گئی تھی۔

ان چار سالوں میں اس نے رسالے میں بے شمار نظمیں، کہانیوں پر تبصرے، تنقیدیں اور اپنی کہانیاں شائع کیں۔ رسالے کی ملازمت ترک کرنے کے بعد اس نے اپنی اولین نثری کتاب ”دی نیریو آف آر تھر گورڈن پائن آف نان ٹکٹ“ شائع کرائی اور اسے وسیع پیمانے پر پڑھا اور پسند کیا گیا۔ اس زمانے میں کتابوں کے طویل نام رکھنے کا رواج تھا۔ مگر اس کتاب سے ایڈگر زیادہ مالی فائدہ حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اس سے کئی گنا زیادہ اس پبلشر نے کمایا جس نے یہ کتاب شائع کی تھی مجبوراً ایڈگر کو واپس ملازمت کی طرف آنا پڑا اور اس بار اسے ایک فلٹن میگزین ”بورٹن جنٹل مین میگزین“ میں نائب مدیر کی نوکری ملی۔ یہاں بھی اس نے بے شمار کہانیاں، تبصرے اور تنقیدیں لکھیں۔ اس کی کاٹ دار تنقید کی وجہ سے اسے مصنف سے زیادہ تنقید نگار کے طور پر جانا جاتا تھا۔ حالانکہ اس نے بورٹن جنٹل مین میں اس معیار کی تنقید نہیں کی تھی۔ جو ساؤڈرن لٹری میگزین میں اس کا خاصا رعبی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسروں پر تنقید کرنے سے زیادہ وہ لکھنے میں مصروف رہا تھا۔ کیونکہ اگلے سال 1839 میں اس کی کہانیوں کا مجموعہ ”نیلو آف گر وکس اینڈ عربکس“ دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ شاید اس کتاب سے اسے کچھ رقم حاصل ہوئی تھی۔ مگر اسے پہلی کتاب جیسی پسندیدگی حاصل نہیں ہوئی اور اس پر خاصی تنقید بھی ہوئی تھی۔

ایڈگر کے دور میں سری ادب سے مراد مار دھاڑ ہوتی تھی۔ یوں سمجھ لیں کہ اسے جاموسی فکشن کی بجائے جاسوسی ایکشن کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ کہانیوں میں ہیرو سراغ رسانی سے زیادہ مجرموں کی براہ راست کئی کرتا تھا اور اس قسم کی کہانیاں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ اگرچہ وہ جی طور پر سری ادب کا بانی سر آر تھر کانن ڈائل کو کہا جاتا ہے جنہوں نے شر لاک ہو مز جیسا شہرہ آفاق کردار تخلیق کیا۔ مگر صرف انہیں سری ادب کا بانی قرار دینا ایڈگر ایلن پو کے ساتھ زیادتی ہوگی کیونکہ اس نے بے شمار چھوٹی اور بڑی ایسی کہانیاں لکھیں جن میں سراغ رسانی کے سائنسی پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا اور اس کی کہانیاں منطق اور حقیقت نگاری کے

معیار پر پورا اترتی تھیں۔ بد قسمتی سے وہ کوئی خاص کردار تخلیق کرنے میں ناکام رہا اور مزید یہ کہ وہ ناول بھی نہ لکھ سکا۔ شاید وہ زندہ رہتا تو یہ دونوں کام کر جاتا۔ ادب میں زندہ رہنے کے لیے ناول نگاری اور کردار نگاری لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ایڈگر ایلن پو نے جو لکھا وہ اسے یاد رکھنے کے لیے کافی ہے۔

ہر معروف ہو جانے والے مصنف کی طرح ایڈگر ایلن پو کے دماغ میں بھی ذاتی پبلشنگ کا سودا سایا۔ یہ فطری خیال ہے۔ مصنف سوچتے ہیں کہ پبلشر ان کی وجہ سے کما رہے ہیں اگر وہ نہ لکھیں تو پبلشر خود سے کما نہیں سکتا اس لیے وہ پبلشر بھی بن سکتے ہیں۔ حالانکہ پبلشنگ ایک الگ میدان ہے اور ضروری نہیں ہے کہ کوئی کامیاب مصنف کامیاب پبلشر بھی بن جائے۔ اگرچہ ایسی مثالیں ہیں جب مصنفین نے اپنی کہانیاں اور کتابیں خود شائع کیں اور کمایا لیکن ایسی مثالوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جب مصنف نے پبلشر بننے کی کوشش کی اور اسے ناکامی ملی۔ بہت سے تو تحریر کے حوالے سے حاصل کی ہوئی دولت اور مقام بھی گنوا بیٹھے۔ ایڈگر نے اعلان کیا کہ وہ عنقریب ”اسٹاکس“ نامی رسالہ نکالنے والا ہے۔ جون 1840 میں فلا ڈلفیا کے معروف اخبار سیٹر ڈے اپوننگ پوسٹ میں اس کا اشتہار بھی چھپا مگر اس میں رسالے کا نام تبدیل کر کے ”پائن میگزین“ کر دیا گیا۔ اشتہار کچھ یوں تھا ”ایک شاندار ماہنامہ جسے معروف مصنف اور شاعر ایڈگر اسے پو کی زیر ادارت اور زیر سرستی شائع کیا جائے گا۔“

مگر ایڈگر کی موت تک یہ رسالہ نہ شائع... ہو سکا۔ ایک طرف تو ایڈگر ایلن پو پبلشر بننے کی کوشش کر رہا تھا دوسری طرف سرکاری حلقوں سے قربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ صدر ٹیلر سے کوئی سرکاری عہدہ حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ گ پارٹی کا ممبر بن سکے گا۔ وہ گ پارٹی سے مراد صدر کے قریبی حلقے کے لوگ تھے جنہیں اس نے مشاورت اور معاونت کے لیے جمع کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ صدر ٹیلر کے بیٹے رابرٹ کی دوستی کو استعمال کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ وہ گ پارٹی کا ممبر بن سکے گا تو کم سے کم فلا ڈلفیا کسٹم ہاؤس میں کوئی نہ کوئی منصب حاصل کر لے گا۔ کسٹم ہاؤس کی اصطلاح ثقافتی مرکز کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ کسٹم ہاؤس کی صدارت پر متمکن فریڈرک ڈیک ہامس سے اس کی اولین ملاقات نہ ہو سکی

حالانکہ اس ملاقات کے نتیجے میں اسے کوئی عہدہ ملنے کا پورا امکان تھا۔ اس نے بیماری کا بہانہ بنایا مگر تھامس کو یقین تھا کہ وہ نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے نہیں آسکا تھا۔ اس کے بعد بھی ہونے والے کئی اپائنٹمنٹ تکمیل تک نہ پہنچ سکے اور یوں سرکاری عہدہ حاصل کرنے کا خواب خواب ہی رہ گیا۔

ورجینیا سے شادی بہت کامیاب رہی تھی حالانکہ ایڈگر بہت غیر ذتے دار شخص تھا۔ وہ شراب پیتا تھا اور اکثر راتوں کو دیر سے آتا تھا۔ ورجینیا اس کی حرکتوں پر صبر کرتی تھی کیونکہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ خود ایڈگر بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ 1842 میں اسے گلے اور سینے میں تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد تشخیص کیا کہ پیانو پر بیٹھنے اور گانے سے اسے یہ تکلیف ہوئی تھی کیونکہ اس کے گلے کی ایک شریان متاثر ہوئی تھی۔ علاج ہوا اور ورجینیا کو افاقہ بھی ہوا تھا مگر اس کی صحت بہت کڑی تھی۔ اس کی فکر کی وجہ سے ایڈگر نے حد سے زیادہ شراب پینا شروع کر دی۔ اس کی اپنی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ ایسے میں ورجینیا نے اسے مشورہ دیا۔

”تم کہیں اور چلے جاؤ اگر تم میرے سامنے رہے تو فکر مند ہو کر خود کو بھی بیمار کر لو گے۔“

ورجینیا کا مشورہ اس کے دل کو لگا۔ ان دنوں وہ گراہم میکزین کی ادارت کر رہا تھا۔ یہ بھی فلاڈلفیا سے شائع ہونے والا ایک ادبی رسالہ تھا مگر اس میں سیاست پر بھی لکھا جاتا تھا۔ ایڈگر کی طبیعت اس سے بیزار ہو چکی تھی اس لیے اس نے میکزین کی نوکری چھوڑی اور نیویارک جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے سرکاری منصب کی پیشکش ہوئی اور اس نے قبول کر لی۔ مگر مسئلہ وہی تھا جب تک وہ یہاں رہتا ورجینیا کی وجہ سے حد سے زیادہ شراب نوشی کرتا رہتا۔ اس لیے بالآخر اس نے یہ نوکری بھی چھوڑ دی اور نیویارک روانہ ہو گیا۔ یہاں اس نے پہلے ایوننگ مرمر میں کچھ عرصے کام کیا اور پھر وہ براڈ وے جرنل میں ایڈیٹر بن گیا۔ اس نے پہلے اس میں مالی شراکت کی اور کچھ عرصے بعد باقی شراکت داروں کے دستبردار ہونے کے بعد وہ اس رسالے کا اکیلا مالک بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسالے کا مستقبل تاریک تھا اور اس پر قرض بڑھتا جا رہا تھا۔ رسالے کا مالک بننے ہی اس کے ہاتھ میں گویا ایک ہتھیار آ گیا اور اس نے معاصر ادیبوں پر کھل کر تنقید شروع کر دی۔ خاص طور سے ہنری

وڈ سورتھ لائٹ فیلو اس کا نشانہ بنا اس نے اس کی تصنیف ”ہلکیر یزم“ پر بے تحاشہ تنقید کی اور اسے ادب پر دھتکار قرار دیا۔ مگر لائٹ فیلو نے اسے بھی جواب نہیں دیا۔

1845 میں اس کی شہرہ آفاق نظم ”دی ریوان“ شائع ہوئی۔ مگر یہ نظم براڈ وے جرنل کی بجائے ایوننگ مرمر میں شائع ہوئی اور اس کے بدلے اسے صرف نوڈالرز ملے تھے۔ اسی نے ایڈگر ایلن پوکا نام سارے امریکا میں پھیلا دیا۔ بعد میں اسے نام بدل کر اور کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ”دی امریکن ریویو“ اسے وگ جرنل“ میں شائع کیا۔ اس بار اسے ”کواریس“ کا نام دیا گیا تھا۔ براڈ وے جرنل زیادہ عرصہ شائع نہ ہو سکا اور مالی مشکلات کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا تھا۔ دل برداشتہ ہو کر ایڈگر بروکس نیویارک کے ایک کالج میں منتقل ہو گیا۔ اس وقت یہاں جنگل تھا اور یہ جگہ کنگسٹن برج کے پاس ہے۔ اس نے ورجینیا کو نیویارک بلا لیا تھا۔ اس جگہ سے قریب ہی سینٹ جانس میڈیکل کالج تھا جو اب فورڈ ہام یونیورسٹی بن چکا ہے۔ اسی کالج کے اسپتال میں ورجینیا نے اپنی زندگی کے آخری سانس لیے۔

عورتوں کے معاملے میں ایڈگر بد قسمت رہا۔ اس کی اولین منگیت سارہ اس سے چھ مہینے پہلے اس نے کئی معاہدے کیے اور سب ناکام رہے۔ پھر ورجینیا اس کی زندگی میں آئی مگر وہ بھی چند سال بعد اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ ایڈگر اس سے محبت کرتا تھا اور اس نے اپنی مشہور نظم ”ڈیجھ آف اے بیوٹی گل دو مین“ میں ورجینیا کو مرکزی کردار بنایا تھا۔ وہ پھر بہت زیادہ پیسے لگا اور بعض اوقات صرف شراب نوشی کا قرض ادا کرنے کے لیے وہ چند ڈالرز کے عوض کہانی دے دیتا تھا۔

ورجینیا کے بعد ایڈگر نے شاعرہ سارہ ہیلن وائٹ مین سے شادی کی کوشش کی اور ان کی منگنی بھی ہو گئی تھی مگر بعض وجوہات کی بنا پر یہ منگنی برقرار نہ رہ سکی۔ ایڈگر کو یقین تھا کہ اس منگنی کے خاتمے میں سارہ کی ماں کا ہاتھ تھا جو اپنی خوب صورت اور دولت مند بیٹی کی شادی مفلس اور بے پروا ایڈگر سے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دل برداشتہ ہو کر اس نے اپنے غم کا رخ کیا اور اپنی اولین محبت سارہ روسٹر سے پھر سے تعلقات کا آغاز کیا۔ سارہ کی شادی ختم ہو گئی تھی اور وہ دوبارہ ایرکس کے پاس آ گئی تھی۔ فی الحال وہ رچونڈ میں ہی مقیم تھی۔ اس کا پاپا ایرکس روسٹر نیویارک منتقل ہو گیا تھا اور وہ مزید دولت مند ہو گیا تھا۔ ایڈگر واپس آیا اور اس نے

سارہ سے ملاقات شروع کی تو یہ خبر ایرکسن روٹر سے زیادہ دیر چھپی نہیں رہی اور وہ آکر سارہ کو اپنے ساتھ نیویارک لے گیا۔

ایڈگر کی ساری زندگی شمال مشرقی امریکا کی ان ریاستوں میں گزری جو بحر اوقیانوس کے ساتھ آباد ہیں۔ وہ یونٹن میں پیدا ہوا، رچمونڈ میں پلا بڑھا اور اس کا ادبی کیریئر فلڈلفیا، نیویارک اور ہالٹی مور میں آگے بڑھا تھا ہالٹی مور میں ایڈگر کے لیے کچھ خاص نہیں تھا، سوائے اخبار ہالٹی مور پیئر یاٹک کے اور اس کے ایڈیٹر ہنری سے اس کے اچھے تعلقات بھی تھے۔ وہ گزشتہ دس سال سے اس اخبار کے لیے لکھ رہا تھا۔ وہ مارچ 1849 میں ہالٹی مور منتقل ہوا اور اس نے یہاں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا۔ مکان کیا یہ اس کا گھر بھی تھا اور دفتر بھی کیونکہ یہیں وہ کام کرتا تھا۔ اب وہ امریکی ادب کا ایک جانا پہچانا نام تھا اور یہاں اس کے بے شمار مداح تھے۔

ان میں ایک ایسلی ہملٹن بھی تھی جو ہالٹی مور کے ایک نامور سیاست دان اور صنعتکار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پہلے وہ اس سے ادب کے حوالے سے ملی لیکن جلد محبت نے انہیں ایک اور رشتے میں جوڑ دیا۔ مگر یہاں بھی وہی مسئلہ ہوا۔ چارلس ہملٹن کو ایڈگر ایک آنکھ نہیں بھایا اور اس نے اسے دھمکی دی کہ وہ اس کی بیٹی سے دور رہے ورنہ وہ اسے شوٹ کر دے گا۔ اس کے باوجود وہ دونوں چھپ کر ملتے رہے۔ ان کی ملاقاتیں ایڈگر کے دفتر نما مکان میں ہوتی تھیں۔ ایسلی چپکے سے آتی اور چپکے سے ہی چلی جاتی تھی۔ یہاں سے ایڈگر کی زندگی کا آخری بڑا سہارہ دور شروع ہوا جو بالآخر اس کی پراسرار موت پر ختم ہوا۔ تاریخ کے صفحوں میں ایڈگر ایلن پو کے حوالے سے ان واقعات کا ذکر نہیں ملے گا۔ مگر بعض دوسرے واقعات اور حالات کو ایسی دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

ہالٹی مور پیئر یاٹک کا تازہ شمارہ دفتر میں موجود پریس میں چھپ رہا تھا۔ اس میں ایڈگر کی تازہ ترین کہانی کی اولین قطع شائع ہوئی تھی۔ ایڈگر پریس میں داخل ہوا تو پریس کے انچارج آفیسر نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے گرم جوش سے کہا۔ ”سٹر ایڈگر دیکھو اپنی کہانی۔“ ایڈگر نے اپنی کہانی دیکھی اور اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ وہ دغمانا ہوا ہنری کے کمرے میں پہنچا اور اخبار پھاڑ کر اس

کے سامنے ڈال دیا۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟“

”جو تم نے لکھی ہے۔“

”یہ بکواس میں نے نہیں لکھی۔“

ہنری نے گہری سانس لی اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ”دیکھو ایڈگر لوگ جرم بڑھانا چاہتے ہیں انہیں خون سے دل چھپی ہے۔ انہیں اس قسم کی الجھی کہانیاں.....“

”تمہاری جرات کیسے ہوئی کہ تم میری تحریر کو تہہ دل کرو۔“

”کیونکہ میں اس اخبار کا مدیر ہوں۔“ ہنری کا لہجہ بھی بلند ہو گیا۔ ”میں اس کا مجاز ہوں۔“

”اب تم اس کے مجاز نہیں ہو گے۔“ ایڈگر نے انگلی اٹھا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر ہنری مطمئن تھا اسے معلوم تھا کہ کل ایڈگر اگلی قطع لے آئے گا جب اسے شراب کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔

☆☆☆

ہالٹی مور کے ڈاؤن ٹاؤن کی ایک کئی منزلہ عمارت کے سامنے کئی افراد جمع تھے۔ اوپر سے کسی عورت کے چہرے چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سامنے سڑک پر پولیس کی دین نمودار ہوئی اور رکتے ہی اس سے نصف درجن پولیس والے باہر آئے۔ ایک بوڑھے آدمی نے کہا۔ ”اوپر چو تھے فلور پر فلیٹ نمبر چار میں کچھ ہو رہا ہے۔“

پولیس کپتان نے دو آدمی نیچے چھوڑے اور اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ اوپر روانہ ہوا۔ مگر ابھی وہ راستے میں تھے کہ انہیں اوپر سے عورت کی ایسی چی سنائی دی جس میں موت کا کرب رچا ہوا تھا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ پولیس والے ایک لمحے کو رک کے تھے پھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ فلیٹ نمبر چار کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کپتان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے ایک ساتھ لات مار کر دروازہ کھول دیا۔ اندر تاریکی تھی اور وہ لائٹنیں آگے کیے اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک کمرے کا فلیٹ تھا جس میں داخل ہونے کا ایک دروازہ اور صرف ایک کھڑکی تھی جس کا پٹ فکس تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک ادھڑ عمر عورت کی لاش پڑی تھی اور اس کا گلا کاٹ دیا گیا تھا۔ کپتان نے جھک کر چیک کیا وہ مر چکی تھی مگر اسے مرے زیادہ نہیں گزری تھی یقیناً اس نے آخری چیج ماری تھی جب قاتل نے اس کا گلا کاٹا تھا۔ مگر قاتل کہاں تھا؟ وہ اس کمرے میں کہاں نظر نہیں آ رہا تھا اور یہاں سے باہر جانے کا

کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ان کی توجہ آتش دان کی طرف مئی اس سے کچھ گر رہا تھا وہ آگے آئے اور سب نے اپنے ہتھیار آتش دان کی طرف کر لیے تھے اس سے اوپر سے ریت یا راکھ گر رہی تھی مگر جب وہ نزدیک آئے تو اچانک ایک انسانی ہاتھ گر کر جموں لگے۔

ایک گھنٹے بعد ڈی فیکٹو ریمینڈ گرین فیلڈ وہاں پہنچا اور اس نے دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ دوسری لاش جو آتش دان سے ملی تھی ایک بارہ سال بچی کی تھی جسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور اس کی لاش آتش دان میں ٹھونس دی گئی تھی۔ پڑوسیوں کے مطابق وہ دونوں ماں بیٹی تھیں اور گزشتہ کچھ عرصے سے ان کے ساتھ ایک لمبے کوٹ والا شخص آکر رہ رہا تھا مگر اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ عورت ریمنڈ کی بیوی تھی۔ فروری تھی۔ گرین فیلڈ کی توجہ لاشوں سے زیادہ اس بات پر مرکوز تھی کہ قاتل کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے کھڑکی کا معائنہ کیا اور اسے چاقو سے کریدتا ہوا ایک خفیہ کھکا مل گیا جسے دہاتے ہی بہ ظاہر یہ بالکل فحش کھڑکی کھل جاتی تھی۔ قاتل اسی سے فرار ہوا تھا۔ بہ ظاہر قاتل کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ ریمنڈ مفلس عورت تھی اس کے پاس سوائے ایک بیٹی کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر قاتل نے پہلے عورت کو موقع دیا کہ وہ چیخ چلا کر اس پاس والوں کو بتا دے کہ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اور عین اس وقت جب پولیس آئی تو قاتل اس کا گلا کاٹ کر اس کھڑکی سے فرار ہو گیا۔ وہ یہ کام پہلے بھی کر سکتا تھا۔ پولیس کو پیچھے آنے سے روکنے کے لیے اس نے کھڑکی میں خفیہ کھکا لگا دیا تھا جسے دبائے بغیر کھڑکی کا پتہ نہیں کھل سکتا تھا۔

☆☆☆

ایڈگر ایلن پو بانی مور تھیمز کے ایک چھوٹے ہال میں اس وقت پچاس ساٹھ خواتین کے سامنے اپنی مشہور نظم دی ریوان سار ہا تھا۔ اس کا پڑا اثر لہجہ اور الفاظ کی اداسی اور حسن بیان نے ان خواتین کو مسحور کر رکھا تھا۔ یہ سب عورتیں اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ سب پانچ پانچ ڈالرز میں دے کر ایڈگر کا پچھر سننے اور اپنی شاعری پر اس کی اصلاح لینے آئی تھیں۔ تیسری قطار میں ایمیلی موجود تھی مگر وہ اصلاح لینے نہیں آئی تھی وہ صرف ایڈگر سے ملنے اور اسے دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور بانی مور پولیس اندر داخل ہوئی سب سے آگے کپتان جوزف تھا اس نے ایڈگر سے کہا۔ ”مسٹر ایڈگر ایلن پو.....؟“

”ہاں میں ہوں۔“

”تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

نصف گھنٹے بعد ایڈگر ڈی فیکٹو گرین فیلڈ کے دفتر میں اس کے سامنے تھا اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔ ”کیا مجھے گرفتار کیا گیا ہے؟“

”بیمبو مسٹر پو۔“ گرین فیلڈ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے تمہاری کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔“

”اوہ تو تم میرے مداح ہو۔“

”میں نے کہا میں نے تمہاری کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔“ گرین فیلڈ نے صبح کی۔

”لیکن عین لیکچر کے دوران پولیس کے دستے کی مدد سے مجھے یہاں بلوانے کا مطلب؟“

گرین فیلڈ نے سامنے رکھا بانی مور پوسٹ کا تازہ شمارہ اٹھایا اور بولا۔ ”ایک طوائف اپنی نو عمر بیٹی کے ساتھ قتل کر دی جاتی ہے۔ قاتل لڑکی کی لاش آتش دان میں چھپا کر کمرے کی کھڑکی سے فرار ہوتا ہے لیکن کھڑکی بہ ظاہر فحش ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک خفیہ کھکا تھا۔ قاتل طوائف کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ کیا تم کو کچھ یاد آیا مسٹر پو؟“

”مجھے کیا یاد آتا چاہیے؟“ ایڈگر نے خشک لہجے میں پوچھا۔ پھر وہ چونکا اور بولا۔ ”میرے خدا یہ تو میری ایک کہانی ہے، لیکن یہ خیال تھا۔“

”مجھے شک ہے ایسا نہیں ہے۔“ گرین فیلڈ نے اخبار اس کے سامنے ڈال دیا۔ ”اب یہ حقیقت بن چکا ہے۔“

ایڈگر نے خبر دیکھی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ”یہ گزشتہ رات کا واقعہ ہے؟“

”رات گیارہ بجے تم کہاں تھے؟“

”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ میں شام کے وقت بندرگاہ کی طرف گیا تھا۔ میں نے بی رکھی تھی اور جب میں جاگا تو اپنے کمر میں تھا مجھے نہیں یاد کہ میں کب اور کس طرح وہاں پہنچا۔“

اسی لمحے دروازہ کھلا اور کپتان جوزف اندر آیا۔ اس نے گرین فیلڈ سے کہا۔ ”سر مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ وہ کہہ کر اجازت کا انتظار کیے بغیر آگے آیا اور جبک کہ اس کے کان میں کچھ کہا اور گرین فیلڈ نے سن کر جس طرح ایڈگر کی طرف دیکھا اسے وہی اس سے متعلق کوئی نئی بات سامنے آنے والی ہے۔ اس کے ہاتھ۔

”مسٹر ایڈگر ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری ایک اور کہانی حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔“

کچھ دیر بعد ایڈگر دوسروں کے ساتھ فولاد کے اس متروک کارخانے میں تھا۔ ہنری وہاں پہلے سے موجود تھا اور اٹلیاں کر رہا تھا۔ گرین فیلڈ نے ایڈگر کو دروازے پر روک دیا اور خود اندر آیا تھا۔ اس نے رومال سے منہ صاف کرتے ہنری سے کہا۔ ”تم نے اطلاع دی ہے؟“

”ہاں میں بالائی سوپر پیئر یا ٹک کا مدیر ہنری ہوں۔“

”میں تمہیں جانتا ہوں۔ یہ کون ہے؟“ اس نے میر پر پڑے شخص کی لاش دیکھی۔ چھت سے لٹکے فولادی پنڈولیم کے سرے پر موجود بڑے سے تیز دھار آلے نے اسے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

”ہر برٹ ریگان۔“ ہنری نے تھوک نکل کر کہا۔

”میں اسے جانتا ہوں یہ برسوں سے میرے اخبار کے لیے لکھ رہا ہے۔“

”کیا لکھتا ہے؟“

”کہانیاں، تبصرے، تنقید۔“

”اس کی دشمنی بھی ہوگی۔“

”ممکن ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ کوئی دشمنی میں اس حد تک آگے جاسکتا ہے۔“

”ایڈگر ایلن پو کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”ان میں تعلقات نہایت خراب تھے۔“ ہنری نے کہا۔ ”دونوں ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھنے کے روا دار نہیں تھے کیونکہ ایڈگر نے اس پر شدید تنقید کی تھی۔“

”تب تمہارا کیا خیال ہے وہ ایسا کر سکتا ہے۔“

”ایڈگر بہت اچھا مصنف ہے اس کا تخیل بہت شاندار ہے۔ وہ تحریر میں کتنی کر سکتا ہے وہ براٹری کے گلاس میں پورا طوفان بیان کر سکتا ہے لیکن جہاں تک عملی فن کا تعلق ہے تو وہ ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں کر سکتا۔“

گرین فیلڈ نے ایڈگر کو اندر بلا لیا۔ ”میں اسے دیکھ کر چونکا۔ گرین فیلڈ نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔“ تم اسے پہچانتے ہو؟“

ایڈگر نے سر ہلایا۔ ”ریگان۔“

”تمہاری ایک کہانی میں اسی طرح ایک مصنف.....؟“

”مرڈران دی آئی۔“ ایڈگر نے آہستہ سے کہا۔

گرین فیلڈ ہنری کی طرف آیا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا

کہ یہاں کچھ ہوا ہے؟“

”مجھے ایک رقعہ ملا تھا۔“ ہنری نے اپنی جیب سے رقعہ نکال کر دیا جس میں بڑی خوب صورت لکھائی میں تحریر تھا۔

”مسٹر ہنری تمہارا ایک کارکن اس وقت فولاد کے متروک کارخانے میں موجود ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ وہ اخبار کی سرخی بن چکا ہے۔“

”تحریر.....؟“ گرین فیلڈ نے کہا چاہا تو ہنری نے اس کی بات کاٹی۔

”ایڈگر سے ملتی ہے لیکن یہ اس کی تحریر نہیں ہے۔“

تازہ خون اور لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے مرے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں ہوا تھا۔ گرین فیلڈ دوبارہ ایڈگر کی طرف آیا۔ ”گزشتہ دو گھنٹے میں تمہاری مصروفیات کیا ہیں؟“

”سوا گھنٹے سے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اس سے پہلے دو گھنٹے تک پیچروم میں رہا تھا۔“ ایڈگر نے جواب دیا۔ ”آفسر کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

گرین فیلڈ چند لمحوں سے غور سے دیکھتا رہا... پھر بولا۔ ”نہیں میرا خیال ہے کوئی جنونی اور ماہر قاتل ان واقعات کے پیچھے ہے اور وہ تمہاری کہانیوں کو حقیقت کا روپ دے رہا ہے۔“

ایڈگر واپس گھر آتے فکر مند تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ گرین فیلڈ کو اس پر شک نہیں تھا لیکن جلد یا بدیر یہ خبر پھیل جاتی۔ ہنری کو غالباً اسی لیے رقعہ لکھ کر اطلاع دی گئی تھی کہ خبر لازمی آئے۔ اس کے بعد اس کی ساکھ تو خراب ہوتی مگر ساتھ ہی اس کے بے شمار مخالفین جنہیں اس نے تنقید کے نشتر سے مشتعل کیا تھا اس کے خلاف میدان میں آ جاتے۔ ایڈگر کو ان لوگوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ اسے اصل میں ایملی کی پروا تھی کہ وہ اس بارے میں کیا سوچے گی اور اس کا باپ اسے مزید نہیں کرے گا۔ ایملی کا خیال آیا تو اس نے رخ بدلا اور ہملٹن ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا جو شہر کے پوش ترین علاقے میں عالی شان محل نما عمارت تھی۔ کچھ دیر بعد بھی میں چارلس ہملٹن ایملی کو لے کر نکلا تو ایڈگر نے بھی کا راجہ دھوک لیا اور پھر بے تکلفی سے بھی میں سوار ہو گیا۔ ہملٹن کا چہرہ اسے دیکھتے ہی بگڑ گیا اور اس نے غرا کر کہا۔

”میں اس عمارت کیسے ہوئی؟“

”میں اس عمارت سے کچھ کہنے آیا ہوں۔“ ایڈگر نے کہا۔

”کیسی سے اتر جاؤ۔“ چارلس غرایا مگر ایڈگر نے اس کی پروا کیے بغیر ایملی سے کہا۔
 ”تم نے بہت شاندار نظم پڑھی مگر اس کا آخری مصرع اتنا اچھا نہیں تھا۔ میری شام ہو تمہارے ساتھ، اسے یوں کر لو کہ میری آج شام ہو تمہارے ساتھ۔“
 چارلس نے پستول نکال لیا۔ ”اگر اب تم یہاں سے دفع نہیں ہوئے تو میں تمہارا بھیجا نکال دوں گا۔“
 ایڈگر نے بیہ پروائی سے کہا۔ ”تمہیں اپنی خوب صورت بنی کے خوب صورت لباس کی فکر نہیں ہے میرے جیسے اور خون سے وہ خراب ہو جائے گا۔“
 ”ڈیڈی۔“ ایملی نے کہا۔

”کوئی بات نہیں میں نے برا نہیں مانا۔“ ایڈگر نے کہا اور ایملی کو پیار کر کے نیچے اتر گیا۔ وہ ایملی کو پیغام دینے آیا تھا اور جانے سے پہلے ایملی نے کبھی سے سر نکال کر اسے اشارہ کیا کہ وہ آج شام آئے گی۔ وہ خوب صورت نقوش اور سنہری بالوں والی حسین لڑکی تھی۔ اس کی عمر چوبیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ عمر میں ایڈگر سے سولہ سال چھوٹی تھی۔ وہ نہایت دولت مند طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور ایڈگر کو یہ کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اسے اگلے وقت کا کھانا ملے گا یا نہیں۔ اس کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ ایڈگر گھر آیا تو اس کا پالتو نولا بے قراری سے اس کا خطرہ تھا۔ وہ بھوکا تھا۔ ایڈگر نے اسے گوشت کے چند ٹکڑے دیے اور میز پر آگیا۔ ایملی آئی تو وہ لکھ رہا تھا۔ وہ خود دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ ایڈگر گھر کا دروازہ بھی لاک نہیں رکھتا تھا۔ وہ کہیں جاتا تب بھی اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ ایملی نے اندر آ کر کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔
 ”آج تم نے مجھے حیران کر دیا۔“

”میں ایسا ہی آدمی ہوں۔“ اس نے بیہ پروائی سے کہا۔ ”مجھے تم سے بہر صورت بات کرنی تھی۔“
 ایملی اس کے پاس آئی۔ ”کیا بات کرنی ہے؟“
 ”تمہارے گھر کا سٹیوم پارٹی ہونے والی ہے۔“
 ”ہاں دو دن بعد ہے۔“
 ”میں ایک مشکل میں پڑ گیا ہوں۔“ ایڈگر نے کہا اور پھر اسے سب بتا دیا۔ ایملی نے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا۔

”تم سمجھتے ہو کہ میں اس بات پر یقین کر لوں گی کہ تم کوئی غلط کام کر سکتے ہو؟“

”نہیں مجھے ہمارے مستقبل کے حوالے سے فکر ہے۔“
 ”تم کیا سمجھتی ہو سٹیز چارلس اس خبر کو استعمال نہیں کریں گے؟“
 ایملی بھی فکر مند ہو گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“
 ”اس سے زیادہ مجھے تمہاری فکر ہے؟“
 ”میری فکر؟“ ایملی چونکی۔ ”کیسی فکر؟“
 ”قاتل میری کہانیوں سے پلاٹ لے کر یہ سب کر رہا ہے اور میں نے حال ہی میں ایک دولت مند آدمی کی کہانی لکھی تھی جس کی بیٹی ایک غریب مصنف سے محبت کرنے لگتی ہے۔“

”سچ میں؟“ ایملی نے کہا۔
 ”ہاں اور پھر ایک نفسیاتی قصص دولت مند آدمی کی بیٹی کو اغوا کر لیتا ہے اور اسے کسی جگہ قید کر دیتا ہے۔“
 ”پھر کیا ہوتا ہے؟“

”ابھی اس کی ایک قسط چھپی ہے اور اس میں لڑکی کو کاسٹیوم پارٹی میں اغوا کیا جاتا ہے۔“
 ”میرے خدا۔۔۔۔۔۔“

”اب تمہیں پتا چلا کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔“
 ”لیکن یہ ممکن نہیں ہے ہمارے گھر کی سیکورٹی بہت سخت ہے۔“

”نفسیاتی کاسٹیوم میں چھپ کر آتا ہے اور لڑکی کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔“

”میں ڈیڈی سے بات کرتی ہوں۔“
 ”نہیں مجھے گرین فیلڈ سے بات کرنی ہوگی۔ وہ ذہن اور اچھا پولیس آفیسر ہے، وہ زیادہ بہتر طریقے سے اس معاملے کو دیکھ سکے گا۔“ ایڈگر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس پارٹی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خیال اور بھی ہے؟“
 ”وہ کیا؟“

ایڈگر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ”ایملی میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”تمہارا مطلب ہے شادی؟“

”ہاں اب میں ہر پل تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔“
 ایملی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے تھے۔

☆☆☆
 گرین فیلڈ بالائی مور پٹریا تک کے اس شمارے

”لیکن ایڈگر.....“

”آپ بتائیں آپ پولیس کو کاسٹیوم پارٹی میں آنے کی اجازت دے رہے ہیں یا نہیں۔“

چارلس چند لمحے اسے ٹھوٹا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے لیکن اس صورت میں ذمے دار تم ہو گے۔“

”مجھے منظور ہے مسز ہملٹن۔“

چارلس ہملٹن کی خواہش تھی کہ ایملی اس پارٹی میں اپنی زندگی کے ساتھی کو منتخب کر لے۔ اس نے بالٹی مور کے آس پاس سے تمام ہی اعلیٰ خاندانوں کو مدعو کیا تھا اور ان میں بڑی تعداد نو جوانوں کی تھی۔ اسے اُمید تھی کہ ایک بار ایملی نے کسی اور کو پسند کر لیا تو پھر وہ اس مفلوک الحال مصنف سے منہ پھیر لے گی۔ چارلس ہملٹن سخت مزاج اور غصہ ور شخص تھا۔ بہت سے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے اور وہ ان کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اسے صرف ایڈگر ایلن پو کی پروا تھی کیونکہ وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ انہیں ایڈگر کا جادو ایملی کے سر اتانہ چڑھ جائے کہ وہ اس سے شادی پر قائل جائے۔ اس لیے وہ جلد از جلد ایملی کی شادی کر دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

”کہانی کے مطابق مجرم ٹھیک بارہ بجے لڑکی کو اغوا کر کے لے جائے گا۔“ گرین فیلڈ نے ایڈگر سے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے مجرم اس حد تک کہانی پر عمل کرے گا؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر وہ نفسیاتی بھی ہے اس لیے ہو سکتا ہے وہ ایسا ہی کرے۔“ ایڈگر نے جواب دیا۔ وہ ابھی میں ہملٹن ہاؤس کی طرف جا رہے تھے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔

”میں نے تحریر کے ماہرین کو مجرم کی تحریر دکھائی ہے جو اس نے ہنری کو لکھی تھی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مذکورہ شخص فرانسیسی نژاد ہے۔ وہ بعض حروف جس طرح لکھ رہا ہے ایسا صرف فرانسیسی ہی لکھتے ہیں۔ کیا تمہارے حلقے میں کوئی فرانسیسی ہے؟“

”نہیں، میرے جاننے والوں میں کوئی فرانسیسی نہیں ہے۔“ ایڈگر نے کہا۔ ”تم جانتے ہو فرانسیسی وہ یورپی قوم ہے جو سب سے کم ترک وطن کر کے امریکا آئی ہے۔ چھوٹی یورپی ممالک سے تعلق رکھنے والی افراد کی کیونٹی بھی فرانسیسی کیونٹی سے بڑی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی انگریزوں اور امریکیوں سے نفرت ہے۔ وہ یہاں آئیں گے

سمیت چارلس ہملٹن کے دفتر میں اس کے سامنے موجود تھا اور اسے کہانی پڑھ کر سنا رہا تھا۔ چارلس کو کہانیوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اس لیے وہ بار بار اپنے خادم کو جھڑک رہا تھا جو اس کے لیے کاک ٹیل ٹھیک سے کس نہیں کر رہا تھا۔ گرین فیلڈ محل سے اس مداخلت کو نظر انداز کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے محل چھوڑا اور جس میں نفسیاتی شخص دولت مند آدمی کی بیٹی کو اغوا کر لیتا ہے۔ چارلس نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”یہ کونسا سنانے کا مقصد۔“

”مسز ہملٹن، سچ کچ کا ایک نفسیاتی قاتل مسز پو کی کہانیوں کو حقیقت کا روپ دے رہا ہے وہ دو قتل بالکل اسی طرح کر چکا ہے جیسے مسز پو نے اپنی کہانیوں میں بیان کیے ہیں اور اس تازہ ترین کہانی میں نفسیاتی شخص دولت مند آدمی کی خوب صورت بیٹی کو اغوا کر کے کہیں قید کر دیتا ہے۔ لڑکی ایک غریب مصنف سے محبت کرتی ہے۔“

چارلس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے ایڈگر کا تذکرہ برداشت کر رہا تھا۔ اس نے حقارت سے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے وہ خود ہی قاتل ہے اور اب اپنی کہانیوں کے پلاٹ پر عمل کر رہا ہے۔“

”ایڈگر کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایک قتل کے وقت لیکچر روم میں تھا اور دوسرے قتل کے وقت ہمارے ساتھ تھا۔ اس لیے وہ قاتل نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرے مجھے یقین ہے قاتل کاسٹیوم پارٹی میں آئے گا جیسا کہ کہانی میں بیان کیا گیا ہے۔“

”ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”امکان ہے اور پولیس کے پاس موقع ہے کہ قاتل کو پکڑ سکے۔“

چارلس آگے جھکا اور سرود لہجے میں بولا۔ ”یہ میری پارٹی ہے اور میں پولیس کے کسی فرد کو اپنے گھر میں دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔“

”لیکن سیکورٹی.....؟“

”اس کے لیے میرے پاس بہترین اسٹاف ہے جو پوری سیکورٹی کر سکتا ہے کوئی غیر متعلقہ شخص میرے گھر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔“

”مگر وہ مستند مجرم ہے اور اس سے پولیس ہی بہتر نمٹ سکتی ہے۔“ گرین فیلڈ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”مسز ہملٹن سوچ لیں معاملہ آپ کی بیٹی کی حفاظت کا ہے۔“

تولازی کچھ نسلوں بعد وہ فرانسیسی کی بجائے انگریزی بولنا شروع کر دیں گے اور انگریزی بولنا انہیں کسی صورت گوارہ نہیں ہے۔“

گرین فیلڈ کو اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی کہ فرانسیسی کیوں ترک وطن کر کے امریکا نہیں آئے؟ اسے دل چسپی تھی کہ قاتل پکڑا جائے۔ سو اس بچے وہ ہملٹن ہاؤس میں داخل ہوئے تھے کہ چارلس ہملٹن ایڈگر کو اس کے ساتھ دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا اور بولا۔ ”یہ شخص یہاں کیوں آیا ہے؟“

”مسٹر ہملٹن، یہ اس معاملے کا اہم ترین کردار ہے۔“ گرین فیلڈ نے کہا۔ ”مسٹر پو کی یہاں موجودگی لازمی ہے۔“

چارلس اپنے ہونٹ کانٹنے لگا تھا پھر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن کل کے بعد مجھے یہ اپنے گھر میں نظر نہ آئے۔ اور ہاں یہ میری بیٹی سے بھی دور رہے گا۔“

چارلس مڑ کر چلا گیا۔ گرین فیلڈ کے آدمی پہلے ہی آچکے تھے اور ان کا انچارج نو جوان سارجنٹ جان سینٹرل تھا۔ گرین فیلڈ ان کو ہدایات دینے لگا۔ ایک درجن پولیس والے پورے ہملٹن ہاؤس کی نگرانی کرتے اور گرین فیلڈ بذات خود تقریب والے ہال میں موجود رہتا۔ جان سینٹرل داخلی دروازے پر تھا اور ہر آنے والے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے گرین فیلڈ کو بتایا کہ اب تک صرف نامور اور جانے پہچانے افراد آئے ہیں جن کی شناخت ہملٹن ہاؤس کے عملے نے کی ہے۔ ایک بھی اجنبی فرد اس وقت تقریب میں موجود نہیں ہے۔ ایڈگر ہال کے چاروں طرف نئی اوپری منزل کی راہداری میں آ گیا۔ یہاں سے وہ ہر طرف دیکھ سکتا تھا۔ اسے ایسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ شاید اندر تیار ہو رہی تھی۔ ساڑھے دس بجتے ہی پارٹی شروع ہوئی اور خواتین و حضرات نے مختلف قسم کے نقاب پہن لیے۔ بہت سے کاسٹیوم لباس میں بھی تھے۔ سازندے ساتھ جانے لگے اور جوڑے وسط ہال میں آ گئے۔ رقص کا آغاز ہو گیا تھا۔

ایسی اندر اپنے بیڈروم میں تیار ہو رہی تھی اور اس کی خادمہ اس کی مدد کر رہی تھی۔ ایسی کا ذہن منتشر تھا کیونکہ ایک طرف تو اسے ماں باپ نے بتا دیا تھا کہ اس پارٹی میں اسے لازمی اپنا جیون ساٹھی چن لینا تھا ورنہ وہ خود اس کے لیے کوئی مناسب شوہر دیکھیں گے اور دوسرے نفسیاتی قاتل کا خوف تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایڈگر کے ساتھ رہے گی۔ جب رات بارہ بجے تک کا وقت خیریت سے گزر

گلوں میں رنگ بھرے بادلوں بھار چلے
میں شامل ایک شعر کے بارے میں یہ غلط فہمی
پیدا ہو گئی ہے کہ فیض احمد فیض نے یہ غزل 29 جنوری
1954ء کو شکاری جیل (سایہ وال) میں لکھی تھی،
بعد میں یہ غزل مہدی حسن صاحب نے فلم سرفروش
کے لئے ریکارڈ کروائی اس غزل کو علاؤ الدین مرحوم پر
قلما یا گیا اسی فلم سے یہ غزل اتنی مشہور ہوئی کہ مہدی
حسن صاحب کی پہچان بن گئی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی شعر
نے جو فیض کے چاہنے والوں میں سے تھے انہوں
ہی غزل پر پوری ایک نئی غزل لکھی اور اور دو شعر بطور
خاص مہدی حسن صاحب کو دیئے جنہوں نے یہ شعر
فیض صاحب کی گلوں میں رنگ بھرے بادلوں بھار چلے
میں شامل کر لئے جس کا ایک شعر بہت مشہور ہوا،
ہوا جو تیر نظر نیم کش تو کیا حاصل
مزا تو جب ہے کہ سینے کے آ رہا چلے
باد جو اس کے کہ خود مہدی حسن صاحب نے
کئی دفعہ وضاحت کی کہ یہ شعر کنور مہندر سنگھ بیدی
سحر کا ہے فیض صاحب کا نہیں، کئی قابل احترام
ادیب، دانشور، اس شعر کو فیض احمد فیض سے منسوب
کرتے ہیں۔
(ذرا حیدر آبادی کے مضمون سے اقتباس)

جائے گا تو وہ ایڈگر سے کہے گی کہ اسے پروپوز کرے اور وہ
سب کے سامنے اس کا پروپوزل قبول کر لے گی۔ اس کے
بعد اس کے ماں باپ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ تیار ہو کر وہ باہر
آئی اور اس نے چہرے پر ایک نقاب لگایا تھا جو چاندی سے
بنا ہوا تھا اور تاج کی طرح اس کے سر تک جا رہا تھا۔ ہال کی
سیڑھیوں پر اس کی بچپن کی سیٹلی ماریٹا اس کی منتظر تھی اور وہ
اس سے بات کرتی نیچے آئی تھی کہ ایک سیاہ انسانی چہرے
کے خول میں چھپے شخص نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایسی
نے دیکھے بغیر کہا۔

”سوری میں کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔“

مگر ہاتھ اس کی طرف دراز ہی رہا تو اس نے دیکھا
اور حیرت کرادی۔ اس نے ہاتھ تمام لیا اور اس کی ہاتھوں میں
آگئی۔ وہ دیکھ کر تھا۔ دونوں رقص کرتے ہوئے ہال کے وسط
کی طرف جانے لگے۔ ایسی نے سرگوشی میں کہا۔ ”تم آ گئے
مجھے تمہارا انتظار تھا۔“

”میں تو کب سے آیا ہوا ہوں۔“ ایڈگر نے بھی سرگوشی میں کہا اس کی آواز کچھ بھاری ہو رہی تھی۔
”ڈیڈی اور مام چاہتے ہیں کہ میں اس تقریب میں کسی لڑکے کو پسند کر لوں۔“

”ہوں۔“ ایڈگر نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک طرف موجود چارلس نے اسے دیکھ لیا اور وہ تیزی سے اس کی طرف آیا۔ دوسری طرف گرین فیلڈ بھی صورت حال بھانپ کر ان کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک ہال کی ایک کھڑکی ٹوٹی اور اس سے ایک نقاب پوش شخص اندر آیا اور اسے دیکھتے ہی عورتیں چیختی ہوئی بھاگی گئیں۔ چاروں طرف سے پولیس والے اس کی طرف دوڑ پڑے۔ نقاب پوش آگے بڑھا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ الٹ کر گرا اور چیخنے دھاڑنے لگا۔ فائر گرین فیلڈ نے کیا تھا وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور پستول کا رخ اس کے چہرے کی طرف کر کے کہا۔

”نقاب ہٹاؤ اپنے چہرے سے قاتل۔“

”میں قاتل نہیں ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے کہا اور چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ ایک ڈراما ہوگا جو سسٹریڈگر کی مرضی سے ہو رہا ہے۔“

”ایڈگر کہاں ہے؟“ چارلس دھاڑا۔ ”میں اسے گولی مار دوں گا۔“

مگر گرین فیلڈ دیکھ رہا تھا کہ وہاں نہ تو ایڈگر تھا اور نہ ہی ایملی نظر آرہی تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔ ”جان دیکھو ایڈگر اور ایملی کہاں ہیں۔“

جان اور دوسرے سپاہی ان دونوں کو تلاش کرنے لگے۔ زخمی نوجوان نے ایک رقعہ گرین فیلڈ کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”اس نے کہا تھا کہ اگر کوئی مجھے کچھ کہے تو میں یہ رقعہ دکھا دوں۔“

گرین فیلڈ نے رقعہ لے کر کھولا تو اس میں چند سطریں لکھی تھیں۔ ”تمہارے جو کچھ وہاں میں نے پورا کر دیا..... پھر سے دوست کہانی آگے بڑھنے کا انحصار تم پر ہے تم اپنے خیال سے جو کچھ گمے میں ویسا ہی کروں گا..... میں خیال رہے تمہاری سوچ میرے ارادے سے متصادم نہ ہو۔“ ایملی کے پاس وقت کم ہے اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے اسے تلاش کر لو۔“

اسی لمحے گھڑیال کے سبھرنے بارہ بجائے اور گرین فیلڈ نے بے ساختہ گھڑی کی طرف دیکھا تھا۔ اوپر سے ایڈگر

اترتا دکھائی دیا۔ اس نے دور سے دیکھ لیا کہ گڑبڑ ہے وہ چلا یا۔ ”کیا ہوا ایملی کہاں ہے؟“
گرین فیلڈ اس کے پاس آیا۔ ”وہ تمہارے ساتھ رقص کر رہی تھی۔“

”میرے ساتھ رقص کر رہی تھی؟“ ایڈگر نے حیرت سے کہا۔ ”میں تو اوپر تھا۔“
”میرے خدا۔“ گرین فیلڈ بولا۔ ”وہ اسے لے گیا ہے۔ باہر جانے والے سارے راستے بند کر دو۔“

پولیس والے اور چارلس کے گارڈز چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ ایڈگر ان کے ساتھ تھا اور انہوں نے کچھ دیر میں ہمشین ہاؤس کا چپ چاپ چھان مارا تھا۔ ایملی غائب تھی۔ عمارت کے عقب میں واضح جنگل میں ایک جگہ گھوڑے کے قدموں کے نشان تھے جو باہر کی طرف جا رہے تھے۔

☆☆☆

ایڈگر سکتے کی حالت میں پولیس آفس کے مینٹگ روم میں ایک طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی سی میز سے لگا ہوا تھا اور گرین فیلڈ اپنے آدمیوں سے بات کر رہا تھا۔ ”سب سے پہلے ہمیں ہالٹی مور کی ہرگلی چیک کرنا ہوگی۔ جس پر ذرا شبہ ہو اسے گرفتار کر لو۔“

”بیکار ہے۔“ ایڈگر نے زیر لب کہا۔ ”وہ کامیاب رہا ہے۔ اس نے کہانی کے مطابق ایملی کو کسی جگہ بند کر دیا ہے جہاں سے وہ آؤ نہیں ہو سکتی۔“

گرین فیلڈ اس کی طرف آیا۔ ”سنو ایڈگر مجھے اسی وجہ سے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ قاتل نے تمہیں چیلنج کیا ہے کہ اب تم کہانی جس طرح آگے بڑھاؤ گے وہ ویسا ہی کرے گا۔“

ایڈگر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس نے یہ بھی کہا ہے کہ میری کہانی اس کی سوچ سے متصادم نہ ہو۔ اس صورت میں نقصان ایملی کو ہوگا اور اس کے پاس وقت پہلے ہی کم ہے۔“
اچانک مینٹگ ہال کا دروازہ دھڑام سے کھلا اور چارلس ہمشین اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر آیا۔ گرین فیلڈ اس کی طرف بڑھا۔ چارلس نے گرج کر کہا۔ ”ینیشنٹ میری بیٹی کہاں ہے۔ وہ تمہارے سامنے غائب ہوئی اور تم نے اس کی ذمہ داری لی تھی۔“

”آپ نے ٹھیک کہا لیکن آپ کے آدمیوں نے بھی کوئی چیز کی ہے۔“

”میرے آدمیوں نے؟“ چارلس کا چہرہ سرخ ہو گیا

پھر اس کی نظر ایڈگر پر مگنی اور وہ غرا کر اس کی طرف بڑھا۔ ”یہ ذلیل شخص یہاں کیا کر رہا ہے؟“

اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا اس نے آگے بڑھ کر ایڈگر کو گھونسا مارا اور وہ بیچ سے نیچے گر گیا۔ وار بہت قوت والا تھا اور ایڈگر بے خبر تھا اس لیے چند لمحوں کے لیے اس کے حواس گم ہو گئے۔ جب وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا تو چارلس کو دو پولیس والوں نے جکڑ رکھا تھا اور گرین فیلڈ اس پر گرج برس رہا تھا۔ چارلس بکنا جھکتا وہاں سے رخصت ہو گیا اور گرین فیلڈ نے اس سے معذرت کی لیکن ایڈگر نے ہاتھ اٹھایا۔ ”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے اور مسٹر چارلس کا غصہ بھی بجا ہے۔ وہ متاثر آدمی ہیں۔“

گرین فیلڈ نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا وہ سب وہاں سے چلے گئے۔ اس نے کہا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“

”مجھے سوچنا پڑے گا۔“ ایڈگر نے کہا۔ ”یہ بیچ صرف میرے لیے نہیں ہے۔ اس وقت ایسلی کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہے۔“ ایڈگر نے اپنی ٹوپی اپنی۔ ”مجھے سوچنا ہو گا کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے؟“

☆☆☆

ایسلی کو ہوش آیا تو وہ کسی تنگ و تاریک جگہ تھی۔ بالکل کسی تابوت کی طرح تنگ اور تاریک۔ اس کا دل خوف اور بے چینی سے بھر گیا۔ اس نے بے تابانی سے ہاتھ مارے اور چلاتے لگی۔ ”کوئی ہے مجھے یہاں سے نکالو، میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

وہ بار بار اوپری تختے پر ہاتھ مارتی رہی اور چلاتی رہی۔ اسے جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ تابوت کے سائز کا لکڑی کا بکس تھا۔ اچانک بکس پر رکھا ہوا دوسرا تختہ سرکا اور اس کی اوپری درازوں سے روشنی جھلکنے لگی۔ پھر اس سے ایک آنکھ ظاہر ہوئی اور کسی نے سرگوشی میں کہا۔ ”اپنا منہ بند کر لو ورنہ مجھے بند کرنا ہو گا۔“

ایسلی کی آواز رک گئی پھر اس نے یہ مشکل کہا۔ ”چلیں میں اب نہیں چیخوں گی۔“

”اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“ آدمی نے کہا اور اچانک ہی بکس سرکا، وہ ترجیحا ہوا نیچے گیا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ ایسلی اندر رہ کر رہ گئی مگر اس بند بکس میں اتنے پلٹنے کی جگہ نہیں تھی۔ بکس سیدھا ہوا اور پھر اس پر دوسرا تختہ آن گرا اور تھوڑے سے کیل ٹھونکنے کی آواز آنے لگی۔ ایسلی پھر ہاتھ مارنے لگی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ مگر آدمی رکا

نہیں۔ کیلیں ٹھونکنے کے بعد اس نے اوپر سے بکس پر مٹی گرانی شروع کی تھی۔ سائینڈوں کے رختوں سے مٹی اندر آ رہی تھی۔ چند منٹ میں وہ زمین میں دفن کر دی گئی تھی۔ وہ خوف سے کانپنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس بند جگہ وہ زیادہ در زندہ نہیں رہ سکے گی۔ دم گھٹ کر مر جائے گی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ شخص کون ہے۔ مگر اسے یقین تھا یہ وہی جنونی قاتل تھا جو ایڈگر کی کہانیوں کو عملی صورت دے رہا تھا۔ اب اس نے اسے زندہ دفن کر دیا تھا۔

ایسلی اپنے خیال میں ایڈگر کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ جب کھڑکی توڑ کر نقاب پوش اندر آیا تو ایڈگر اسے پہنچ کر وہاں سے لے جانے لگا اور ایسلی نے بھی اس خیال سے اس کا پورا ساتھ دیا کہ شاید نقاب پوش وہی قاتل تھا۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے ہملٹن ہاؤس کے عقبی حصے میں آئے اور جب ایڈگر اسے لے کر جنگل میں داخل ہوا تو ایسلی نے پوچھا۔ ”ایڈگر تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟“

”کیونکہ میں ایڈگر نہیں ہوں۔“ اس نے کہا تو ایسلی اچھل پڑی تھی اور پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر نقاب پوش نے اسے جکڑ لیا اور اس نے چلانے کی کوشش کی تو اس کے چہرے پر ایک رومال آکر جم گیا۔ اس سے اٹھتی تیز بو ایسلی کے دماغ پر چڑھنے لگی اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ایڈگر کا غم قلم لے کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا ذہن اس معے کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی کہانیوں کو اتنی صفائی سے عملی صورت دینے والا شخص صرف نفسیاتی مریض نہیں تھا بلکہ وہ ایک الگ طرح کی ذہانت اور جسمانی صلاحیتوں کا حامل بھی تھا۔ ایڈگر سوچوں میں اس کا شخصی تجزیہ کر رہا تھا۔ اس کے خیال میں ایسا شخص جو اپنے میدان میں نظر انداز کیا گیا ہو اور یہ ظاہر وہ معمولی سا دکھائی دیتا ہو۔ اس کی محرومی نے اسے نفسیاتی بنایا اور جن لوگوں کو وہ اس کا ذمے دار سمجھتا تھا وہ ان کے خلاف مصروف عمل ہو گیا۔ اس کے فکار ہونے والے تینوں افراد غیر متعلق تھے۔ وہ صرف ایڈگر کی کہانیوں کو عملی شکل دینے کی وجہ سے اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ البتہ ایسلی اس سے تعلق رکھتی تھی۔ ایڈگر نے خود سے پوچھا۔ ”مجھ سے کیا پر خاش ہو سکتی ہے۔“

ایڈگر کے خیال میں اہل میں ایک ہی صلاحیت تھی جس سے کوئی دوسرا فرد حسد کر سکتا تھا۔ اس کے لکھنے کی

نے کہتے ہوئے آئیوان کو آواز دی اور بولا۔ ”لیکن اس قصہ کا عنوان.....“

”کہانی کا ایک لفظ بھی تبدیل نہیں ہوگا۔“ ایڈگر نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”اوکے۔“ ہنری نے ٹھنڈی سانس لی اور لمبا سانس کاغذ آئیوان کو پکڑا دیا۔ ایڈگر کی عاوت تھی کہ وہ ایک صفحے پر لکھتا تھا اور اسے رول کرتا جاتا۔ یعنی وہ اصل میں رول پر لکھتا تھا جہاں تک پہنچ کر کہانی ختم ہو جاتی وہاں کاغذ رول سے کاٹ کر اس کی نگلی سیٹا لیتا تھا۔ یہ اس کا منفرد اور مخصوص انداز تھا۔ اس کے علاوہ شاذ ہی کسی مصنف نے اس طرح لکھا ہو۔ ایڈگر آئیوان کے ساتھ پریس والے حصے میں آتا کیونکہ یہاں اس کی پسندیدہ چیز کا اسٹاک تھا اس نے میز کے نیچے سے بوتل نکالی اور آئیوان سے کہا۔

”اسے سب سے اوپر والے حصے میں ذرا نمایاں کر کے لگاتا۔“

”آپ بے فکر رہیں مسٹر پو، میں آپ کی تحریر ہمیشہ نمایاں کر کے لگاتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں آپ کا مداح ہوں۔“

ایڈگر نے اس کی بات غور سے نہیں سنی تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا کہ آخر وہ نامعلوم قاتل اس سے کیا چاہتا تھا یہ تو سچ تھا کہ وہ ایسلی کو آزاد نہیں کرے گا کیونکہ اس طرح خود اس کی شخصیت کھل جائے گی پھر وہ اسے چیلنج بھی کر رہا تھا کہ وہ ایسلی کو آزاد کرالے۔ اگلے دن بالٹی مور پٹریا ٹک میں اس کی کہانی کی اگلی قسط نمایاں طور پر شائع ہوئی جس میں اس نے بیان کیا تھا کہ ایسلی نے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی اور پھر سے پکڑی گئی۔ اس دوران میں گرین فیلڈ کے آدمی شہر بھر میں ایسی ویران جگہوں کو کھوہا پھر رہے تھے جہاں کسی کو خفیہ طور پر چھپایا جاسکتا تھا۔ دن مصروف رہنے کے بعد گرین فیلڈ واپس گھر آیا تو خانا نے اسے ایک چھوٹا سا بکس دیا۔ گرین فیلڈ نے پوچھا۔ ”کہاں سے آیا؟“

”ہاں نہیں سر، میں نے اسے دروازے کے سامنے میز پر رکھے پایا۔ کوئی شام چھ بجے کے بعد رکھ گیا ہے۔“

گرین فیلڈ نے بکس ذرا سا کھول کر دیکھا اور بند کرتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایڈگر کے پاس اس کے سامنے تھا۔ اس نے بکس میز پر رکھا۔

صلاحیت۔ گرین فیلڈ کے پولیس ماہرین نے اس کی دوسری تحریر پر بھی کام کیا تھا اور ان کے خیال میں مذکورہ شخص نہ صرف اعلیٰ تخیلاتی صلاحیت رکھتا تھا بلکہ ادب اور دوسرے علوم پر اس کی معلومات بھی بہت زیادہ تھیں۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ایڈگر کو خیال آیا کہ وہ اب ایسلی کی قید کا احوال بیان کرے گا۔ اس نے قلم اٹھایا انک میں ڈبویا اور لکھنے لگا۔ وہ کہانی کی تکمیل میں اتنا مگن ہو گیا کہ اسے دروازے پر ہونے والی دستک بھی سنائی نہیں دی اور جب اندر سے جواب نہیں ملا تو گرین فیلڈ اپنا پستول نکال کر اندر آ گیا۔ اس نے ایڈگر کو صحیح سلامت میز کے دوسری طرف پا کر اطمینان کا سانس لیا اور پستول واپس کوٹ میں رکھ لیا۔

”سوری مسٹر پو میں نے تم کو پریشان کیا لیکن میں نے سوچا کہ تم سے بات کروں۔“

”کسی بات؟“ ایڈگر نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”کیا تم نے کبھی کسی ملال کی کہانی لکھی ہے؟“

”نہیں؟“

”کسی کہانی میں ملال کا ذکر ہے؟“

ایڈگر اٹھ کر بیٹھنے لگا پھر اس نے بے بسی سے گرین فیلڈ کی طرف دیکھا۔ ”مجھے یاد نہیں، شاید میں نے ایسا کیا ہو لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”قاتل نے جو قصہ لکھا ہے وہ کاغذ عام طور سے ملال استعمال کرتے ہیں۔ یہ کسی قدر چکنا ہوتا ہے جو پانی سے جلدی مٹا نہیں ہوتا۔“

”اگر اس نے ایسا کاغذ استعمال کیا ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملال ہے؟“

”ملا بہت کچھ نہیں ہوتا ہم مفروضوں پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔“ گرین فیلڈ نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”کیا تم نے اپنے تخیل کو استعمال کیا؟“

”میں یہی کوشش کر رہا ہوں۔“ ایڈگر نے کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔

ایڈگر بالٹی مور پٹریا ٹک کے دفتر میں ہنری کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور ہنری اس کی کہانی پڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا اس کے چہرے پر جوش کے علامات بڑھ رہے تھے آخر میں اس نے میز پر ہاتھ مارا۔ ”یہ میں نہیں چاہتا ہوں کہ تم قارئین کو جکڑ لینے والے انداز میں لکھو ان کو حقائق میں الجھاؤ بہ نسبت جاسوسی طریقوں کے۔“ ہنری

☆ ☆ ☆

”وہ نہیں ہے۔“ گرین فیلڈ نے کہا۔ ”اس کا لباس دیکھو، ایملی نے ایسا لباس نہیں پہنا تھا۔ قاتل یہیں ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔“

گرین فیلڈ تیزی سے آگے آیا۔ وہ سرنگوں میں دیکھ رہا تھا۔ ایک سرنگ کے سرے پر اسے کسی کا سایا نظر آیا اور اس نے آواز دی۔ ”کون ہے۔“

اس پر سایا تیزی سے آگے بڑھا تو گرین فیلڈ بھی اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ سائے نے لمبا کوٹ پہنا ہوا تھا اور گرین فیلڈ کو یاد آیا کہ ریمن کے پڑوسیوں نے قاتل کا حلیہ جو بیان کیا تھا اس میں لمبا کوٹ نمایاں تھا۔ گرین فیلڈ نے سیٹی بجائی اور اس کے پیچھے لگا رہا۔ ایک جگہ وہ صاف دکھائی دیا اور گرین فیلڈ نے اس پر فائر کیا مگر وہ بچ گیا۔ پھر وہ اچانک ہی غائب ہو گیا اور جب گرین فیلڈ اس جگہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ میز حیاں اوپر چار دی ہیں اور کوٹ والا باہر نکل گیا تھا بس اس کی آخری جھلک دکھائی دی تھی۔ گرین فیلڈ بھی تیزی سے میز حیاں چڑھ کر اوپر آیا اور اس نے سر باہر نکالا تھا کہ سامنے سے ایک چمبی آئی دکھائی دی۔ سوراخ عین سڑک کے درمیان میں نکل رہا تھا۔ وہ بے ساختہ نیچے ہوا اور اس کے ہاتھ سے میز می نکل گئی وہ تقریباً پندرہ فٹ کی بلندی سے نیچے آگرا۔ چند لمحوں بعد وہ کراہتا ہوا اٹھا تو اسے چوٹ خاص نہیں آئی تھی مگر قاتل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اسی لمحے اس کے آدمی آگئے اور انہوں نے بتایا کہ نکالی جانے والی لاش ایملی کی نہیں تھی بلکہ کسی اور لڑکی کی تھی۔

☆☆☆

بالٹی مور اسپتال کے مردہ خانے کی میز پر لڑکی کی لاش پڑی تھی اور گرین فیلڈ اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ لڑکی کے ہونٹ چوہوں نے کھا لیے تھے مگر اس کے دانت سلامت تھے۔ لڑکی کی موت گلے میں رسی کا پھندا پڑنے سے ہوئی تھی۔ گرین فیلڈ نے ایڈگر کی طرف دیکھا۔

”یہ بھی تمہاری کوئی کہانی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”دی گرل منگ ان شیدوز۔“
گرین فیلڈ نے گلے میں پھنسی رسی کاٹ کر الگ کی تو ایڈگر نے مے باختہ کہا۔ ”کو پرناٹ..... میں نے کہانی میں اسی گروہ کا ذکر کیا ہے۔“

”کتیا کا بچہ۔“ گرین فیلڈ نے غصے سے کہا۔ ”وہ بہت مکار اور تیز آدمی ہے۔ بہت بھی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ وہ میرے سامنے سے نکل گیا۔“

ایڈگر نے کھول کر دیکھا اور چونک گیا۔ بکس میں ایک گوشت کا ٹکڑا رکھا تھا اور یہ کسی انسان کی زبان تھی۔ اس نے چٹنی سے اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”یہ کم سے کم دو دن پرانی ہے۔“

”ایملی کو غائب ہوئے اتنا ہی وقت ہو گیا ہے۔“
گرین فیلڈ نے کہا۔ بکس کے نیچے ایک چھوٹا سا رقعہ تھا اس پر ایڈگر کی ایک نظم کے دو مصرعے تحریر تھے۔

وہ جو تار یک سرنگوں میں رہتے ہیں
وہ جنہوں نے روشنی کبھی نہیں دیکھی

گرین فیلڈ ایڈگر سے ملا اور اس کے سامنے رقعہ رکھ دیا۔ ایڈگر نے رقعہ دیکھا اور گرین فیلڈ سے پوچھا۔ ”کیا شہر میں کہیں سرنگیں ہیں؟“

”بالکل نئے شہر کے نیچے سرنگیں ہیں جو کسی زمانے میں پرانے شہر کی گلیاں ہوتی تھیں پھر ان کو کا کر کے اور ان پر چھت تعمیر کر کے انہیں بارش کے پانی کی نکاسی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔“

”ایملی وہیں کہیں ہے۔“ ایڈگر بولا۔ ”اپنے آدمیوں کو بلا لو اور کھدائی کے اوزار بھی منگوا لو۔“

شام ہونے سے پہلے وہ ان سرنگوں میں پہنچ گئے تھے جو نصف مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں اور انہیں سرخ اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ وہ سب ان سرنگوں میں پھیل گئے اور کسی ایسی جگہ کو تلاش کرنے لگے جہاں کسی کو چھپایا جا سکتا ہو۔ ساتھ ہی وہ چلا چلا کر ایملی کو آواز دے رہے تھے۔ ایڈگر الگ تھا وہ ایک کھدال کے ساتھ سرنگوں کی دیوار چیک کر رہا تھا۔ وہ کھدال کا دستہ مار کر دیکھ رہا تھا کہ دیوار ٹھوس ہے یا اس کے پیچھے کوئی خلا ہے؟ ایک جگہ اسے محسوس ہوا کہ دوسری طرف خلا ہے اور اس نے اس پر کھدال چلائی شروع کر دی۔ چند منٹ میں اس نے پہلی اینٹ نکالی دی اور اس کے بعد کام آسان ہو گیا۔ چند اینٹیں نکال کر اس نے لائٹن کی روشنی میں اندر جھانکا تو اسے ایک بہت پرانا خستہ حال فرنیچر والا کمرہ نظر آیا۔ ایملی یہاں نہیں تھی۔ اسی لمحے اسے کہیں دور کھدال چلنے کی آواز آئی۔ وہ لائٹن اٹھا کر اس طرف دوڑا اور جب وہاں پہنچا تو گرین فیلڈ ٹوٹی دیوار سے اینٹیں نکال رہا تھا۔ اس جگہ کی نشان دہی جان نے کی تھی کہ یہاں دیوار پر اینٹوں کا رنگ ہلکا تھا۔ جیسے ہی خلا ذرا بڑا ہوا انہوں نے لائٹن اٹھا کر اندر دیکھا اور انہیں سنہرے بالوں کی جھلک دکھائی۔ ایڈگر نے بے تاب سے کہا۔

”ایملی.....“

ایڈگر نے اس کا منہ کھولا تو اندر سے زبان غائب تھی مگر اس کی جگہ ایک زنجیر والی گھڑی تھی۔ اس کے ساتھ سونے کی چین بھی منسلک تھی۔ گھڑی کی سوئیاں سات بج کر بیالیس منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔ ایڈگر چونکا۔
 ”یہ نشان دہی ہے؟“
 ”کس کی؟“

”شاید جگہ کی، یہ ارض البلد اور طول البلد کی چھوٹی اکائیاں ہیں۔ ہمیں اس علاقے کے تفصیلی نقشے کی ضرورت ہے۔“
 ”ایسا نقشہ کہاں ملے گا؟“

”میں جانتا ہوں کہاں ملے گا میرے ساتھ آؤ۔“
 کچھ دیر بعد وہ ہملٹن ہاؤس میں تھے۔ چارلس ہملٹن سابق جہاز راں تھا اور وہ بحری جہازوں پر کپتان بھی رہا تھا۔ اس کے پاس بہترین اور تفصیلی نقشے تھے۔ حسب معمول اسے دیکھ کر چارلس کا چہرہ بگڑا تھا مگر جب اسے پتا چلا کہ وہ ایمپلی کے جائے قید کے بارے میں مدد کے لیے اس کے پاس آئے ہیں تو وہ فوراً تیار ہو گیا اور انہیں اپنی اسٹڈی میں لے آیا۔ ایڈگر اسے نقشوں کے بارے میں بتانے لگا اور چارلس حیران ہوا۔ ”تم نقشوں کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“

”میں مصنف ہوں میرا کام ہی جانتا ہے۔ ورنہ میں لکھوں گا کیسے؟“

”کون سا نقشہ چاہیے؟“
 چارلس کے پاس دو بانی دو فٹ سائز میں عرض البلد اور طول البلد کے تفصیلی نقشے تھے۔ ایڈگر نے بالٹی مور کا نقشہ لیا اور اس کی سات بیالیس تلاش کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک جگہ انگلی دہکی۔ ”یہ ہے۔“

”یہاں قبرستان ہے۔“ گرین فیلڈ نے کہا۔
 ”ہمیں فوراً جانا ہوگا“ چارلس نے بے چینی سے کہا۔

گرین فیلڈ اور جان کے ساتھ ایڈگر، چارلس اور اس کے آدمی بھی تھے۔ وہ قبرستان پہنچے تو موسم ابر آلود تھا اور جنگل کی طرف سے دھند نمودار ہو رہی تھی۔ قبرستان کا ایک حصہ بالٹی مور کے نامور مارٹل خاندان کے لیے مخصوص تھا اور انہوں نے یہاں ایک بہت بڑی عمارت بنوائی تھی۔ ان کے مردے اسی عمارت میں رکھے یا دفن کیے جاتے تھے۔ یہی ایک جگہ ہو سکتی تھی جہاں کسی زندہ انسان کو چھپا پا جا سکتا تھا۔ وہ اس عمارت کے چاروں طرف پھیل گئے۔ ایڈگر

دروازوں کو دیکھ رہا تھا۔ جان ایک طرف عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اسے ایک دروازے کی طرف سے ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا اور وہ پستول سیدھا کیے اس کی طرف آیا کہ اسے اوپر سے آہٹ سنائی دی اور جب اس نے اوپر دیکھا تو ایک سایا سا اس کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ دھات کی چمک لہرائی اور جان کا گلا کٹ گیا۔ اس نے فائر کیا مگر گولی نہیں اور گئی تھی۔ وہ گلا تمام کر نیچے گر گیا اور جب اس نے قاتل کا چہرہ دیکھا تھا۔ قاتل نے آرام سے جھک کر اس کے ہاتھ سے پستول نکالا اور ایک طرف غائب ہو گیا۔ اسی لمحے فائر کی آواز سن کر گرین فیلڈ دوڑتا ہوا وہاں آیا اور جان کو دم توڑتے دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنا مفلتر اتار کر اس کے گلے پر رکھا اور بولا۔

”جان یہ کیا ہوا ہے؟“

جان نے لرزتے ہاتھوں سے اس سمت اشارہ کیا جس طرف قاتل گیا تھا اور اسی لمحے جنگل کی طرف سے چلائی جانے والی گولی آکر گرین فیلڈ کے سینے میں اتر گئی۔ وہ چیخ مار کر گر گیا تھا۔ ایڈگر بھی دوڑتا ہوا وہاں آیا اس کے پیچھے چارلس اور اس کے آدمی تھے۔ گرین فیلڈ نے اپنا پستول ایڈگر کی طرف بڑھایا۔ ”اس کے پیچھے جاؤ میرا گھوڑا لے جاؤ۔“

ایڈگر نے گرین فیلڈ کا گھوڑا پکڑا اور آگے بڑھا دیا۔ جنگل سے ٹاپوں کی آواز بتا رہی تھی کہ قاتل فرار ہو رہا ہے۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے ایڈگر گھوڑے کی ٹاپوں پر بچھا کرنے لگا مگر چند فلائنگ آگے نکلنے کے بعد ٹاپوں کی آواز رک گئی۔ ایڈگر بھی رک گیا تھا۔ اچانک سامنے سے گولی آئی اور گھوڑے کی گردن میں اتر گئی۔ اس نے جھپٹا کر اگلے پاؤں اٹھائے تو ایڈگر الٹ کر پیچھے گرا اور گھوڑا بھاگ نکلا۔ ایڈگر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا اور اس نے پستول نکال لیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ قاتل کہاں ہو سکتا ہے۔ اچانک سامنے سے پھر فائر ہوا اور اس بار ایڈگر نے سمت دیکھ لی اور نے لگا تار دو فائر کیے اور چلا کر بولا۔

”بزدل سامنے آؤ۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

جواب میں ایک قہقہہ سنائی دیا اور پھر گھوڑوں ٹاپوں کو بجنے لگیں۔ قاتل فرار ہو رہا تھا۔ ایڈگر نے اس سے پیستول کی باقی ساری گولیاں چلا دیں مگر وہ قاتل کا نہیں بگاڑ سکا تھا۔ جب وہ واپس پہنچا تو قبرستان پوٹ

شائع نہ کی۔“

ہنری نے کہانی کا رول اس کے منہ پر دے مارا۔ ”اسے لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

اگر آئیوان نہ پکڑتا تو ایڈگر پھر ہنری کا گھاد بوجھ لیتا۔ وہ اسے کھینچ کر باہر لے گیا اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے شراب کا گلاس پیش کیا۔ یہ ایسی چیز تھی جس سے ایڈگر کسی صورت انکار نہیں کر سکتا تھا اس نے ایک سانس میں گلاس خالی کیا اور آئیوان سے کہا۔ ”تم دیکھ لیتا اگر میں لکھتا بند کر دوں تو یہ جیتھڑا کوئی ردی کے بھاؤ بھی نہ لے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر پو۔“ آئیوان نے ادب سے کہا۔ ”آپ اور مسٹر ہنری دونوں غصے میں ہیں آپ کل آئیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ہنری کے کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور ہنری نے جھانک کر کہا۔ ”اسے کہو اب یہاں آنے کی زحمت نہ کرے۔ یہ اخبار اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ جلد اسے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا۔“

اس نے کہا کہ دروازہ بند کر لیا۔ ایڈگر وہاں سے روانہ ہوا۔ وہ سارا دن پالٹی مور کی سڑکیں تاپتا رہا اور جب شام کے وقت گھر پہنچا تو اس کا گھر کھلے اگل رہا تھا۔ فائر بریک کا عملہ۔ ہینڈ پمپ اور بالٹیوں میں پانی کی مدد سے آگ بجھا رہا تھا مگر شعلوں سے لگ رہا تھا اس کا سارا اثاثہ راکھ ہو گیا تھا۔ اس میں اس کے ہاتھ سے لکھے مسودے بھی شامل تھے۔ فائر فائٹر چیف نے اسے بتایا کہ کسی نے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر آگ لگائی۔ امکان تھا کہ شراب کی بوتل کے منہ پر پکڑا ٹھونس کر اسے آگ دکھا کر اندر پھینکا گیا تھا اسی لیے آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ جب تک فائر بریکسٹڈ والے آتے اندر سب راکھ ہو چکا تھا اب وہ صرف آگ بجھا رہے تھے۔ بچنے والی واحد چیز ایڈگر کا نیولا تھا جو بچرے میں بند تھا۔ وہ ایڈگر کے حوالے کر دیا گیا۔ آج اس کے لیے مہدموں کا دن تھا۔ ایملی کی زندگی کی اُمید ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ہنری نے اس کی کہانی شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اب اس کی ساری کہانیاں اور کتابیں جل گئی تھیں۔ اگرچہ یہ کہانیاں رسالوں، اخبارات اور کتابوں کی صورت میں موجود تھیں مگر ان کے ہاتھ کی تحریر میں اب باقی نہیں رہی تھیں۔ وہ نئے نئے لکھے گئے مسودوں سے وہاں سے رخصت ہوا۔ بہت دیر بعد اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو گرین فیلڈ کے گھر کے سامنے پایا۔ دستک کے جواب میں

والوں سے بھرا ہوا تھا۔ جان کی لاش اور زخمی گرین فیلڈ کو لے جایا گیا تھا۔ چارلس وہاں موجود تھا اور پہلی بار ایڈگر کو اس میں نرمی نظر آئی۔ وہ تھکا اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ایڈگر سے اپنے رویے پر معذرت کی تھی۔ ایڈگر گرین فیلڈ کے گھر پہنچا جہاں ڈاکٹر نے اس کا آپریشن کر کے گولی نکال دی تھی اور اس کی حالت بہتر تھی۔ مگر جان کے مارے جانے کا دکھ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس نے ایڈگر سے کہا۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔“

”ابھی تو وہ بہت چالاک اور ہر موقع پر ہم سے تیز ثابت ہو رہا ہے۔ وہ ہمیں کٹھن پتلیوں کی طرح اپنے اشاروں پر نچا رہا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور ہمارے سامنے سے نکل جاتا ہے۔“

”اتفاقات اسے بچارے ہیں۔“

”نہیں یہ اس کے اندر کی شیطانی قوت ہے۔“ ایڈگر نے کہا۔ ”وہ شیطان کا پرتو ہے۔ وہ عام مجرم نہیں ہے۔“

”وہ ایک انسان ہے۔“ گرین فیلڈ نے نرمی سے کہا۔ ”نہیں وہ شیطان ہے۔“ ایڈگر نے یقین سے کہا اور

وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب اسے اس کہانی کا اگلا حصہ لکھنا تھا۔ اس نے ساری رات جاگ کر اس کا اگلا حصہ لکھا اور اسے لے کر ہنری کے پاس گیا۔ اس میں اس نے بیان کیا کہ قاتل نے غلطی کی اور ایملی اس کی قید سے نکل گئی۔ اس کے بعد قاتل نے زہر پی کر خودکشی کر لی کیونکہ اس کا راز فاش ہونے والا تھا اور اسے قانون کے ساتھ ذلت کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ ہنری نے یہ قسط دیکھی اور اسے میز پر پھینک دیا۔

”بکو اس یہ نہیں چلے گی۔“

”کیوں؟“ ایڈگر نے بے قابو ہو کر کہا۔

”کیونکہ اب میں جان گیا ہوں تم میرے اجبار کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہو۔“

”میں یہ کام رقم کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ تمہیں اسے شائع کرنا ہو گا۔“ ایڈگر نے اس کا گھلا پکڑ لیا۔ آئیوان

درمیان میں آیا اور اس نے بہ مشکل ہنری کو ایڈگر سے چھڑایا۔ ہنری ہانپنے لگا تھا اس نے چلا کر کہا۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔“

”اور میں تمہیں جہنم بھیج دوں گا اگر تم نے میری کہانی

”مسٹر گرین فیلڈ سو رہے ہیں؟“

”ہاں کیونکہ اس کہانی کا آخری باب مجھے لکھنا ہے۔“
اس نے ایک گلاس ایڈگر کی طرف سرکا دیا۔ ایڈگر کو لگا کہ اس کا
سر چکر رہا ہے اسے شراب کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس
نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔
”تم دیوانے ہو۔“

”بہن! یہاں کیا ہے؟“ آئیوان نے اس کی بات دہرائی۔ ”کوئی ٹیکھا جملہ نہیں..... کوئی مصرع نہیں..... ایسا مصنف جو تاریکیوں کا مزاج شناس ہے جو بیروں سے تھے موجود اصرار جانتا ہے..... اس سے اس سادہ جملے کی توقع نہیں تھی۔“

ایڈگر نے اچانک پستول اس کے کان کے پاس کرتے ہوئے فائر کیا اور چلا کر بولا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

ایڈیٹر نے سوچا اور پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی حالت خراب ہو رہی تھی اور اندر اذیت بڑھ رہی تھی۔ آئیوان نے پستول لے کر نیچے رکھا اور ایک چھوٹی شیشی نکالتے ہوئے بولا۔ ”مسٹر پوتھارے تاثرات سے لگ رہا ہے تم کسی ننھے بچے کی طرح رونا چاہتے ہو۔“ اس نے چھوٹی شیشی ایڈیٹر کو دکھائی۔ ”یہ تریاق ہے۔ تم جانتے ہو تریاق

اس نے لفافہ لا کر دیا اور ایڈگر نے کھولا تو اس میں ہنری کی تحریر میں لکھا تھا۔ ”تم ہار گئے ایڈگر..... ہنری۔“

ایڈگر نے کاغذ توڑ مڑ کر نیچے پھینک دیا۔ وہ مڑا اور روانہ ہو گئے۔ جب وہ ہالٹی مور پیڑیا تک کی عمارت میں داخل ہوا تو رات کا آخری پہر تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد صبح ہو جاتی۔ ایڈگر اندر آیا اور ہنری کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایڈگر نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا اور بولا۔ ”ایسلی کہاں ہے؟“

ہنری نے کوئی جواب نہیں دیا اس کے جسم میں حرکت بھی نہیں ہوئی تھی۔ ایڈگر نصے سے بے قابو ہو کر آگے آیا تھا۔ ”ذلیل شخص جواب دو ایسلی کہاں ہے؟“

آئینان نے دونوں ہاتھ اوپر کیے اور پھر اس کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بالکل بدل گئے تھے اور وہ نہایت شاطرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ”حیران ہوئے..... ہے تا مسر ہو؟“

”ڈرک۔“ آئیوان نے اس کی بات نظر انداز

میرے باپ کی ایجاد ہے۔ ہرزہ ہر کا توڑ ہے۔“

”زہر۔“ ایڈگر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں میرے باپ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ جب کہیں کچھ کھانے پینے جاؤ تو اسے ہمیشہ ساتھ رکھا کرو۔ ممکن ہے کہیں تمہیں زہر دے دیا جائے۔“ اس نے کہتے ہوئے چھوٹی شیشی ایڈگر کے گلاس میں اٹریل دی۔ ”میں یہ تریاق اپنے وقت کے عظیم ترین مصنف کو پیش کر رہا ہوں۔ جس کے ساتھ کام کرنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔“

”میرے ساتھ کام؟“

”ہاں میں نے تمہارے بعض آئیڈیاز کو عملی صورت

دی ہے مسٹر پو۔“

”نہیں مسٹر آئیوان، تم نے صرف ایک نفسیاتی قاتل کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ کوئی تخلیق نہیں ہے۔ کسی کو قتل کر دینا کوئی تخلیق نہیں ہے۔“

آئیوان کا چہرہ سخت ہو گیا۔ ”میں تم سے متفق نہیں ہوں۔ میں تمہارے ماسٹر پیس کا ایک حصہ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اسے کون کھل کرے گا میں یا تم۔۔۔۔۔ لیکن یہ ہو گا ماسٹر پیس ہی۔“ اس نے تریاق کا گلاس ایڈگر کی طرف سرکایا۔ ”ممکن ہے یہ تریاق ہو یا ممکن ہے یہ مہلک زہر ہو جو ایک لمحے میں تمہارا کام تمام کر دے۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ تم ایک خطرناک زہر بی جکتے ہو۔“

یہ بات ایڈگر بھی محسوس کر رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ اس کا جگر اندر سے کٹ رہا ہو۔ اس نے سوچا اور گلاس اٹھا کر حلق میں اٹریل لیا۔ اسے لگا جیسے اس کے حلق سے آگ کی ایک لکیر اندر تک چلی گئی ہو۔ آئیوان نے اس کا لکھا ہوا صفحہ اٹھایا اور اس کا آخری حصہ پڑھا۔

”ایہلی بے سدھ اور بے حرکت تھی میں نے اسے سینے سے لگایا۔ اس سے التجا کی، وہ آنکھیں کھولے اور مجھے دیکھے۔“ آئیوان نے کاغذ واپس رکھ دیا۔ ”خوب صورت لائیں ہیں۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”میں بتا چکا ہوں مسٹر پو۔“ آئیوان نے اپنا کوٹ پہنا۔ ”ممکن ہے تم زندہ رہو اور ممکن ہے نہ رہو لیکن یہ بات یقینی ہے میں یہاں نہیں ہوں۔“

”ماسٹر ریٹلڈ بھی آگئی ہے۔“ باہر سے کسی نے پکار کر کہا۔

”میں آ رہا ہوں۔“ آئیوان نے کہا اور اپنا بیگ

اٹھاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ایڈگر کا سر چکر رہا تھا اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر آئیوان کا راستہ روک سکتا۔ اسے ایہلی کی فکر تھی کہ وہ کہاں تھی۔ ایڈگر نے اپنا سر قدام لیا۔ اچانک اسے آئیوان کی ایک بات یاد آئی۔ اس نے انھنے کی کوشش کی اور نیچے گر گیا۔ اس نے انھنے کی بجائے فرش ٹولنا شروع کیا اور پھر میز کے نیچے لگے اوزاروں والے تختے سے ایک ہتھوڑی اٹھا کر فرش بجانے لگا۔ ایک جگہ اسے کھوکھلی آواز آئی تو وہ اس پر ہتھوڑی چلانے لگا۔ یہ جگہ میز کے نیچے تھی۔ اس نے بھاری میز سرکانا چاہی مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے دیوار سے پشت لگا کر دونوں پاؤں میز کے سرے پر جمائے اور زور لگا کر اسے الٹ دیا۔ پھر اس نے ہتھوڑی سے اوپری پلائی توڑ دی اور پھر نیچے موجود تختے کی بلایاں توڑیں۔ یہاں فرش میں ایک تختہ الگ سے تھا اس نے اسے اٹھایا تو میٹر حیاں ظاہر ہوئیں۔

اس نے لائین اٹھائی اور نیچے اتر گیا۔ عمارت کے نیچے پرانے کمرے تھے جواب چھپ گئے تھے وہاں مٹی اور جالے تھے وہ ایک سرنگ سے گزر کر ایک کمرے تک آیا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ ہو بہو اس کے گھر کا سیٹ تھا۔ بالکل ویسی ہی میز، کرسی، ٹیبلٹ، ویلف جن میں کتا بیٹا اور اس کے ہاتھ کے لکھے مسودے تریب سے رول کی صورت میں رکھے تھے۔ یہ سب وہی چیزیں تھیں جو اس کے جل جانے والے گھر میں تھیں۔ ایڈگر کو لگا کہ اس کی عقل خبط ہو جائے گی۔ آئیوان کس قسم کا آدمی تھا۔ پھر اسے ایہلی کا خیال آیا اور وہ اسے تلاش کرنے لگا۔ اس کی نظر ایک طرف موجود کچے فرش پر گئی اور اس نے بے تابی سے اس کی مٹی ہٹائی۔ نیچے ایک تختہ ظاہر ہوا۔ اس نے ہتھوڑی سے اس کی بلایاں توڑ دیں اور اسے کھولا تو اندر ایہلی ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے بے تابی سے اسے بکس سے نکالا اور گود میں لے کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”ایہلی آنکھیں کھولو، پلیز آنکھیں کھولو۔“

وہ اسے مسلسل پکارتا رہا اور بالآخر ایہلی کی پلکوں میں جھپکی ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”ایڈگر یہ خواب ہے یا تم میرے سامنے ہو؟“

”یہ کچھ نہیں ہے پاس ہوں۔“ ایڈگر نے اسے سینے سے لگایا پھر وہ اسے اٹھائے اور پر کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

گرین فیلڈ کی آنکھ کھلی تو اسے ایڈگر اور ایہلی کا خیال

آیا وہ بے ہوش گیا اور اس نے خادمہ کو آواز دی۔ وہ فوراً آگئی۔ ”نیس ماسٹر؟“

”کیا مسٹر پو یہاں آئے تھے؟“

”نیس ماسٹر وہ اپنا نوا رکھوا کر گئے ہیں اور ان کے لیے ایک محلہ آیا تھا جو میں نے ان کو دے دیا۔“

”محلہ کیسا محلہ؟“

”وہ اسے یہیں پھینک کر کہیں چلے۔“ خادمہ نے

لباس سے رتھ نکال کر گرین فیلڈ کی طرف بڑھایا۔ گرین

فیلڈ نے اسے لے کر پڑھا اور بستر سے اتر آیا۔ خادمہ نے

پریشان ہو کر اسے روکنا چاہا مگر وہ کپڑے پہن کر باہر نکل

گیا۔ اس کی بھی کارخ بالٹی مور پیٹر یا ٹک کے دفتر کی طرف

تھا اور جب وہاں پہنچا تو صبح کی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔

ایبوی لینس کے ساتھ طبی عملہ وہاں آچکا تھا اور چارلس ہملٹن

اسٹریچر پر لیٹی ایبلی کے ساتھ باہر آ رہا تھا۔ گرین فیلڈ نے

چارلس سے پوچھا۔

”ماسٹر پو کہاں ہیں؟“

”ہاں نہیں۔“ چارلس نے جواب دیا۔ اسے ایبلی کو

ایبوی لینس تک پہنچانے کی جلدی تھی تاکہ اسے اسپتال لے

جایا جاسکے۔ تین دن تک مسلسل بھوکے پیاسے رہنے سے

اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اسے خوراک اور پانی کے

ساتھ باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی۔ گرین فیلڈ دیوانوں کی

طرح ایڈر کو تلاش کرنے لگا۔ مگر وہ وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔

پولیس آچلی تھی اور ہنری کی لاش کا معائنہ ہو رہا تھا۔ اپنی

اشاعت کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب بالٹی پیٹر یا ٹک شائع

نہیں ہو سکا تھا۔

☆☆☆

تین دن بعد گرین فیلڈ اسپتال میں ڈاکٹر کالبرٹ

کے سامنے تھا۔ وہ گرین فیلڈ سے کہہ رہا تھا۔ ”موت کی ممکنہ

وجہ، برین ہیمریج، دل کی بیماریوں کا کام چھوڑ دینا اور جگر کی

خرابی ہو سکتی ہے۔“

”اسے ہوش نہیں آیا؟“

”تین دن سے وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا اور اس

دوران میں اس نے کئی بار ایک ہی جملہ کہا کہ اس کا آخری

نام ریٹالڈ تھا۔“

”ریٹالڈ۔“ گرین فیلڈ نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر کہ وہ ہڈیانی کیفیت میں تھا۔“

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہڈیانی کیفیت میں آدمی

لا یعنی اور مختلف باتیں کرتا ہے وہ ایک ہی بات بار بار نہیں کرتا۔“
گرین فیلڈ نے ایڈر گرائلین پو کی لاش کی طرف دیکھ
جس کا آج صبح ہی انتقال ہوا تھا۔ مرنے کے بعد اس کے
چہرے پر سکون تھا۔ گرین فیلڈ غیر جذباتی آدمی تھا اور بے
شمار لاشیں دیکھ چکا تھا مگر اس وقت اس کے چہرے پر دکھ
کے تاثرات تھے۔ پھر اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔
”تمہارے تعاون کا شکریہ ڈاکٹر۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد گرین فیلڈ نے ایڈر گرائلین پو

کی لاش کے پاس آ کر آہستہ سے کہا۔ ”دوست میں نے تم

سے وعدہ کیا تھا میں اسے ضرور پورا کروں گا۔“

ایڈر گرائلین پو کی تدفین بالٹی مور کے قبرستان میں کی

گئی۔ جس میں اس کی بہن کے ساتھ ہملٹن خاندان اور اس

کے کچھ دوست و واقف کار شریک تھے۔ بعد میں اس کی قبر

پر چوکور کتبہ لگایا گیا جس کے وسط میں اس کی شبیہ بھی

ہے۔ اس پر تحریر ہے۔ ”یہاں معصوف اور شاعر ایڈر گرائلین پو

محو خواب ہے۔ اس کی زندگی کی طرح اس کی موت بھی پُر

اسرار تھی۔“

☆☆☆

تین مہینے بعد جرس کے مرکزی ریلوے اسٹیشن پر

ٹرین سے آنیوان اتر ا۔ اس کا اصل نام آر تھر ریٹالڈ تھا

ایک پورٹر نے اس کا سامان اٹھایا اور وہ باہر موجود اپنے لیے

نٹھر بھیجی تک آیا۔ مگر جیسے ہی وہ اندر گھسا اس نے دیکھا ایک

پستول کی نال اس کی طرف مرکوز ہے اور اس کے پیچھے گرین

فیلڈ موجود تھا اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ہیلو مسٹر ریٹالڈ۔“

آر تھر ریٹالڈ نے اس پر جھپٹنے کی کوشش کی اور ایک

فائر کی آواز نے اسے دانت چھپتے گیوتروں کو اڑنے پر مجبو

کر دیا تھا۔ اس کہانی کا آخری کردار بھی انجام کو پہنچا تھا

آر تھر ریٹالڈ کے مرنے کے بعد گرین فیلڈ کو اس کے ساما

سے کئی مسودے اور ایک ڈائری ملی جس میں اس نے کیا

کے انداز میں یہ سارے واقعات تفصیل سے لکھے تھے۔

وہ اس وقت آنیوان روز بگ تھا۔ جب کہ اس کا اصل

آر تھر ریٹالڈ تھا۔ اس نے اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھ

تھا اس لیے گرین فیلڈ اور بالٹی مور کی پولیس یہ کیس

کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ایڈر گرائلین پو کی موت کا تمام ریک

ضائع ہو چکا ہے اور آج کی دنیا میں کوئی واضح طور پر نہیں

سکا کہ آخری چند دنوں میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

شہرِ ستم گراں

شیراز خات

دنیا بھر میں ایسے لاتعداد شہر ہیں جو سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں مگر سیاحوں کے لیے وہاں ہر گلی ہر کوچے میں صیاد بھی دام پھیلانے منظر ربتے ہیں۔ ایسے شہر کہاں کہاں واقع ہیں اور کن وجوہات کی بنا پر بدنام ہیں اس پر ایک ہلکی سی نظر۔

دنیا بھر کے بدنام شہروں کا ذکر

شہر کسی بھی ملک کی ترقی کی نشانیاں ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں ایسے بے شمار شہر ہیں جو سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جب کہ ایسے شہروں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جنہیں دنیا کے خراب ترین شہروں میں رکھا گیا ہے۔

ان کی خرابی کی رینٹنگ، ٹریننگ کے خراب نظام، جرائم، صحت اور صفائی کے ناقص انتظامات اور اسی قسم کی دیگر خرابیوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ پوری دنیا میں سروے کے ذریعے اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے تو آئیں ایسے چند



شہروں کے بارے میں جانتے ہیں۔

آبد جان۔ کوٹ ڈی ویلورے کا شہر۔ دسویں نمبر پر دنیا کا خراب ترین شہر ہے۔ (کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم اس سے متفق بھی ہوں لیکن یہ ذیلی گراف کی رپورٹنگ ہے)۔

کیرون کا شہر ڈاولا۔ انتہائی خراب، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، جگہ جگہ گندگی، امن و امان کی ناقص صورت حال، بے ہنگم ٹریفک۔ یہ سب مل کر اس شہر کو دنیا کے خراب ترین شہروں میں شامل کر رہی ہیں۔

لیبیا کا شہر ٹریپولی۔ یہ شہر بھی بہت خراب ہے۔ یہاں زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔

ذیلی ٹیلی گراف کی رپورٹنگ کے مطابق ہمارا کراچی بھی اس فہرست میں شامل ہے اور کراچی میں جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے سامنے ہی ہے۔

الجزیرہ کا شہر الجیرس بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ یہاں بھی زندگی عذاب بنی رہتی ہے۔

زمبابوے کا شہر ہرارے۔ دیکھنے میں خوب صورت لیکن برتنے میں بہت مشکل۔

نائیجیریا کا شہر لاگوس بھی۔ اسی فہرست میں شامل ہے۔

پاپوانیو گنی کا شہر پورٹ ماروش۔ دنیا بھر میں خراب ترین شہروں کی فہرست میں دوسرے نمبر پر ہے۔

بنگلہ دیش کے شہر ڈھاکہ کو دنیا کا سب سے خراب شہر بتایا گیا ہے۔ اس کی وجہ وہاں کی بے ہنگم آبادی ہے۔ ہر جگہ جھونپڑیاں نظر آتی ہیں اور ٹریفک کا نظام بھی بہت بدتر ہے۔

ایک اور سروے بھی کیا گیا ہے جس کے مطابق دنیا میں بہت سے ایسے شہر ہیں جو سیاحوں کے لیے خطرناک ہیں۔ ان کا خطرناک ہونا بے شمار وجوہات کی وجہ سے ہے

جیسے گینگ وار، منشیات کا گڑھ، فرقہ وارانہ فسادات، اسٹریٹ کرائم، دھوکا دہی ملوث مارا اور نارگٹ کلنگ وغیرہ۔

آئیں ان شہروں کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔

ہنڈراس کا شہر San pedro sula، اس شہر کو بہت خطرناک قرار دیا گیا ہے۔ اسے کی اسمگلنگ ایک عام سی بات ہے۔ شہر پر قبضے کے لیے کئی کینٹون ہیں جو آپس

میں لڑتے رہتے ہیں۔ خون ریزی ایک عام سی بات ہے۔ منشیات کا بھی یہ ایک بڑا گڑھ ہے۔

سیاسی بد امنی اور فرقہ واریت کی وجہ سے کراچی بھی

اس فہرست میں شامل ہے۔ نارگٹ کلنگ، بم دھماکے، گینگ وارز، اسلحے اور منشیات کی وجہ سے ہمارا یہ شہر خطرناک شہروں کی فہرست میں آ گیا ہے۔ (خدا وہ دن بھی دکھائے جب یہ شہر دنیا کے پرسکون شہروں کی فہرست میں اول نمبر پر ہو)۔

کابل۔ خطرناک شہروں میں اس شہر کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ بم دھماکے عام سی بات ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی بد امنی اور بے چینی بھی بہت زیادہ ہے۔

سیاحوں کو منع کیا جاتا ہے کہ اول تو نہ جائیں اگر کسی سبب سے جانا بھی پڑ جائے تو اپنے ہوٹل سے باہر نہ نکلیں۔

بد قسمتی سے کسی زمانے میں اس شہر کو علم کا شہر کہا جاتا تھا۔ کیا کیا نہیں تھا یہاں۔ بڑے بڑے مدرسے، دانش گاہیں، فلاسفرز اور اس شہر بے مثال کی داستانیں۔ یعنی

ذکر ہے بغداد کا جواب بد امنی اور خانہ جنگی کا شہر بن کر رہ گیا ہے۔ آئے دن بم دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات بھی انتہا کو ہیں۔ سینکڑوں لوگ مارے جا چکے ہیں۔

اسی لیے یہ شہر سیاحوں کے لیے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔

میکسیکو کا شہر Aca pulko۔ انتہائی خطرناک، اس شہر میں مرڈر رینٹنگ دنیا کے بہت سے شہروں سے کہیں

زیادہ ہے۔ اس کی وجہ منشیات کا گڑھ، گینگ وارز اور اسلحے کی بھرمار ہے۔ یہاں سے اسلحے کی اسمگلنگ بھی ہوا کرتی ہے۔ یہاں آنے والے سیاحوں کو بے شمار ہدایات دی جاتی ہیں۔ کہاں جائیں کہاں نہ جائیں۔ شام کے وقت ہوٹلز سے باہر نہ جائیں۔ زیادہ تر دارو اتیں شہر کے مضافات میں

ہوا کرتی ہیں۔

گوئے مالاٹشی۔ حالانکہ پورا ملک بہت خوب صورت ہے۔ سیاحوں کے لیے قابل دید مقامات ہیں لیکن کیا کیا جائے اس شہر میں ہونے والے جرائم نے اس شہر کو غیر محفوظ

کر دیا ہے۔ سیاحوں سے کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے گوئے مالا کا پروگرام بنا ہی لیا ہے تو اس ملک کے کسی اور شہر چلے جائیں گوئے مالاٹشی نہ جائیں تو بہتر ہے۔

ریو ڈی جزو۔ برازیل کا خوب صورت شہر، حالانکہ یہ شہر سیاحوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔ لاکھوں سیاح یہاں آتے

رہتے ہیں۔ اس کے باوجود اس شہر میں جرائم کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ سیاحوں سے کہا جاتا ہے کہ آپ جا تو رہے ہیں لیکن اپنے رسک پر جائیں۔

کیپ ٹاؤن۔ جنوبی افریقا کا مشہور شہر، ایک جدید شہر سیاحوں کی بھرمار رہتی ہے اس کے باوجود یہ ایک

خطرناک شہر ہے۔

Ciudad jaurez۔ میکسیکو کا شہر، یہ شہر لوٹ مار اور تشدد کے لیے بہت مشہور ہے۔ سیاحوں کو اغوا کر کے ان سے بھاری رقومات وصول کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی خطرناک گینگٹو ہیں جو شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔

صومالیہ کا شہر موغادیشو۔ القاعدہ نے یہاں قدم جما رکھے ہیں۔ اس شہر میں مختلف فرقوں کے درمیان گھسان کی جنگ چھڑی رہتی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس میں بچوں کو بھی جنگ کے میدان میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔ اس شہر سے یو این او اور اس قسم کی دیگر تنظیموں کے دفاتر ہٹا دیے گئے ہیں۔

یمن کا شہر صنعاء بھی اس فہرست میں شامل ہے۔ یہاں بھی القاعدہ کا اثر ہے۔ اس شہر میں بھی بم دھماکے عام ہیں۔ خود یہاں کے رہنے والے بھی شہر چھوڑ کر فرار ہو رہے ہیں۔

پاکستان کے شہر پشاور کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہاں ہونے والے آئے دن کے بم دھماکوں نے اس شہر کو غیر محفوظ کر دیا ہے۔ (پچھلے دنوں ہونے والے اسکول کے حادثے نے اس کی ساکھ اور خراب کر دی ہے)۔

نیروبی۔ مسلح جتھے اس شہر میں بھی موجود ہیں اور یہ شہر مسلسل ہنگاموں کی زد پر رہتا ہے۔

اب ذرا ان شہروں کی طرف آئیں جو سیاحوں کی جنت کہے جاتے ہیں۔ جی ہاں اس فہرست میں دنیا کے مشہور اور خوب صورت ترین شہر شامل ہیں۔

ان شہروں میں تشدد اور ہنگامے وغیرہ تو نہیں ہوتے لیکن یہاں ایک دوسری قسم کا خطرہ ہر دن بر منڈلاتا رہتا ہے اور وہ ہے جیب کتروں کا۔ بس نگاہ چلی اور سال دوسروں کا۔ دنیا کے انتہائی شاطر قسم کے جیب کتر ہے ان شہروں میں اپنے ہنر دکھاتے رہتے ہیں۔ سیاحوں کو بہت کمزور کر جاتی ہے کہ وہ ہوشیار رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ جب کوئی تاریخی عمارت دیکھ رہے ہوں تو اس دوران آپ خود تماشا بن کر رہ جائیں۔

آئیں ذرا ان شہروں کو بھی دیکھ لیں۔
ایتھنز۔ دنیا بھر میں بیش بہا تاریخی اٹالہ رکھنے والا واحد شہر۔ جس کے ہر کونچے میں تاریخ دکھائی دیتی ہے۔
قدیم یونان اپنی پوری جلوہ گری اور شان کے ساتھ آپ کے سامنے آ جاتا ہے۔

منفرد شعر و منفرد الفاظ

شکر بتراز دی وزارت برکش
شو ہر ہر بلبل بلب ہر مہوش
فارسی کا یہ شعر، سلطان اشعرا حضرت امیر خسرو کا ہے اور اس شعر کی انفرادیت یہ ہے کہ اسے سیدھا پڑھیں یا الٹا۔ دونوں طرف سے وہی الفاظ بنتے ہیں۔ دونوں مصرعوں میں یہ خوبی ہے اور یہ کوئی عام بات نہیں اور ہر شاعر کے بس کی بھی بات نہیں ہے۔ ذیل میں اردو کے وہ الفاظ لکھے جا رہے ہیں جو سیدھے اور الٹے دونوں طرف سے یکساں لفظ بنتے ہوں۔

آبا۔ ادا۔ اڈا۔ آنا (اگر عدد کو شمار میں نہ لائیں تو یہ الفاظ بھی شمار کیے جاسکتے ہیں۔ آنا، آبا۔ آرا، آغا، آقا، آہا، آیا) باب، بالب، پاپ، پیپ، تحت، تخت، ناٹ، چھاپہ، درد، دید، درد، ساس، داماد، کاک، کوک، کیک، کرک، کلک، کلک، گھاگھ، لال، لعل، لیل، مام، میم، موم، مادام، نان، نین، نون، ایشیا، شاہاش، جج، جبت، ہم۔

مرسلہ: غشی محمد عزیز سے لندن

سیاح یہاں آتے ہیں اور تاریخ کو دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں اور یہاں کے جیب کترے آپ کی اسی بے خودی کا فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہ جیب کترے ہر اس مقام پر ہوتے ہیں جہاں سیاحوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ کندھے سے کندھا چمکتا ہے اور اسی دوران آپ کی جیب بھی چمک جاتی ہے۔

ویت نام کا ہنوئی۔ یہ شہر ویت نام کا عجیب ترین شہر اور ایشیا بھر میں جیب کتروں کی جنت بھی۔ اس شہر میں ہر وقت شور ہوتا رہتا ہے۔ ہزاروں ٹیکسیاں، گاڑیاں، رکشے، موٹر سائیکلیں۔ اس پر سے لوگوں کا بے تحاشا ہجوم۔ ان لوگوں نے مل کر اس شہر کو جیب کتروں کے دھندے کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا سیاح ہو جو بے چارہ نہ بنے یا سپورٹ اور نقدی کی شکایت لے کر پولیس اسٹیشن نہ گیا ہو۔

بالیڈ کا شہر ایمپوریم۔ جی ہاں، ایک طرف تو یہ شہر سیاحوں کے لیے بہت دلکش رہتا ہے۔ یہاں کے خوب

صورت گر جاگھر اور پورے شہر کی مجموعی خوب صورتی آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب رہتی ہے۔ وہیں دوسری طرف اس شہر کے شاطر چور بھی آپ کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ آپ ذرا ایک بار جا کر تو دیکھیں۔

فلورنس۔ اٹلی کا بے مثال شہر، جس نے پوری دنیا کو نہ جانے کتنے باکمال مصور، سنگ تراش اور شاعر دیتے ہیں۔ دوسری طرف یہی شہر آپ کو باکمال جیب کترے بھی دے رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ بے چارے اتنے مشہور نہ ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کام تو چل رہا ہے۔

بیونس آئرس۔ ساؤتھ امریکا کا سب سے دولت مند شہر اور یہی دولت لٹیروں اور جیب کتروں کو یہاں کھینچ لاتی ہے۔ اس شہر میں ٹھگ بھی ہیں۔ گروہ کا کوئی آدمی آپ کو کسی بڑی مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔ آپ تو سیاح ہیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اسی وقت گروہ کا دوسرا آدمی آپ کا ہمدرد۔ بن کر آپ کو اس پرانے سے نجات دلا دیتا ہے اور آپ بری طرح لٹ جاتے ہیں۔

بیرس۔ رنگوں، خوشبوؤں، پیار اور گیتوں کا سب سے دلکش شہر۔ یہ شہر اتنی دلچسپیاں رکھتا ہے کہ سیاح یہاں آ کر سحر زدہ ہو جاتے ہیں اور یہاں کے جیب کترے آپ کی اسی کیفیت کا فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہاں کی ٹرین اتنی بھری ہوئی ہوتی ہے اور لوگ اس طرح ایک دوسرے سے چپک کر کھڑے ہوتے ہیں کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ کس کا ہاتھ کس کی جیب میں ہے۔

میڈرڈ۔ اسپین کا شہر میڈرڈ، جو اٹل فائنک کی وجہ سے دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ خود اندازہ لگا لیں کہ جب اس شہر کو دیکھنے کے شوقین ایک دوسرے پر گر پڑ رہے ہیں تو ایسا کون سا بد قسمت جیب کتر اہوگا جو اس موقع کو ہاتھ سے جانے دے گا۔ لہذا یہ شہر بھی جیب کتروں کی کمائی کا بہت بڑا مرکز ہے۔

روم۔ اب آجائیں روم کی طرف، کیا شہر ہے اور کیا تاریخ ہے اس کی اور کیسے جیب کترے ہیں جو اپنے ہنر میں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ اپنی جیب کو کھینچتے رہ جاتے ہیں اور آپ کا اثاثہ ان کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

پیراگوئے۔ یورپ کے خوب صورت ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اس شہر کا بد صورت پہلو اس کے جیب کترے ہیں۔

اسپین کے شہر بارسلونا کی بھی ایسی ہی شہرت ہے۔

ماہنامہ سرگزشت

ایسا نہیں ہے کہ سروے کرنے والوں نے دنیا کے صرف ان شہروں کا سروے کیا ہو جہاں جرائم ہیں۔ بد امنی ہے۔ لوٹ مار ہے بلکہ ان ملکوں کا بھی سروے کیا ہے جو دنیا کے محفوظ ترین اور امن پسند ممالک سمجھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب پورا ملک ہی امن پسند ہوگا تو اس کے شہر بھی ایسے ہی ہوں گے۔ آئیں ان ممالک کی فہرست کا جائزہ لے لیں۔

ماریشس۔ افریقا کا ایک امن پسند ملک۔ جی پی آئی کی سروے رپورٹ کے مطابق یہ ملک اپنی ایک امن پسندانہ شہرت رکھتا ہے۔

گلوبل پیس انڈیکس (جی پی آئی) کے مطابق قطر مشرق وسطیٰ کا سب سے زیادہ امن پسند ملک ہے۔ یہاں تشدد کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسی طرح یہاں جرائم کی شرح بھی بہت کم ہے۔ یہ ملک اسی لیے بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

پرتگال۔ یورپ کا خوب صورت اور امن پسند پرسکون ملک ہے۔ یہاں بھی جرائم کی شرح کم ہے۔ اسی لیے سیاح یہاں جانا پسند کرتے ہیں۔

بھوٹان۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ دولت ہی سکون اور خوشی کی ضمانت ہو۔ بلکہ ذہنی اور روحانی سکون بھی خوشی دیتا ہے۔ بھوٹان انڈیا اور چین کے درمیان ہمالیہ کے دامن میں ایک چھوٹا سا ملک ہے اور یہاں سکون اور اطمینان کی شرح بہت زیادہ ہے۔

سنگاپور۔ سیاحوں کی جنت کے ساتھ ساتھ دنیا کے منظم ترین ملکوں کی فہرست میں اول نمبر پر ہے۔ ماحولیات، تعلیم اور صحت کی سہولیات کے ساتھ ساتھ یہ اتنا پرسکون ہے کہ آپ بد آسانی جاسکتے ہیں۔

آسٹریلیا۔ یہاں کیا نہیں ہے؟ خوب صورت شہر، ہرے بھرے میدان، آگکھوں کو موہ لینے والے مناظر، صاف شفاف ہوائیں۔ اسی لیے اس ملک میں اوسط عمر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تعلیم و ترقی کا ایک مضبوط سسٹم اور اس کے ساتھ جرائم کی شرح بہت کم اور جینے کو کیا چاہیے۔

جرمنی۔ دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک۔ بے مثال شہر، گڑیوں کے گھروں جیسے گھر، تعلیم اور صحت کے وسائل کی فراوانی ان سب کے ساتھ امن اور سکون جس نے جرمنی کو ایک محفوظ ترین ملک بنا دیا ہے۔ آپ وہاں چلے جائیں تو پھر یہاں رہ جانے کو دل چاہتا ہے۔

زنج رپبلک۔ موسیقی کے رسیا لوگ، پیار کرنے والے، مصوری پر جان دینے والے اور اس کے ساتھ بے انتہا پرامن۔ اسی لیے اس کو دنیا کے پرسکون ملکوں میں شمار کیا گیا۔

سلووینیا۔ یورپ کا ایک خوب صورت ملک۔ زندگی یہاں بھی بہت آرام اور اطمینان سے گزر جاتی ہے اسی سے اندازہ کر لیں کہ یہاں کی جیلوں میں مشکل سے ہزار کے قریب قیدی ہوں گے۔

آئر لینڈ۔ ایک خوب صورت ملک، یہاں کے رہنے والوں کی حس مزاج بہت زیادہ ہے۔ یہاں آپ کو دنیا کے بہترین گولف کورس کے ساتھ لاجواب کھانے بھی ملیں گے اس کے ساتھ سکون بھی۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک فلاحی ریاست ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولیات، بہترین حکومتی انتظامات جس کی وجہ سے جیل میں آپ کو بہت کم لوگ ملیں گے۔ یہاں کا سلوکن ہے کہ آپ ملک کے جس حصے میں جائیں وہاں آپ کو سکون ملے گا۔

بیلجیم۔ کیا خوب صورتی ہے، کیا روایات ہیں، قدیم طرز تعمیر کے شہر، پل، اینٹوں سے بنی محرابیں، اس کے عجائب گھر دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے پرسکون حالات۔ جرائم کی شرح بہت کم۔ آپ بے دھڑک نہیں بھی جاسکتے ہیں، رہ سکتے ہیں۔ اگر آپ بارشوں کا لطف لینے والوں میں سے ہیں تو یہ آپ کے لیے اور بھی زبردست ہے۔

اسکٹڈے نیوین ملکوں کا ایک اور ملک سویڈن۔ بلاشبہ ایک فلاحی ریاست، موسم سرما یہاں اپنے عروج پر اور بہت طویل ہوتا ہے۔ حکومت اپنی عوام کا بہت خیال رکھتی ہے کیوں کہ یہاں کا سسٹم ہی ایسا ہے۔

کینیڈا۔ دنیا کے بہت سے ملک ایسے بھی ہیں جہاں سالانہ اوسط آمدنی صرف پچاس یا ساٹھ ڈالر ہے۔ جب کہ کینیڈا کا اندازہ لگائیں یہاں کی آمدنی ہزار ڈالر کی ہے۔ آنکھوں کو موہ لینے والے مناظر اور میرٹ کی بنیاد پر ترقی کے مواقع دینے والا یہ ملک دنیا کے پرسکون ملکوں کی فہرست میں بہت بلند درجے پر ہے۔

فن لینڈ۔ اگر آپ طویل ترین موسم سرما سے پریشان نہیں ہوتے ہیں تو یہ ملک بے مثال ہے۔ دنیا کا بہترین تعلیمی نظام اس ملک میں قائم ہے۔

جاپان۔ اگر آپ جاپان جائیں تو آپ کو یہ فکر کرنے

کی ضرورت نہیں ہے کہ فلاں ہوٹل میں صفائی وغیرہ کا کیسا انتظام ہے۔ بلاشبہ پورا جاپان بے داغ ہے۔ اس کے علاوہ بلند معیار تعلیم، لوگوں کے رویے، لاجواب معاشی ترقی۔ ان سب کے ساتھ جرائم کی بہت کم شرح۔ ان سب نے مل کر اس ملک کو دیکھنے اور رہنے کے قابل بنا دیا ہے۔

سویٹزر لینڈ۔ قدرتی مناظر میں بے مثال، اس ملک کو دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔ تو کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا۔ صحت مند اور خوش باش لوگوں کا ملک۔ جہاں ہر طرح کی سہولیات حاصل ہیں۔ صحت، صفائی، تعلیم اور عدل کا نظام۔ اسی لیے یہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ معاشی لحاظ سے بہت مضبوط۔ اس ملک کا بینکنگ سسٹم سب سے زیادہ محفوظ ہے۔

آسٹریا۔ اس ملک میں صرف سولہ برس میں ووٹ دینے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن شراب نہیں خرید سکتے۔ جب تک عمر کے ایک خاص معیار تک نہ پہنچ جائیں۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہت خوب صورت مناظر سے بھرا ہوا ہے۔ ٹرانسپورٹ کا لاجواب نظام۔ یہ سب آپ کو اس ملک میں ملے گا۔

نوزی لینڈ۔ دنیا کے بہت کم آبادی والے ملکوں میں سے ایک۔ گردوغبار اور کثافت سے بہت حد تک محفوظ ملک یہاں بہت بڑی تعداد میں مہاجر آباد ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک انتہائی پرسکون ملک ہے۔ یہاں کے باشندے ایک پرامن زندگی گزار رہے ہیں۔

ڈنمارک۔ کہا جاتا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ہیں۔ صاف ستھرا ماحول، زندگی کی بہترین سہولیات اور ایک فلاحی ریاست۔ وہ سب کچھ جس کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی حسین مناظر۔ سب کچھ اس ملک میں موجود ہے۔

آئس لینڈ۔ یہاں کے نظارے قدرت کے شاہکار ہیں۔ ایک تو یہ وجہ ہے اور دوسری بات یہاں کی پرسکون زندگی ہے۔ اسی لیے اس ملک کو دنیا کا سب سے پرسکون ملک کہا جاتا ہے۔ آبادی بہت کم لیکن شرح خواندگی سو فیصد یعنی سب کے سب پڑھے لکھے۔ اسی لیے جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہ تھا ایک جائزہ دنیا کے ملکوں اور شہروں کا۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنے ملک کو کیسا دیکھنا یا بنانا چاہتے ہیں۔



آہ علی سفیان آفاقی

علی سفیان آفاقی ایک نابذ روزگار شخصیت، سرگزشت کی جان سمجھے جانے والے 27 جنوری 2015ء کو ہم سب سے جدا ہو گئے۔ وہ 22 اگست 1933ء کو بھارتی صوبہ مدھیہ پردیش کے شہر بھوپال میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آ گئے اور ماڈل ٹاؤن میں رہائش اختیار کی۔ (لیکن چھ سات سال قبل انہوں نے یہ مکان چھوڑ دیا اور دوسرے مکان میں آ گئے تھے) حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے اس کی سن تعمیر بھی 1933ء ہے۔ گویا اپنے ہم عمر مکان میں رہ رہے تھے۔ اس مکان کے سیدھے ہاتھ پر واقع ایک کمرے میں بیٹھ کر وہ لکھائی بڑھائی کرتے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ان کے قلم کی حکمرانی رہی۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر انہوں نے ہٹ فلموں کی کہانیاں لکھیں، مقبول عام مضامین تصنیف ہوئیں۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر معراج رسول صاحب کی فرمائش پر فلمی الف لیلہ شروع کی جو جلد ہی مقبولیت کے معراج پر نظر آنے لگی۔ اس لیے کہ پاکستانی فلموں کی تاریخ میں کسی ایسی شخصیت نے جو فلمی صنعت میں بھی مقام رکھتا ہو فلموں یا فلمی شخصیت پر یا خود اپنی روداد نہیں لکھی۔ فلمی الف لیلہ نہ صرف ان کی آپ بیتی تھی بلکہ جگ بیتی بھی تھی۔ اسی میں ہالی ووڈ، بالی ووڈ اور لالی ووڈ کے بے شمار فلمی ادبی اور سیاسی شخصیات کی سرگزشت شامل ہوئی رہیں۔ ماہنامہ سرگزشت سے ان کا رشتہ 1990ء میں جڑا۔ ابتدا میں یہ طے پایا تھا کہ سفر نامہ وہ اپنے نام سے اور فلمی شخصیات کے قصے فرضی نام سے لکھیں گے۔ فرضی نام ”آشنا کے قلم سے“ تجویز ہوا۔ سرگزشت کا پہلا شمارہ دسمبر 1990ء میں آیا۔ اس میں انہوں نے اداکارہ رانی کی روداد کرداروں کے نام بدل کر لکھی۔ مثلاً رانی کا نام شہزادی رکھا لیکن بعد میں وہ ہر ایک کی روداد پر اصل نام دینے لگے۔ بنیادی طور پر وہ ایک شفیق ہستی تھے۔ نئے لکھنے والوں کو بھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ وہ ایک سینئر لکھاری ہیں جس کی وجہ سے نئے لکھنے والے کا قلم رواں ہو جاتا۔ وہ مذہبی سوچ کے حامل تھے۔ شیخ وقار نمازی، محبت وطن پاکستانی تھے۔ گو کہ انہوں نے صحافتی کیریئر کا آغاز جماعت اسلامی کے پرچے ”ترجمان القرآن“ سے کیا تھا لیکن یہ وابستگی بہت مختصر عرصے پر محیط رہی اور 1951ء میں وہ روزنامہ چٹان سے منسلک ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تحریر میں کبھی کبھی شورش کا شیر کی گرم لہر در آتی۔ آغا شورش کا شیر کی بارے میں انہوں نے سرگزشت میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ پھر وہ چٹان سے روزنامہ نوائے وقت میں آ گئے۔ حمید نظامی، مجید نظامی اور رمیز نظامی کے ساتھ کام کیا۔ مرحوم حمید نظامی کے چاہنے کے باوجود وہ نوائے وقت میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے اور روزنامہ آفاقی میں چلے گئے۔ روزنامہ آفاقی اس زمانے کا پہلا اخبار تھا جس میں باقاعدہ فلمی صفحہ شروع کیا گیا تھا اور اس کی ابتدا انہوں نے ہی کی تھی۔ فلمی صفحے کی ادارت نے انہیں فلمی دنیا سے فریب کر دیا۔ فلمی دنیا کی چکا چوند انہیں اس وقت بھی بھاری تھیں جب وہ کم سن تھے اور میرٹھ میں رہائش تھی۔ اسی وجہ سے وہ فلمی دنیا سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

1957ء میں انہوں نے شباب کیرانوی کی شراکت میں فلم ”ٹھنڈی سڑک“ بنائی اور پہلی بار فلم کی کہانی، مکالمے اور اسکرین پلے لکھا۔ فلمی دنیا انہیں اتنی پسند آئی کہ 1958ء میں وہ کل وقتی طور پر فلم سے وابستہ ہو گئے اور فلم جنگی کا منظر نامہ لکھا۔ 1965ء میں فلم ٹھنڈی کی ابتداء کی اور فلم کینر بنادی۔ اس فلم نے کئی ریکارڈ توڑ دیے۔ 1972ء میں فلم سازی کے ساتھ ہدایت کاری میں بھی اپنا ہنر دکھایا اور فلم آس بنائی۔ مزید کئی کامیاب فلمیں بنا کر پوری طرح ثابت کر دیا کہ نہ صرف وہ ایک بہترین لکھاری ہیں بلکہ کامیاب ہدایت کار بھی ہیں۔ اسی دوران میں انہوں نے ایک شام کا اخبار بھی نکالا۔ گو کہ ”نوروز“ نے صرف ایک سال کی عمر پائی مگر اس کے کئی ادارے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ 1990ء میں وہ دوبارہ ادارہ نوائے وقت میں لوٹ آئے۔ اس بار انہوں نے ہفت روزہ فیملی کی ادارت سنبھالی تھی۔ سفر آخرت پر روانہ ہونے تک وہ اس پرچے کے مدیر رہے۔ الف لیلہ بھی 1990ء میں سرگزشت کے لیے لکھن شروع کی تھی جس کی آخری قسط اس ماہ شامل ہے۔ کہتے ہیں فلمی دنیا کو سٹے کی کوٹھری ہے۔ پھر بھی ان کے دامن پر کبھی کوئی داغ نہ لگا۔ کبھی کوئی مسئلہ نہ سامنے نہیں آیا۔ کیوں کہ انہیں ادب اور صحافت سے عشق تھا۔ فلم سازی، ہدایت کار اور کہانی نویس پر نگار ایوارڈز، گریجویٹ ایوارڈز، فلم کریٹکس ایوارڈز، نگار ٹیلی ویژن سمیت کئی قومی ایوارڈز بھی حاصل کیے۔ الف کیریئر فلم ایوارڈ کی جیوری کے رکن رہے۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ انشٹی ٹیوٹ امریکا ہوائی کے رکن رہے۔ پاکستان فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین رہے۔ پاکستان فلم پروڈیوسر ایسوسی ایشن کے وائس چیئرمین رہے۔ پاکستان فلم جرنلس ایسوسی ایشن، پاکستان ڈائریکٹر ایسوسی ایشن اور لاہور پریس کلب کے تاحیات رکن رہے۔ اسی کی 30 کے قریب تصانیف ہیں۔ ایک ایسے ہمہ جہت شخص کہ دینے کا غم ہم سب کے لیے ناقابل برداشت ہے مگر مشیت ایزدی سے غم نہیں آئے سب مل کر دعا کریں کہ رب العزت جملہ مسئلہ مرحومین کے ساتھ آفاقی صاحب کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔



قسط نمبر: 237

فلمی افیقہ

علی رضا خان افغانی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتاں کی یاد
تہائوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے ناد روزگار حال حال ہی نظر آتے ہیں جو نصف
صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل
ہوں اور اپنے روزاؤل کی طرح تازہ دم بھی ان کے ذہن رسا کی
پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کہیں تھکن کا شکار نظر
آئے آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے اپنی نمایاں حیثیت کی
نشان اس کی پشمانی پر ثبت کر دیے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے
وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت
سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا دید و شنید
اور مہل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل
رشتہ ہے آٹھے پم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج
خواب معلوم ہو جائے

ادب و صحافت سے لے کر دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت



چھلے دنوں ہم کراچی گئے تو سڑکوں پر ایک نیا منظر
دیکھا ایک ٹرک یا ٹرک نما گاڑی یا کرین نما چیز ایک کار کو
ناک سے پکڑے کھینچے لیے جا رہی ہے اور وہ بے زبان
خاموشی سے ”کھینچو عبت“ بنی چپ چاپ چلی جا رہی
ہے۔ پوچھنے سے پتا چلا کہ کراچی بھی اب ماشاء اللہ دنیا کے
ترقی یافتہ اور ماڈرن شہروں کیلئے شمار ہونے لگا ہے۔ کم از کم

مارچ 2015ء

113

ماہنامہ سرگزشت

اب لاہور اور دوسرے ماڈرن شہروں میں بھی یہی طریقہ رائج ہو چکا ہے، ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے ملک میں ہر ماڈرن رواج پر بہت خوش ہوتے ہیں بلکہ فخر کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں خدا کے فضل سے جدید ترقی کا ایک اور نمونہ آگیا۔

مگر ہوا یہ کہ دوسرے ہی دن ہم کراچی کے ایک فیشن اہل علاقے سے گزر رہے تھے کہ ہمیں ”مزمہ کار“ نظر آگئی جسے ایک ٹرک کے ساتھ آٹنی زنجیروں سے باندھ دیا گیا تھا اور بے چاری کار خاصی بے آرام اور بیکل پوزیشن میں تھی۔ ہمارے سامنے ایک غیر ملکی بھی کھڑے دیکھ رہے تھے چند لمحے انہوں نے یہ منظر دیکھا اور پھر ہم سے انگریزی میں پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟ کوئی ایگری ٹیشن وغیرہ کی ریہرسل ہو رہی ہے؟“

ہم نے ان کی لاعلمی پر حقارت سے انہیں گھورا اور کہا ”آپ نہیں جانتے؟ یہ کار ہے جسے Tow کر کے لے جایا جا رہا ہے۔“

”اس طرح؟ مگر کس جرم کی پاداش میں؟“ انہوں نے دریافت کیا۔

ہم حیران رہ گئے کہ کوئی انگریز اتنا بے خبر اور علم سے کورا بھی ہو سکتا ہے۔ لہذا اپنی قابلیت بھگوانے کے لیے کہا۔ ”دیکھیے جب کوئی شخص غلط پارکنگ کرتا ہے تو محکمہ سزا کے طور پر اس کی کار کو Tow کر کے لے جاتا ہے۔ یورپ، امریکا میں تو یہ بات عام ہے؟ کیا آپ بھی ان ملکوں میں نہیں رہے؟“

وہ مسکرائے اور بولے۔ ”میں پیدا ہی ملک گو میں ہوا تھا۔“

”اچھا۔“ ہم نے کہا۔ ”تو کیا وہاں کاروں کو Tow نہیں کیا جاتا؟“

”کیوں نہیں؟ مگر کوئی وجہ بھی تو ہو۔“

ہم سمجھ گئے کہ کسی انتہائی سڑیل اور جرح کرنے والے امریکی سے پالا پڑ گیا ہے۔ چنانچہ طعنے انداز میں کہا۔ ”وجہ یہ کم ہے کہ اس نے ٹریفک رولز کی خلاف ورزی کی ہے؟“

”اچھا تمہارے ہاں ٹریفک رولز بھی ہوتے ہیں؟“

اس نے معصومیت سے سوال کیا۔ مارے غصے کے ہمارے کان لال ہو گئے۔ یہ کس قسم کے امریکی سے واسطہ پڑ گیا؟ ہمارے ملک کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا؟ ہم ”جواب

ٹریفک کے محکمے نے یہ ضرور تہیہ کر لیا ہے کہ کراچی کو غلط پارکنگ کے جرمائوں کی حد تک یورپ اور امریکا کا ہم پلہ ضرور بنائیں گے۔ دوسرے ملکوں میں ہوتا یہ ہے کہ سڑکوں پر، بازاروں میں، شاپنگ سینٹرز پر، سینما گھروں کے سامنے، پارکوں میں۔ غرض یہ کہ ہر جگہ کاروں کو پارک کرنے کے لیے وسیع اور کشادہ جگہیں مخصوص ہوتی ہیں۔ مصروف اور گنجان آباد شہروں میں پارکنگ کے لیے زیر زمین جگہ حاصل کی جاتی ہے۔ کئی کئی منزلہ سرب فلک عمارتیں بھی کار پارکنگ کے لیے بنائی گئی ہیں۔ دفاتر میں یہ سہولت دفتر کی طرف سے مہیا کی جاتی ہے۔ عمارتوں میں رہنے والوں کے لیے عمارت کے مالک یہ آسانی فراہم کرتے ہیں۔

شاپنگ سینٹرز میں دکانوں والے اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر بلند یہ کی جانب سے نشانات لگائے گئے ہیں جن کے سوا کسی اور جگہ کار پارک نہیں کی جاسکتی۔ کاروں کو مناسب مقام پر کھڑا کرنے کے لیے پرائیویٹ پارکنگ ادارے بھی مصروف عمل ہیں۔ بڑے بڑے مصروف شہروں میں جا بجا پارکنگ کا بندوبست ہے جہاں فیس ادا کرنے کے بعد کوئی بھی اپنی کار کھڑی کر سکتا ہے۔ مصروف شاہراہوں پر تو سڑے سے پارکنگ کی اجازت ہی نہیں ہے لیکن دوسری سڑکوں پر بھی پارکنگ کے لیے مخصوص مقامات مقرر ہیں اور ان جگہوں پر مقررہ اوقات ہی میں کار کھڑی کی جاسکتی ہے۔ ورنہ ”ٹکٹ“ مل جاتا ہے۔ یعنی پولیس جرمانے کی پرچی کار پر لگا جاتی ہے جس کی ادائیگی ایک لاکھ امر ہے۔ کاروں کو باندھ کر اور تھیت کر لے جانے والی سزا شاذ و نادر ہی دی جاتی ہے اور وہ بھی ایسی صورت میں جب کہ بائیکل ممنوعہ علاقے میں آپ کار پارک کر دیں۔ ان حالات میں ”مجرم کار“ کو ایک شائستہ اور معقول شکل کی گاڑی نہایت احتیاط سے اٹھا کر اپنے ساتھ منسلک کر لیتی ہے اور کار کو اپنے ساتھ باندھ کر لے جاتی ہے۔ اس کو Tow کرنا کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ رسی وغیرہ سے باندھ کر کھینچنا۔ کئی کوری سے باندھ کر کھینچنے کو بھی Tow کہتے ہیں۔

Tow کرنا ایسی سزا ہے جو کسی کار کو انتہائی عرصے ”جرم“ پر دی جاتی ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ کراچی میں معمولی سے ”جرم“ میں ملوث کاریں بھی ٹرک کے ساتھ جھکڑی لگا کر لے جاتی جارہی تھیں۔ کراچی کی دیکھا دیکھی

Tow کرنا ایسی سزا ہے جو کسی کار کو انتہائی عرصے

”جرم“ پر دی جاتی ہے لیکن ہم نے دیکھا کہ کراچی میں معمولی سے ”جرم“ میں ملوث کاریں بھی ٹرک کے ساتھ جھکڑی لگا کر لے جاتی جارہی تھیں۔ کراچی کی دیکھا دیکھی

جاہلاں باشندہ خوشی“ کے مطابق خاموش رہے اور آگے چل پڑے۔

وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اچانک بولا۔ ”پارکنگ کی جگہ کہاں ہے؟ مجھے تو کہیں نظر نہیں آتی۔ نہ کوئی پارکنگ لائٹ نظر آیا، نہ ہی سڑکوں پر پارکنگ میٹر ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ پارکنگ کے لیے جو نشانات ہوتے ہیں وہ بھی نہیں ہیں۔ تو پھر غلط پارکنگ کہاں ہوتی ہے۔“

اب ہم اس کی باتوں میں چھپا ہوا طنز سمجھ چکے تھے اس لیے دوبارہ خاموشی اختیار کی۔ دراصل اب اس کے مزید سوالات کا جواب دینے کے لیے کم از کم ڈی آئی جی ٹریفک کے رینک کے کسی شخص کی ضرورت تھی جو فی الحال میسر نہیں آ سکتا تھا۔ شکاگو میں پیدا ہونے والا امریکی تو چلا گیا مگر ہمیں اس ابھرنے والے شکار کر گیا کہ واقعی جب پارکنگ کا مناسب بندوبست ہی کہیں نہیں ہے تو پھر غلط پارکنگ پر جرمانہ اور سزا کیسی؟ ابھی ہم یہ معاملہ نہیں کر پائے تھے کہ لاہور کے اخباروں میں ایک خبر نظر سے گزری جس میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب کی صوبائی حکومت نے کمپیوٹر کے ذریعے ٹریفک چالانوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ایک ”ٹریفک ٹوکن فائن اسکیم“ کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ طریقہ دنیا کے جدید ترین شہروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب ”مجرم کار“ پر ٹوکن لگایا جائے گا تو ہاتھ کے ہاتھ نقد جرمانہ بھی وصول کر لیا جائے گا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے والوں کے کاغذات پولیس اپنے قبضے میں لے لے گی اور وہ دفتر جا کر جرمانہ ادا کرنے کے بعد ہی کاغذات واپس لے سکیں گے۔ گویا جرمانہ ادا کرنے والا تو کیا کام سے۔ جب تک وہ غریب دو چار دن دھکے نہیں کھائے گا کاغذات اس کے ہاتھ نہیں لگیں گے۔ واقعی اتنا جدید ترین اور ”ایذا رساں ترین“ طریقہ بھلا دنیا کے کسی اور شہر میں کہاں مانج ہوگا؟ اخبار میں ٹریفک کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے جرمانے کے ریٹ بھی لکھے ہوئے ہیں۔ یہ تو ابھی تانہ بھلا ہے جسے آگے چل کر ان میں کتنا اضافہ ہوگا؟ یہ اندازہ آپ خود بخوبی لگا سکتے ہیں۔ فی الحال بھٹی کے طور پر ٹریفک لائسنس کی خلاف ورزی کرنے کا جرمانہ ڈیڑھ سو روپے ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہر قسم کی سواری کے لیے جرمانے کی رقم مختلف ہے۔ اسی طرح خلاف ورزیوں کی سنگینی کے مطابق جرمانے کے بھاد بھی چڑھے ہوئے ہیں۔

فلسفہ

جب زندگی کو اپنے دل کے گیت سنانے کے لیے گانے والا نہیں ملتا تو وہ اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے فلسفی پیدا کر دیتی ہے۔ (خلیل جبران)

فلسفہ کا مقصد زندگی کی تشریح کرنا نہیں بلکہ اسے بدلنا ہے۔ (رادھا کرشن)

تھوڑا سا فلسفہ انسان کو دہریت کی طرف لے جاتا ہے لیکن فلسفہ کی اتھاہ گہرائی اس مذہب کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ (ہیکسن)

ہم ایسے فلسفی ہیں کہ ایک دوسرے کی جبربادی ہی میں اپنی خوش حالی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ (لوئس بلاک)

مرسلہ: اولیس شیخ۔ نو بہ ٹیک سنگھ

یہ خبر پڑھ کر ہمیں یہ خیال آیا کہ ہماری ٹریفک پولیس آج تک لوگوں کو ٹریفک اصولوں کی الف۔ب تک تو سکھا نہیں سکی مگر جرمانے وصول کرنے کے لیے اس نے کمپیوٹر کی خدمات حاصل کر لیں۔ واقعی کیا مستعدی اور کارکردگی ہے کہ جو ٹریفک پولیس جسکی اور رکشا کے میٹر درست نہ کراسکی۔ ٹریفک کی لائسنس درست نہیں رکھ سکی۔ سڑکوں پر ٹریفک کے رکنے کے لیے نشانات نہیں لگوا سکی۔ کاروں کو فل لائٹ سے بغیر چلانا نہ سکھا سکی۔ سائیکل، ٹائٹلے اور ریڑھے میں ٹھنڈی ہارن لائسنس، روشنی یہاں تک کہ رات کو چمکنے والی کوئی شے تک نہیں لگوا سکی۔ جو ٹریفک پولیس ون وے پر دو طرفہ چلنے والوں کی روک ٹوک نہ کر سکی۔ ویکوں اور بسوں کو مویشیوں کی طرح بھرنے سے نہیں روک سکی۔ قانون کی موجودگی کے باوجود ویکوں اور بسوں میں بے ہودہ ریکارڈنگ بند نہ کر سکی۔ انہیں سڑک پر جب اور جس جگہ چاہیں اچانک ایسا روک دے بغیر کھڑے ہو جانے سے نہیں روک سکی۔ غلیظ دھواں کھینچنے والی گاڑیوں کا زہر اور بغیر سائینسروں والی موٹر سائیکلوں اور کاروں کا شور کم نہ کر سکی۔ پیدل چلنے والوں کو سڑک عبور کرنے کا طریقہ اور بسوں، ٹرک اور موٹروں والوں کو پیدل چلنے والوں کے حقوق کا احساس نہ

دلا سکی۔ غرض یہ کہ ٹریفک کے ابتدائی اصول و ضوابط تک نافذ نہ کرا سکی اگر وہ لوگوں سے جرمانے وصول کرنے کے لیے کمپیوٹر استعمال کرنے لگے تو پھر اسے اینٹیم بم سے چوہا مارنے کا تجربہ کرنے کے سوا اور کیا قرار دیا جاسکتا ہے۔

دراصل اگر آپ غور فرمائیں تو ہمارا چاہے کوئی محکمہ ہو اس کے طرز عمل اور کارکردگی کے بارے میں ایک قدر مشترک آپ کو نظر آئے گی اور وہ یہ ہے کہ عوام کو سزا نہیں دینا۔ ان پر جرمانے کرنا۔ ان کے استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں بے تحاشا اضافہ کرنا۔ ان پر کسی نہ کسی بہانے ٹیکس عائد کرنا اور پھر لطف یہ کہ ان سب جرمانوں اور گرانٹوں کے باوجود عوام بے چاروں کی کسی سہولت، آسائش اور ضرورت کا مطلق خیال نہ کرنا۔ محض پولیس اور ٹریفک کے محکمے ہی تک محدود نہیں ہے۔ یہ انداز فکر ہر جگہ اور ہر محکمے میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس پر طرہ و فتری کارروائیوں کی طوالت اور سرخ فیتے کی کارستانیوں جس کے سامنے خود بیوروکریسی بھی مہربان نظر آتے ہیں۔ یعنی اگر آپ کسی بہت بڑے افسر سے شکایت کریں کہ فتری کارروائی بہت طویل اور اذیت رساں ہے تو جواب میں وہ بھی بے بسی سے کاندھے اچکا کر کہیں گے۔ ”ارے صاحب! کیا کریں؟ سسٹم ہی ایسا ہے، دراصل یہ سارا دفتری نظام ہی تبدیل کرنے والا ہے، فی الحال تو یوں ہی کام چلے گا۔“ گویا وہ خود بھی اس کی خامیوں اور کوتاہیوں بلکہ ضرر رسانوں سے آگاہ ہیں۔ وہ واقعہ تو آپ نے ضرور سن رکھا ہوگا جب ہائی کورٹ کے ایک جج (انگریزی حکومت کے عہد میں) اپنے تمام جاہ و جلال اور اختیارات کے باوجود ایک پنواری سے ہار مان کر سرنیزر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ انگریزی عہد کا واقعہ ہے آج کل کیا عالم ہوگا یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پرانیم یہ ہے کہ ہمارے ادارے باب انتظام آج تک یہ معمولی سی بنیادی حقیقت نہیں سمجھ سکے کہ سارے محکمے اور سارے حکومت کے نظام دراصل لوگوں کی خدمت، سہولت اور فائدے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یعنی محکمے پر محکمہ جو قائم کیا جا رہا ہے اس کا مقصد محض کچھ لوگوں کو مہماری اور باقی کو نوکریاں دینا نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ اس غرض کے لیے جا رہا ہے کہ لوگوں کے لیے زیادہ سہولت فراہم کی جائے۔

لیکن اگر عملی طور پر دیکھیے تو معاملہ بالکل برعکس ہے۔ جتنے محکمے، افسر اور دفتر بڑھ رہے ہیں اسی قدر لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر نیا محکمہ اور ہر نیا افسران

کے لیے ایک نیا عذاب اور اذیت بن کر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹریفک پولیس ہی کو دیکھ لیجیے۔ آپ ساری دنیا میں پھر آئیے۔ اس قدر ناقص ٹریفک کا نظام کہیں نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ ہمارے شہروں میں تو شاید ٹریفک کا کوئی قانون سرے سے ہے ہی نہیں۔ تو پھر اتنے درجنوں ڈی آئی جی، ایس پی، ڈی ایس پی اور درجہ بدرجہ دوسرے افسر اور ہزاروں ٹریفک کے سپاہی آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ بقول غالب

وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں
یعنی ہماری ٹریفک پولیس ایک زمانے میں سہولتوں کی شکایت کیا کرتی تھی مگر اب دیکھیے تو قریب قریب تمام جدید ذرائع انہیں میسر ہیں۔ پیٹرول کاریں بھی ہیں۔ سائرن بجاتی ہوئی اور روشنیاں چمکاتی ہوئی نئی کاریں بھی ہیں۔ خوب صورت دردیاں بھی ہیں اور امریکی طرز کی موٹر سائیکلیں بھی ہیں جو وائرلیس سے مزین ہیں۔ دفاتروں میں جا کر دیکھیے تو ان کنڈیشنڈ ہیں۔ افسروں کو دیکھیے تو مطمئن ہیں۔ سپاہیوں کو دیکھیے تو آسودہ حال ہیں۔ تو پھر ٹریفک کا یہ حال کیوں ہے اور بے چارے عوام بدحال بلکہ حال سے بے حال کیوں ہیں؟

☆.....☆

”ہماری ایک ہی زبان ہونی چاہیے۔ بس اس کے بغیر ہم ایک قوم نہیں بن سکتے۔“

ایک پڑھے لکھے پروفیسر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ایم مسعود کھد کھد پوچھ کر بہت حیرت ہوئی اور انہوں نے کہا۔ ”یہ آپ بہت خطرناک بات کہہ رہے ہیں اگر ایسا ہی ہے تو ہم اقوام متحدہ کے رکن کیسے بن سکتے ہیں؟“ ایم مسعود صاحب کی اس حیرت پر ہمیں حیرت اس لیے ہو رہی ہے کہ اول تو اقوام متحدہ کا رکن بننے کے لیے کسی ملک یا قوم کی زبان ”مشروط“ نہیں ہے۔ دوسرے ایم مسعود صاحب شاید یہ بھول رہے تھے کہ جس وقت پاکستان اقوام متحدہ کا رکن بنا تھا اس وقت پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان ایک اور صرف ایک تھی کیوں کہ قیام پاکستان سے قبل ہی قائد اعظم نے اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اردو ہوگی۔ یہی زبان ہے جسے متحدہ ہندوستان کے ہندوؤں نے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اچھوت اور لیچہ قرار دے دیا تھا اور آج تک ان کی یہ نفرت قائم ہے۔ حالانکہ یہ وہ زبان ہے جس میں ہندی اور برصغیر کی مختلف



مسعود کھدر پوش

ہندی کی نہایت ٹھٹ اور مشکل سنسکرت آمیز شکل کو سارے ملک میں رائج کر دیا۔ جنوبی ہند میں احتجاجی مظاہرے ہوئے، توڑ پھوڑ بھی ہوئی مگر یہ ملک آج بھی قائم ہے اور ہندی سارے ملک کی واحد اور قومی زبان ہے۔ یہ مت بھولیے کہ بھارت میں 22 سے زیادہ زبانیں موجود ہیں۔ ان میں بھارتی، مرہٹی، بنگالی، تیلگو، تامل اور گورکھی پنجابی جیسی انتہائی ترقی یافتہ زبانیں بھی موجود ہیں اور وسیع علاقوں میں بولی جاتی ہیں ان زبانوں کا لٹریچر انتہائی ترقی یافتہ اور علوم و فنون کے ذخیروں سے مالا مال ہے۔ اس کے باوجود ہندی جیسی غیر معروف اور غیر ترقی یافتہ زبان کو بھارت کی قومی زبان کا درجہ دیا گیا آخر کیوں؟

ایم مسعود صاحب نے دنیا کے لگ بھگ ڈیڑھ سو سے زائد ملکوں کی فہرست میں سے چند ملکوں کے نام بھی گنوائے ہیں جہاں ایک سے زائد قومی زبانیں رائج ہیں مثلاً سوئٹزر لینڈ، کینیڈا، سری لنکا، افغانستان اور لبنان وغیرہ۔ ہوں تو لوگ اپنے موقف کی تائید میں قرآن حکیم اور احادیث سے بھی مطلب کی دلیلیں لے آتے ہیں لیکن اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو مذکورہ بالا مثالیں ایم مسعود صاحب کے موقف کو تقویت نہیں پہنچاتیں۔ اسے کمزور کرتی ہیں۔ سوئٹزر لینڈ کی مثال ہمارے دانشور ہر سانس کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ ملک دنیا کا انوکھا اور

علاقائی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن ہندوؤں کو اس زبان سے اس لیے دشمنی تھی کہ
1۔ یہ اس کماری سے کشمیر تک تمام مسلمان بولتے تھے۔

2۔ ہندی اور علاقائی زبانوں کی بھرمار کے باوجود اس میں مسلمانوں کی عربی اور فارسی زبان کی آمیزش تھی اور یہ اسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

اردو کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہی وہ زبان ہے جس میں تحریک پاکستان کی جنگ لڑی گئی۔ کانگریس اور مہا سبھا کی اخبارات جو پاکستان کے شدید مخالف تھے وہ بھی پاکستان کی مخالفت کرنے کے لیے اسی ہندوستان گیر زبان کا سہارا لینے کے محتاج تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ زبان جس پر آج بھی بھارت میں مسلمانوں کی زبان کا ٹھپا لگا ہوا ہے اور اسی بنا پر اس کو برادری سے خارج کر دیا گیا خود پاکستان میں اپنا مقام حاصل نہیں کر سکی۔

ایم مسعود صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک قوم ایک زبان کا ”گمراہ کن نظریہ“ مشرقی پاکستان پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ بنگالیوں نے اس کے خلاف مزاحمت کی اور بالآخر قوم کو 1971ء میں ایک قوم ایک زبان جیسے ”گمراہ کن نظریے“ کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ ایم مسعود صاحب کی اس منطق کی رو سے دیکھا جائے تو پھر سرے سے پاکستان ہی کو ”گمراہ کن نظریہ“ قرار دے دینے میں کیا قباحت ہے۔ پاکستان کا تو قیام ہی ایک قوم اور ایک زبان کے نام پر عمل میں آیا تھا۔ بنگالیوں نے ”ایک زبان“ کے گمراہ کن نظریے کے خلاف جنگ نہیں کی تھی۔ اس لیے کہ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں وہ اسی نعرے کو اپنا کر پاکستان کی جنگ لڑ چکے تھے۔ جو قوم ملک کے ایک حصے کو ہٹوانے کے بعد بھی آج تک یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکی کہ ہم نے یہ بھاری قیمت کس وجہ سے اور کس کی وجہ سے ادا کی ہے۔ اس کے دانشوروں اور اہل سیاست کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ ہمارے ان دانشوروں کو شاید یاد نہیں کہ ہمسایہ ملک بھارت نے جب آزادی کی جنگ کا آغاز کیا تھا تو ہندو قوم کو کسی لیڈر نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آزاد بھارت کی صرف ایک قومی اور سرکاری زبان ہوگی اور وہ ”ہندی“ ہوگی لیکن آزادی کے بعد بھارت کے رہنماؤں نے ایک شامی صوبے میں محدود پیمانے پر بولی جانے والی زبان کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کا اعلان کر دیا اور

عجیب ملک ہے۔ یہ فرانس، اٹلی اور جرمنی کی نسلوں پر مشتمل ہے۔ ان تین ممالک کے حصے کاٹ کر سویٹزر لینڈ کا قیام عمل میں آیا ہے اور نسلی اور لسانی طور تینوں علیحدہ اور مختلف اقوام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر قوم نے اپنی قومی زبان کو اپنانے پر اصرار کیا اور یہ تمام زبانیں سویٹزر لینڈ کی قومی زبان میں قرار دے دی گئیں لیکن یہ بھی نہ بھولیے کہ ہر اعتبار سے سویٹزر لینڈ دنیا کا انتہائی ترقی یافتہ ملک ہے۔ تعلیم اور تکنیکی علوم میں وہ پاکستان تو کیا دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ملکوں سے بھی آگے ہے۔ لوگوں میں رواداری بھی ہے اور قوت برداشت بھی ہے۔ سویٹزر لینڈ کے لوگوں میں جو شعور اور آگہی پائی جاتی ہے اس کا عشرِ شیر بھی ترقی پذیر ملکوں میں نہیں ہے۔ کوئی مثال پیش کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ وہاں کے حالات، تمدن، تہذیب، مزاج اور پس منظر کے ساتھ ساتھ قومی اور انفرادی شعور کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ یہ وہ ملک ہے جو انتہائی مختصر اور محدود ہونے کے باوجود دوسری عالمگیر جنگ کی آگ سے محفوظ رہا۔ اس چھوٹے سے ملک میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ اس نے اپنی غیر جانب دار حیثیت متحارب طاقتوں سے منوائی اور اس کا احترام کرایا۔ پاکستان کے مسائل کا تقابل اور موازنہ سویٹزر لینڈ جیسے ملک سے کرنا انتہائی معکمہ خیز ہے۔ کیا ایسے ملک سے ہم اپنے پسماندہ اور ہر اعتبار سے ترقی پذیر ملک کا موازنہ کر سکتے ہیں؟

دوسرا ملک کینیڈا ہے۔ امریکا کی طرح یہ بھی ایک نیا ملک ہے مگر ہوا یہ کہ جب گوری اقوام نے کینیڈا میں آباد ہونا شروع کیا تو آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جو فرانس کے باشندوں پر مشتمل تھا صوبہ کیوبیک میں آباد ہو گیا۔ فرانسیسی زبان اور پھر کے مواصلے میں انتہائی متعصب ہیں اور انگریزوں اور انگریزی سے تو انہیں خدا واسطے کا بھر ہے چنانچہ ان مخصوص حالات کے تحت انہوں نے فرانسیسی کو بھی قومی زبان بنانے پر اصرار کیا۔ خود ان کے صوبے کیوبیک سے انہوں نے انگریزی (اور انگریزوں کو) نظر بیا جلا وطن کر دیا ہے۔ یہ وہ صوبہ ہے جو سولہا سال سے فرانسیسی الحاق کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور صدرِ ریاست کے دورِ حکومت میں تو جب انہوں نے کیوبیک کا دورہ کیا تو کینیڈا نے رکھی طور پر بھی فرانس کی حکومت سے ان کی فرانس نواز سرگرمیوں پر احتجاج کیا تھا۔ گویا کینیڈا جیسے ترقی یافتہ اور باشعور ملک میں بھی زبان اور پھر کے اس مسئلے نے ایک

مسلل آویزش اور کشمکش کی فضا پیدا کر رکھی ہے اور سیاسی مبصرین کا اندازہ ہے کہ زرد یا بدیر یہ صوبہ کینیڈا سے علیحدہ ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ انگریزی اور فرانسیسی اس ملک کی علاقائی زبانیں نہیں ہیں۔ یہ دو علیحدہ اقوام کی زبانیں ہیں اور اس ملک میں دو مسلمہ مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ پاکستان کے حالات سے ان حالات کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

اب سری لنکا کی بھی بن لیجیے۔ یہاں سنہالی اور تامل دو زبانیں قومی زبانیں ہیں۔ نسلی لسانی اور تمدنی اعتبار سے یہ دونوں یکسر مختلف اقوام ہیں اور ان کی باہمی آویزش اور کشیدگی گزشتہ دنوں جس انتہا کو پہنچ گئی تھی اس کا تماشا ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ یہ دو مختلف اقوام آج بھی برسرِ پیکار ہیں اور عام خیال یہی ہے کہ سری لنکا کے تامل اکثریت کے علاقے بھارت کے ساتھ الحاق کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ انہیں بھارتی حکومت اور رہنماؤں کی آشر واد بھی حاصل ہے اس پس منظر میں سری لنکا کی مثال ہمارے لیے باعثِ عبرت ہے، تاکہ قابلِ تقلید۔

اس کے بعد ذرا اسرائیل کی طرف نظر ڈالیں۔ یہ ملک دنیا بھر کی اقوام کا ملغوبہ ہے۔ یورپ اور ایشیا کے ہر ملک سے یہودی نقل و وطن کر کے اپنے نئے ملک میں آباد ہوئے ہیں۔ پاکستان کے بعد یہ دوسرا ملک ہے جو مذہب کے نام پر قائم ہوا ہے، جس ملک اور قوم کے لوگ اسرائیل پہنچے وہ اپنی زبان اور پھر ساتھ لے کر گئے مگر اسرائیل نے اپنی قومی اور سرکاری زبان کے طور پر ”عبرانی“ کو منتخب کیا جو موجودہ عہد میں ایک ”مردہ“ زبان ہے۔ کتب خانوں اور مذہبی صحیفوں کے سوا اس زبان کا کہیں وجود نہیں ہے۔ یہ انتہائی مشکل اور ناقابلِ فہم زبان ہے مگر اس کو اسرائیل بھی ترقی یافتہ اور جدید مملکت کی قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اس کے باوجود اسرائیل ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے ہمسایوں کے ٹکڑے کر کے اپنی جغرافیائی سرحدیں بڑھا رہا ہے۔

افغانستان میں پشتو اور فارسی بولنے والوں کی آبادی ہے لیکن عملی طور پر (اور سرکاری طور پر بھی) فارسی زبان کو قومی زبان کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ حالانکہ پشتو بذاتِ خود ایک ترقی یافتہ زبان ہے اور آبادی کی بہت بڑی تعداد پشتو بولتی ہے۔ لبنان کی مثال بھی ایم مسعود صاحب نے پیش کی ہے۔ فراموش کر بیٹھے کہ لبنان میں قومی زبانیں



ہوتا۔ انگلستان ہمارے دانشوروں کے لیے ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے مگر اسکاٹ لینڈ، آئر لینڈ اور ویلز کی زبانوں کی موجودگی میں وہاں انگریزی کو قومی زبان قرار دیا گیا اور آج بھی انگریزی ہی وہاں کی قومی اور سرکاری زبان ہے مگر اس کے باوجود یہ ملک آج بھی ”یونائیٹڈ کنگڈم“ ہے اور ایک زبان ٹھونسنے کے باوجود اس کے ٹکڑے نہیں ہوئے۔ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں یورپ کی تمام اقوام نے ڈیرہ جمایا مگر وہاں کی قومی زبان محض ایک ہے۔ انگریزی مگر کیا بات ہے کہ دوسری اقوام اور دوسری زبانیں بولنے والوں کو ان ملکوں میں احساس محرومی پیدا نہیں ہوا؟ سب سے زیادہ حیرت امریکا کے رہنے والوں پر ہے۔ ہسپانوی کو غیر رسمی طور پر امریکا کی دوسری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ جنوبی امریکا کی زبانیں بولنے والے بھی بہت بڑی تعداد میں یہاں آباد ہیں۔ وہ آج بھی اپنی زبان بولتے ہیں۔ اپنے پھر پر فر کرتے ہیں۔ اپنی رسوم پر کاربند ہیں۔ شادی بیاہ بھی اسے آبائی ملکوں میں جا کر کرتے ہیں مگر قومی زبان کے طور پر انگریزی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ میں امریکا میں ایسے ہسپانوی اور اطالوی لوگوں سے بھی ملا ہوں جو بیس بائیس سال سے امریکی ہیں مگر انگریزی زبان سے بالکل ان کی نئی نسلیں انگریزی بولتی ہیں اور اپنے بزرگوں کے لیے ترجمہ کے طور پر فرائض ادا کرتی ہیں۔ اس پس منظر میں یہ دلیل کہ ان کی زبان ترک کر کے کسی اور مشترک زبان کو اپنانے کا مطالبہ کیا جائے زمین پر اتارنے کی ناکام کوشش کے مترادف ہے ”غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ ایک قومی زبان

ایک سے زائد ہیں مگر اقوام اور نسلیں بھی ایک سے زائد ہیں اور ان کے اختلافات اور تعصبات جس انتہا کو پہنچ چکے ہیں ان کا ثبوت ساری دنیا کے سامنے ہے۔ یہ بد قسمت ملک آگ اور خون کے سمندر میں غرق ہے۔ حالانکہ بقول مسعود صاحب، یہاں کے دانائوں نے ایک قومی زبان رائج کرنے کی غلطی نہیں کی ہے۔ مسعود صاحب نے یہ دلیل دی ہے کہ محض جغرافیائی تقسیم کی بنا پر زبان مختلف نہیں ہو سکتی۔ مثلاً عرب ممالک کی سرحدیں علیحدہ ہیں مگر زبان ایک ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ عرب ممالک کی یہ تقسیم مصنوعی ہے جو سامراجی طاقتوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کی تھی ورنہ درحقیقت عرب ایک ہی قوم ہیں اس لیے ان کی زبان اور تہذیب بھی بنیادی طور پر ایک ہی جیسی ہے۔ اب ذرا اس کے برعکس چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ امریکا کی نئی دنیا دریافت ہوئی تو یورپ اور دنیا کے گوشے گوشے سے لوگوں نے وہاں کا رخ کیا۔ ہسپانوی، اطالوی، فرانسیسی، جرمن، انگریز، ڈچ غرض یہ کہ ہر جگہ کے لوگ وہاں آباد ہوئے۔ اس کے باوجود وہاں کی قومی زبان ایک ہے جب کہ تہذیبیں اور اقوام مختلف ہیں لیکن شاید ابرہہ ہم لنگن اور جارج واشنگٹن اتنے بڑے دانشور نہیں تھے کہ مختلف قومی زبانیں اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے۔ ہسپانوی دنیا کی عظیم ترین زبانوں میں سے ہے، اطالوی بھی ساری دنیا میں بولی اور بھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود امریکا کی قومی زبان صرف ایک ہے یعنی انگریزی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید یہ ملک ریاست ہائے متحدہ نہ رہتا اور اس کا شیرازہ بکھر چکا

اختیار کرنے سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ علاقائی زبانوں کا وجود ختم کر دیا جائے۔ اس کے برعکس علاقائی زبانوں کی ترویج اور ترقی کے لیے موثر اور منظم کوشش کرنی چاہیے، جو لوگ یہ شکوہ کرتے ہیں کہ پاکستان میں علاقائی زبانوں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا گیا ہے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستان میں تو حکمرانوں نے آج تک قومی اور سرکاری زبان اردو کے ساتھ بھی وہی بلکہ اس سے بدتر سلوک روا رکھا ہے۔ احساس محرومی کسی ایک زبان کو رائج کرنے کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتا (جب کہ اس زبان کو باقاعدہ، باضابطہ اور موثر طور پر رائج بھی نہیں کیا گیا) یہ رہنماؤں کی بے عملی، حکمرانوں کی بے تدبیری اور دانشوروں کی خود غرضی کے سبب نشوونما پاتا ہے۔ ہاں جو لوگ پاکستان کو مختلف قوموں کا ملک سمجھتے اور قرار دیتے ہیں انہیں چاہیے کہ زبان اور تہذیب کے پردے میں اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ لوگ ماضی قریب میں تحریک پاکستان کے مقاصد کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو مگر تاریخ کے صفحات میں ابھی یہ خرید و خندنی نہیں ہوئی ہے کہ قیام پاکستان کے لیے دلیل ہی یہ پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دونوں آباد ہیں اور مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں جن کا مذہب، تہذیب، تمدن اور زبان ایک ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی اکثریت نے اس مطالبے کی تائید کی تھی یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور پاکستان حاصل کر لیا، اگر یہ فلسفہ اور نظریہ درست نہیں تھا تو پھر مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پنجابی، بلوچی، سندھی اور بھٹوانی غیر منقسم ہندوستان میں بھی تھے۔

انگلستان میں تو قومی زبان اردو نہیں ہے اگر کوئی چوتھی یا پانچویں جماعت کا بچہ آپ سے غالب اور میر کے بارے میں گفتگو کرنے لگے تو آپ کیا سوچیں گے؟ غالب اردو ادب میں کلاسیکی حیثیت رکھتے ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں کے نصاب میں غالب کو پڑھانے پر وہ زور نہیں دیا جاتا جو شیکسپیر کو پڑھانے پر دیا جاتا ہے۔ کولہو میں ایک پانچویں جماعت کی بچی نے جھجکا کر اپنی ہوم ورک کی کاپی سے سرائیا اور پوچھنے لگی۔

”انکل! کیا آپ کے ملک میں بھی شیکسپیر ہوتا ہے؟“

غالباً مراد اس کی یہ تھی کہ کیا آپ کے ملک میں بھی

نصاب میں شیکسپیر پڑھایا جاتا ہے؟ چنانچہ ہم نے فخریہ انداز میں کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہمارے ہاں تو بچے بچے شیکسپیر کا نام جانتا ہے۔ دیکھو بیٹے، ولیم شیکسپیر بہت بڑا ڈراما نگار تھا۔ اس کی عظمت میں تو کلام ہی نہیں ہے۔“

”واقعی آپ سچ کہتے ہیں۔ اگر اتنا بڑا ڈراما نگار نہ ہوتا تو ہماری چھٹی کلاس کے سکسپس میں نہ شامل ہوتا۔“ پھر ایک لمحہ اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”انکل آپ نے شیکسپیر کو پڑھا ہے؟“

”بھئی جو شخص انگریزی پڑھتا ہے وہ شیکسپیر کو ضرور پڑھتا ہے۔“

”تو پھر بتائیے! کیا وہ آپ کو اچھا لگتا تھا۔ آپ شوق سے اس کے ڈرامے پڑھا کرتے تھے؟“

یہ سوال ذرا ٹیڑھا تھا۔ سچ پوچھیے تو دل بہلا دے کی خاطر پڑھنے کی غرض سے ہمیں بھی شیکسپیر اچھا نہیں لگا مگر اس کے بارے میں لکھوائے گئے نوٹس ہمیں بڑی پابندی اور دلجمعی سے یاد کرنے پڑتے تھے۔ بہر حال لڑکی کا دل بہلانے کے لیے ہم نے مختصر سا جواب دے دیا۔ ”ہاں! ہمیں اچھا لگتا تھا اور تمہیں؟“

چھوٹی لڑکی نے برا سا منہ بنایا۔ ناک سیکڑی اور شانے اچکا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس ایک واقعے نے ہمیں شیکسپیر کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا کر دیا۔ آخر شیکسپیر میں وہ کیا خاص بات ہے کہ ہم تیسری دنیا کے ایشیائی ملکوں میں شیکسپیر کو گھوٹ کر ملا دیا جاتا ہے مگر کیا اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے؟ شیکسپیر کے ڈرامے، شیکسپیر کے کردار، شیکسپیر کی ٹریجڈیز، یہ سب آگے چل کر ہماری روزمرہ کی زندگی پر کیا اثر ڈالتی ہیں؟

ہم واپس لاہور آئے تو ہماری بیٹی ساتویں جماعت کا کورس لیے بیٹھی تھی اور سامنے پیچھے ہوئے کاغذات کو دیکھ دیکھ کر برے برے منہ بنا رہی تھی۔

”کیا کوئی سوال سمجھ میں نہیں آتا؟“ ہم نے اخلاقی ہمدردی کے خیال سے پوچھا۔

”نہیں پاپا۔“ وہ ہنسی سے بولی۔ ”ہم شیکسپیر کے بارے میں نوٹس یاد کر رہے ہیں۔“

”بیچے پھر وہی شیکسپیر یہاں بھی آگیا۔ تیسری دنیا کے وہ جگہ جگہ جہاں انگریزوں کا راج رہا ہے وہاں آج بھی شیکسپیر کا نام کافی رائج رہا ہے۔ ان میں خواہ پاکستان ہو،



”پاپا ناراض نہ ہوں۔ چند نمچرز کے سوا اسے کوئی نہیں سمجھتا۔ پھر بھی اس کا کیا بگڑتا ہے، وہ ہر کورس کی کتاب میں موجود ہے۔“

”یہی اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔“ ہم نے کہا۔ ”یہ بتاؤ تمہیں شیکسپیر کے بارے میں کیا نوٹس لکھوائے گئے ہیں۔“

”شیکسپیر کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے۔ ابھی تو مس ہمیں اس زمانے کے انگلستان کے بارے میں نوٹس لکھوا رہی ہیں جن دنوں شیکسپیر لکھا کرتا تھا۔ اس زمانے کے طور طریقے، لباس، رہن سہن، انگریزوں کی عادتیں اور خصلتیں۔ پاپا کیا ایک شیکسپیر کو پڑھنے کے لیے ساری انگلش ہسٹری پڑھنی ضروری ہے؟“

ہمارے ماہرین تعلیم تو خبر بھی ان مسائل پر کیا سوچتے ہوں گے مگر بچے اور ان کے والدین۔ یقیناً اس بات پر غور کرنے پر مجبور ہیں کہ اسکول کی چھوٹی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی اونچی کلاس تک ہمارے ہاں نصاب کے ذریعے شیکسپیر گھول کر طلبہ کو پلایا جاتا ہے۔ اس کی عظمت ان کے ذہنوں پر بٹھائی جاتی ہے تو آخر عملی زندگی میں انہیں اس سے حاصل کیا ہوتا ہے؟ صرف شیکسپیر ہی نہیں۔ دوسرے انگریزی کے کھنڈے والوں کے بارے میں ہماری نسل جو کچھ سمجھتی اور پڑھتی ہے۔ اسکول اور کالج سے باہر نکلتے ہی اسے فراموش کر دیتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں روزمرہ کی زندگی میں ان کے لیے بے کار ہیں۔ سیزر، ہیلٹھ، میکھ، لیٹر ان سب کا تعلق پاکستانی نوجوان کی زندگی سے کیا تعلق اور واسطہ ہے لہذا ان کو پڑھ کر ہماری نئی نسل آخر کیا

بھارت ہو، سری لنکا ہو یا بنگلہ دیش۔ ہر ملک کے طالب علموں کو ابتدائی کلاسوں ہی سے شیکسپیر رٹانا شروع کروایا جاتا ہے پھر آگے چل کر وہ دور آتا ہے جب انہیں اسٹیج پر شیکسپیر کے ڈرامے قدیم زمانے کے فرسودہ لباس پہن کر قدیم انداز کے لب و لہجہ میں انگریزی بول کر پیش کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ڈرامے محض برائے ڈراما ہوتے ہیں۔ نہ ان میں کام کرنے والے ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور نہ دیکھنے والے۔ ہاں ان معدودے چند ”دانشوروں“ کی بات

اور ہے جو شیکسپیر کا نام سنتے ہی آنکھیں موند کر کسی ماورائی دنیا میں کھینچ جاتے ہیں۔

میں نے کچھ معلومات اپنی بچی سے حاصل کرنی چاہئیں۔ ”یہ بتاؤ۔ شیکسپیر تمہیں کیسا لگتا ہے؟“

اس نے خاموشی سے شانے ہلا دیے۔

”تم نے پہلی بار شیکسپیر کب پڑھا تھا؟“

جواب ملا۔ ”پانچویں جماعت میں شیکسپیر کی تین کہانیاں ہمارے کورس میں شامل تھیں۔“

”وہ کہانیاں تمہیں اچھی لگی تھیں؟“

”بالکل نہیں۔“ پھر اس نے مزید معلومات فراہم کیں۔ ”پاپا شیکسپیر کے ڈرامے اور ٹریجڈیز کے بارے میں ہمیں اتنا کچھ بتایا جاتا ہے مگر ہمارے دل پر ان کا کوئی اثر

نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے تو اس زمانے کے رسم و رواج اور آداب بتائے جاتے ہیں۔ ہمیں ان سے کیا واسطہ؟ پھر وہ زبان پڑھائی جاتی ہے جو اب دنیا میں کہیں نہیں بولی جاتی۔

خود شیکسپیر بھی آج زندہ ہوتا تو یہ زبان استعمال نہ کرتا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ شیکسپیر تو انسانی جذبات کا نقشہ

پیش کرتا ہے۔ انسانیت کا پیامبر ہے اس کی ٹریجڈیز۔“

”ٹریجڈیز؟“ وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”کنگ لیرر“

بھی کوئی ٹریجڈی ہے۔ ہمیں تو اس پر ذرا بھی رونا نہیں آتا۔

اور پاپا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ لوگوں کو مار مار کر ٹریجڈی پیدا کرو۔ ہمیں تو ان کہانیوں پر ہنسی آتی ہے نہ روتا۔“

”فضول خیالات کا اظہار مت کرو۔ جانتی ہو کہ

شیکسپیر رہتی دنیا تک باقی رہنے والی شخصیت ہے۔ تمہارے

نہ بچنے سے اس کا کیا بگڑ سکتا ہے؟“

کی حرارت سے خالی۔ البتہ ٹیکلیکی خوبیاں آپ ان میں جا ہے جتنی تلاش کر لیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شیکسپیر کا ڈراما دیکھنے کے لیے بمشکل ایک سو آدمی آتے ہیں اور وہ بھی ڈرامے کے دوران میں جھانپاں لیتے رہتے ہیں مگر ڈرامے کے اختتام پر بڑے زور و شور سے اس کے فنی پہلوؤں پر بات چیت کرتے ہیں۔

ایک دانشور نے یہ سوال بر محل اٹھایا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم انگریزی زبان کے گڑے نردوں کو اکھاڑ کر اپنے نونہالوں کے ذہنوں میں دفن کر دیں جب کہ اس سے انہیں حاصل کچھ نہ ہوگا۔ انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں اپنی ہر چیز کی طرح اپنے ادب کو بھی عالمگیر بنا دیا تھا مگر آپ دیکھیں گے کہ دقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بیشتر مصنف اور تصنیفات محض لائبریریوں کی زینت بن کر رہ جائیں گی۔ زندگی بہت تیزی سے رواں دواں ہے۔ 1884ء کے چارلس ڈکنس سے آج کے پاکستانی بچے کو بھلا کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟

Great Expectations تو شاید وہ

ہضم کر لے مگر پک وک پیرز اس کے حلق سے کیونکر اتریں گے مگر اصرار یہ ہے کہ یہ کلاسیک ادب ہے جو لوگ محض تفریح یا دل بستگی کے لیے پڑھتے ہیں ان کے نزدیک مذکورہ مصنف قصہ پارینہ بن چکے ہیں مگر ہمارے نصاب کی کتابوں میں آج بھی بچے ان کو پڑھنے پر مجبور ہیں مگر کیا یہ جائز ہے؟

☆.....☆

زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ آج کے نوجوان کل کے جوان اور تجربہ کار بوڑھے کہلاتے ہیں۔ آج بھی جب میں اخبارات میں بعض صحافیوں اور سیاستدانوں کے لیے بزرگ سیاستدان یا بزرگ صحافی کے خطابات پڑھتا ہوں تو ہنستا ہوں۔ ان لوگوں پر نہیں بلکہ زمانے کی نیرنگی پر یہ ہمارے ہمعصر ہیں۔ ان میں سے کچھ ہمارے سینئر ہیں مگر جب ہم نے انہیں پہلے پہل دیکھا تو یہ نوجوان تھے۔ کامیابیوں کے دروازے کھٹکتا رہے تھے، ہر شعبے میں بے شمار نوا سوز اور ناتجربہ کار داخلے کی راہیں تلاش کر رہے تھے مگر دقت کے ساتھ ساتھ اب وہ ادھیڑ عمر یا بوڑھے ہو چکے ہیں۔ آج کی نسل کے لیے وہ بزرگ ہیں مگر اپنے ہمعصروں کے نزدیک ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مثلاً جب میں اپنے صحافی اور اہل قلم دوستوں کو دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ بات بات پر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے والا بے پردا انسان

حاصل کر سکتی ہے؟ حالت یہ ہے کہ اسکول اور کالجوں میں شیکسپیر گھوٹ گھوٹ کر پلایا جاتا ہے اس کی تحریروں کے اعلیٰ نکات سمجھائے جاتے ہیں مگر ذرا ایمان سے سوچے کہ کتنے لوگ ہیں جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد وقت گزاری یا محض دلچسپی کے لیے بھی شیکسپیر کو پڑھتے ہیں؟ انگریزی کے بے شمار مقبول مصنف ہیں جنہیں انگریزی داں دلچسپی سے پڑھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان میں ردمانک رائٹر بھی ہیں اور جرائم کی کہانیاں لکھنے والے بھی لیکن جیمز ہیڈلے چیز کو جس بڑے پیمانے پر اور جس قدر دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ کیا شیکسپیر کے بارے میں بھی یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ شیکسپیر کو زبردستی اعصاب اور دماغ پر نازل کیا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے بعد یہ نقش بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔

شیکسپیر کے بارے میں گزشتہ سالوں میں تحقیقات کے بعد بہت سے انکشافات بھی کیے گئے۔ اکثر دوسرے مصنفین کے ڈراموں سے اس کا موضوع نکراتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شیکسپیر نے اپنے تمام ڈراموں کے لیے خیالات دوسری جگہوں سے مستعار لیے تھے بلکہ ایک محقق نے تو یہ بھی ثابت کر دیا کہ شیکسپیر نامی کسی شخصیت کا وجود نہیں تھا۔ یہ محض ایک قلمی نام ہے اس کے باوجود انگریز نہ تو خود اپنے ذہنوں سے شیکسپیر کی عظمت کا خول اتارنا چاہتے ہیں اور نہ ہم ایشیائیوں کے ماہرین تعلیم شیکسپیر کا پچھا چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔

بعض رستار کہتے ہیں کہ شیکسپیر کے ڈرامے محض پڑھنے کے لیے تیار رکھتے ہیں جب کہ دوسرے کہتے ہیں کہ شیکسپیر کا ڈراما آج پر سحر طاری کر دیتا ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم نے خود لکھنا نہیں بھی شیکسپیر کے ڈرامے دیکھے ہیں۔ تماشائی منہ کھولے آگے نہیں بھاڑے مرعوب بیٹھے دیکھتے رہے۔ قسم لے لو جو کسی نے واقعی Injoy کیا ہو۔ ہمارے ملکوں میں بھی شیکسپیر کے ڈرامے دیکھنے والوں کی تعداد مٹھی بھر ہے۔ ان میں سے بھی اکثریت خاموش رہتی بنی دیکھتی رہتی ہے۔ ڈراما دیکھنے کا یہ انداز تو نہیں ہوتا؟ لیکن وجہ یہ ہے کہ کیوں کہ بچپن ہی سے ہمیں شیکسپیر کی عظمت اور خوبیاں زبانی یاد کرادی جاتی ہیں اس لیے کسی میں یہ اخلاقی جرأت نہیں کہ اظہار ناپسندیدگی کر سکے۔ ڈراما دراصل جیتے جاگتے کرداروں کا مظہر ہونا چاہیے۔ تاکہ ہزاروں سال پرانی تہذیب کا نوحہ معلوم ہو۔ کروار بے جان، الفاظ زندگی



سابق صدر پرویز مشرف اور فضل محمود

کچھ کھنڈرا نو جوان ایک دن پنجابی اور اردو شاعری کا بزرگ ستون بن جائے گا۔ میری مراد منیر نیازی سے ہے۔ ابھی نکل ہی کی بات ہے کہ منیر نیازی کبھی سعادت حسن منٹو، کبھی ابراہیم جلیس، کبھی شاد امرتسری اور نصیر انور کے ساتھ آفاق کے دفتر میں آکر گھنٹوں چائے پیتا اور لطیفے سناتا تھا مگر اب وہ جہاں دیدہ اور قابل احترام بزرگ شاعر ہے۔ انتظار حسین کو دیکھ لیجئے لڑکے سے لگتے تھے۔ آفاق میں میرے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ ان کی ادبی عظمت کو کبھی ان کے سامنے ہم نے تسلیم کر کے نہیں دیا۔ کبھی ان کے محاوروں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ کبھی الزام ہے کہ انتظار صاحب تو نکسالی زبان نہیں بلکہ پاپوڑا اور خولہ کی مقامی زبان لکھتے ہیں۔ جنہیں اہل پنجاب مرحوب ہو کر ”شستہ اردو“ سمجھ لیتے ہیں۔



جمید نظامی

انتظار حسین بڑے مرحبا مرحبہ نو جوان تھے۔ ہاں ادبی بحث شروع ہو جائے تو ان کے گلے میں نہ جانے کہاں سے لاؤڈ اسپیکر فٹ ہو جاتا ہے ورنہ بہت دھیمی آواز میں بولنے والے زیر لب مسکرانے والے۔ اپنی زبان کی غلطیوں کی نشاندہی پر بھی مسکرا کر محض یہ کہہ کر رہ جاتے تم کیا جانو زبان کھاتی ہے؟ ”اب وہ ثقہ ادبی شخصیت ہیں، بزرگ ادیب۔ صاحبوں میں بہت سے صحافی جو آج اخبارات کے صفحات پر دم مار رہے ہیں اس وقت صحافت میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے جب ہم نے صحافت کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں ہمارے ساتھ کام کرنے والے حبیب اللہ اوج، جمیل الزماں، عبدالسلام خورشید، ظہور عالم شہید، خالد لطیف، زاہد چودھری، سردار فضل، ہدایت اللہ آضر، بشیر احمد، ارشد ابو صالح، اصلاحی (مرحوم)، میاں محمد شفیع، ممتاز احمد خاں، امجد حسین، احمد بشیر، ظہیر بابر، خورشید الاسلام، حمید ہاشمی مرحوم، عبداللہ ملک، افتخار احمد وغیرہ تھے۔ آج ان میں کتنے ہی فوت ہو گئے

ہیں۔ باقی ماندہ ”بزرگ صحافی“ بن گئے ہیں۔ آج کے ضیاء الاسلام انصاری، عبدالقادر حسن وغیرہ ہمارے کچھ بعد وارد ہوئے اور ان کے بعد آنے والے تو اور بھی نو عمر ہیں۔ مجید نظامی نوائے وقت کے مدیر اور مٹین اینڈیٹر ہیں۔ میں نوائے وقت میں تھا تو مجید نظامی ابھی اخبار سے وابستہ بھی نہیں ہوئے تھے بعد میں ایک صحافی وفد سندھ شمالی علاقوں کے دورے پر گیا تھا مجید نظامی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ آج کے زرعی کالم لکھنے والے سیالانی ان دنوں جونیئر انفارمیشن آفیسر تھے۔ مجید صاحب شروع سے ہی کم گو ہیں مگر اب تو غالباً ”کمترین گو“ ہو گئے ہیں مگر مجھے جب ان کا خیال آتا ہے وہی مسکراتی ہوئی تصویر نگاہوں میں ابھرتی ہے جو سات آٹھ دن کی ہمسری کے دوران میرے ذہن پر نقش ہو گئی۔ ذکی الدین ہال نوائے وقت میں رپورٹر تھے اور قانون کے طالب علم بھی، بہت درد مند اور ذمے دار نو جوان تھے۔ ایک بار رات کو ڈیوٹی سرانجام دیتے ہوئے میں نے ایک کامن پن نگل لی۔ یار لوگوں نے بہت التالٹا کر دیا یا جھکے دیے مگر پن نہ نگلی۔ ایک کاتب نے بتایا کہ یہ تو خون کی رگ میں جا کر خون میں شامل ہو جائے گی اور کسی جگہ تک کر مصیبت ڈال دے گی۔ یہ خبر سن کر میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھ سے زیادہ ہوش ظہور عالم شہید کے اڑے جو نیوز اینڈیٹر انچارج تھے۔ فوراً تانگہ لایا گیا اور ذکی الدین ہال کی سربوای میں چند لوگ ہمیں بے ہوشی کے عالم میں لے کر میو اسپتال گئے۔ وہاں دوروز تک کیا ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے مگر میں فم کے مارے بار بار ہوش میں آتا اور بار بار بے ہوش ہوتا۔ جب ہوش میں آتا تو ذکی الدین ہال میرے پاس بیٹھے نظر آتے۔ اگلے دن ڈاکٹر عالم نے ایکمرے لے لیا

اور کہا کہ پن جسم میں موجود نہیں ہے مگر میں اپنے محلے دل، جگر اور نہ جانے جسم کے کن کن حصوں میں سوئی کی خیالی چھین محسوس کرتا اور شور مچاتا کہ نہیں پن ابھی جسم میں موجود ہے۔ اسپتال سے واپس آنے کے دو دن بعد ایک روز کھانا کھا رہا تھا کہ نوالے میں کوئی چیز چھپی دیکھا تو ایک رنگ آلود پن تھی۔ یہ معاً آج تک حل نہیں ہوا کہ یہ پن وہی تھی جو میں نے نگلی تھی؟ اور اگر وہی تھی تو اتنے دن تک کہاں غائب رہی۔ بہر حال یہ واقعہ بعد میں لطیف بن گیا اور ضرب المثل کے طور پر نوائے وقت میں کام کرنے والے ہر نووارد سب ایڈیٹر کو سنایا جاتا رہا۔

ذکی الدین پال نے بعد میں زور شور سے وکالت کی اور اس کے بعد اس سے بھی زیادہ زور شور سے پنجاب ہائی کورٹ کے جج رہے اس عرصے میں ایک بار بھی میری ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک بار میں اپنی شادی کے بعد مری گیا تو ایک ہونٹ میں دور سے ذکی الدین پال صاحب نظر آئے۔ میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ جج صاحب ہمارے بے تکلف ساتھی تھے تو جج صاحب کی سنجیدگی اور متانت دیکھ کر اسے یقین نہ آیا۔ ذکی صاحب دور چند لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے اس وقت ملاقات کو نامناسب سمجھا مگر آج تک کوئی موقع غنیمت نہ ملا کہ ذکی صاحب سے ملاقات ہوتی۔

☆.....☆

فضل محمود کا ایک ریکارڈ عمران خان نے توڑ دیا تھا۔ آج کی نسل کے لیے عمران خان ہی آئیڈل ہے اور سچ بھی یہ ہے کہ عمران خان نے پاکستان میں کرکٹ کو ایک رومانٹک ایجنڈے میں بہت مدد کی ہے۔ قیامت کے باؤلر اور آفٹ سے بھرے ہوئے بینسمین تھے مگر میرے دھیان کی گلیوں میں فضل محمود محسوس نہیں ہیں۔ عمران تو اگلی نسل ہیں۔ نسل اسی وقت اچھی ہوتی ہے جب پچھلے اہل خاندان کا شجرہ اور کارنامے یاد ہوں۔ فضل محمود اور عقیل محمد کا عروج ہماری آنکھوں دیکھتے ہوئے یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں گھر گھر کرکٹ کو پہچانے میں ان دونوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یوں تو کاردار بھی تھے امتیاز، وقار، نذر محمد، خان محمد، محمود حسن، صادق بھی تھے گویا ایک لمبی قطار ہے۔ جنہوں نے کرکٹ کو بام عروج تک پہنچانے کے لیے خدمات سرانجام دیں مگر گھر گھر اس کھیل کو مقبول کرنے کا سہرا فضل محمود اور حنیف محمد کے سر ہے۔ جسے دیکھیے فضل یا حنیف بننے کی کوشش کر رہا

ہے۔ ضرب المثل کے طور پر اب یہ فقرہ متروک ہو گیا تھا کہ ”تم کون سے بریڈ مین یا طر ہو۔“ اس کی جگہ عام ہو گیا تھا۔ ”کیا اپنے آپ کو حنیف اور فضل سمجھتے ہو؟“

حنیف پر فضل کو جو فوقیت حاصل تھی۔ وہ ان کی شخصیت تھی، ایسا بانٹا جیلا گورا، سرخ و سفید رنگت اور دلکش نقش کا مالک، نیلی آنکھیں، شرعی بال، قد و قامت مثالی اس پر گفتار الکی میٹھی اور بے تکلف۔ اگر یہی شخص ”اول“ کا ہیرو بھی ہو تو مجھے کہ قیامت آگئی۔ فلمی اداکاروں پر وہ ہجوم اور پروانہ دار یورش نہیں دیکھی جو فضل محمود کے مقدر میں تھی۔ ہندوستان کے دورے پر گئے تو کروڑوں دلوں کو دھڑکتا چھوڑ آئے۔ انگلستان گئے تو حسینان فرنگ کو لوٹ لیا۔ ”اول“ کی فتح کے بعد جب ایک شام پاکستانی پولیس کی وردی میں ملبوس ایک اسمارٹ اور خوش رونو جوان لندن کے ایک سینما میں داخل ہوا تو چاروں طرف تہلکہ مچ گیا۔ ”فضل..... فضل“ انگریز قوم جو بہت منظم اور مہذب ہے (اور اس زمانے میں واقعی ہوا کرتی تھی) چوڑی بھول گئی۔ جسے دیکھیے فضل پر ٹوٹا ہوا ہے۔ بڑے سے بڑے چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے دل میں فضل سے ملنے کی خواہش تھی اور لڑکیاں تو شاید اس زمانے میں خواب میں اول کے ہیرو کو دیکھا کرتی تھیں۔ ان میں ہر ملک کی لڑکیاں شامل کر لیجیے۔

فضل فلمی حلقوں میں بھی ہیروز سے زیادہ مقبول اور ہر دلچیز تھے۔ ہیروئن آگے پیچھے پھر رہی ہیں۔ فلم ساز کام کرنے کی دعوت دے رہے ہیں مگر ایک بات میں فضل محمود کی تعریف میں ضرور کروں گا۔ خدا نے فضل محمود کو جو شخصیت جو شہرت اور عروج عنایت کیا تھا اس کا ایک چوتھائی بھی کسی اور کو ملتا تو دماغی توازن کھو بیٹھتا۔ مگر فضل ہمیشہ ایک متوازن اور نارمل انسان رہے۔ بعد میں یہی خوبی میں نے عمران خان میں پائی۔ یہ خدا کا بندہ بھی تعریف شہرت حسن و جمال کسی بات پر نازاں نہیں رہا۔ خدا خوش رکھے اور اسی طرح کامیاب و کامراں رکھے۔ یہ لوگ جو کچھ پا چکے ہیں اس کے مستحق ہیں اور جو انہیں اب تک نہیں ملا وہ بھی ان کا حق ہے۔

ہاں تو بات فضل محمود کی ہو رہی تھی۔ ہونٹ کے سروں میں دوستوں کے دفتروں میں فضل محمود بے تکلفی سے آجاتے، نان کباب کھائے جارہے ہیں، گپیں ہو رہی ہیں مگر فضل کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی تعریف اور اپنے

”باغی گروپ“ کی خبریں اخبارات میں عام ہونے لگیں تو میں نے دیکھا کہ حامیوں اور مخالفوں کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ میاں واو کی حمایت میں تھا اور کہہ رہا تھا کہ ماجد، سرفراز ہیں کیا۔ ان کے بغیر پاکستان میں کرکٹ زیادہ کامیاب رہے گی۔ دوسری طرف ایک گروہ تھا جو کہہ رہا تھا کہ جاوید میاں داد کا کھیل اب بس ہو گیا۔ ایک نوعمر اور غیر ذمہ دار کھلاڑی کی خاطر اسے بہت سے اچھے کھلاڑیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ جاوید کو اب کرکٹ سے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ یہی رویہ سری لنکا کے ساتھ میچوں کے دوران دیکھنے میں آیا۔ بہت سے لوگ جاوید میاں واو کی حمایت میں نعرے لگا رہے ہیں۔ بہت سے تماشائی ماجد، عمران، سرفراز اور ظہیر کی حمایت میں چلا رہے ہیں اور دوسرے گروہ کے لیے ”مردہ باد“ کے نعرے لگا رہے ہیں۔ انہیں تو آپ عوام، نوجوان اور جذباتی مداح کہہ کر شاید نظر انداز کر دیں مگر اخبارات کے مراسلات کے کالموں میں بھی یہی طرز گفتگو رہا اور تو اور صحافتی کالم نگاروں، اسپورٹس اور رپورٹروں نے بھی کسی ایک کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت شروع کر دی تو تشویش پیدا ہونے لگی۔ کتنی بد نصیبی ہے ہماری کہ ہم جذبات میں بہہ جاتے ہیں اور خود اپنے ہی ایک عضو کی دوسرے عضو پر برتری یا کمتری ثابت کرنے لگ جاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ خود اپنے جسم کے ایک حصے کو ناکارہ قرار دے کر اسے کاٹ کر پھینک دینے پر زور دیتے ہیں۔ یہ رویہ زندہ قوموں کی شان کے شایان نہیں ہے۔ دراصل ہم ابھی یہ شعور پیدا نہیں کر پائے ہیں کہ اس ملک کی جو بھی چیز یا جو بھی شخصیت ہے وہ ہماری ہے جس طرح ایک خاندان کے فرد اور ان کی جاوید ہوتی ہے۔ معمولی سی بحث یا اختلاف پر کسی خاندان کے افراد میں کاٹ چھانٹ تو نہیں شروع ہو جاتی۔ سارے فنکار، سارے کھلاڑی، سارے شاعر اور ادیب ہمارے ہیں۔ ہمیں ان سب پر فخر ہونا چاہیے۔ ان کے باہمی جھگڑوں سے اپنے آپ کو بالاتر رکھنا چاہیے۔ جب عمران میدان میں وکٹ کی طرف دوڑتا تھا تو ہمارا دل خیر کا ہو جاتا تھا۔ سرفراز نواز، اقبال قاسم، مدثر نذر جو بھی وکٹ لیتا تھا ہمیں فخر کا احساس ہوتا ہے۔ جاوید میاں داد، ظہیر میاں ماجد، مدثر یہ سب ہماری آنکھوں کے تارے ہیں۔ پاکستان کو کرکٹ نیم کارہ کھلاڑی ہمارے جگر کا کٹڑا ہے۔ ہماری دعائیں اور تحنیں ان سب کے لیے ہیں اس لیے کہ یہ پاکستان کے ہیں۔

کارناموں کا زیادہ بیان نہیں کرتے تھے۔ البتہ لطفی کے طور پر کچھ واقعات ضرور سنایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک بار جب وہ پولیس کی ڈیوٹی کے سلسلے میں ایک علاقے میں متعین تھے، دیکھا کہ ایک دیہاتی ہٹا کٹا چور مال غنیمت لے کر بھاگ رہا ہے۔ انہوں نے جیب میں پیچھا کرنا چاہا مگر راستہ دشوار گزار تھا۔ جھٹ جیب سے گود کر پیدل دوڑنے لگے۔ میل ہا میل تک دونوں آگے پیچھے دوڑتے گئے۔ وہ دیہات کا پلا ہوا چور بھاگنے میں طاق۔ یہ او دل کے ہیرا اور اسپورٹس میں دوڑنے میں کب ہار مان سکتے تھے۔ کئی میل کا سفر طے ہو گیا مگر نہ چور بھاگنے سے باز آیا نہ فضل محمود تعاقب کرنے سے، آخر ایک جگہ چور تھک ہار کر کھیت کی منڈ پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ فضل محمود بھی جا کر پاس ہی دراز ہو گئے اور سانس درست کرنے لگے۔ دونوں کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو چور نے بڑی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں ارجی میں نے تمہارے جیسا جوان پولیس میں نہیں دیکھا۔

فضل مسکرائے اور بولے مگر کرکٹ کے میدان میں تو دیکھا ہوگا۔ بعد میں انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ چور نے کرکٹ کبھی نہیں کھیلی تھی۔ نہ کبھی بیچ دیکھا تھا مگر فضل محمود کا نام جانتا تھا فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا اور کہا۔ ”اجی پہلے بتا دیا ہوتا کہ تو فٹبال ہے۔“

فضل نے بہت فتوحات حاصل کیں مگر آخر ایک دن ریٹائر ہونا تھا۔ کچھ عرصے بعد صوفیت کی طرف مائل ہو گئے۔ داڑھی رکھ لی۔ پانچوں وقت کی نماز، روزے، وظائف اور اسلامی موضوعات پر تحریریں۔ یہ فضل محمود کا دوسرا روپ تھا۔ کئی سال وہ مذہب اور روحانیت کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان تمام ادوار میں وہ بطور پولیس افسر بھی اپنی نیتیں واریاں نبھاتے رہے۔ پھر وہ ”بزرگ کھلاڑی“ بنے اور نوجوانوں کو مشورے دیتے رہے مگر میری نگاہوں میں ان کی وہی سبیلی، خوب صورت، فٹس لکھ اور نوجوان شخصیت تصویر لگائے بیٹھی رہی۔ شاید میں بذاتِ خود ذہنی طور پر اپنے آپ کو ”بزرگ“ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا؟

آج کے نوجوان کل کے بزرگ ہوں گے اور اس طرح یہ تجربے مشاہدے سسل در سسل منتقل ہوتے رہیں گے۔ آنے والی سسل گزری ہوئی سسل کے کارناموں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے گی۔

ایک بار قصہ یہ ہوا کہ جب کرکٹ کنٹرول بورڈ اور

حاصل ہو بھی جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس دوران میں طرزِ مزاج ایک بھیاں بھیاں ماحول میں مصائب کی زندگی گزارتا ہے اور ہماری جیلوں کا ماحول ایسا ہے کہ کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد انسان یا تو تارک الدنیا ہو جاتا ہے یا عادی مجرم۔

پروچانڈیو ہو یا کوئی دوسرا ڈاکو۔ ہر ایک کی زندگی کو ان ہی مرحلوں سے گزرتا پڑا ہے اور آج جو پروچانڈیو سوسائٹی میں موجود ہیں انہیں بھی بعینہ وہی حالات درپیش ہیں۔ جو لوگ ڈاکو بن چکے، وہ تو اب واپسی کا سفر اختیار کرنے سے معذور ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرے میں مستقبل کے جو پروچانڈیو جنم لے رہے ہیں یا جنم لینے والے ہیں ان کی روک تھام کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ بھارت میں بھی ڈاکوؤں کی کوئی کمی نہیں ہے، نہ تھی۔ یہ اور بات ہے پروچانڈیو

☆.....☆

مادام نور جہاں کی جہاں کہیں عزت افزائی اور آؤ بھگت ہوتی تھی۔ ہم سمجھتے کہ یہ ہماری ذاتی عزت افزائی ہے۔ ہمارے ملک کی عزت افزائی ہے۔ فیض، جوش، احمد فراز، منیر نازکی، جمیل الدین عالی۔ قشیش شفا کی۔ احمد ندیم قاسمی جہاں کہیں اپنی شاعرانہ عظمت کے جھنڈے گاڑتے ہیں ہم سمجھتے کہ وہ ہماری فتح ہے۔ جہاں ہماری خوشبو پھیل جاتی ہے۔ ان میں بڑے چھوٹے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ ہمارے دل ان سب کے لیے یکساں دھڑکتے ہیں۔ اب بھی میرا یہ خیال ہے کہ یہ سب ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ جب تک یہ رویہ عام نہ ہوگا۔ ہم اپنے مایہ ناز فرزند کی دل شکنی کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ ان کی ناقدری کا جرم سرزد کرتے رہیں گے۔ دیکھیے ناں اگر آپ سرفراز یا ماجد کو پست کرتے ہیں اور جادید میانداد کو بلندی پر لے جاتے ہیں تو نقصان تو ہمارے پاکستان کا ہے۔ وطن کی سرزمین کے یہ بیٹے اپنی ماں کی نظردوں میں یکساں عزیز اور محبوب ہیں۔

☆.....☆

سندھ کا مشہور و معروف ڈاکو پروچانڈیو اپنی زندگی میں بھی خبروں کا موضوع بنا رہا، مرنے کے بعد بھی پروچانڈیو کے تذکرے ختم نہیں ہوئے تھے۔ اخباری نامہ نگار اس بارے میں خصوصی جائزہ شائع کر رہے تھے اور اس کی زندگی پر ایک کتاب بھی شائع کی تھی جس میں اس کے بچپن سے لے کر جوانی اور پھر ہلاکت تک کے واقعات تفصیل سے درج تھے۔ پروچانڈیو ڈاکو کیوں بنا؟ اس کے اسباب قریب قریب وہی ہیں جو برصغیر میں پیدا ہونے والے تمام قابل ذکر اور قابل ذکر ڈاکوؤں کے ہوتے ہیں یعنی سماجی انصاف سے محرومی، جاگیرداروں اور وڈیروں کا استحصال، پولیس کی بے اعتنائی، انصاف کا عدم حصول، معاشی لوٹ کھسوٹ، طبقہ وارانہ نشیب و فراز اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی بے حسی۔ اس کے بعد نوبت آتی ہے عدالتی انصاف کی۔ عدالتیں انصاف کرنے کے لیے کوائف و شواہد کی محتاج ہوتی ہیں اور ابتدائی رپورٹوں اور دوسرے واقعات کی ترتیب دینے میں پولیس اور جموں کی کوتاہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مرحلے پر بھی عدالت بے نوا اور بے زر آدمی کو انصاف میسر نہیں آتا پھر ہمارے عدالتی طریقہ کار کی طوالت بھی ایک مرحلہ ہے۔ مقدمات اتنی طوالت اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر بشرط محال کسی کو انصاف



کہ اگر ملک کی وسعت اور آبادی کے تناسب کو دیکھا جائے تو غالباً ہمارے ہاں ڈاکوؤں کی پرورش اور تعداد کہیں زیادہ ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد سماجی اور انتظامی نظام تو بھارت میں بھی زیادہ تبدیل نہیں ہوا۔ نہ ہی سماجی نا انصافیوں اور معاشی ناہمواریوں کا ازالہ ہو سکا۔ طبقہ وارانہ منافرت بھی اس معاشرے میں ہم سے کہیں زیادہ ہے اس کے باوجود سماجی بنیادوں پر ڈاکوؤں کو روکنا اور اس پر لانے کے لیے وہاں کئی تحریکیں چلائی گئیں جنہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ڈاکوؤں کی عام معافی کا اعلان کیا گیا۔ تائب ہونے کی صورت میں وعدہ کیا گیا کہ انہیں معمولی سزاؤں کے بعد معاشرے میں نئے سرے سے باعزت شہریوں کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح ایک محدود بہانے پر ہی سبھی عمر بھارت میں ڈاکوؤں کو ختم کرنے کی ایک شعوری اور سماجی کوشش ضرور کی گئی جب کہ ہمارے ہاں درجنوں سماجی انجمنوں اور مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے باوجود ان کی طرف سے اس اہم مسئلے کو حل کرنے

کی کوئی تدبیر اور کوشش نہیں کی گئی۔

پرو چانڈیو کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالیے اور اس کے بعد آئے دن منظر عام پر نمودار ہونے والے ڈاکوؤں کے حالات زندگی پڑھیے (جو عموماً اخباری کالموں کی زینت بنتے رہتے ہیں) تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا وجوہ آپ کو ہر ڈاکو کے معاملے میں کارفرما نظر آئیں گی۔ اسباب و علل قریب قریب وہی ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے (یا ان کو خراب تر کرنے) کے طریقے بھی وہی ہیں۔ چلیے ایک شہری جائز یا ناجائز شکایات کی بنا پر ڈاکو بن گیا یا پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ مرحلہ بھی اپنی جگہ انتہائی قابل غور اور تشویش ناک ہے۔ ڈاکوؤں سے لے کر عام بد معاشوں تک کے واقعات دیکھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ابتدائی جرائم میں یا تو وہ پکڑا ہی نہیں گیا یا بہ آسانی ضمانت پر رہا ہو گیا۔ انتہا یہ کہ ایک قاتل بھی جیل جانے سے بچ گیا یا پھر مختصر سزاکاٹ کر دوبارہ سنگین جرائم کرنے کے لیے تازہ دم اور تربیت یافتہ ہو کر جیل سے باہر آ گیا۔ گویا سنگین جرائم میں ہلکی اور برائے نام سزائیں اور اکثر حالات میں سزاؤں سے محفوظ رہتا بھی اس رجحان کو بڑھانے میں نمایاں ہے۔ اگر کوئی شخص قابو میں آ ہی گیا تو اس نے دوراستے اختیار کیے۔ سپاہیوں یا جیل کے حکام سے مراعات حاصل کرنے کے بعد موقع پا کر ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل بھاگ گیا مردانہ وار جیل تو ذکر فرما رہا ہو گیا اور اس طرح پہلے سے بھی زیادہ خطرناک اور سنگین جرائم کا مرتکب ہوا۔ گویا ثابت یہ ہوا کہ جب تک قانون نافذ کرنے والے اداروں کو موثر نہ بنایا جائے اور قانون و انصاف کی فراہمی کی سہولتیں ہر خاص و عام کے لیے یکساں، آسان اور فراوان میسر نہ کی جائیں انتظامی طور پر اس مسئلے کا کوئی حل موجود نہیں ہے اور یہ تو اس مسئلے کا سرے سے کوئی حل ہی نہیں کہ پہلے تو ڈاکو بنائے جائیں اور پھر پولیس مقابلے میں انہیں ہلاک کیا جائے اور اس سلسلے میں سینکڑوں پولیس والے بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

ایسی کہانیوں میں سو فیصد آپ کو ایسے شواہد ملیں گے کہ سماجی نا انصافی اور زبردست مظالم سے تنگ آ کر ایک شخص نے جب پولیس چوکی کے دروازے کھٹکھٹائے تو اسے تحفظ کی بجائے بے حسی اور سرد مہری ہی نصیب ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ یہ معاشرہ جس کی لالچی اس کی بھینس کے فلسفے پر عامل ہے اور

جب تک وہ خود قانون کو ہاتھ میں نہیں لے گا اس کو انصاف نہیں مل سکے گا۔ ہر ڈاکو، بد معاش اور مجرم کے حالات زندگی میں یہ نکتہ آپ کو مشترک نظر آئے گا۔

دوسری حالات اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کب تک اور کتنے ڈاکوؤں کو ماریں گے اور اس کا فائدہ کیا ہوگا جب کہ ان کی جگہ دوسرے اور اکثر حالات میں ان سے زیادہ تعداد میں ڈاکو پیدا ہو جائیں گے؟ دوسرے لفظوں میں جب تک ڈاکو ساز نرسریاں اور اسکول ختم نہ ہوں گے ڈاکوؤں کی پیدائش، نشوونما اور پرورش ختم نہ ہو سکے گی۔

وہ لوگ جو جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کے لیے فلموں، خصوصاً پنجابی فلموں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں ان کے لیے بھی یہ ایک لمحہ فکر یہ ہے۔ پنجابی فلموں میں ظلم کے خلاف ہتھیار اٹھانے والے مظلوم کو ہیرو کا نام دیا جاتا ہے جو معمول کے مطابق انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ان میں دوسرا موضوع باہمی دشمنیاں اور انتقام کی آگ کو بنایا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے معاشرے میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور آئے دن اخبارات میں شائع ہونے والے روح فرسا اور سنگین واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہماری پنجابی فلمیں کسی حد تک ہمارے دیہاتی معاشرے کی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں جب کہ دوسری فلموں میں گل و بلبل کے رومانی قصوں اور جرم و سزا کے مغربی تصورات کے سوا دوسرے موضوعات کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں اور یہی پنجابی فلموں کے قبول عام ہونے کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ دیہاتی معاشرے میں عام کسان کی زندگی کے شب و روز جس نا انصافی کے ماحول میں بسر ہوتے ہیں اور حصول انصاف سے محروم رہنے کے باوجود اس کے دل میں جو جذبات اور آتش فشاں اگلے رہتے ہیں اس کے نتیجے میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص پرو چانڈیو بن جائے مگر جب کوئی پرو چانڈیو بن جاتا ہے تو اس کے کارناموں میں ہر شخص اپنی دبی ہوئی خواہشوں اور سسکتی ہوئی آرزوؤں کا نظارہ کر لیتا ہے اور اس طرح مجرموں کو ان کے نزدیک ہیرو کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک انتہائی خوفناک اور تشویش ناک صورت حال ہے۔ یوں سمجھیے کہ ہم ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں جس کی شدت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے مگر ہم اس آگ کو بجھانے کی تدبیر تو کیا اس کے متعلق سنجیدگی

گول کیا اور اس خطے کے عوام کو غلامی کے دور سے نجات حاصل ہو گئی اس کے بعد بھی ساہیا سال تک محکمہ عریضوں کے لیے یہی طرز نگارش مخصوص رہی۔ یہی نہیں بلکہ ہر محکمے کے باہر جس بورڈ پر متعلقہ محکمہ کے افسر کا نام درج ہوا کرتا تھا اس کے ساتھ ہی بے شمار القاب بھی درج ہوا کرتے تھے۔ مثلاً صاحب بہادر ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ فلاں۔ پھر اخبارات میں متعلقہ محکموں کی جانب سے جو ٹینڈرنس یا اشتہارات شائع ہوا کرتے تھے ان کے آخر میں بھی جناب صاحب بہادر کے تمام القاب درج کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا گویا سیاسی طور پر تو ہم لوگوں نے آزادی حاصل کر لی تھی لیکن جہاں تک دفتری آزادی کا تعلق ہے اس سے محروم تھے اور فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے غلامی انگریز کے بیوروکریٹ کی تھی اور اب پاکستانی بیوروکریٹ کی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خود کسی محکمے کے سربراہ یا بیوروکریٹ اعظم کو بھی اس صورت حال کا احساس نہیں ہوا، وہ بدستور اپنی افسری کی شان میں مگن تھے اور عوام بدستور فدیہ یا نہ کتیری کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے کافی عرصے بعد کچھ اخبار نویسوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ غیر ضروری القاب و آداب آزادی کے بعد بھی کیوں اور کس لیے استعمال کیے جاتے ہیں؟ بلکہ درحقیقت ان درخواستوں کا انداز تحریر اس قدر فدیہ یا نہ ہوا کرتا تھا اور درخواست گزار اس میں اپنی کمتری اور احقری کے اظہار میں اتنا فراغ دل ہوا کرتا تھا کہ ان درخواستوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی کراہیت آتی تھی۔ حیرت ہے کہ درخواستیں پڑھنے والوں کو کبھی یہ احساس تک نہ ہوا کہ وہ بنی نوع انسان کو کس قدر ذلیل کر رہے ہیں اور انسانی عظمت کی اہانت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

بہر حال، اخبارات میں شور و غل ہوا۔ کچھ حکومتیں ایسی آئیں جنہیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب اس قسم کے القاب و آداب کو متروک کر دینا چاہیے اس لیے کہ آزاد ملکوں میں سرکاری افسر عوام کے حاکم نہیں بلکہ ملازم اور خدمت گار ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ درخواستوں کا لب و لہجہ بدلنے لگا مگر دفاتر کے باہر لکھے ہوئے آداب و القاب میں کوئی فرق نہ آیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس مسئلے پر بھی توجہ دی گئی اور غالباً سرکاری افسروں نے بذات خود ہی احساس کمر نفسی سے مجبور ہو کر اپنے القاب کو مختصر کر دیا۔ اب جہاں تک دفتری کا تعلق ہے یہ القاب دیکھنے میں نہیں آتے۔ نہ

سے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ مغرب میں رابن ہڈ ایک ایسا ہی کردار تھا، یہ مغرب کے استحصالی معاشرے میں انصاف کا علمبردار اور غریبوں اور مظلوموں کا حمایتی تھا۔ رابن ہڈ امیروں کی دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ غریبوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہو کر امیروں کے سامنے آہنی چٹان بن کر کھڑا ہو جاتا تھا مگر آپ نے بھی غور کیا کہ آج کے مغربی معاشرے میں کوئی رابن ہڈ کیوں نہیں جنم لیتا۔ وہ مغربی بچے جو کسی زمانے میں رابن ہڈ کی کہانیوں کو حفظ جاں بنا کر رکھتے تھے۔ اب ان کے لیے رابن ہڈ ایک خیالی کردار بن کر رہ گیا ہے اور اس کردار میں بھی اب ان کے لیے کوئی خاص دلچسپی کا سامان موجود نہیں ہے۔ مغرب کا بچہ اب سائنس فکشن اور ایٹمی دور میں سائنس لینے والے کرداروں کی خیالی کہانیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ اب وہاں رابن ہڈ پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں۔ مغربی معاشرے میں سائنٹفک انداز میں۔ بینک لوٹے، فراڈ کرنے والے، لوٹ مار کرنے والے اور دوسرے جرائم کرنے والے لوگ تو موجود ہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ معاشرہ اب رابن ہڈ سے محروم ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ سماجی ناہمواری، انصاف کا عدم حصول، قانونی عمل کی سست رفتاری اور مائنٹ از رائٹ کا اس معاشرے میں کوئی وجود باقی نہیں ہے مگر کیا ہمارے معاشرے میں بھی اس کا کوئی امکان ہے؟ خاص طور ایسی صورت میں جب کہ ہم ایک مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کے دعویدار بھی ہیں؟

☆.....☆

آزادی سے پہلے کسی بھی محکمے کے سربراہ کو کسی بھی معاملے میں درخواست دینے کے لیے کچھ اس قسم کی عبارت مخصوص تھی۔

بکھنور فیض محبوب صاحب۔ صاحب بہادر..... جناب والا۔ گزارش کمترین کی یہ ہے کہ..... اس کے بعد کمترین نہایت عاجزی سے اپنی گزارشات پیش کرنے کے بعد آخر میں صاحب بہادر کی شان میں کچھ اذیت پسند اور اس امید پر دعائیں درج کرتا تھا کہ شاید اس کی درخواست کی پذیرائی ہو جائے۔ درخواست کا اختتام کچھ اس طرح ہوا کرتا تھا۔

آپ کا نیاز مند۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہوایہ کہ جب انگریز حاکم نے برصغیر سے اپنا بوریا بستر

ماہنامہ سرگزشت

ہی اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کے آخر میں جناب صاحب بہادر قسم کے الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں لیکن یہ انقلاب یا تبدیلی محض تحریر کی حد تک ہوتی ہے۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے افسروں کا رویہ بدستور دیا ہی تحکمانہ ہے اور درخواست گزار کی لجاجت اور کتتری میں عملی طور پر کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس موضوع پر اخبارات کے کالموں میں بہت کچھ لکھا گیا عالموں نے مقالات لکھے۔ فاضلوں نے تحقیق کا جال بچایا اور یہ دور کی کوڑی لائے کہ دراصل یہ ہمارے دور غلامی کی یادگار ہے۔ اس کے لیے دانشوروں نے ایک اصطلاح بھی واضح کر لی ہے جسے عرف عام میں ”غلامانہ ذہنیت“ کہا جاتا ہے۔

غلامانہ ذہنیت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کیوں کہ ہم نے سالہا سال انگریز کی غلامی کی ہے اس لیے ہم ذہنی طور پر اب تک غلامی کے ان اثرات سے نجات حاصل نہیں کر سکے جو ہمارے ذہنوں اور رگ و ریشے میں سرایت کر چکے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت ہی کا کرشمہ ہے کہ اس معاشرے میں جو بھی اور جہاں بھی قدرے صاحب اختیار ہے اس کا فرض ہے کہ دوسروں کو ڈرائے دھمکائے۔ اپنے سے کمتر جانے ان سے بدسلوکی کرے۔ ان صاحب اختیار لوگوں میں اعلیٰ سرکاری حاکم سے لے کر محکمہ کا چہرہ اسی تک سبھی شامل ہیں بلکہ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ ایسے مقامات پر بھی اس غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے جہاں عوام کو کسی ”صاحب اختیار“ کی نظر کرم کا امیدوار ہونا پڑتا ہے۔ وہاں ضروری ہے کہ عام التجا کریں اور جس سے ان کا واسطہ پڑا ہے یا جان کا حاجت روا ہے وہ ان کو گھر کیاں دے، جہز کے اور ضرورت پڑے تو انہیں برا بھلا کہہ۔ کئی جگہ پر تو آپ نے عوام کو پولیس اور انتظامیہ کے منہ سے کھاتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ عوام یہ ڈنڈے نہایت مبرور سے کھاتے ہیں اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ نہ نئی ذہنیت مارنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو وہ دھمکے رسید کر رہے ہیں دراصل وہ آزاد ملک کے معزز شہری ہیں۔ ساری دنیا میں گاہکوں سے جو سلوک کیا جاتا ہے وہ سب کو معلوم ہے اور آزاد ملکوں کے معزز شہری جن مراعات اور جس عزت و احترام کے مستحق ہیں اس سے بھی اب سبھی واقف ہو چکے ہیں مگر ہماری غلامانہ ذہنیت نے ہماری فہم اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا ہے اس لیے ہم یہ نہیں غور کرتے کہ ہم کس اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی بلکہ قانونی

جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تحریر کیا ہے اس قسم کے مظاہروں کے لیے کسی سرکاری دفتر میں جانا ضروری نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی بھی قسم کے اختیار کا مالک ہے اپنے سے نیچے لوگوں سے بدسلوکی کرتا ہے اور اپنے سے اونچے درجے کے افراد کے سامنے کھکھیاتا ہے۔ ہاتھ باندھ کر التماس کرتا ہے۔ آسان زبان میں یوں کہا جاتا ہے کہ شاید ہم لوگوں کو ”عزت نفس“ کا پاس نہیں ہے یا دوسرے الفاظ میں خود داری سے محروم ہیں۔ تم ظریفی یہ ہے کہ اقبال کے کلام کو بھی ہم لہک لہک کر پڑھتے ہیں اور علامہ کے فلسفہ خودی کے حد درجے معترف ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر نصاب کی ہر کتاب میں شامل ہے اور ہر وہ شخص جو اردو پڑھتا ہے وہ یہ شعر بھی زبانی یاد رکھتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے یہ پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟
یعنی ایک طرف خودی کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ اللہ میاں سے بھی طلب گار ہیں کہ ہماری عزت نفس کا خیال رکھا جائے اور دوسری طرف خودی کی پستی کا یہ عالم ہے کہ مجھے کے چہرہ اسی کے آگے بھی ہاتھ باندھے، سر جھکائے کھڑے ہیں۔ داناؤں نے بتایا ہے کہ یہ دراصل ہماری غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔

ہم تو تقدیر کے اس فیصلے کو غلامانہ ذہنیت کا لازمی جز تسلیم کر کے راضی برضا تھے مگر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ پچھلے دنوں جب ہم امریکا گئے تو ہمیں ان سیاہ فام لوگوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جو کچھ عرصے پہلے جج جج کے غلام تھے یعنی جن کے آباؤ اجداد کو خرید کر دور دراز علاقوں سے لایا گیا اور پھر انہیں امریکا کے سفید فام مالکوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا جیسا کہ آپ نے امریکی تاریخ میں پڑھا ہوگا غلام کے جسم و جان کا مالک اس کا آقا ہوا کرتا تھا۔ امریکا میں بھی کالے غلاموں پر ان کے آقاؤں کو ہر طرح کا اختیار حاصل تھا۔ انہیں انسانی حقوق تو کیا انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا بھی اختیار نہیں تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کالوں کی افزائش نسل بھی موشیوں کی طرح کی جاتی تھی۔ یعنی بدتر مت اور توانا مرد اور محنت کش خوش شکل اور مضبوط عورتوں کو محض نسل بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اس ضمن میں تہذیب بھی نہیں رکھی جاتی تھی کہ ان کا آپس میں کوئی خون کا رشتہ تو نہیں ہے؟ گویا امریکا کے کالے جج معنوں میں غلام تھے۔ ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم۔

جب دنیا بھر میں آزادی کا غلغلہ مچا ہوا اور خود امریکا آزادی کی تحریک کا چیمپین بن گیا تو وہاں بھی کالوں کے انسانی حقوق بحال کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ آج سے چند دہائی پہلے تک امریکا کے بہت سے شہروں اور علاقوں میں کالے لوگ سفید قوم لوگوں کے ساتھ بس میں نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ہوٹلوں میں نہیں داخل ہو سکتے تھے۔ گوروں کے اسکولوں میں کالوں کا داخلہ ممنوع تھا لیکن کالوں نے اپنے حقوق کے لیے قربانیاں دیں گوروں کی آبادی کے ایک معقول عنصر نے بھی ان کے مطالبات کی حمایت کی غرض یہ کہ سالہا سال کی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد کالوں نے گوروں کے مساوی حقوق حاصل کر لیے۔ اب عملی طور پر صورت حال یہ ہے کہ کالوں کو آبادی کے تناسب سے نوکریاں حاصل ہیں۔ واشنگٹن ڈی سی امریکا کا دارالحکومت ہے جہاں کالوں کی آبادی تقریباً 75 فیصد ہے۔ منتخب اداروں کے علاوہ سرکاری دفاتر میں بھی ہر جگہ آپ کو اسی تناسب سے کالے نظر آئیں گے گوروں کے افسر بھی کالے ہیں۔ واشنگٹن ڈی سی کا میئر کالا ہے۔ پولیس کمشنر، اٹارنی جنرل، چیف جج سب کالے ہیں اور سب نام کے افسر نہیں ہیں۔ انہیں مکمل اختیارات بھی حاصل ہیں لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کالوں میں غلامی کا احساس اب زائل ہو چکا ہے۔ وہ غلامانہ ذہنیت کے شکار نہیں ہیں۔ وہ بڑی بے تکلفی سے گوروں سے میل جول رکھتے ہیں۔ برابری کے تعلقات ہیں بلکہ ایک لحاظ سے وہ اپنے آپ کو گوروں سے برتر سمجھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کالوں نے گوروں کے فیشن اور ان کا فطران اختیار کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ امریکا میں کالوں کے فیشن مختلف ہیں۔ ماڈرن سیاہ فام عورتیں بھی بالوں کے اسٹائل مختلف بناتی ہیں جو کالوں کے مخصوص انداز سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کے لباس گوری عورتوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ انہوں نے رہن بہن بھی گوروں سے الگ اختیار کیا ہے مگر جو بات سب سے زیادہ حیران کن ہے وہ یہ ہے کہ وہ بالکل برابری سے گوروں سے بات کرتے ہیں نہ ان کے سامنے کھکھیاتے ہیں، نہ خوشامد کرتے ہیں، نہ کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار ہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ کالے غلامانہ ذہنیت سے کیونکر محفوظ ہیں؟ بلکہ دیکھا جائے تو غریبی اور پسماندگی کے باوجود ان میں ایک احساس تفاخر اور رعب و اب کا عنصر موجود ہے۔ مثال کے طور پر گورا کچھ مانگے گا تو

اخلاق اور لجاجت سے مکر کالا اپنا حق سمجھ کر۔ ایک دن فٹ پاتھ پر ایک بٹے کٹے کالے سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے تکلفی سے میری طرف بڑھا اور نہایت دوستانہ لہجے میں بولا۔ ”آپ جو سگار پی رہے ہیں ایسا دوسرا سگار ہو تو مجھے دے دیں۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس دوسرا سگار نہیں ہے۔“ کہنے لگے۔ ”تو پھر یہی دے دیں۔ یہ میرا پسندیدہ سگار ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میرا بھی پسندیدہ سگار ہے اور صرف ایک ہے۔“ اس نے سر جھکایا اور بولا۔ ”ایک ڈالر ہو گا؟“ میں نے ایک ڈالر ان کے حوالے کیا۔ وہ ”تھینک یو“ کہہ کر اپنی راہ چل دیے۔ نہ سر کہہ کر مخاطب کیا نہ ملتجیانہ لہجہ اختیار کیا۔ حد تو یہ ہے کہ بھیگ مانگتے وقت بھی میں نے کالوں کو فدیہ یا نہ انداز اختیار کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک دن ہم اپنے ایک پاکستانی دوست کے ریٹورنٹ میں گئے۔ پتا چلا کہ وہاں کچھ امریکی ملازم ہیں۔ کچھ عرب ایک سیاہ فام لڑکی کیرن گرے اور ایک پاکستانی صاحب مسٹر شفیع۔ پاکستانی کی یہ شہرت تھی کہ وہ ریٹورنٹ کے عرب اسٹنٹ منیجر سے بھی سر کے بغیر بات نہیں کرتے تھے اور نہایت فدیہ یا نہ انداز اختیار کیے رکھتے تھے، کوئی مطالبہ کرتے تو کھکھیا کر یہاں تک کہ چھٹی کی درخواست بھی کرتے تو پہلے اپنی کسی فرضی بیماری کا تذکرہ کرتے اور پھر ایک دن کی چھٹی طلب کرتے۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ ایک دن کیرن گرے نے مجھ سے پوچھا۔ ”مسٹر آفاق! یہ پاکستانی ہم سب سے مختلف ہے، یہ اتنی خوشامد کیوں کرتا ہے۔ میں نے دوسرے پاکستانی لوگوں کو بھی اسی طرح التجائیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

ہمیں کوئی جواب نہیں سوجھا مگر پھر فوراً دماغ نے کام کیا اور ہم نے کہا۔ ”کیرن! دراصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ انگریزوں کے غلام رہے ہیں۔ ہماری ذہنیت ہی غلامانہ ہو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اس سے نجات ملے گی۔“ وہ کہنے لگی۔ ”آپ کو آزاد ہوئے تو 34 سال ہو گئے ہیں پھر بھی آپ لوگوں کی ذہنیت نہیں بدلی۔“ ہم لا جواب ہو کر کوئی عذر تلاش کر رہے تھے کہ اس نے کہا۔ ”میں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے، مسلمانوں نے تقریباً نو سو سال ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ غلامی کا آغاز 1057ء سے ہوا۔ 1947ء میں آپ لوگ آزاد ہو گئے میں حیران



راگ تان سین کی تخلیق ہیں۔ وہ شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں شمار ہوتے تھے۔ مشہور ہے کہ وہ دیپک راگ گا کر دیے جلاتے اور مہارگا کر بارش کے ذریعے انہیں بچھا دیا کرتے۔ اب بھی فن موسیقی کے طالب علم میاں تان سین کی قبر کے سر ہانے پیری کے درخت کا ایک پتا کھا کر یہ سمجھتے ہیں کہ راگوں کا سمندر ان کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے گا۔ اورنگزیب عالمگیر کے علاوہ دیگر مغل شہنشاہ موسیقاروں کی سرپرستی کیا کرتے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد ہندو راجوں اور مسلمان نوابوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اسی اثنا میں موسیقی کے کئی گھرانے وجود میں آ چکے تھے۔ جن میں زیادہ مشہور پٹیاں، شام چوراسی، کیرانہ، گوالیار، دہلی، آگرہ یا رگیلا، سچے پور، اترالی وغیرہ شامل ہیں۔ ان گھرانوں کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں، کوئی تان پر زیادہ دھیان دیتا ہے تو کوئی الفاظ کی ادائیگی کا خاص اہتمام کرتا ہے۔ نوابوں اور مہاراجوں کے دور میں کئی عظیم مسلم موسیقاروں نے جنم لیا۔ ماضی قریب کے بہترین گائیکوں میں ایک نام استاد فیاض خان کا ہے جنہیں آفتاب موسیقی کہا جاتا ہے۔ ان کا تعلق آگرہ گھرانے سے تھا۔ خاندانی پس منظر بہترین تربیت اور بے پناہ ذہنی استعداد نے انہیں اپنے دور کا عظیم ترین گائیک بنا دیا۔ ان کے نانا غلام عباس خان نے انہیں اپنے گھرانے کی گائیکی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے بعد دوسرے گھرانوں کے اساتذہ کے پاس بھیجا

ہوں کہ صرف 90 سال میں آپ کی زہنیت غلامانہ ہو گئی مگر نو سو سال کی حکمرانی کا اثر آپ میں کیوں باقی نہ رہا۔“

کیرن گرے کے اس سوال کا جواب نہ ہمیں اس وقت سوچا تھا نہ اب ہمارے پاس اس کا کوئی معقول جواب ہے۔ کسی صاحب کے پاس ہو تو بتائیں۔

☆.....☆

فن موسیقی میں مسلمانوں میں پہلا نام مشہور صوفی بزرگ حضرت امیر خسرو کا ہے جو حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید خاص تھے۔ آپ کو موسیقی کی تمام شاخوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس وقت کے سب سے بڑے ہندو موسیقار بانسنگ گوپال کو گائیکی کے مقابلے میں شکست دی۔ برصغیر کے فن موسیقی پر امیر خسرو کے بڑے احسانات ہیں۔ انہوں نے خیال، تراخی، نقش اور کئی دوسری اصناف موسیقی ایجاد کیں۔

قرون وسطیٰ میں حضرت امیر خسرو کے بعد دوسرا بڑا نام جو مسلمان موسیقاروں میں آتا ہے وہ نعت خان صداریگ المعروف میاں تان سین (1535ء سے 1592ء) کا ہے۔ میاں تان سین کو مشرقی کلاسیکل موسیقی کا عظیم ترین گائیک تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی راگ ایجاد کیے۔ میاں کی مہار میاں کی نوڈی اور دوسرے کئی

خان کا ہے جنہیں ”بابا“ کہا جاتا ہے۔ بنگال کے ایک معزز گھرانے میں جنم لینے والے علاؤ الدین کو موسیقی سیکھنے کے شوق نے گھر سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے گائیکی کے علاوہ سازوں کی موسیقی میں بھی بہت مہارت حاصل کی۔ والسٹن، پیانو، کلارنٹ، شہنائی کے علاوہ ایسے سازوں کی تعداد سو سے زائد ہے جنہیں بجانے میں بابا علاؤ الدین کو مہارت تھی۔ انہوں نے مسٹر رائٹ لوہو سے مغربی کلاسیکی موسیقی بھی سیکھی۔ تان سین گھرانے کے استاد

مظہر امر او بندو خان



وزیر خان نے علاؤ الدین خان کو چالیس سال تک سرود رباب، سرستھار کے علاوہ دوسرے ساز بجانے سکھائے اور دھریڈ کے ساتھ ساتھ موسیقی کی دیگر اصناف کا بھی ماہر بنادیا۔ بابا علاؤ الدین خان نے کئی راگ ایجاد کیے۔ ان میں وہ جملہ اوصاف موجود تھے جو تان سین گھرانے کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ ویسے انہوں نے مختلف گھرانوں کے پانچ سو سے زائد اساتذہ سے فن موسیقی پاریکیاں سیکھیں یوں انہیں اس پر عبور حاصل ہو گیا۔

کسی فرد کے گھرانے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کس استاد سے سب سے طویل عرصے تک تعلیم حاصل کی اور وہ اس کے انداز میں موجود خوبیوں کو کتنے انداز میں ادا کر سکتا ہے۔ یہ فرق نہایت واضح تھا اور

جس سے خان صاحب نے اکتساب فن کیا۔ 24 سال کی عمر میں استاد فیاض خان کو ایک محفل میں گانے کا موقع ملا جس میں پیالہ گھرانے کا مشہور گائیک میاں جان خان بھی موجود تھے۔ میاں جان خان نے نوجوان گلوکار کی رفتار منس دیکھ کر کہا ”اصل استاد تو تم ہو“ اس دور کے بڑے گلوکار کردار کے اعتبار سے بھی عظیم تھے۔ فن موسیقی پر استاد فیاض خان کی گرفت کا اندازہ ایک واقعے سے لگایا جاسکتا ہے جو استاد امر او بندو خان نے بیان کیا۔ ایک محفل میں خان صاحب نے تان چھیڑی تو ایک پنڈت جو پاس بیٹھے تھے بولے ”استاد صاحب! آپ نے غلط سُر لگایا ہے۔“ فیاض خان نے مسکرا کر پوچھا ”کیسے؟“ پنڈت نے کہا کہ شاستر میں اس طرح لکھا ہے۔ استاد نے پاس دھری شاستر سے کان لگا دیے۔ تھوڑی دیر بعد کہا ”پنڈت صاحب! یہ تو کچھ نہیں بولتی۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بولے گی۔ تھوڑی اسے کھول کر دیکھیے کہ اس میں لکھا کیا ہے؟“ استاد فیاض نے کہا ”اس میں جس طریقے سے لکھا ہے“ آپ اس طریقے سے گما کر دکھا دیجئے۔“ یہ سن کر ہندو پنڈت حیران رہ گیا اور اس کی بولتی بند ہو گئی۔ خان صاحب نے 1950ء میں وفات پائی۔

استاد بڑے غلام علی خان پیالہ گھرانے سے تعلق رکھنے والا بہت بڑا نام ہے۔ خان صاحب نیم نیم شخص تھے، خوراک پہلوانوں کے برابر تھی۔ بڑی بڑی سوچیں چلنے کا شاہانہ انداز۔ نہایت متاثر کن شخصیت کے مالک شخص کو دیکھ کر یہ ماننا مشکل ہوتا تھا کہ اس آدمی کی آواز نہایت ہی مدھر اور نکتہ دار ہے۔ وہ فن موسیقی کے تحقق اساتذہ میں سے تھے جن کی ایک ایک پہلو پر گہری نظر تھی۔ استاد صاحب کی گائی ہوئی ٹھمریاں مثلاً باد پیا کی آ کی کئے نہ بردہ کی رات پریم کے پھندے میں آ کر کھنکھاتی نظر یا کے بین وغیرہ ابھی تک سننے والوں میں مقبول ہیں اور ان کے ریکارڈ ہاتھوں ہاتھ بک جاتے تھے۔ استاد بڑے غلام علی خان کے چھوٹے بھائی استاد برکت علی خان بھی عظیم گائیکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کی آواز کی حلاوت بھی کبھی تو بڑے غلام علی خان سے بھی بڑھ جایا کرتی۔ باغوں میں پڑے جھیلے دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے اک ستم اور لاکھ ادا میں دغیرہ ایسے آئینے ہیں جنہوں نے استاد برکت علی خان کے نام پر ہمیشہ کے لیے یادگار بنادیا۔

موسیقی کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام استاد علاؤ الدین

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2015ء

132

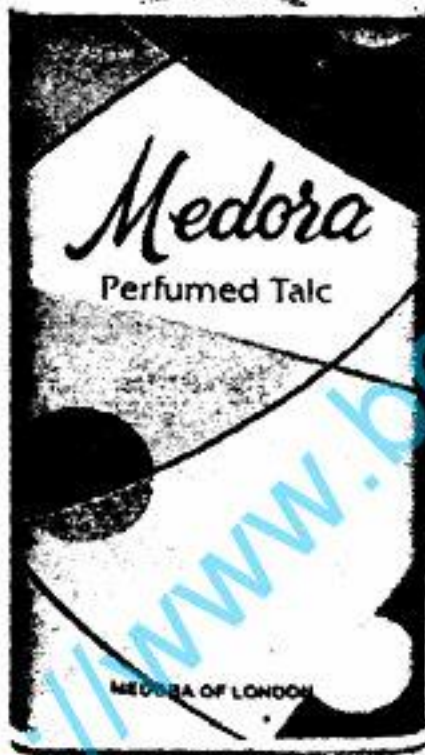
Medora

Perfumed Talc

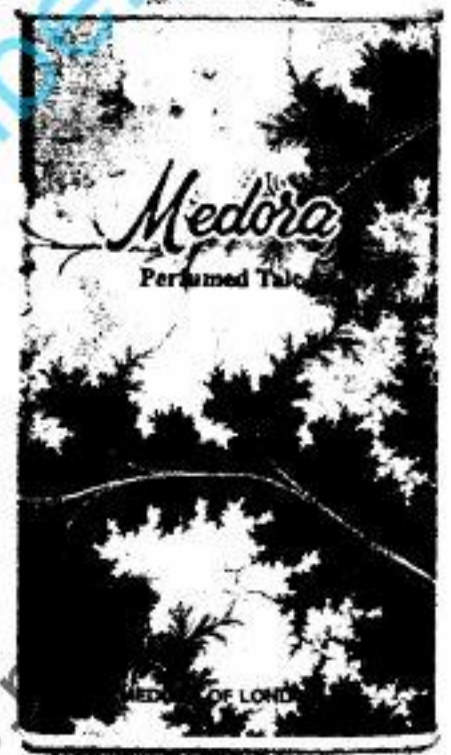
خوشبو جو دل کو پہنائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے

Joy

Cherish



میدورا ہر فیوڈاٹک
کی تازگی جنگاوی
خوشبو سے
ملہ آپ کو مہکتا فریش
احساس جو رہے لب بھر
آپ کہ ساتھ



8 مختلف و نفرب خوشبوؤں میں دستیاب ہے

Pleasure, Cherish, Joy, Season, Passion

Salute اور Dignity, Greetings

MEDORA OF LONDON

کی بنا پر گھرانوں کی حد بندیاں کی گئیں لیکن قدیم اساتذہ میں ایک دوسرے کا احترام لازم سمجھا جاتا تھا۔ استاد اللہ دیا خان کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جب ایک گائیک نے ان کے سامنے دوسرے کا مذاق اڑایا تو استاد صاحب نے اسے سختی سے ڈانٹا اور کہا ”ایسی بات مت کرو اور کسی کو بھی الزام نہ دو۔ ہر کسی کے گانے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔“

استاد اور گھرانے کی گائیکی کئی امور میں نہایت فائدہ مند بھی ہے کہ اس سے گائیک میں پختگی آتی ہے۔ یہ چیز موسیقی کے جدید اسکولوں میں سیکھنے والوں کے لیے نہایت مشکل ہے۔ ایک مرتبہ مشہور مغنیہ سدھیش وری ویوی نے کہا تھا ”کون سا اسکول استاد کا مقابل ہو سکتا ہے۔ میرے استاد نے مجھے نوڈی راگ کے 18 انداز سکھائے۔ کس اسکول میں فن اس گہرائی تک سکھایا جاتا ہے۔ یہ تو شوقیلیٹ حاصل کرنے کا دور ہے فن سیکھنے کا نہیں۔“

اساتذہ فن میں ایک بہت بڑا نام استاد امیر خان کا ہے جو جنوبی ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی آواز میں جادو کا سا اثر تھا۔ ایک مصنف کے بقول خان صاحب کا گایا ہوا میٹھ اور لالیت راگ انسان کو گرد و پیش کی دنیا سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ امیر خان نے باقاعدہ طور پر کسی بھی گھرانے کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی اس لیے ان کی گائیکی میں کئی گھرانوں کی خصوصیات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ اپنے انداز گائیکی کو ”اندور گھرانہ“ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ فن موسیقی کی تمام تر اصناف میں مہارت کے باوجود وہ عوامی اجتماعات میں ٹھمری نہیں گایا کرتے تھے کیونکہ وہ استاد بڑے غلام علی خان کو ٹھمری کا اپنے سے بہتر گائیک مانتے تھے۔ مشہور ہندو گائیک پنڈت گوکلاتھ ساؤجی نے ہوہو استاد امیر خان کا انداز اپنایا۔ ایک مرتبہ بھارتی ریڈیو پر پنڈت جی نے استاد امیر خان کی گائی ہوئی غزل گائی۔ دونوں کی آواز میں اس حد تک مشابہت ہے کہ پاکستان سے بہت لوگوں نے بھارتی ریڈیو کو خط لکھے کہ استاد امیر خان مرحوم کی غزل کسی دوسرے کے نام سے چلا دی گئی۔ پنڈت امر ناتھ کے مطابق موجودہ موسیقاروں میں سے 60 فی صد استاد امیر خان کے انداز سے متاثر ہیں۔ ان کا انتقال 1974ء میں ایک ٹریفک حادثے میں ہوا۔ مسلمان گائیکوں میں ایک اور نام استاد ولایت خان کا ہے۔ ان کا شجرہ نسب میاں تان سین سے ملتا ہے۔ انہیں موجودہ عہد کے عظیم ترین گلوکاروں میں سے ایک کہا

جاسکتا ہے۔ انہوں نے میوزک فینٹیول بمبئی میں پہلی پبلک پرفارمنس دی تو بمبئی کے ایک تھیٹر نے ان کا شور کھ دیا۔ تھیٹر میں لوگ بھر جانے کے بعد لاؤڈ اسپیکر لگائے گئے اور تھیٹر کے باہر 10 ہزار لوگوں نے استاد ولایت خان کو گاتے ہوئے سنا۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ملکہ برطانیہ نے ہنگامہ پلس میں مدعو کر کے ان کی گائیکی سنی۔ اپنے فن سے خلوص کا یہ عالم تھا کہ بھارتی حکومت نے انہیں 1964ء میں پدمشری اور 1968ء میں پدم بھوشن ایوارڈ دینے کا اعلان کیا جو بھارت کے سب سے بڑے اعزاز ہیں تو انہوں نے یہ ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ کمیٹی میں شامل افراد کی فی الہیت اتنی نہیں کہ وہ میرے فن کو پرکھ سکیں۔ استاد ولایت خان نے ستار نوازی کو ایک نیا انداز دیا اور ستار کے تار 7 سے کم کر کے 6 کر دیے اور اس پر بہتر بن پرفارمنس دی۔ 2004ء میں انہوں نے وفات پائی۔ فن گائیکی کے علاوہ مختلف سازوں کے بجانے میں بھی مسلمان فنکاروں نے اپنا آپ منوایا۔ استاد بسم اللہ خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے شہنائی کو کلاسیکی موسیقی کا حصہ بنادیا۔ وہ شہرت کو ناپسند کرتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ فنکار کو صرف سنا جانا چاہیے۔ وہ ایشیا اور یورپ کے کئی ممالک کا دورہ کر کے اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ موسیقی کے گھرانوں میں بعض بھائیوں کی جوڑیاں بہت مقبول ہوئیں جو مل کر گاتے اور شائقین سے اپنے فن کی داد وصول کرتے۔ استاد امانت علی خان اور فتح علی خان ایسی ہی ایک جوڑی تھی جن کا تعلق پٹیالہ گھرانے سے تھا۔ سلامت علی خان اور نزاکت علی خان بھی بہت مقبول ہیں جو شام چوراسی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیگر برادران بھی مل کر اپنے فن کا جادو جگاتے ہیں۔ یہ استاد ظہیر الدین خان اور فیاض الدین خان ہیں۔

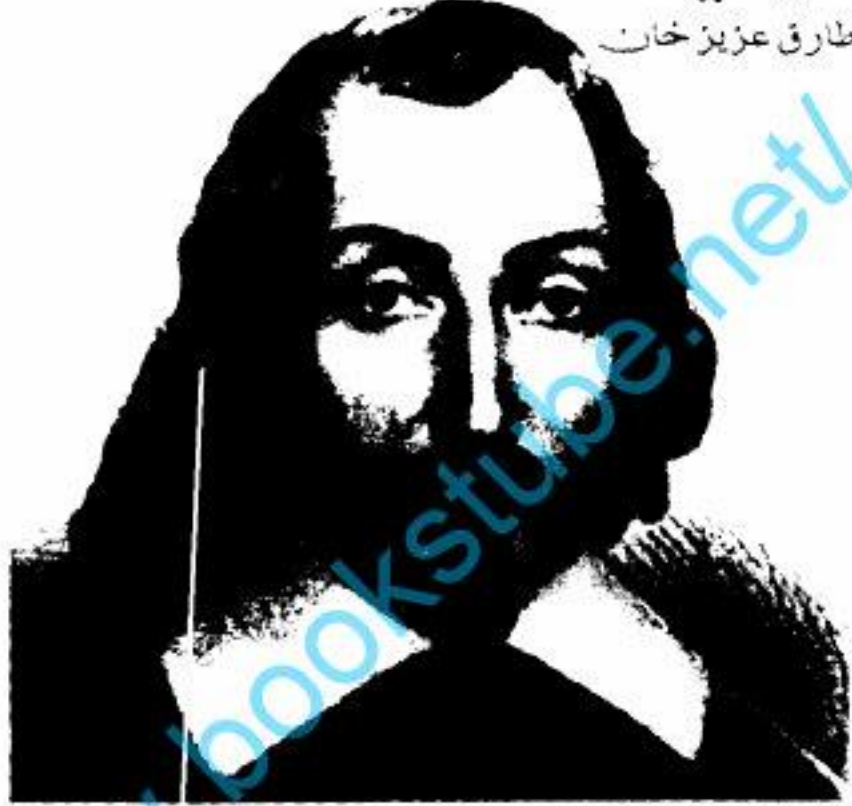
مسلمان خواتین گلوکاراؤں نے بھی موسیقی میں اپنا لو منوایا۔ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کو گزشتہ صدی کی سب سے بڑی گلوکارہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ فن کی باریکیوں سے پورا طرح آگاہ اور آگرہ گھرانے کے انداز میں اعلیٰ تر معیاری کی گائیکی پیش کرنے پر قادر تھیں۔ پھر ملکہ بکھارا اختر بی بی انبالے والی، بیگم اختر خواتین کا وہ نیکا جو کلاسیکل موسیقی میں منفرد مقام رکھتی ہیں اور ان کے ذہن کے بغیر اس فن کا تذکرہ مکمل نہیں ہوتا۔



نئی دنیا کی تلاش میں سینکڑوں جہاں گرد اپنی جان گنوا بیٹھے۔ صرف چند ایک مہم جو کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انہی خوش قسمت مہم جو میں ایک بڑا نام سیموئل ڈی چیمپ لین ہے۔ اس نے کس طرح کینیڈا کو دریافت کیا اسے جاننے کے لیے لکھا گیا ایک مختصر اہم مضمون۔

نئی دنیا

طارق عزیز خاں



نئی سرزمین تلاش کرنے والے مہم جو کا تذکرہ

دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ کینیڈا کا کل زمینی رقبہ 99 لاکھ 70 ہزار 6 سو 10 مربع کلومیٹر اور موجودہ (2011ء) آبادی 4 کروڑ کے قریب ہے۔ کینیڈا کے شمال میں بحیرہ منجمد شمالی پر مشتمل قطب شمالی کا علاقہ ہے جبکہ جنوب میں ریاست ہائے متحدہ امریکا، مشرق میں شمالی بحرالقیانوس، شمال مشرق میں خلیج ہینن، مغرب میں شمالی بحرالکابل اور شمال مغرب میں الاسکا واقع ہیں۔ کینیڈا کی سرزمین پر یورپین کے قدم سن 1000ء میں پہلے جب ناروے سے تعلق رکھنے والے بحری قذافی ایرکسن نے شمالی بحرالقیانوس کو پار کر کے نیوفاؤنڈلینڈ کے علاقے کو دریافت کیا۔ دریافتوں کے دور میں کینیڈا کی سرزمین تک رسائی کی پہلی بلاتدرکوش 1497ء میں ہوئی جب اطالوی نژاد برطانوی مہم جو بحالی کیوٹ نے مشرقی کینیڈا سے

سرزمین کینیڈا کی دریافت کے حوالے سے فرانسیسی جغرافیہ دان اور مہم جو، سیموئل ڈی چیمپ لین (Samuel de Champlain) کی مہمات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے 1608ء میں کیوبک کے علاقے میں نو فرانس (New France) کے نام سے پہلی فرنیچ نوآبادی سلطنت کی بنیاد رکھی جو اگلے 150 سال تک قائم رہی۔ وہ 1612ء سے اپنی وفات (1635ء) تک نیو فرانس کا پہلا وائسرے رہا۔ چیمپ لین کے اقدامات کے نتیجے میں امریکا اور کینیڈا کی سرحد پر واقع عظیم جھیلوں (Great Lakes) کے علاقے کا سروے ممکن ہوا۔

بڑا عظیم شمالی امریکا کا سب سے بڑا ملک کینیڈا رقبے کے لحاظ سے ریشین فیڈریشن (رقبہ 17,075,200) کے بعد

2015ء

135

ماہنامہ سرگزشت

میں سے وابستہ ہو کر بحراوقیانوس پار کرنے کا پہلا موقع ملا۔
 فرینکوئس کے چار بحری جہازوں نے فروری 1603ء کی شروعات میں شمالی فرانس سے مہم کا آغاز کیا۔ انہوں نے اگلے پانچ ہفتوں کے دوران شمالی بحراوقیانوس کو پار کر کے مشرقی کینیڈا میں نیوفاؤنڈ لینڈ اور جزیرہ نما نووا سکوشیا (Nova Scotia) کے درمیان واقع خلیج سینٹ لارنس (Gulf of St Lawrence) میں رسائی حاصل کی۔ وہ خلیج کو پار کر کے اس کے مغربی حصے میں واقع دریائے سینٹ لارنس کے چوڑے دہانے کے اندر داخل ہوئے۔ فرانسیسی بیڑے نے 15 مارچ کے دن دریائے سینٹ لارنس اور دریائے سیکوٹائے (Saguenay) کے سنگم پر واقع ٹھیک اس جگہ لنگر گرائے جہاں آج ٹاڈو ساک (Tadoussac) کی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔
 خشکی پر قدم رکھتے ہی مقامیوں کی ایک بھیڑ نے یورپین کو گھیر لیا۔ ان کے قد لمبے، رنگ سرخی مائل سفید اور جسم مضبوط تھے۔ انہوں نے سر پر ہندمی پٹی سے پرندوں کے پر اڑے ہوئے تھے اور جانوروں کی کھالوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ مشرقی کینیڈا میں آباد مونٹگنائس (Montagnais) قبائلی تھے۔ ان کے سردار بیگورائٹ (Begourat) نے فرانسیسیوں کو اپنی سرزمین پر خوش آمدید کہا اور ان سے سمور (Fur) کی تجارت پر آمدگی ظاہر کی۔
 جمپ لین نے فرینکوئس کو مقامی شکاریوں کے ساتھ لین دین میں مصروف دیکھ کر چھوٹی کشتیوں کے سہارے دریائے سینٹ لارنس کی سیاحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دریا کے شفاف اور ٹھہرے ہوئے پانی میں جنوب کی طرف مہم کا آغاز کیا۔ وہ خط استواء سے 46 ڈگری شمال کے خط پر دریائے سینٹ لارنس سے آکر ملنے والے ایک دریا کے دہانے پر پہنچا۔ جمپ لین اسے ری چیلی (Recheliu) کا نام دیا۔ اس نے سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ وہ خط استواء سے 45.35 ڈگری شمال کے خط پر دریائے سینٹ لارنس اور دریائے اوٹاوا (Ottawa) کے سنگم پر واقع مونتریاں کے موجودہ جزیرے تک پہنچا۔ یاد رہے کہ مونتریاں کے جزیرے کو جیکوئس کارنیر نے اکتوبر 1535ء کے دن دریافت کیا تھا۔ جہاں اس زمانہ میں شکاریوں کی ایک بستی آباد تھی۔ کارنیر نے جزیرے پر واقع پہاڑی نیلے کو ماؤنٹ رائل (Mont-Royal)

متصل نووا سکوشیا اور نیوفاؤنڈ لینڈ کو دریافت کیا۔ 16 ویں صدی کی دوسری دہائی میں فرانس بھی دریافتوں کی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ 1524ء میں فرانسیسی حکومت نے اطالوی نژاد مہم جو، گیووانی ڈاؤریاز کو شمال مغرب کی طرف سے چین تک رسائی کی مہم پر روانہ کیا۔ اس مہم کے نتیجے میں ورازانو نے امریکا کی مشرقی ساحلی پٹی کو دریافت کیا، تاہم وہ مزید شمال میں جانے کی بجائے یورپ واپس چلا آیا۔ 1534-36ء کے دوران فرانسیسی مہم جو، جیکوئس کارنیر (Jacques Cartier) نے شمالی بحراوقیانوس کو پار کر کے کینیڈا کی مرکزی سرزمین کو دریافت کیا اور اسے اس کا موجودہ نام دیا۔ کارنیر کی مہمات کے نتیجے میں فرانس کے بادشاہ فرانس اول (1494-1547) نے کینیڈا کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ فرانسیسی حکومت نے کینیڈا میں پہلی فرینچ کالونی کی بنیاد رکھنے کی منصوبہ بندی کی۔ تاہم اگلے کئی عشروں تک یہ منصوبہ بار آور نہ ہو سکا۔ 17 ویں صدی کے آغاز پر فرانسیسی مہم جو، سیسول جیمپ لین نے کارنیر کے قدموں کے نشان پر سفر کرتے ہوئے کینیڈا میں قدم رکھا۔ اس نے مشرقی کینیڈا کے علاقوں میں فرینچ خاندانوں کو آباد کرنے کے ایک جامع پروگرام کو شروع کیا جس کے نتیجے میں شمالی امریکا کی سرزمین پر "نیو فرانس" کے نام سے ایک نئے نوآبادیاتی دور کا آغاز ہوا۔

سیسول ڈی جیمپ لین 1567ء میں مغربی فرانس میں خلیج بسکے کے کنارے واقع قصبے برواچ (Brouage) میں پیدا ہوا۔ اس کے اباؤ اجداد پیشہ ور طاح تھے۔ اس کا بچپن اپنے باپ اور چچا کے ساتھ خلیج بسکے کی بندرگاہوں کے تجارتی سفر کرتے ہوئے گزرا۔ اس نے لڑکپن میں کشتی بڑھنے اور جہاز رانی کے آلات کے استعمال میں مہارت حاصل کی۔ 1597ء میں جیمپ لین ایک تجارتی بحری جہاز کا کپتان مقرر ہوا۔ اس نے 1598ء میں اپنے چچا کے بحری جہاز سنٹو لین (Saint Julien) میں جنوبی اسپین کی بندرگاہوں کا تجارتی سفر کیا۔ وہ 1601ء میں دارالحکومت ہیرس چلا آیا اور بادشاہ ہنری چہارم (1553-1610) کے دربار سے بطور جغرافیہ دان وابستہ ہو گیا۔ ہیرس میں قیام کے دوران جیمپ لین کی فرانسیسی مہم جو، جیکوئس کارنیر کی مہمات کے تحریری ریکارڈ تک رسائی ممکن ہوئی۔ اس نے ان مہمات سے متعلق مواد کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور فرانس کی حکومت کے لیے شمالی امریکا کے نقشے تیار کیے۔ اس دوران جیمپ لین کو فرانسیسی تاجر، فرینکوئس

(Spednik) سے لکھا ہے۔ یہ خلیج فنڈے میں سمائے جانے سے پہلے کینیڈا کے صوبے نیو برنس وک اور امریکی ریاست مینی کی سرحد کا کام دیتا ہے۔ دریا کا مین ٹیٹھے پانی کی چھوٹی بڑی جھیلوں سے انا ایک سربز علاقہ ہے۔ فرانسیسی ہم جوڈس کی آمد کے وقت یہاں ایل گون کوئن (Algonquian) زبان بولنے والے شکاری قبائل آباد تھے۔

جیمپ لین اور اس کے ساتھیوں نے موسم گرما کے دوران قرب و جوار کے علاقے کی سیاحت کی اور وہاں بس رہے مقامیوں سے جانوروں کی کھالوں کا لین دین کیا۔ انہوں نے سردیاں گزارنے کے لیے دریا کے کنارے لکڑی کے تین کمپن تیار کیے۔ موسم سرما کے عروج پر پورا علاقہ شدید دھند اور برفانی طوفانوں کی زد میں رہا۔ دریائے کروکس اور خلیج کا بیشتر حصہ برف سے ڈھک دیا گیا اور قرب و جوار کی سرزمین کئی کئی فٹ برف کی تہہ کے نیچے دب گئی۔ جان لیوا ٹھنڈ اور خوراک کی کمی کی وجہ سے فرانسیسیوں کے 79 میں سے 44 لوگ ہلاک ہو گئے۔ 1605ء کے موسم گرما کے دوران جیمپ لین نے خلیج مینی کے مغرب میں واقع نیو برنس ویک سمیت امریکی ریاست مینی، نیو ہیم شائر اور میساچوسٹس میں کیپ گڈ (Cape God) تک کے ساحلی علاقے کا نقشہ تیار کیا۔ اس نے نئے علاقے کو ”آکیڈیا“ (Acadia) کا نیا نام دیا اور اس کی تحریک پر تین درجن فرانسیسیوں نے ڈوگا ڈی مونٹس کو آکیڈیا کا پہلا گورنر منتخب کر لیا۔ انہوں نے اگلے دو سال خلیج مینی کے ساحلوں پر گزارے اور 1607ء کی گرمیوں کے دوران فرانس واپس پہنچ گئے۔ فرانسیسی بادشاہ ہنری چہارم نے جیمپ لین کی مہم کو سراہا۔ اس نے مشرقی کینیڈا اور شمال مشرقی امریکا پر مشتمل آکیڈیاک کی ملکیت کا دعویٰ اور وہاں پہلی فریج کالونی کی بنیاد رکھنے کے اقدامات شروع کر دیے۔

1608ء کے موسم بہار میں سیموئل جیمپ لین نے فرانسیسی حکومت کی سرپرستی اور ڈوگا ڈی مونٹس کے مالی تعاون سے کینیڈا تک رسائی کی تیسری مہم کا آغاز کیا۔ فرانسیسی بیرونی ملک شپ Don-de-Dieu (خدا کا تحفہ) اور Levrier (شکاری کتا) نام کے دو بڑے بحری جہازوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ 150 سے زیادہ افراد میں آباد کاری کے لیے چھ فرانسیسی خاندان بھی شامل تھے۔

دونوں بحری جہازوں نے بحر اوقیانوس پار کیا اور اپریل کے آخر میں خلیج سینٹ لارنس سے ہوتے ہوئے

نام دیا جو آگے چل کر مونٹریال سے تبدیل ہو گیا۔ جیمپ لین، مونٹریال کے جزیرے پر آباد مقامی انڈینز سے کھل مل گیا۔ اس نے مقامیوں کی بات چیت سے اندازہ لگایا کہ دریائے سینٹ لارنس وہاں سے 250 کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ٹیٹھے پانی کی ایک بڑی جھیل سے نکلتا ہے۔ مقامیوں نے انکشاف کیا کہ اس جھیل کے مغرب میں عظیم جھیلوں کا ایک سلسلہ واقع تھا۔ جیمپ لین نے خیال کیا کہ یہ جھیلیں اس براعظم کے مغرب میں واقع سمندر تک رسائی کا ذریعہ ہو سکتی تھیں۔ جیمپ لین نے مونٹریال سمیت قرب و جوار کے علاقے کا نقشہ تیار کیا۔ وہ عظیم جھیلوں کے علاقے تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا، تاہم اس کے ساتھیوں نے واپسی کا مطالبہ کیا۔ جیمپ لین نے فرینکوئس کی قیادت میں یورپ واپسی کا سفر شروع کیا اور ان کے بحری جہاز 20 ستمبر 1603ء کو شمالی فرانس کے ساحلوں پر پہنچ گئے۔

سیموئل جیمپ لین نے پیرس میں بادشاہ ہنری چہارم سے ملاقات کے دوران اپنے سفر کی روداد پر روشنی ڈالی۔ اس نے بادشاہ کی تحریک پر اپنی مہم سے متعلق سفرنامہ تحریر کیا، جس میں شمالی بحر اوقیانوس میں کینیڈا تک رسائی کے آسان بحری راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس نے وسائل سے بھرپور کینیڈا کی سرزمین خاص کر دریائے سینٹ لارنس کے زرخیز کناروں کو فرانسیسی آبادکاروں کے لیے ایک مثالی مقام قرار دیا۔ جیمپ لین کے ترغیب دلانے پر فرانسیسی مہم تاجروں نے بحر اوقیانوس کو پار کرنے کی مہمات ترتیب دیں۔

سیموئل جیمپ لین نے مارچ 1604ء میں فرانسیسی تاجر پیرے ڈوگا ڈی مونٹس (Pierre Dugua de Monts) کی قیادت میں دوسری بار کینیڈا کا سفر اختیار کیا۔ ان کے دو بحری جہاز مینی کے آغاز میں مشرقی کینیڈا سے متصل جزیرہ نما نووا اسکوشیا کے قریب پہنچے۔ انہوں نے کینیڈا کی مرکزی سرزمین تک رسائی کے لیے جزیرہ نما کے شمال میں واقع خلیج سینٹ لارنس کی بجائے جنوب میں واقع خلیج مینی (Gulf of Maine) کا انتخاب کیا۔ جیمپ لین کی راہنمائی میں دونوں بحری جہازوں نے خلیج مینی اور خلیج فنڈے (Gulf of Fundy) کے سنگم پر خط استواء سے 45 ڈگری شمال پر 367 ڈگری مغرب کے خط پر واقع دریائے سینٹ کروکس (St Croix River) کے دہانے کے قریب ٹکرا گئے۔ لگ بھگ 200 کلومیٹر لمبا دریائے سینٹ کروکس، امریکا اور نیڈا کی سرحد پر واقع جھیل پیڈ تک (Lake

دریائے سینٹ لارنس میں داخل ہوئے۔ جیمپ لین نے 3 جولائی 1608ء کے دن خط استواء سے 47.50 ڈگری شمال اور 71.13 ڈگری مغرب کے خط پر دریائے سینٹ لارنس کے کنارے کیوبک (Quebec) شہر کی بنیاد رکھی جسے موجودہ کینیڈا کی حدود میں قائم ہونے والی پہلی یورپین کالونی کا اعزاز حاصل ہے۔ جیمپ لین نے کینیڈا کے علاقوں کو "نیو فرانس" کا نیا نام دیا۔

مئی 1610ء میں ہنری چہارم کے قتل کے بعد جیمپ لین کو فرانس واپس آنا پڑا۔ اس نے نو سالہ بادشاہ Louis XIII کی سرپرست ملکہ میری ڈی میڈیسی (Marie de Medici) سے ملاقات کی۔ اس نے ملکہ کو نیو فرانس میں فرانسیسیوں کی آباد کاری سے متعلق اعتماد میں لیا۔ میڈیسی نے جیمپ لین کو نیو فرانس کا پہلا وائسرائے مقرر کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کینیڈا تک رسائی کے لیے مزید مہمات روانہ کرنے کا اعلان کیا۔

جیمپ لین نے 27 دسمبر 1610ء کو پیرس میں ایک دولت مند خاتون سے شادی کی۔ وہ اپریل 1611ء میں نئے وسائل کے ساتھ واپس کینیڈا پہنچا۔ اس نے 1612ء میں باقاعدہ طور پر نیو فرانس کے پہلے وائسرائے کا حلف اٹھایا۔ جیمپ لین کی زندگی کے اگلے 23 سال مشرقی کینیڈا پر فرانس کے قبضے کو مستحکم بنانے کے لیے ایک طویل جدوجہد سے عبارت ہیں۔ اس نے اس قلیل عرصے میں وسائل جمع کرنے لیے فرانس اور کینیڈا کے درمیان ایک درجن سے زیادہ بار بحراوقیانوس کو پار کیا۔ اس نے دریائے سینٹ لارنس کے کنارے فوجی قلعے تعمیر کروائے اور نیو فاؤنڈ لینڈ، نیو برنس ویک اور کیوبک کے علاقوں میں آباد مقامی انڈینز قبائل کو فرانسیسی بادشاہ کے تابع کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا۔ جیمپ لین نے مقامی انڈینز کو فرانسیسی فوج میں بھرتی کرنے کا پروگرام شروع کیا اور ان میں یورپین طرز معاشرت اپنانے کے آداب سکھائے۔ اس نیکو بک اور انٹاریو کی حدود میں عیسائی مشنریوں کے وفد روانہ کیے۔ اس کی ایک پر عظیم جھیلوں کے علاقے میں متحدہ دریافتیں ممکن ہوئیں جن میں جھیل ہورن (Lake Huron)، جھیل اوٹاوا (Lake Ontario)، جھیل سپیریئر (Lake Superior)، جھیل مشی گن (Lake Michigan)، جھیل ایری (Lake Erie) اور جھیل جیمپ لین نمایاں ہیں۔

جیمپ لین 1633ء میں فرانس کے آخری دورے

کے بعد کینیڈا واپس پہنچا۔ وہ 1634ء میں کیوبک شہر میں مقیم تھا اور نیو فرانس کے نام سے لگائے اپنے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ رہا تھا۔ اس نے 1635ء کے موسم بہار میں عیسائی مشنریوں کے ایک وفد کو دریائے سینٹ لارنس میں مونٹریال کے جزیرے پر روانہ کیا۔ وہ جزیرے پر نیا شہر بنانے آرزو مند تھا، تاہم جیمپ لین کی یہ خواہش اس کی زندگی میں پوری نہ ہو سکی اور 25 دسمبر 1635ء کو اس کا کیوبک میں انتقال ہو گیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ جیمپ لین کی وفات کے بعد 1640ء میں چالیس فرانسیسی آبادکاروں نے مونٹریال کے جزیرے پر پہلی فرنج کالونی کی بنیاد رکھی اور مقامی لوگوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی۔ یہ جیمپ لین کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج 45 لاکھ کی آبادی مشتمل مونٹریال، کینیڈا کا سب سے بڑا اور پیرس کے بعد فرنج زبان بولنے والا دنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔

ایک اندازے کے مطابق سیموئل جیمپ لین نے 1603ء سے 1612ء کے دوران فرانس سے کینیڈا تک رسائی کی تین نمایاں مہمات کے دوران مجموعی طور پر 50 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اس نے مشرقی کینیڈا اور شمال مشرقی امریکا کے لگ بھگ 15 لاکھ مربع کلومیٹر علاقے کو دریافت کیا۔ جیمپ لین نے 1608ء میں نیو فرانس کی نوآبادی سلطنت قائم کی جو 1763ء تک قائم رہی۔ 1750ء کی دہائی میں اپنے دور عروج پر یہ سلطنت کینیڈا اور امریکا کے 60 لاکھ مربع کلومیٹر کے قریب رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں عظیم جھیلوں سمیت دریائے سینٹ لارنس اور دریائے سینی کے بیسن کا پورا علاقہ نیو فرانس کی سلطنت کا حصہ رہا۔ 18 ویں صدی کے آخر میں برطانیہ نے کینیڈا کو فتح کر کے لیے مہمات ترتیب دیں۔ ان مہمات کے نتیجے میں فرانسیسی عملداری کیوبک تک محدود ہو گئی جبکہ کینیڈا کے 90 فی صد کے قریب علاقے پر برطانیہ کا کنٹرول قائم ہو گیا۔ 4 جولائی 1776ء کو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے اعلان آزادی کے بعد کینیڈا کے عوام نے بھی غیر ملکی قبضے کے خلاف آزادی شروع کر دی۔ کینیڈا کی آزادی کا یہ سفر اگلے سو تک جاری رہا، یہاں تک کہ یکم جولائی 1867ء کو کینیڈا برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ جس کے بعد انھوں نے ما- میں فرانس بھی کینیڈا کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے کیوبک اور ملحقہ علاقوں کی ملکیت سے دستبردار ہو گیا۔

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئر لائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئر لائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہہ رہے ہیں۔ طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

بازوق قارئین کے لیے پوشیدہ خاص



ہے۔ "انکار کی گنجائش نہ تھی نوکری خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ میں ان کے ساتھ اپنے دفتر لوٹ آیا۔ ابتدائی کام شروع کرنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ اس لیے کہ جہاز خریدنے کے لیے جو بنیادی معلومات تھیں وہ تک ان کے پاس نہیں تھیں۔ طے پایا کہ جیسے ہی مجھے کچھ فرصت ملے گی میں شام جا کر ان کے ساتھ یہ کام مکمل کروں گا۔ اس دوران میں وہ ان تمام معلومات کو اکٹھا کریں گے جن کی مجھے ضرورت ہے۔ یہ میرا یمن کا پہلا اور آخری سفر تھا۔

عمامہ بی نوعیت کا شاید ایک ہی شہر ہے۔ جہاں ہر چیز مختصر پیمانے پر تھی۔ سوائے نئی پارلیمنٹ بلڈنگ کے۔ لوگ چھوٹے، دکانیں چھوٹی، مکان چھوٹے مگر بلند۔ مکان یہاں چھوٹے سے پلاٹ پر بنائے گئے تھے۔ زیادہ تر میں ایک منزل پر ایک ہی کمرہ بعض میں دو۔ ہر عمارت

© 2015

سنا ہے ایک زمانے میں نجران کا علاقہ جو اب سعودی عرب میں ہے، یمن کا حصہ ہوتا تھا۔ یمن پر سعودی عرب کا ایک طرح سے کنٹرول تھا۔

یمن ایئر لائنز کے B-737 جہاز بھی سعودی عرب نے ہی دلوائے تھے اور اب انجن کے اس کنٹریکٹ کی باری کی۔ میں نے کنٹریکٹ کا تجزیہ کر کے رپورٹ چھٹی سے پہلے عدنان کو بھجوادی۔ آج کا قصہ میری حد تک ختم ہو چکا تھا۔ JT8D انجن کی سہ ماہی مینٹنگ کے بعد میں مانٹریال سے واپس آ چکا تھا کوئی تین ہفتہ قبل۔

عدنان کے دفتر سے بلاوا آیا۔ وہاں پہنچا تو ایک صاحب سے تعارف ہوا۔ "یہ یمینہ کے ٹیکنیکل کے سربراہ ہیں۔ یمینہ کو ایک A300 جہاز خریدنا ہے۔ ان صاحب کے ساتھ اس کے مواصفات پر تم کو کام کرنا

ماہنامہ مسرگزشٹ

139

یہ مرحلہ بھی خیریت سے گزر گیا۔ اب میں آزاد تھا۔
یمن کی بیڑی پاؤں میں نہ تھی۔

RB-211 انجن کا کنٹریکٹ BA کے ساتھ ختم

ہو چکا تھا۔ نیا کنٹریکٹ Qantas کے ساتھ طے پایا۔
اس وقت سعودیہ کے پاس سو سے زیادہ RB-211 انجن
تھے۔ دس انجن کا کنٹریکٹ بھی ایک بڑا کنٹریکٹ ہوتا ہے۔
RB-211 انجن کا کنٹریکٹ بہت ہی بڑا کنٹریکٹ تھا۔
Qantas نے اپنے پاور پلانٹ کے منیجر مسٹروس بار کا کو
مستقل طور پر جدہ میں تعینات کر دیا تھا تاکہ Qantas
بہترین طور پر اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکے۔ Qantas
کے لیے سب سے بڑا منفی مسئلہ سڈنی اور جدہ کے درمیان کا
فاصلہ تھا۔ روس کو یقینی بنانا تھا کہ اس مسئلے کے باوجود سعودیہ
کو بروقت انجن یا اس کے پرزہ جات لانے لے جانے میں
کوئی کوتاہی نہ ہو ورنہ یہ گاڑی زیادہ دور نہ چل سکتی تھی۔
روس ایک قابل انجینئر اور منیجر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک
اچھے انسان بھی تھے۔ شریف النفس، دھیمی طبیعت، ہونٹوں
پر ہر وقت مسکراہٹ۔

سڈنی کی پہلی کارکردگی کی سہ ماہی میٹنگ میں کرٹ
نے شرکت کی تھی۔ دوسری میٹنگ میں مجھے جانا تھا۔ میں
سڈنی پہلی دفعہ جا رہا تھا۔ میں نے میٹنگ سے متصل ہفتہ وار
چھٹی کے ساتھ تین دن حریذ چھٹی لے لی۔ تاکہ راستے میں
دو دن تھائی لینڈ بھی رک سکوں۔ میرے ساتھ انجن شاپ
کے زین الدین کو بھی جانا تھا مگر ان کی فلائٹ الگ دن تھی۔
ہم دونوں کو مقررہ دن سڈنی میں ہونک میں ملنا تھا۔ بینکا کہ
میں میرا قیام نہ تھا۔ مجھے پھوکیٹ جانا تھا پھر وہاں سے جیمز
بونڈ آئی لینڈ۔ وقت کم تھا۔

بالی کے بعد پھوکیٹ میرا پسندیدہ جزیرہ تھا جہاں میں
چھٹیاں گزارنے جاتا تھا۔ بے حد خوب صورت جگہ لوگ
بہت ملتے۔

پھوکیٹ پہنچا تو سفر کی ٹکان تھی۔ کھانا کھا کر سو
باہر جانے کا موقع نہ ملا۔ دوسرے دن صبح جیمز بونڈ آ
لینڈ جانا تھا۔

راستے کا پانی بہت اٹھلا تھا۔ بعض جگہ تو پانی کی
کمی تھی کہ کشتی کو چوبی بجائے بانس سے کھینچنا پڑتا تھا۔
کارمنزل مقصود پر پہنچ گئے۔

اس جزیرے کا نام پہلے کچھ اور ہوتا تھا مگر یہاں
کارمنزل کی ایک فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی جس کے بعد سے

تین چار یا پانچ منزل۔ ایک منزل پر ملاقات کا کمراد دوسری پر
کھانے پکانے اور کھانے کا اہتمام اس کے اوپر خواب گاہ
وغیرہ وغیرہ۔

زیادہ تر عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ پتھر مقامی طور
پر دستیاب تھے۔ اور کئی رنگوں میں تھے جو قدرتی تھے ان پر رنگ
دروغ کی ضرورت نہ تھی۔ ان پتھروں کا رنگ ان دھاتوں کا
مرہون منت ہوتا ہے جو اس میں شامل ہوتی ہیں۔ یمن کا پتھر
خانہ کعبہ میں بھی بہت استعمال ہوا ہے۔

کام دو تین دن میں ختم ہو چکا تھا ممکنہ مواصفات تیار ہو
چکے تھے۔ میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ یمنیہ نے مجھے تازہ گھمانے
کی پیشکش کی جو مجھے منظور تھی۔ میں اور میرے ساتھی یمنیہ کے
دو افسروں اور ڈرائیور کے ساتھ تازہ کے لیے روانہ ہو گئے۔
تازہ پہاڑی علاقہ ہے۔ بہت نر فضا۔ سعودی عرب کے
علاقے بحر ان سے متصل۔

راستے میں ڈرائیور نے کہا۔ ”اگر آپ لوگ اجازت
دیں تو ہم کات کے بازار سے ہوتے ہوئے چلیں بارہ بجتے
والے ہیں۔ ایک دو گھنٹے بعد یہ بازار بند ہو جائے گا۔ معلوم
کرنے پر پتا چلا کہ کات ایک شہر کا پتہ ہوتا ہے جس میں خمار یا
ہلکا نشہ ہوتا ہے۔ یہ یمن کی تہذیب کا جز لازم ہے۔ خاص
خاص جگہوں پر اس کے باقاعدہ بازار لگتے ہیں جہاں کات کی
کاشت کرنے والے اس کو لاکر بیچتے ہیں۔ یہ بازار دس بجے
صبح سے لے کر تقریباً دو بجے تک چلتے ہیں۔“

بازار میں پہنچ کر دیکھا تو کات کے پتے کچھ نیم کے
پتوں کی طرح دکھائی دیے۔ جب لوگ اپنی ضرورت کے
مطابق کات خرید لیتے ہیں تو پھر کات کی محفل جمتی ہے۔ جس
میں کات کی کوئل پتوں کو منہ میں جمع کر کے اس کا رس حلق
سے اتارتے ہیں جس سے ان کو سرور ملتا ہے۔

☆.....☆

ہم ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ ڈرائیور نے کات کا گھٹھا اٹھایا۔
دونوں افسروں نے ہم سے دو گھنٹے بعد ملنے کا وعدہ کیا اور کات
کی محفل جمانے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

مجھے یمنیہ کے کنٹریکٹ منیجر کو کنٹریکٹ کے اسرار و رموز
سے شناسائی کروانی تھی۔ مجھے شرعی کے دفتر کا دس بارہ سال
پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب L-1011 کے کنٹریکٹ کی میری
رپورٹ دیکھ کر شرعی کا نظام صوتی کلام کا متحمل نہ رہا تھا۔
انہوں نے ہاتھ کے اشاروں سے مجھے اپنے دفتر سے دفع ہو
جانے کا عندیہ مرحمت فرمایا تھا۔

ماہنامہ سرگزشت

کا نام جیمز بوٹل آئی لینڈ پڑ گیا۔ آئی لینڈ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اتنا خاص نہ تھا جتنا اس کا شہرہ تھا۔ دو پہر کو وہی جی۔ کھانا نور میں شامل تھا۔ کھانے کے لیے راستے میں ایک جگہ رکنا تھا۔ یہ جگہ پہاڑی کے دامن پر بنائی ہوئی ایک چھیروں کی بستی تھی۔ اونچے اونچے بانسوں پر لکڑی کے بڑے بڑے تختے بچھا کر یہ بستی بنائی گئی تھی۔ تمام گھر لکڑی کے بنے ہوئے تھے سوائے ایک عمارت کے۔ یہ عمارت ایک مسجد تھی۔ بستی کے رہنے والے مسلمان تھے اور اسی مسجد میں عبادت کیا کرتے تھے۔ میں نے اپنے گائیڈ سے آدھا گھنٹا مسجد میں گزارنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا جلدی آ جانا کھانا کسی کا انتظار نہیں کرے گا۔ تم کو ایسا سی فوڈ پورے تھائی لینڈ میں نہیں ملے گا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا اور مسجد کی طرف چل پڑا۔

مسجد کے مؤذن صاحب مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان کو پاکستان کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہ تھیں بس یہ معلوم تھا کہ یہ ایک بڑا اسلامی ملک ہے۔ انہوں نے اپنی بیوی اور بیٹی سے بھی ملوایا۔ زیادہ وقت نہ تھا میں کھانے کی جگہ واپس آ گیا۔ کھانا ایک لمبے اور پتلے کمرے میں لمبی لمبی تین میزوں پر سجا ہوا تھا۔ ان میزوں پر جس جس قسم کا سی فوڈ آپ کے ذہن میں آ سکتا تھا موجود تھا۔ پھلی، جھینگے، اسکوئڈ، کیکڑے، گھونگے، سپیاں اور بہت کچھ۔ گائیڈ کا کہنا صحیح تھا کہ اتنی انواع میں اور اس وافر تعداد میں سی فوڈ پورے تھائی لینڈ میں ملنا مشکل تھا حالانکہ بینکاک میں بھی بہت اعلیٰ سی فوڈ ریسٹورنٹ ہیں۔

کھانا کھا کر واپس پھوکیٹ۔ شام کی فلائٹ سے بینکاک۔ پھر سڈنی۔ سڈنی میں میٹنگ۔ دو دن پہلے پہنچا تھا تا کہ میں سڈنی شہر اور اس کے اڑوں پرکس میں گھوم سکوں لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ہوٹل پہنچا تو صبح بخار ہو چکا تھا۔ اگلے دن دو پہر کو طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ میرے ساتھی زین ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ مجھے فون کیا۔ ”سڈنی میں کیا کیا دیکھ لیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ابھی تو صرف ہوٹل کا کمر اور باتھ روم دیکھا ہے۔ جب سے آیا ہوں بخار نے جکڑ رکھا ہے۔“

”اگر اب بہتر ہو تو بوٹل آئی لینڈ چلتے ہیں۔“ بوٹل آئی لینڈ کا مشہور بیچ ہے۔

”ابھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دو گھنٹے بعد۔“

بچ پر تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد میں اور زین شہر گھومنے نکل گئے۔ سڈنی میں مجھے محسوس ہوا کہ یہاں پر انگریزوں کی تہذیب کا کافی حد تک اثر موجود ہے۔ گوکہ آسٹریلیا، برطانیہ کی کالونی تھا لیکن پہلا یورپ کا باشندہ جس نے آسٹریلیا میں قدم رکھا اس کا نام ولیم جانسزون تھا جس کا تعلق نیدر لینڈ سے تھا۔ یہ 1606ء میں آسٹریلیا گئے تھے۔ برطانیہ کے جیمز کک بہت بعد میں 1770ء میں بوٹلی بے پر اترے۔ بوٹلی بے آج کے سڈنی کا پرانا نام ہے۔ 1788ء میں انگلستان نے بوٹلی بے کو باقاعدہ اپنی کالونی بنا لیا۔ یہاں پر انگلستان کے معزول مجرموں کو سزا کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ آج کے اکثر گورے آسٹریلین انہی مجرموں کی اولادیں ہیں۔ بعد میں بہت سے لوگ آسٹریلیا آ کر آباد ہو گئے۔ یہاں تقریباً دنیا کے دو سو ملکوں سے آ کر لوگ آباد ہوئے ہیں۔ آسٹریلیا کی آبادی تقریباً کراچی کی آبادی کے برابر ہے۔ آسٹریلیا جریزہ ہے۔ زیادہ تر آبادی جریزہ کے چاروں طرف ساحلوں پر ہے۔ جریزہ کا اندرونی حصہ بہت کم آباد ہے جہاں زیادہ تر ایبوریجنس لوگ رہتے ہیں جو پہلے نیم وحشیوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ پچاس ساٹھ ہزار سال پہلے انڈونیشیا سے آ کر بوٹلی بے وغیرہ کے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کا رنگ بہت کالا اور ٹاک بے تحاشا پھل ہوئی ہوتی ہے۔

☆.....☆

Qantas کے ساتھ میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔

جن لوگوں نے اس تحریر کو یہاں تک پڑھنے کی ہمت کی ہے ان کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میٹنگ کا اہم ترین جز چائے کا دور ہوتا ہے۔ جب یہ اہم کام سرانجام پا چکا تو انجن کا کام زبردست آیا۔ اس کی تفصیل نیند کی گولیوں کا کام دے گی۔ اس سے اجتناب سب کے حق میں بہتر ہو گا۔ میٹنگ کے دوران کا اہم جز تو چائے ہے مگر میٹنگ کے بعد اہم ترین موضوع رات کے کھانے کا ہوتا ہے۔ فرانس میں کسی کسی دن ہم لوگوں کو چائے اور کھانے کے درمیان کام کا بھی موازنہ مل جاتا تھا لیکن سڈنی تو لوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ سڈنی میں کام زیادہ اور پیٹ پوجا کم۔

رات کا کھانا سڈنی بار میں ایک کشتی میں تھا۔ مقررہ وقت پر لوگ اس کشتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کشتی ساحل پہنچتی اور اگلے تین گھنٹے سڈنی بار کے گرد چکر لگاتی۔ اس کشتی میں کھانے کے کمرے اس

نگاہ سے خطرناک ہو سکتی تھی خاص طور سے پرانے جہازوں کے لیے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے بوننگ نے ایک مرمت (موڈی فیکشن) تیار کیا جو سیکشن 41 موڈی فیکشن کہلایا۔ یہ بڑا کام تھا کئی ہزار گھنٹے کا۔ سودیہ کو بھی اپنے پہلی کھپ کے B-747 پر یہ کام کروانا تھا۔ اس کے کرنے کے لیے خاص مہارت کی ضرورت تھی۔ جس کمپنی سے یہ کروایا جائے اس کی استعداد، قابلیت، مہارت اور تجربے کا جانچنا ضروری تھا۔ سودیہ کی ٹیم جو ان کمپنیوں کا جائزہ لینے اور معائنہ کرنے گئی اس کی سربراہی میرے ذمے تھی۔

آسٹریلیا میں ایک کمپنی Asta کے نام سے تھی ان کا بیگز بھی دیکھنا تھا۔ یہ کمپنی پہلے آسٹریلوی حکومت کے پاس تھی پھر اس کی نج کاری کے بعد اب یہ Asta کے نام سے کام کر رہی تھی بعد میں اس کو روکول نے خرید لیا۔ اب یہ بوننگ کی ملکیت ہے۔ Asta کا دفتر اور بیگز ملبورن میں تھے۔ ہم ملبورن، بینکا ک سے گئے تھے۔ راتین راتوں کے علاوہ تھائی لینڈ جن چیزوں کے لیے مشہور ہے ان میں مگر چھ اور سانپ کی کھال سے بنی ہوئی چیزیں، تھائی سلک اور جواہرات خاص طور سے شامل ہیں۔

میں نے مگر چھ کو تو کبھی تکلیف نہیں دی لیکن ایک دفعہ سانپ کی کھال کا بنا ہوا جوتوں کا جوڑا ضرور خریدا تھا۔ ان جوتوں کے علاوہ میں تھائی سلک بھی خرید چکا تھا مگر اس دفعہ ماں کی فرمائش پر مجھے تھائی سلک ایک بار اور خریدا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک کم قیمت انگوٹھی بھی۔ تھائی سلک لینے میں تھامسن سلک کی دکان پہنچ گیا۔ یہ دکان جم تھامسن کی یادگار ہے۔ تھائی سلک کا ذکر جم تھامسن کے ذکر کے بغیر ادھر ہے۔ جم تھامسن کی کہانی غیر معمولی اور دلچسپ ہے۔ ان ایک طرح سے تھائی سلک کی صنعت کا بانی اور محافظ کہا جاسکتا ہے۔ جم امریکی باشندے تھے ابتدائی طور پر انہوں نے بحیثیت آرکیٹیکٹ کام کیا پھر دوسری جنگ عظیم کے دوران OSS میں شامل ہو گئے۔ OSS کو بعد میں تو ذکر IA کو تشکیل کیا گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جم تھائی لینڈ آئے جہاں انہوں نے OSS کا آفس قائم کیا۔ 1946ء میں جم نے آرمی کو خیر باد کہا اور 1948ء میں تھائی لینڈ انحطاط پذیر سلک کی کالج انڈسٹری کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور محنت وقف کر دیا۔ تھائی سلک کمپنی اس کمپنی کے بنائے ہوئے تھائی سلک کے ڈیزائن

طرح بنائے گئے تھے کہ ہر طرف شیشے لگے ہوئے تھے۔ لوگ کھانا بھی کھاتے جاتے اور ہارپر کے منظر سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ سڈنی کا مشہور و معروف آپرہاؤس بھی سڈنی ہارپر پر ہے۔ اس کشتی کے بادبانوں جیسا ڈیزائن اپنی نظیر آپ ہے۔ بلاشبہ بے نظیر۔ اس کا ڈیزائن ڈنمارک کے آرکیٹیکٹ یورن اتران کا بنایا ہوا ہے۔ یہ ایک انعام یافتہ ڈیزائن تھا جو یورن نے سخت بین الاقوامی مقابلے کے بعد 1957ء میں جیتا تھا۔ رات کے وقت سڈنی آپرہاؤس کا پل ہوتا ہے۔ سڈنی ہارپر میں دوسری قابل دید چیز یہاں کا پل ہے جو سڈنی ہارپر برج کہلاتا ہے۔ یہ ایک محراب کی شکل کا اسٹیل کا بنا ہوا پل ہے۔ اس پر سے ٹرین، گاڑیاں، سائیکلیں اور پیدل چلنے والے سب گزرتے ہیں۔ یہ پل سڈنی کے کاروباری مرکز کو شمالی سڈنی سے ملاتا ہے۔ یہ دنیا کا دوسرا سب سے چوڑا پل ہے جو اتنا لمبا ہے۔ دنیا کا سب سے چوڑا لمبا پل کینیڈا کے شہر وینکوور کے پاس ہے جس کا نام پورٹ لین برج ہے۔

اس مجمع میں Qantas کے تمام افسران اعلیٰ مع اپنی بیگمات کے موجود تھے۔ روس بارکلا بھی جدہ سے ہمارے ساتھ آئے تھے ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ بعض جوڑے ایسے ہوتے ہیں جن میں میاں بیوی دونوں متاثر کن اور دل آویز شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ روس اور ان کی بیگم کا شمار بھی ان جوڑوں میں ہوتا ہے۔ وقت بہت اچھا گزرا۔ کھانے سے زیادہ ماحول اچھا تھا۔ کل میٹنگ کا دوسرا اور آخری دن تھا۔

یہ میرا آسٹریلیا کا پہلا چکر تھا لیکن آخری نہ تھا۔ چونکہ میری دلچسپی کی چھٹی بخار منانے میں نکل گئی تھی۔ روس (Ross) نے وعدہ کیا کہ وہ اس زیادتی کا مداوا کریں گے۔ میری اگلی سیڑھی مجھے آسٹریلیا آنا ہوگا۔ ٹکٹ کی ذمہ داری Qantas کی ہوگی۔ اس ٹکٹ کا فائدہ نہ اٹھانا بھی زیادتی ہوتی۔ میری اگلی سیڑھی سڈنی میں گزری۔ یہ بھی آسٹریلیا کا آخری چکر ثابت ہوا چند ماہ بعد میں پھر آسٹریلیا میں تھا مگر اس بار سڈنی نہیں بلکہ ملبورن۔

B-747 کی فیوز لاج (جہاز کا دھڑ) سیکشن میں بنا ہوا ہے۔ کاک پٹ جس سیکشن میں ہے وہ سیکشن 41 کہلاتا ہے۔ پچھلے چند سال کے دوران مختلف ائر لائنوں کے سیکشن 41 کے معائنے کے دوران اس میں کریک اور دوسرے نقص پائے گئے تھے۔ یہ صورت حال جہاز کی سیفٹی کے نکتہ

چیونکہ تھا۔ دہلی تھی۔ لہذا قہر، شکل اوسط مگر مسکراہٹ دل میں اتر جانے والی۔ ”میں آٹھ بجے آپ کو اسی جگہ ملوں گی۔“ ماریانہ نے کہا۔
 ”میں اس کو کھول لوں۔“
 ”کیوں نہیں۔ یہ کھولنے کے ہی لیے پیک کیا گیا ہے۔“

قلم پا کر ماریانہ کی آنکھوں میں بچوں جیسی خوشی کی چمک تھی۔ ٹھکانا آچکا تھا۔ اس میں کئی طرح کے گوشت کے پتلے پتلے کئے ہوئے پارچے تھے۔ کچھ سبزیاں، چاول۔ کل صبح Qantas کی پرواز سے ملبورن جانا تھا۔ انگلی میری جیب میں تھی۔ اس کو ہونٹ میں چھوڑنا مناسب نہ تھا۔

ملبورن انٹرپورٹ پر فلائٹ رات میں پہنچی۔ Asia نے ہونٹ کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم سیدھے ہونٹ چلے گئے۔ نو دس گھنٹے کی پرواز کے بعد صرف ایک چیز سوچتی ہے بستر، رات سونے لینا تو صبح کی خبر لی۔

صبح نو بجے کے قریب Asta کے ڈائریکٹر مارکیننگ مسٹر والٹر ہونٹ کی لابی میں موجود تھے مع اپنی گاڑی کے۔ ان کی گاڑی میں سوار ہو کر ہم Asta کے لیے روانہ ہو گئے۔ Asta کا دفتر ملبورن سے کچھ فاصلے پر تھا۔ راستے میں ہم لوگ ایک اونچے پل پر سے گزرے۔ نیچے عمیق کھاکی تھی۔

سیکشن 41 سوڈی فیکشن کی Asta کی تیاری قابل ستائش تھی۔ ساری دنیا میں B-747 کے جتنے بھی جہاز متاثر تھے ان سب کا نقصانی ریکارڈ کمپیوٹر میں محفوظ تھے۔ سعودیہ کے جہازوں سمیت Asta کے لیے ضروری تھا کہ اگر وہ اپنی خدمات دنیا میں پہنچنا چاہتے تھے تو ان کی خدمات دوسروں سے بہتر ہوں اس لیے کہ آسٹریلیا بہت سے ملکوں سے بہت دور پڑتا ہے اور جو ممالک آسٹریلیا کے قریب ہیں یعنی آٹھ گھنٹے کی پرواز کے اندر۔ ان سب کے پاس خود اپنی صلاحیتیں موجود ہیں جیسے Haeco سنگاپور انٹر لائن، جاپانی انٹر لائن وغیرہ۔

Asta کا ٹیکر بھی منفرد تھا۔ اس کی شکل گنبد نما تھی۔ اتنا بڑا گنبد نما ٹیکر بنانا آسان کام نہیں۔ میننگ کا رآمد اور کامیاب رہی۔ وقت ہمارے پاس کم تھا۔ دو ہفتے سے بھی کم وقت میں دنیا کے کروڑوں لوگ کرچہ بیگروں کا معائنہ اور ابتدائی بات چیت کرنی تھی۔ ہم یورپ، امریکا اور آسٹریلیا

برائیز کی مشہور زمانہ فلم دی سنگ اینڈ آئی میں استعمال ہوئے۔ اس کے بعد سے تھامسن کی کمپنی ترقی پر ترقی کرتی گئی۔ جم کو غریب تھائی خواتین کا بہت خیال رہتا تھا۔ انہوں نے بے شمار کام کرنے والوں کو غربت کی دلدل سے نکالا۔ چند سال بعد وہ بے پناہ ہو گئے ہر طرح کی کوشش کے باوجود ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

تھائی سلک میں خرید چکا تھا۔ اب مجھے مسٹر بھونگ کی دکان پر جا کر ایک انگلی خریدنا تھا۔ مسٹر بھونگ تقریباً میرے دوست بن چکے تھے۔ پچھلے چند برسوں میں، میں اپنے ایک سعودی ساتھی کے ہمراہ ان کی دکان پر تین چار مرتبہ جا چکا تھا۔ میرے یہ سعودی ساتھی بھونگ کے مستقل خریدار تھے وہ اکثر بھونگ کی دکان سے جیولری خرید کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ تھائی لینڈ میں جواہرات کی خریداری میں دھوکے کا بہت امکان رہتا ہے۔ یہاں زیادہ تر سیاح زندگی میں صرف ایک بار ہی آتے ہیں۔ ان سیاحوں کو اگر ناقص یا جھوٹا مال بیچ بھی دیا جائے تو وہ اس کو واپس کرنے دوبارہ تھائی لینڈ نہیں آئیں گے۔ بھونگ نہ صرف ایماندار تھے بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی قیمتیں بھی مناسب ہوا کرتی تھیں۔ انگلی میں نے پسند کی اور خرید لی لیکن شاید بھونگ مجھے اپنا مستقل گاہک بنا کر میری وفاداریوں کو یقینی بنانا چاہتے تھے گو کہ اس دن کے بعد میں ان کی دکان پر دوبارہ پھر بھی نہیں گیا۔ انہوں نے اصرار کیا۔ ”آج رات کے کھانے پر تم میرے مہمان ہو۔ میں تم کو کوریا کا کھانا کھلاؤں گا۔“ میں نے کوریا کا کھانا پہلے بھی نہیں کھایا تھا گو کہ بعد میں مجھے یہ شرف اس وقت حاصل ہوا جب میں چند سال بعد کوریا کے شہر سیول گیا۔

”کپڑے اچھے پہن کر آنا۔“ بھونگ نے وارننگ دی۔
 کپڑوں سے کھانے کا کیا تعلق۔ کیا تو کھانا کھانا کپڑے دیکھ کر دیا جاتا ہے۔ مجھے زیادہ دماغ نہ لڑا تھا۔ اچھے کپڑوں کی وجہ بھونگ کے برابر آکر کھڑی ہو چکی تھی۔ ”کھانے پر تم کو ماریانہ لے جائے گی۔ ماریانہ کورین ہے۔“

بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ ماریانہ کو دیکھنے سے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ کورین ہے۔ تھائی لوگوں کے مقابلے میں کورین لوگوں کے رنگ گورے ہوتے ہیں۔ ناک تقریباً ستواں اور چہرے کے نقش مختلف۔ ماریانہ کا پورا نام ماریانہ

آچکے تھے۔ اگلا اسٹاپ ہانگ کا ہنگ پھر واپس جدہ۔ یہ میرا دنیا کے گرد تیسرا چکر تھا۔ شاید ایک چکر اور لگانا پڑے۔ وقت بتائے گا۔

☆.....☆

کراچی میں شادی کی تقریب تھی مجھے اس میں شرکت کرنا تھا۔ اس زمانے میں جدہ سے کراچی کے لیے کسی روز دو کسی روز تین پروازیں ہوتی تھیں۔ میں نے صبح دس بجے چلنے والی پرواز کا انتخاب کیا۔ وقت مقررہ پر مسافروں کو جہاز پر سوار کروادیا گیا۔ پرواز کی اڑان کا وقت ہو چکا تھا مگر اڑنے کی تیاری کے کوئی آثار نہ تھے۔ جہاز کے دروازے ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ پھر وقت سے پندرہ منٹ اوپر ہو گئے۔ کپتان نے اعلان کیا کہ فنی خرابی کے باعث تاخیر ہو رہی ہے۔ پندرہ بیس منٹ اور لگیں گے۔ مزید آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اعلان ہوا کہ فنی خرابی دور کرنے میں وقت لگے گا ہم آپ کو واپس لاؤنج لیے چلتے ہیں۔ لاؤنج میں دو گھنٹے انتظار کے بعد اعلان ہوا کہ یہ جہاز نہیں جاسکتا۔ دوسرا کوئی جہاز اس وقت موجود نہیں ہے۔ تین گھنٹے بعد دوسرا جہاز مسافروں کو لے کر کراچی جائے گا۔ جہاز میں خرابی کے ایسے واقعات کوئی غیر معمولی بات نہیں ہیں۔ ہوتے رہتے ہیں۔ تین گھنٹے بعد مسافر دوسرے جہاز میں بیٹھ گئے۔ جہاز فضا میں بلند ہو گیا۔

ہر اتر پورٹ پر جہازوں کے آنے اور جانے کے راستے متعین ہیں۔ آنے والے راستے Star اور جانے والے راستے Sids کہلاتے ہیں۔ جدہ سے کراچی پرواز کے لیے جہاز کو ایک خاص زاویہ سے جانا ہوتا ہے۔ ٹھوڑا سا سمندر کی طرف جا کر پھر مشرق کی طرف جہاز مڑتا ہے۔ ہمارا جہاز مشرق کی طرف مڑنے کی بجائے سمندر کے رخ چلا گیا۔ میں منہ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا میرے برابر میرے عزیز دوست ڈاکٹر یوسف کمال بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”اب ہم واپس جدہ اتر پورٹ جائیں گے۔“ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ”کیسے معلوم۔“ ان کا سوال غیر متوقع نہ تھا۔ ”جہاز سمندر میں فول ڈمپ کر رہا ہے۔“ فالتو ایندھن سمندر میں پھینک رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“

”میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا ہے۔“ ایندھن پھینکنے کی نالی باہر نکلی ہوئی ہے۔ ایندھن کرنے کی

دھار دکھائی دے رہی ہے۔“

ہوائی جہاز میں ہر طرح کے وزن احتیاط کے ساتھ مقرر کیے جاتے ہیں۔ بلند ہونے اور لینڈ کرنے کے وزن کی حدیں مقرر ہوتی ہیں۔ لینڈ کرتے وقت اگر جہاز کا وزن اس حد سے تجاوز کر جائے تو اس کے لینڈنگ گیزر پراثر پڑ سکتا ہے۔ لینڈنگ گیزر ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے زائد ایندھن کو گرا دیا جاتا ہے تاکہ وزن کی حد مقررہ پر جہاز کو اتارا جاسکے۔ ہمارے جہاز نے جیسے ہی اڑان پکڑی اس کے ایک انجن میں خرابی پیدا ہو چکی تھی۔ جہاز کو واپس جدہ اتر پورٹ پر اتارنا لازمی ہو گیا تھا۔ بغیر ایندھن سمندر میں پھینکے جہاز اتر نہیں سکتا تھا۔

تیسرا جہاز جب مسافروں کو لے کر کراچی اتر پورٹ پر اترتا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ شادی کی تقریب ختم ہو چکی تھی۔ دولہا دلہن تھکے میں تھے۔

کراچی میں جمعہ اور ہفتے کی درمیانی شب کو پہنچا تھا۔ اتوار کو مجھے زیورخ جانا تھا جہاں سوئس اتر اور پریٹ اینڈ ویشی کے ساتھ A-300 کے انجن کے کمن میں میٹنگ میں شرکت کرنا تھا۔ میری پرواز اتر فرانس سے تھی۔ پہلے کراچی سے جیئرس پھر جیئرس سے زیورخ۔

اتر فرانس کی یہ پرواز بینکاک سے کراچی آتی تھی۔ میں اس پرواز سے دو تین دفعہ کراچی آچکا تھا۔ کراچی سے مسافروں کو لے کر یہ پرواز جیئرس کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ کراچی سے بہت کم مسافر سوار ہوتے تھے۔

اتر پورٹ پہنچا تو وہاں ہر ایک صاحب اور ایک لڑکی کو اتر فرانس کے کاؤنٹر کے پاس کھڑا پایا۔ وہ صاحب آگے بڑھے اور کہنے لگے۔ ”یہ میری بیٹی ہے۔ چند دن پہلے اس کی شادی ہوئی ہے اپنے شوہر کے پاس امریکا جا رہی ہے۔ آپ اس کا خیال رکھیے گا۔“ میں نے جواب دیا کہ ”مگر صرف جیئرس تک جا رہا ہوں۔“

”جہاں تک آپ جا رہے ہیں خیال رکھیے گا۔ میر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“

لڑکی ویسی ہی دہلی پتلی سی تھی جیسی انیس بائیس سا کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ہاتھوں کی ہندی چھکی پڑ چکی تھی۔ ابھی مٹی نہ تھی۔ کچھ کھوئی کھوئی سی کچھ کچھ اداس۔ کچھ باہ کے آنکھن کی پیاس۔ کچھ ساجن سے ملنے کی آس۔ شاید اداسی انہیں متضاد جذباتوں کا اثر تھا۔ ایک طرف بائیں۔ آنکھن سے پھرنے کا غم دوسری طرف جیون سادھی سے۔

کی لگن۔ کسی بھی لڑکی کے لیے یہ بڑی آزمائش کا مقام ہوتا ہے۔

یہ لڑکی شاید زندگی میں پہلی دفعہ رپورٹ آئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کو کسی چیز کی کوئی معلومات نہ تھیں۔ یہ اکیلی امریکا کیسے جائے گی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ بقول امام نذیر میرا جذبہ شفقت پدرانہ یکا یک دیو بن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ”یہ لڑکی تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس کو خیریت سے پہنچانا تمہارا کام ہے۔“ میرا بس چلتا تو میں امریکا جا کر اس کے ساجن کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھما کر لوٹا لیکن شاید سعودیہ کو یہ بات پسند نہ آتی کہ میں زیورخ کی میٹنگ چھوڑ کر امریکا بھاگ نکلوں۔

پیرس پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ”آپ ٹرانزٹ لاؤنچ چلی جائیں۔“ جواب ملا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے۔“ مزید تفصیل میں جانا غیر ضروری تھا۔

میری اپنی فلائٹ میں تقریباً ایک گھنٹہ گزرا تھا مگر اس لڑکی کو اس کے جہاز تک پہنچانا ضروری تھا۔ اگر میری فلائٹ چھوٹ بھی گئی تو میں دوسری فلائٹ سے یا ٹرین سے زیورخ جاسکتا تھا۔ اس لڑکی کو بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

میں جب اس کا بورڈنگ کارڈ لے کر اس کو اس کے ڈیپارچر گیٹ پر چھوڑ کر اپنی فلائٹ کی طرف آیا تو میری فلائٹ روانہ ہونے والی تھی۔ ”زید پانچ منٹ کی دیر میرے لیے پریشانی کا باعث ہوتی مگر میرے جذبہ شفقت پدرانہ کو ایک گونہ سکون مل چکا تھا۔“

ایسے موقعوں پر مجھے ہمیشہ مارٹینا یاد آ جاتی ہے۔ اس کا الہزپن، مصحوبیت اور بچکانہ بے نیازی۔

☆.....☆
سعودیہ کے 1011-L ٹرائی اگلے جہاز میں فرسٹ کلاس اور اکانومی کلاس کے درمیان ایک سببن ہوتا تھا جس میں سیٹوں کی تین یا چار قطاریں ہوا کرتی تھیں چونکہ سعودیہ کا عملہ اور ملازمین بڑی تعداد میں سعودیہ کا کاروباری اور ذاتی سفر کیا کرتے تھے۔ اس سببن میں زیادہ تر سعودیہ کے ملازمین کوئی سببن دی جاتی تھیں تاکہ دوسرے مسافروں کو ان کی وجہ سے کسی قسم کی دشواری یا تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آج مجھے بھی اس سببن میں سیٹ ملی تھی۔ میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ چکا تھا۔ میں سعودیہ کا دفتری کام ختم کرنے کے بعد لندن سے جدہ واپس جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ایک نوخیز نو بہار سببن میں داخل ہوئی۔ بورڈنگ کارڈ پر اپنا

سیٹ نمبر دیکھ کر میرے برابر آکر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے بند قبا کا ذکر لازمی ہے کہ یہ سارا کھیل ان کی اسی بند قبا کا ہے۔

شہر میں ان کے رنگ حنا کی بند قبا کی بات چلی انہوں نے بغیر آستین کی بہت زیادہ نیچے گلے والی بنیان نما چیز پہن رکھی تھی۔ اس ڈھیلی ڈھالی بنیان کے اوپر سرخی مائل نارنجی رنگ کی بلاؤز زیب تن کر رکھی تھی جس کی آستینوں نے کانڈھوں سے کہنی تک دونوں ہاتھوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ سامنے سے بلاؤز پوری طرح سے کھلا ہوا تھا۔ کمر سے کچھ نیچے بلاؤز میں ایک ڈھیلی سی گرہ بندھی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے انتہائی کسی ہوئی جینز جو پنڈلیوں تک جا کر اختتام پذیر ہوئی تھی۔ ماتھے سے اوپر بالوں پر کالی ٹیک۔ منہ میں چوہنگ کم ہاتھ میں دو بیگ۔

بڑے بیگ کو اوپر بٹے ہوئے سامان کے خانے میں رکھنے کے بعد انہوں نے میرے برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ سیٹ ان کی ہے۔ میں کھڑے ہو کر ایک طرف ہو گیا کہ وہ اپنی سیٹ تک رسائی حاصل کر سکیں۔ سیٹ پر بیٹھ کر انہوں نے دوسرا بیگ اٹھایا اور جھک کر اس بیگ کو اپنے سامنے والی سیٹ کے نیچے سامان کے لیے بنی ہوئی جگہ پر رکھ دیا۔

بیگ کو ٹھکانے لگانے کے کارخیز کے بعد جب وہ ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ پر سیدھی ہونے لگیں تو اس جھٹکے کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کی بنیان نما جامہ علم بغاوت بلند کر دیا۔

محترمہ نے بنیان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کھینچا اور اس کو ٹھیک کرنے کے بعد میری طرف مسکرا کر یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں ”آپس کی بات ہے۔“ مجھے جہاز نکھنوی کی نظم ”نورا“ کے اختتامی شعر اس صورت حال کی عکاسی کرتے دکھائی دیے۔

ادھر میرے دل میں تو محشر ہلچا تھا
مگر اس طرف حال ہی دوسرا تھا
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھٹکھٹا کر
کہ شمع حیا رہ گئی جھملا کر
سہی نہ سہی مسکراہٹ رہی سہی
محشر میری طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ابھی مصافحہ ختم ہی ہوا تھا کہ وہ خواتین کے مقبول ترین مشغلے میں مشغول ہو گئیں۔ باتیں بغیر رکے لامتناہی باتیں۔

خود ہی سوال کرتیں اور خود ہی جواب دیتیں۔ مجھے سچ سچ میں ہوں ہاں کرنے اور سر ہلانے کی اجازت تھی۔ اپنی طرف سے بغیر کوئی سوال پوچھے ہوئے ہی۔ میرے پاس ان کی فائل مع تمام اہم کوائف کے تیار ہو چکی تھی۔

مارٹینا کا تعلق ڈنمارک سے تھا۔ عمر انیس سال چار مہینے اور ساڑھے دس دن۔ آدھے دن کا حساب یوں تھا کہ وہ رات دس بجے کی مبارک ساعت پر اس دنیا میں وارد ہوئی تھیں۔ ابھی لندن میں صبح کے صرف نو بجے تھے جو ڈنمارک میں صبح کے دس کا عمل تھا۔ ابھی ان کی پیدائش کے مہینے میں گیارہواں دن مکمل ہونے میں پورے بارہ گھنٹے باقی تھے۔ لہذا ابھی عمر عزیز کے بیسویں سال کے پانچویں مہینے کے صرف ساڑھے دس دن پورے ہوئے تھے۔ گیارہ نہیں۔ بات معقول نکلی۔

مارٹینا کا ایمان تھا کہ ہائی اسکول کے آگے پڑھائی جاری رکھنے سے ذہن پر مضراثرات مرتب ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھیں۔ باتوں کی شوقین اس لیے تھیں کہ زیادہ باتیں کرنے سے ذہن کو جلا ملتی ہے۔ باتوں کے علاوہ وہ گھومنے کی شوقین تھیں۔ اپنے اس گھومنے کے شوق کو پورا کرنے کی خاطر وہ پچھلے ایک سال سے SAS انٹر لائن میں بطور انٹر ہوسٹس کام کر رہی تھیں۔ اسی دوران ان کے کسی دوست نے ان کی توجہ سعودی انٹر لائن کے اشتہار کی طرف دلائی کہ سعودی انٹر لائن کو تجربہ کار انٹر ہوسٹس کی ضرورت تھی۔ مارٹینا نے درخواست دی، انٹرویو ہوا۔ منتخب ہو گئیں۔ آج کی پرواز سے وہ اپنی نوکری کا آغاز کرنے کی غرض سے عازم جدہ تھیں۔ یہ ان کا جدہ جانے کا پہلا اتفاق تھا۔

اب تکٹ میں صرف سنتا رہا تھا لیکن اب میرے بولنے کا موقع آ گیا تھا۔ مارٹینا کو سعودی عرب کے رسم و رواج سے متعلق معلومات پہنچایا ضروری تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی سادگی کی وجہ سے کسی ایسی دیکھی مشکل میں پڑ جائے۔ میرا خیال تھا کہ یہ کام بہت آسان ہے۔ اس میں کسی قسم کی دشواری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ میں غلط تھا۔

جب میں نے مارٹینا کو سعودی عرب میں عورتوں کے لباس کے متعلق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہاں پر زیادہ تر خواتین اپنے لباس کے اوپر عبایا بھی پہنتی ہیں تو اس کو یقین نہیں آیا۔ وہ مجھے آزادی نسواں پر کچھ دینے کو تیار ہو گئی۔ میرے لیے

یہ صبر آزمائیت تھا۔ وہ مجھ سے اس بات پر بحث کر رہی تھی کہ جس پر نہ تو میرا ہی کوئی اختیار تھا اور نہ ہی اس کا۔ صبر کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

جب اس کا جوش ذرا ٹھنڈا پڑا تو میں نے اس کو سہولت کے ساتھ سمجھایا کہ یہ اس ملک کا دستور اور قانون ہے۔ یہاں اس کو آزادی نسواں کا کوئی حامی نہیں ملے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ میرے مشورے پر عمل کرے۔ اگر وہ سعودی عرب میں رہنا چاہتی ہے تو ورنہ ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے دیس اپنے ماحول میں واپس چلی جائے۔

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر نیند نے اسے آدھو چا۔ سوتے میں وہ انتہائی معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی معصومیت دیکھ کر مجھے فیض صاحب کا شعر یاد آ گیا۔

ادلے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ مگر نظر کو حجاب آتا ہے
میں نے اس کے شانوں پر کبل ڈال دیا۔ مارٹینا سوتی رہی۔ میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔

مارٹینا کا تعلق ایک ایسے ملک سے تھا کہ جہاں پورے خاندان کا بغیر کپڑوں کے ساحل سمندر پر دھوپ سینکنا۔ دوڑ بھاگ کرنا۔ روزمرہ کی عام بات تھی۔ اس ماحول میں پلنے بڑھنے والی کسی لڑکی کے لیے مختصر کپڑے پہننا یا ستر کا کھل جانا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ ان لوگوں کے معاشرے میں ستر کا وہ تصور نہیں ہے جو اسلام میں ہے۔ اس ماحول میں پلنی ہوئی مارٹینا مجھے ایک سیدھی سادی، الہڑ اور بے ساختہ لڑکی لگی جو کم عمری میں دنیا گھومنے کا شوق پورا کر رہی تھی۔ بغیر کسی خدشے کے کہ وہ کسی خطرناک حادثے سے بھی دوچار ہو سکتی تھی۔

اس واقعے کو دہراتے ہوئے مجھے مستنصر حسین تارڑ صاحب کی لال ٹھنری یاد آ گئی۔ لیکن یہ تقابل مناسب نہیں۔ لال ٹھنری کی زندگی تو ایک جی کا شکار ہو گئی تھی کہ سالگرہ کے تحفے میں ملی ہوئی اسپورٹس کار چلا تے ہوئے ایک حادثے کا شکار ہو گئی اور اپنی ٹانگ ٹنوا بیٹھی۔ مگر مارٹینا تو لالہ تھی کہ جس نے صرف بہار دیکھی تھی۔ خزاں کا تصور شاید اس کے خواب میں بھی نہیں آیا تھا۔

خزاں کے جو دستم کو نہ جس نے دیکھا
پہاں نے جسے خون جگر سے پالا

جدہ آچکا تھا۔ میں نے اور مارٹینا نے اپنی اپنی راہ چھوڑی۔

اس دن کے بعد سے میری مارٹینا سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی مڈ بھیڑ حالانکہ ہم دونوں ہی سعودی ائر لائن کی مہیا کی ہوئی رہائش گاہ سعودیہ سٹی میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود جب بھی مجھے مارٹینا کا خیال آتا تو اس کا الہڑ پن اور اس کی بے ساختگی اور معصومیت یاد آ جاتی اور اس کے لیے میرے دل میں ایک ہی تمنا ابھرتی۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہوتو

☆.....☆

زیورخ کی میننگ کا تذکرہ غیر ضروری ہے کہ وہ روز مرہ کی عادی میننگ تھی۔ کوئی غیر معمولی بات یا واقعہ نہ ہوا۔ البتہ میننگ کے بعد کی مشغولیت کا ذکر ضروری ہے۔ یہ مشغولیت زیورخ کے ایک بڑے ہوٹل میں وقوع پذیر ہوئی۔

کھانے کی لمبی سی میز پر سترہ اٹھارہ لوگ موجود تھے۔ میز بانی سوئس ائز کی تھی۔ لطیفوں کا دور چل پڑا۔ سعودی عرب میں سو سے اوپر شہریت کے لوگ کام کرتے ہیں۔ ہر شہریت والے نے دوسرے کے متعلق لطیفے بنا رکھے ہیں۔ دو تین افراد کی باری آئی اس کے بعد اور ہال شاپ کے سعودی سو پروائیز نے ایک لطیفہ سنایا۔

ایک کشتی میں چار لوگ سفر کر رہے تھے۔ ایک آئرش، ایک کیوبن، ایک سعودی اور ایک پاکستانی۔ بیچ سمندر میں پہنچے تو آئرش نے دہسکی سے بھرا ہوا بکس پانی میں پھینک دیا۔ سب نے شور مچایا اتنی جیتی دہسکی تم نے سمندر میں بہا دی۔ اس نے شان اسٹینٹنی سے ڈیکھا اور کہا۔ ”کوئی بات نہیں آئر لینڈ میں دہسکی کی کوئی کمی نہیں۔ ہمارے یہاں بہت دہسکی ہوتی ہے۔“

اور تھوڑی دور گئے تو کیوبن نے ہوانا سگار کا بہت بڑا ڈبہ سمندر میں بہا دیا۔ اس کا جواب بھی وہی تھا جو آئرش کا تھا۔ ”کیوبا میں لاتعداد سگار ہوتے ہیں ہم کو ان کی کوئی پروا نہیں۔“

”جب سعودی کی باری آئی تو اس نے پاکستانی کو اٹھا کر پانی میں پھینک دیا کہ سعودی عرب میں پاکستانیوں کی کوئی کمی نہیں۔“ پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ میری غیرت کو لاکھارا گیا۔

امریکا میں پولینڈ کے باشندوں کی دانش مندی کے

استے ہی چرچے ہیں جتنے سکھوں کی دانش مندی کے چرچے پاک و ہند میں ہیں۔ پولش لوگوں کا امریکا میں اسی طرح ذکر خیر ہوتا ہے جیسا ہمارے یہاں سکھوں کا۔

پریٹ اینڈ وٹنی نے جو اپنا مقامی انجینئر جدہ میں تعینات کیا تھا وہ بھی پولش تھا۔ اس کا نام اسٹاسکی تھا۔ وہ کھانے کی میز پر ہمارے ساتھ تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”سعودی میرے بھائی ہیں میں ان کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ پولش لوگوں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں اس لیے کہ میں آپ کو پولش لوگوں کے بہت قریب محسوس کرتا ہوں اگر آپ میرے نام میں صرف اس اضافہ کر دیں تو میں پولش بن جاؤں گا میرا نام رزاسکی ہو جائے گا اور میں اسٹاسکی کا سگا نہیں تو کم از کم سویتلا بھائی ضرور لگوں گا۔“ اس کے بعد میں نے ایک سنا سنایا قصہ سنا دیا۔ وہ قصہ یہ تھا۔ ایک دفعہ ایک امریکی ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا۔ ”مجھے پولش بننا ہے۔“ ڈاکٹر کا منہ حیرت سے کھل گیا کہنے لگا۔ ”دنیا کا کوئی سچ الدماغ آدمی پولش نہیں بننا چاہتا۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو مجھے پولش بنا دو یہ میری بچپن کی خواہش ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اس کے لیے تمہارا آدھا دماغ نکالنا پڑے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”منظور۔“

آپریشن ہو گیا جب مریض ہوش میں آیا تو اس نے پوچھا کہ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو ڈاکٹر نے کہا۔ ”ایک تھوڑی سی غلطی ہوئی ماتحت ڈاکٹر نے آدھے کی بجائے پورا دماغ نکال دیا۔“

مریض نے کہا۔ ”مالش“ اور اٹھ کر چلا گیا۔

ہال ایک دفعہ پھر گونج اٹھا۔

یہ مالش چچی تیل والا مالش نہیں تھا۔ مالش عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کوئی بات نہیں۔ امریکی پورا دماغ نکلنے کے بعد پولش نہیں بلکہ سعودی بن چکا تھا۔

میرے سعودی دوستوں کو یہ بات زیادہ نہ بھائی مگر اس کے بعد سے کسی سعودی نے مجھے پاکستانیوں کے خلاف کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔

اگلے روز جدہ واپسی تھی۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا

بس یہی بات ہے اچھی مرے ہر جا کی کی

کیونکہ ہر جا کی کا دل جدہ سے بھرنے لگا تھا۔

☆.....☆

سعودیہ کے پاس اس وقت پانچ 100-747 B

ماہ 2015ء

جہاز تھے اور ایک B747-SP ریاض اور جدہ سے نیویارک کی پرواز پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کا دھڑ چھوٹا ہوتا ہے۔ پیٹرول اتنا ہی ہوتا ہے جتنا B747-100 میں ہوتا ہے۔ پیٹرول اتنا ہی اور وزن کم۔ اس طرح یہ جہاز بغیر ر کے جدہ سے نیویارک جاسکتا تھا۔ اس میں یہ احتیاط ضرور رکھی جاتی تھی کہ آئر لینڈ کے شہرین میں اس کوری ڈیج کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسافروں اور سامان کے وزن کو اور ہوا کے رخ وغیرہ کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاتا تھا کہ جہاز میں ایندھن بچا ہے وہ نیویارک جانے کے لیے کافی ہے یا نہیں اگر ایندھن کافی نہیں ہوا تو جہاز کو شین میں اتار کر اس میں مزید ایندھن بھرا جاتا تھا۔ ایندھن لینے کے لیے جب جہاز اترتا ہے تو اس کو ٹیکنیکل لینڈنگ کہا جاتا ہے اگر جہاز ٹیکنیکل لینڈنگ کرے تو اس کو وہاں سے مزید مسافر اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

ٹیکنیکل لینڈنگ کے امکانات کو کم سے کم کرنے کے لیے سعودیہ کی خواہش تھی کہ روس راکس اپنے RB-211 انجن کی کارکردگی کو بہتر بنانے پر غور کرے۔ B-747 کی اگلی کھپ میں اس پر کافی زور تھا۔ یہ اگلی کھپ چار جہازوں کی تھی تین B747-100 اور ایک B747-SP۔

اب مواصفات میری ذمہ داری نہ تھی۔ فلائیڈ اس کے ذمہ دار تھے مگر جہاز کے مواصفات سے اتنی آسانی سے رشتہ توڑنا مشکل تھا فلائیڈ بھی میرے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے مجھے مواصفات کی میننگ میں بھی شرکت کرنی پڑی کہ اب میری ذمہ داری صرف جہاز کی خریداری کے شہریت تک محدود تھی۔

چونکہ B-747 کی پہلی کھپ میں تمام اہم معاملات طے پا چکے تھے ان چار جہازوں کی خریداری میں کوئی خاص مسئلہ نہ ہوا۔ مواصفات میں صرف چند تبدیلیاں کی گئیں جن کا محرک سعودیہ کا ان جہازوں کے اڑانے اور مرمت کا تجربہ تھا۔ B-747 کی دوسری کھپ کی خریداری کے کنٹریکٹ پر دستخط ہونے کے بعد موقع تھا کہ میں بھی جنسٹون لے سکوں۔ میں نے تین ہفتے کی چھٹی کی درخواست دی۔

☆.....☆

کالج کے زمانے میں ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جس

میں جیک لیسن، بھلی ووڈ اور ٹونی کرٹس نے کام کیا تھا۔ فلم کا نام تھا ”دنیا کے گرد اسی دن میں“ وہ لوگ اسی (80) دن میں دنیا کے گرد گھومے تھے۔ میں بیس دن میں دنیا کے گرد گھوموں گا۔ یہ تھامیری چھٹی کا مقصد۔

پچھلے چند سال میں، میں آسٹریلیا کے علاوہ باقی چار براعظموں میں کافی گھوم چکا تھا گو کہ چند سال بعد میرا کئی دفعہ آسٹریلیا جانے کا اتفاق ہوا جس کا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ اب کی میں چند ایسی جگہوں پر بھی جانا چاہتا تھا جہاں پہلے کبھی نہیں گیا تھا مگر آسٹریلیا اس دورے میں شامل نہ تھا۔ کینیڈا میں بھی چند دن گزارنے تھے میں کافی عرصے سے کینیڈا نہیں گیا تھا۔ ابتداء یورپ سے کرنا تھا۔ پہلا اسٹاپ میڈرڈ۔

میڈرڈ میں پہلے جا چکا تھا۔ اس زمانے میں جب میں برمنگھم میں پڑھائی کر رہا تھا۔ میڈرڈ کے علاوہ قرطبہ اور سیول بھی دیکھ چکا تھا۔ ٹولیدو اور قرطبہ میڈرڈ سے سیول جاتے ہوئے راستے میں پڑتے ہیں۔ سیول میڈرڈ کے جنوب میں تقریباً ساڑھے پانچ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس دفعہ میں بارسلونا جانا چاہتا تھا جو میڈرڈ سے مشرق اور کھوڑا شمال میں سو اچھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ میڈرڈ سے بارسلونا کا سفر بذریعہ ٹرین تھا۔

میڈرڈ سے بارسلونا کے لیے رات میں کوستا براوا ٹرین چلتی ہے جو نو یا دس گھنٹے کے سفر کے بعد صبح بارسلونا پہنچا دیتی ہے۔ اوپر نیچے دونوں برتھ پر رات کو سونے کا بندوبست ہوتا ہے۔ دو طرف ٹرین کی دیوار اور دو طرف تار پولین کے پردے۔ بیڈ روم جیسا آرام برتھ نہایت آرام دہ۔

مجھے میڈرڈ میں ہوٹل میں نہ ٹھہرنا تھا۔ چند گھنٹے رکنا تھا۔ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہی انکیشن پہنچ گیا۔ وہاں پر ایک صاحب مل گئے ان کا نام تھا آرتورو۔ یہ انگریزوں کے آرتور کا ہم معنی ہے۔ آرتورو بارسلونا میں رہتے تھے۔ میڈرڈ کام سے آئے تھے اب گھر واپس جا رہے تھے۔

”بارسلونا میں کہاں ٹھہرو گئے۔“ آرتورو نے پوچھا۔ ”معلوم نہیں، کوئی ہوٹل ڈھونڈوں گا۔ دو دن رکنا ہے۔“

”اگر تم میرا مشورہ مانو۔“ آرتورو نے مشورہ دینا چاہا۔ ”تو تم ہوٹل کی بجائے پسیون میں ٹھہرو وہاں تم کو گھر کا محسوس ہوگا۔“ ہوٹل والے لہوٹے ہیں اور ٹھیک سے خیال

بھی نہیں رکھتے۔“

شہر گھومنے کے لیے بھی آرتورو کے مشورے قابل قدر تھے۔ ”سگراڈا فیمیلیا چرچ ضرور دیکھنا۔ ساری دنیا میں اس کی ٹکر کا کوئی چرچ نہیں۔ ساحل سمندر جانا وہاں پر پھیلی اچھی ملتی ہے اور جیسے جیسے بارسلونا میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں مل سکتے ہم ان کو گامباس کہتے ہیں۔ سمندری نمک کے ساتھ بہت لذیذ ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان نعمتوں سے محروم رہتے ہیں وہ سی فوڈ نہیں کھاتے۔ تم سی فوڈ کھاتے ہو؟“

”جی میں سی فوڈ کھاتا ہوں۔“ میں نے اقرار کیا۔

ٹرین آچکی تھی میں اور آرتورو اپنے اپنے ڈبوں کی طرف جا رہے تھے کہ آرتورو کو کچھ یاد آگیا۔ اچانک مڑے اور کہا۔ ”ہاں بھنے ہوئے آکٹوپس کھانا مت بھولنا، باقی باقی۔“

اتنے تفصیلی مشورے شاید کوئی ٹریول ایجنٹ بھی مجھے نہ دیتا۔ میں نے آرتورو کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ڈبے کی طرف بڑھ گیا۔

پنسیون دراصل انگریزی زبان کا پشن ہے۔ یہ ذاتی گھروں کے وہ ایک دو کمرے ہوتے ہیں جو وہ مقامی لوگ جو ریٹائرڈ ہو چکے ہوتے ہیں کرائے پر اٹھا کر اپنی آمدنی بڑھانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ میں ایک پنسیون چنچ گیا۔ بڑے میاں اور بڑی بی دونوں بہت محبت سے ملے۔ انگریزی سے زیادہ آشنا نہ تھے۔ دو دن واقعی اپنائیت کا پرسکون ماحول ملا۔ ناشتا بھی ملا۔

سب سے پہلے سگراڈا فیمیلیا دیکھنا تھا۔ یہ واقعی قابل دید عمارت تھی جس کا ڈیزائن کیتھان کے آرکیٹیکٹ انٹونی گاڈوی نے بنایا تھا۔ اس کے آٹھ اونچے اونچے مینار ہیں جن میں سے کم سے کم اونچے مینار کی اونچائی سو میٹر سے زیادہ ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر سگراڈا فیمیلیا کی نیابت کا صحیح لطف اٹھانا ہے تو اس کے مینار پر چڑھ کر شہر کا نظارہ کرو۔ تین سو فٹ میڑھیاں چڑھنے کی ہمت نہ جب میں نہ اب ہے۔

دوپہر کا وقت ہو چلا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی آرتورو نے کہا تھا کہ ساحل سمندر پر پھیلی نہایت لذیذ ملتی ہے۔ بیچ کا رخ کیا۔ لوگ حسب معمول دھوپ سینکنے اور سمندر میں نہانے کے مزے لوٹ رہے تھے مگر آگے جانے سے پہلے مجھے پیٹ پوجا کرنا تھا۔

عارضی قسم کے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ ان کے باہر میزیں لگی تھیں۔ میں کرسی بھیج کر ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ آواز آئی۔ ”کیا کھائیں گے۔“ یہ جملہ اردو میں کہا گیا تھا۔ میں نے تعجب سے پلٹ کر دیکھا تو ایک پاکستانی لڑکا کھڑا تھا۔ ”حیران نہ ہوں سر، میں بھی پاکستانی ہوں۔ انگلستان جاتا تھا۔ ایجنٹ نے یہاں تک لا کر چھوڑ دیا۔ پیٹ تو بھرنا ہے۔ میں نے یہاں بیرے کی نوکری کر لی۔ یہاں پھیلی مزیدار ہوتی ہے۔ لے آؤں۔“

”ہاں لے آؤ۔“ میں نے جواب دیا۔ خدا معلوم ایسے کتنے ہی پاکستانی دنیا بھر میں ایجنٹوں کے ہاتھوں رسوا اور پریشان ہو رہے تھے اور اب بھی ہو رہے ہیں۔

کھانا کھا کر میں ساحل کی طرف نکل گیا۔ پنسیون پہنچا تو بڑی بی اسی طرح پریشان تھیں جس طرح گھر والے دیر سے آنے پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ ”سینور (مسٹر) آپ کہاں چلے گئے تھے، دوپہر کھانے پر بھی نہیں آئے؟“ میں نے بتایا کہ میں سگراڈا فیمیلیا دیکھنے اور بیچ گھومنے چلا گیا تھا۔ بڑی بی نے فوراً اپنے سینے پر کراس کا نشان بتایا۔ میں کمرے میں آرام کرنے چلا گیا اسپین آکر مل فائٹ اور فلیمنکو ڈانس نہ دیکھنا اسپینر ڈکی غیرت کو لٹکانے کے برابر ہے۔ رات کو فلیمنکو ڈانس دیکھنا تھا۔

اگلے دن آرکیٹیکٹ انٹونی گاڈوی کی بنائی ہوئی ایک اور عمارت کا زامیلا دیکھنا تھا جو لاپیڈیرا بھی کہلاتی ہے۔ لاپیڈیرا کے معنی صید یا شکار کے ہیں۔ یہ نام شاید اس لیے پڑ گیا ہو کہ یہ عمارت ایک جوڑے روز بریکمون اور بیرے میلا نے بنوائی تھی۔ روز بریک امیر بیوہ تھی۔ میلا نے اس سے شادی کر لی تھی اور اس کے پیسے سے عیش کی زندگی گزارتا تھا۔ لوگ اس کے پیچھے پڑے تھے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ عمارت بھی اپنے ڈیزائن میں منفرد ہے تین چار منزلہ ہر منزل پر کئی اپارٹمنٹ، الفاظ میں اس کا احاطہ کرنا صرف مستنصر حسین تارڑ کو آتا ہوگا۔ میں نہیں کر سکتا۔ اس عمارت کی کہانی صرف اس کی تصویر کی زبانی ہی سنی جاسکتی ہے۔

پھلی میں کل کھا چکا تھا۔ گامباس کھانا باقی تھا۔ میں نے ساحل کا رخ کیا۔ ساحل سے باہر سڑک پر کئی ہوٹل موجود تھے جہاں گامباس کھائے جاسکتے تھے۔ یہاں گامباس ثابت چلے جاتے ہیں۔ سمندری نمک کے ساتھ پلیٹ میں دیے جاتے ہیں۔ گامباس کے سر اور دم کو خود الگ

کرنا ہوتا ہے۔ لوگ گامباس کے سروں کو پھینکنے سے پہلے ان کو چوس رہے تھے۔ میں نے بھی ڈرتے ڈرتے کراہیت کے ساتھ ایک سر کو چوسا۔ خلاف توقع مزے کا لگا۔ اتنے بڑے جھینٹے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے نہ کھائے تھے مگر اس کے بعد بینکاک میں کھانے کا اتفاق ہوا۔ تھائی لینڈ میں بھی گامباس اسی طرح بناتے ہیں مگر وہ لوگ سمندری نمک کی بجائے اس کو تلے ہوئے لہسن کے ساتھ بناتے ہیں۔

آرتورو نے جو کھانے کی چیزیں بتائی تھیں اس میں صرف بھنے ہوئے آکٹوپس کھانا باقی تھا۔ پھیون والی بڑی بی سے پوچھا تو انہوں نے ایک جگہ کا نام بتایا جو قریب ہی دیے تو آکٹوپس ہر جگہ مل جاتے تھے۔ میں شام میں وہاں چلا گیا۔ یہ کئی کئی فٹ لمبے آنکھ دس پیروں والے آکٹوپس نہ تھے بلکہ ننھے ننھے آکٹوپس کے بچے تھے جن کو یہ لوگ حل کر اس طرح کھاتے تھے جیسے ہم پنے وغیرہ کھاتے ہیں۔

بارسلونا میں دیکھ چکا تھا۔ اب مجھے براستہ نہیں، کانز جانا تھا جہاں سالانہ بین الاقوامی فلمی میلہ لگتا تھا۔ نیس تو لوس سے تقریباً ساڑھے پانچ سو کلومیٹر مشرق کی طرف بحر میڈیٹیرینین کے کنارے ہے۔ کانز وہاں سے نیس پینتیس کلومیٹر پر واقع ہے۔ نیس میں پہلے جا چکا تھا کانز بھی نیس کی طرح نکلا کوئی قابل ذکر بات نہ تھی کانز میں جان اسی وقت پڑتی ہے جب یہاں سالانہ بین الاقوامی فلمی میلہ منعقد ہوتا ہے۔ نیس سے بحیرہ پھر نورنؤ۔

کراچی کے بعد مجھے جس شہر سے لگاؤ ہے وہ نورنؤ ہے مگر میں یہاں تین چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اپنے رشتے داروں اور پرانے دوستوں سے ملنے اس کے بعد ہی لاس انجلس کے ہوتا ہوا میلا پہنچ گیا۔ یہ سب جگہیں میں پہلے بھی ایک سے زیادہ دفعہ دیکھ چکا تھا۔ اس دفعہ شمالی میریانہ جانا چاہتا تھا جو چند چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل تھا اور اس پر امریکا کی عملداری تھی۔ وہاں جانے کے لیے مجھے پہلے گوام جانا تھا۔

میں جزیرہ سیپ جانا چاہتا تھا مگر وہاں کی پرواز میں دو دن جگہ نہ تھی میرے پاس وقت نہ تھا میں نے جزیرہ روٹا کا ٹکٹ خریدا اور جہاز میں بیٹھ گیا۔ روٹا وہ جگہ تھی جہاں وقت ٹھہر جاتا ہے کرنے کے لیے کچھ نہیں صرف ساحلوں پر مکھو میں اور آرام کریں۔ یہ جزیرہ جاپان کے لوگوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں پر جاپانوں نے ایک بڑا ہوٹل تیار کر رکھا ہے جس میں جاپان کے لوگ چھٹیاں گزارنے آتے

ہیں۔ اس وقت میرے علاوہ اس ہوٹل کا ہر مہمان جاپانی تھا یا تھی۔ جزیرہ مکھو کر کھانا کھانے آیا تو اسٹیک مل سکتا تھا یا جاپانی کھانا۔ میں نے جاپانی کھانا کھایا۔ کیا کھایا یہ صرف باورچی کو معلوم تھا کہ جاپانی تو ہر چیز کھا جاتے ہیں۔

شام کمرے میں لیٹا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے پر ایک جاپانی صاحب کھڑے تھے۔ دروازہ کھلا تو وہ جاپانی طریقے سے دد دفعہ رکوع میں گئے۔ مجھے بھی جانا پڑا۔ ”آج شام ہم ایک جاپانی فیسیول منارہے ہیں آپ شریک ہوں گے تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔ کھانے پر آپ ہمارے مہمان ہوں گے۔“ دیار غیر میں وقت گزارنے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ ”ضرور۔“ پھر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

وقت مقررہ پر تقریب کی جگہ پہنچا تو میرے میزبان مسٹر آ کی ہیکو دوڑے ہوئے آئے اور آتے ہی رکوع میں چلے گئے۔ مجھے بھی رکوع میں جانا پڑا۔ ہم دونوں باری باری کئی دفعہ رکوع میں گئے۔ ہر رکوع کے بعد جھکاؤ میں نسبتاً کمی آتی جا رہی تھی۔ آخر کار ہم سیدھے کھڑے ہو گئے پھر ہاتھ ملایا۔ فیسیول میں کچھ مذہبی رنگ تھا بہت سی لائیں اور پٹائے۔ پھر جاپانی دھن میں گانے۔ ہیکو صاحب نے مجھے اور لوگوں سے ملایا اور پوچھا۔ ”آپ سا کی ٹھنڈی پیس گے ٹکنی یا گرم۔“ سا کی ایک قسم کی جاپانی شراب ہے جو چاول سے بنتی ہے اور موسم اور پینے والے کے ذوق کے مطابق ٹھنڈی ٹکنی یا گرم کر کے پی جاتی ہے۔ میں نے کوکا کولا پر اکتفا کیا۔ اب یہی میرا پسندیدہ مشروب بن چکا تھا۔

جاپانی موسیقی ختم ہوئی تو تیز مغربی دھنیں بجنے لگیں نو جوان جوڑے رقص کرنے میں مشغول ہو گئے۔ فیسیول ختم ہوا تو آدمی رات گزر چکی تھی۔ میں نے مسٹر ہیکو اور ان کی بیگم کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔

اب میں براستہ میلا بینکاک پہنچ چکا تھا۔ تھائی لینڈ میرا پسندیدہ ملک ہے لیکن پسندیدہ شہر بینکاک نہیں۔ بینکاک کا ذکر میں متعدد بار کر چکا ہوں لیکن اس دفعہ بینکاک کا ذکر صرف ایک واقعے کے ضمن میں ہے۔

میں شیرٹن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جو سری وونگ روڈ پر واقع ہے۔ اس کے نزدیک ہی پیٹ پونگ روڈ ہے جو اپنی شینیزنگ کے لیے بدنام اور مشہور ہے۔ رات کے وقت یہ

سڑک ٹریفک کے لیے بند کر دی جاتی تھی اور یہاں پر رات کا بازار لگتا تھا جہاں پر لوگ ٹیلیوں پر اپنا مال سجا کر بیچتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف بارھیں جہاں شراب اور رقص کا دور چلتا تھا۔ اندھیرا ہو چلا تھا میں پیٹ پونگ مارکیٹ سے بیٹھ کر خریدنا چاہتا تھا۔ بینسنز یہاں اچھی اور بہت کم داموں مل جاتی تھیں۔ میں نے دو بینسنز خریدیں ان کو فریم سے نکلوا کر رول کروالیا کیوں کہ جہاز میں فریم لے جانا مشکل تھا۔ یہ کام ختم کر کے میں ایک بار میں چلا گیا۔ پاس لگ رہی تھی میں کوک پینا چاہتا تھا ایک لڑکی کوک لے آئی۔ کوک دینے کے بعد اس نے فرمائش کی کہ مجھے ایک ڈرنک خرید دو۔ میں نے خرید دیا۔

وہ ڈرنک لے کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی پھر فرمائش کی۔ ”میں بہت تھک گئی ہوں۔ کام نہیں کرنا چاہتی۔ تم ”ماما سین“ کو دو سو بھات دے دو وہ مجھے چھٹی دے دے گی۔ ”ماما سین بہت اچھی ہے۔“ اس کے بعد کی تفصیل۔ ”پھر تم مجھے اپنے ساتھ ہوٹل لے چلو۔ صبح پانچ سو بھات دے دینا۔“ میں نے انکار کر دیا وہ پیچھے پڑ گئی۔ آخر کار میں نے کہا ٹھیک ہے چلو یہ دو سو بھات ماما سین کو دے دو۔

باہر آ کر میں نے اس کو پانچ سو بھات دیے۔ ”یہ لو اپنے پانچ سو بھات میں تم کو ہوٹل نہیں لے جاؤں گا۔“ ”تم خفا ہو گئے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو معافی مانگتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”واپس جاؤں گی تو ماما سین ناراض ہوگی۔ میں اس کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تم مجھے ہوٹل لے چلو۔“

میں نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہہ دیا میں ہوٹل نہیں جا رہا ہوں۔ مجھے رابنسن اسٹور جاکر چیزیں خریدنی ہیں۔“ ”میں بھی رابنسن چلوں گی۔“ وہ کسی طرح پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ ہوئی۔

”اچھا چلو۔“ میں نے تھک آ کر کہا لیکن ابھی نہ میری آزمائش ختم ہوئی تھی نہ اس کی فرمائشیں میں کپڑے بدل کر چلوں گی۔ میرا کرا ہوٹل کے پیچھے ہے زیادہ دور نہیں تم میرے ساتھ چلو گے؟ اب میں وہی کچھ کروں گا جو یہ کہے گی۔ ”ضرور چلوں گا۔“

ہم چلتے چلتے شیرٹن کے پھوڑے آ گئے۔ اس شاندار ہوٹل کے پیچھے جو گندگی، غربت اور افلاس تھا، بیان سے باہر ہے۔ ایک دروازے کے سامنے اس نے جاپانی نکالی

اس کو دروازے میں سمھا کر دروازہ کھولا۔ چھوٹا سا کمرہ۔ صرف ضرورت کی چند چیزیں ساتھ میں غسل خانہ۔ وہ دروازے کی اوٹ میں کپڑے بدلنے چلی گئی۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے پیچھے جانے سے پہلے اس نے کیسٹ پلیئر چلا دیا تھا۔ کیسٹ سے تھائی گانوں کی بجائے ہندی گانوں کی آواز آرہی تھی۔

”تم ہندی گانے سنتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ جواب ملا۔ ”یہ میرے بابا کے گانے ہیں وہ سنتا تھا۔“ اب وہ کپڑے بدل کر آ چکی تھی۔ ”میرا بابا ہندوستان سے آیا تھا۔ وہ میری ماں سے ملا۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ میری ماں نے گھر والوں سے چھپ کر میرے باپ سے شادی کر لی۔ گھر والوں نے اس کے بعد میری ماں کی شکل نہیں دیکھی۔ سب نے اس کو چھوڑ دیا۔ مگر وہ میرے باپ کی اتنی دیوانی تھی کہ اسے اور کچھ نہ چاہیے تھا۔ پھر میں پیدا ہو گئی۔ میرا باپ یہیں کا ہو رہا کبھی ہندوستان واپس نہ گیا۔ میری ماں ہی اس کا سب کچھ تھی۔“ وہ سانس درست کرنے کو رہی۔ میرا تجسس بڑھ رہا تھا۔ ”پھر کیا ہوا۔“

”پھر۔“ اس نے کہا۔ ”میرا باپ اچانک مر گیا۔ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی دو مہینے بعد وہ بھی مر گئی۔ میں اکیلی رہ گئی۔“ میرا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔ وہ رک گئی۔ ”تم چائے پیو گے۔“ ”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم ماما سین کے پاس کیسے پہنچ گئیں۔“

”ماما سین بہت اچھی ہے۔“ اس نے عقیدت سے کہا۔ میں نے ماما سین کو بار میں دیکھا تھا وہ خود تیس سال سے کم عمر کی رہی ہوگی۔ اس لڑکی نے بات جاری رکھی۔

”میرے کسی رشتے دار نے مجھے سہارا نہیں دیا۔ مالک مکان نے گھر سے نکال دیا۔ میں دو دن سے بھوکی تھی۔ سڑک پر غنڈے مجھے پکڑ کر لے جانا چاہتے تھے۔ ماما سین اور اس کے دو ساتھی وہاں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بچایا۔ پھر ماما سین مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ اس نے مجھے دو مہینے اپنے پاس رکھا۔ میں اپنا جسم نہیں بیچنا چاہتی تھی ماما سین کے پاس کب تک اس طرح رہتی۔ ماما سین بہت اچھی ہے۔ اس نے کبھی میرے ساتھ نہ ہی کوئی زیادتی کی اور نہ ہی اپنا جسم بیچنے پر مجبور کیا لیکن میں ہمیشہ کے لیے ماما سین پر بوجھ نہیں بن سکتی تھی۔ اپنی ذمہ داری

مجھے خود اٹھانی تھی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”آج میں بہت تھک گئی تھی۔ ورنہ میں ماماسین کا نقصان نہ کرتی۔ ماماسین فرشتہ ہے۔“

اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں طوائف کا جو پلید اور غلاظت بھرا تصور تھا دھل چکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ سو بھات رکھے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

یہ لڑکی ایک ہندوستانی مرد اور ایک تھائی عورت کی لازوال محبت کا شرمیلی جو بینکاک کے بازاروں میں بک رہی تھی۔

ہوٹل جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اصل بدکار کون تھا ماماسین جو اس لڑکی سے پیشہ کروائی تھی یا وہ معاشرہ جس نے ایک کم عمر اور بے سہارا لڑکی کو تحفظ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا ماماسین واقعی فرشتہ تھی۔

طبیعت مکدر ہو چکی تھی۔ ماں یاد آ رہی تھی۔ میں نے پھوکیٹ کا پروگرام کینسل کیا اور اگلے روز کراچی پہنچ گیا۔ ماں کی ماما میری منتظر تھی۔

باقی چھٹیاں کراچی میں گزار کر میں جدہ پہنچ چکا تھا۔ میرا دنیا کے گرد کا سفر پورا ہو چکا تھا لیکن میں نہیں، بائیس دن میں۔ میرے سعودیہ میں شامل ہونے کے بعد سے اب تک سعودیہ تین مزید 1011-1 اور B-747 اور گیارہ A-300 جہاز خرید چکی تھی۔ اب اس کو B-707 طیاروں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ ویسے بھی یہ جہاز کافی پرانے ہو چکے تھے۔ پرانے جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا خرچہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ یہ جہاز فالتو تھے پیچھے جا سکتے تھے۔ گاہک کی تلاش تھی۔ اسی دوران سعودی حکومت نے طے کیا کہ ایک B-707 سوڈان کے صدر نمیری Numairy کو تحفہ پیش کیا جائے۔ اس تحفے سے متعلق تمام تکنیکی امور کی ذمہ داری میرے سر تھی۔

جب بھی کوئی جہاز خریدایا یا بیچا جاتا ہے یا کسی اور طریقے سے اس کی منتقلی ایک فریق سے دوسرے فریق کو ہو تو یہ دستور ہے کہ اس کا C چیک کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جہاز کو مرمت اور دیکھ بھال کا پچھلے کئی سال کا ریکارڈ بھی منتقل کیا جاتا ہے۔ انجن کے ریکارڈ کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پچھلے چند سال سے بہت سے بوئس پرزے مارکیٹ میں آ گئے تھے اور کئی

حادثوں کا باعث بنے تھے۔ اس لیے اب انجن کی منتقلی سے پہلے اس کے پیدائش سے آج تک کا تمام ریکارڈ ہونا لازمی قرار پایا۔

جہاز کے انجن بنیادی طور پر گیس ٹربائن ہوتے ہیں ان کو صنعت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر ان کے مواصفات سے اتنے سخت نہیں ہوتے جتنے جہاز کے استعمال کے لیے ضروری ہیں۔

ان کے پرزے جہاز میں استعمال کیے جانے والے پرزوں کی نسبت کمزور ہوتے ہیں۔ کم قیمت ہوتے ہیں۔ یہ جہاز کے انجن میں قانونی طور پر استعمال نہیں کیے جا سکتے ہیں لیکن چند ان اداروں نے ان پرزوں کو ناجائز طور پر جہاز کے انجنوں میں لگانا شروع کر دیا تھا جس کے خطرناک نتائج سامنے آ چکے تھے۔ جس کی بنا پر انجن کے پرزوں کے ریکارڈ کی فراہمی لازمی قرار دے دی گئی تھی۔ اس کے بغیر انجن نہیں بیچے جا سکتے تھے۔

جہاز کا چیک مکمل ہو چکا تھا۔ کل صبح یہ سوڈان جائے گا۔

جہاز کو سعودیہ کے رائل ٹرمینل کے سامنے پارک کر دیا گیا ہے۔ میرے پاس رات میں ڈکرن کا فون آیا۔ ”ریڈیو لائسنس اور جہاز کا رجسٹریشن کس کے پاس ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ ڈکرن نے جواب دیا۔ ”اتارے بھی تھے یا نہیں۔“ پھر وہی جواب ملا۔ ”معلوم نہیں۔“ میں فوراً ایئر پورٹ بھاگا یہ دونوں دستاویزات سول ایوی ایشن میں جمع کروانی تھیں۔ جہاز کا سوڈانی رجسٹریشن ہو چکا تھا۔

میں نے جہاز پر سیر می لگوائی اور دونوں دستاویزات گھر لے آیا۔

صبح دفتر پہنچا تو کرٹ کے پاس پیشی ہوگی۔ ”تم رات میں سوڈان والے جہاز پر گئے تھے۔“

”ہاں ریڈیو لائسنس اور رجسٹریشن اتارنے۔“ میں نے جواب دیا۔ کرٹ نے مجھے بتایا کہ میرا حلق دنیا کے کس جانور سے ہے۔

”تم سے بڑا گدھا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس اعزاز کی وجہ کا بھی پتا چل گیا۔

”تم آخری آدمی تھے جو جہاز پر گئے تھے۔ تم سیدو رٹی رسک بن چکے ہو۔ اس فلائٹ پر سوڈان کی بہت اہم

مختصیتیں پرواز کریں گی اگر خدا نخواستہ کوئی حادثہ ہوا تو تم جیل جانے والے پہلے آدمی ہو گے۔“

کرسٹ کی بات سو فیصد سچ تھی میں نے کام کی دھن میں اس بات پر غور ہی نہ کیا تھا کہ مجھے یہ کام سرکاری طور پر کروانا چاہیے تھا۔ جب تک جہاز خرطوم کے ائر پورٹ پر اتر نہ گیا میں تمام مسافروں کی درازی عمر کی دعائیں مانگتا رہا۔

ایک B-707 جا چکا تھا مگر ابھی پانچ کا مسئلہ باقی تھا۔ پھر اچانک بوننگ کے مقامی منیجر نے جوحدہ میں سعودیہ کے دفاتر میں بیٹھا تھا رابطہ کیا کہ بوننگ کمپنی ان جہازوں کو خریدنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ وہ ان کو ٹینکر میں تبدیل کریں گے۔ ظاہر ہے ٹینکر لڑاکا جہازوں کو فضا میں ایندھن پہنچانے کے لیے استعمال ہوتے۔ بوننگ خود تو ان کو استعمال نہیں کرے گی کوئی اور ان کے ذریعے ان جہازوں کو خریدے گا۔ سعودیہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ طیارے بطور ٹینکر کسی ایسے ملک کو پہنچ جائیں جن سے سعودی عرب کو کسی قسم کا خطرہ ہو۔ یہ چیز بوننگ پر واضح کر دی گئی مذاکرات لندن میں ہوں گے سلمان کوٹی اور میں مذاکرات میں شامل ہوں گے۔

عدنان ترقی ہو کر EVP آپریشنز کی خدمت پر معذور ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ سلمان کوٹی VP انجینئرنگ بنا دیے گئے تھے۔ لندن کی بہت مشہور لافرم کا ورڈ چانس کے نام سے تھی جو لندن میں سعودیہ کے تمام قانونی معاملات سنبھالتی تھی۔ پہلی میٹنگ ان کے ساتھ تھی۔

میٹنگ سعودیہ کے لندن ٹاؤن آفس میں ہونی تھی۔ مقررہ وقت پر ایک ٹریڈ ٹاؤن آفس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ دہلی، ممبئی، کراچی، آنکھوں پر عینک گردن پر مظہر، زکام زدہ سسز سسز کرتی ہوئی ”میرا نام این ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔ ”میں کا ورڈ چانس میں وکیل ہوں۔ ایوی ایشن میرا فیلڈ ہے۔“ میں نے اور سلمان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کی نگاہوں میں مایوسی تھی مگر میٹنگ تو بہر حال کرتی تھی۔ ہم نے این کو اپنے نکات بتائے۔ این نے ان کو نوٹ کیا۔ پھر سوالات پوچھنے شروع کیے وضاحت طلب کی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے ہم کو اندازہ ہوتا گیا کہ ہمارا پہلا تاثر کس قدر غلط تھا این بہت ذہین تھی۔ اگلے دن جب وہ کنٹریکٹ بنا کر لائی تو وہ سو فیصد ہماری ضروریات اور

خواہشات کے مطابق تھا۔

کئی سال بعد میں اور سلمان ایک دفعہ پھر لندن میں کا ورڈ چانس کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اس دفعہ B-747 کے مال بردار جہاز کی خریداری کا مسئلہ تھا۔ سلمان نے خاص طور سے این کے متعلق پوچھا اور اس کی ذہانت اور کام کی تعریف کی۔ این کسی اور پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ مصروفیت کی بنا پر ہم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مگر اس کا کام ہمارے ذہن پر اپنے نقش چھوڑ چکا تھا۔

ہمارا قیام لندن کے ہیتھرو ائر پورٹ پر تھا۔ ہیتھرو پر دو شیرٹن ہوٹل ہیں۔ ایک شیرٹن ہیتھرو کہلاتا ہے۔ دوسرا اسکائی لائن شیرٹن۔ ہم اسکائی لائن شیرٹن میں ٹھہرے تھے۔ سعودیہ کا آپریشنز آفس بھی اسی ہوٹل میں تھا۔ اس سے پہلے یہ آفس ہیتھرو ہوٹل میں ہوا کرتا تھا اس وقت سعودیہ کے زیادہ تر لوگ بھی ہیتھرو ہوٹل میں ہی ٹھہرا کرتے تھے۔ یہ ہوٹل بہت پرانا تھا اور دنیا کی تقریباً ہر ائر لائن کے لوگ یہاں ٹھہرا کرتے تھے خاص طور سے پائلٹ وغیرہ۔ ہیتھرو ہوٹل کی بار میں ساری دنیا کے پائلٹ ایک دوسرے سے اپنے اپنے تجربات بیان کرتے تھے۔ بعد میں اس کا نام بدل کر پینٹا ہوٹل رکھ دیا گیا آج کل یہ کسی اور نام سے چلتا ہے۔

اسکائی لائن نیا ہوٹل تھا۔ اس کی خاص بات اس کا بار تھا۔ بار کے سامنے بڑا ساحل بنا ہوا تھا۔ بار میڈ اس میں تیر کر آتی تھیں اور مہمانوں کو ان کی طلب کردہ مشروبات پہنچاتی تھیں۔

میٹنگ سے واپس آکر میں اور سلمان تازہ دم ہونے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ گھنٹے بھر بعد بار کے سامنے ملنے کا پروگرام تھا۔ ایک گھنٹا بعد ہم لوگ پول کے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لڑکی تیرتی ہوئی آئی اور ہماری مشروبات ہم کو تھما دیں۔ میں اپنا ٹریڈ مارک کوک پی رہا تھا۔ سلمان اپنی پسندیدہ مشروب۔ سلمان بغیر رکے۔ بلا ٹکٹان اور بلا ٹکلف گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ ان کا افتتاحی جملہ ہوتا تھا۔ ”میں بولتا بہت ہوں۔“ اس کے بعد وہ دو دو تین تین گھنٹے مسلسل بول کر اپنے افتتاحی جملے کو سچ ثابت کرتے تھے۔ سچ بھی یہی ہوا۔

دوسرے دن بوننگ سے میٹنگ تھی۔ جو دو دن جاری رہی۔ سارے معاملات طے ہوئے۔ کنٹریکٹ کو حتمی شکل دے دی گئی۔ تین دن بعد میں اور سلمان جدہ واپس آ چکے

جب کوئی بات طے ہو جائے تو پھر وہ ہر طرح سے اور پوری ایمانداری سے اس پر کار بند رہتی ہیں۔ چاہے ان کا نفع ہو یا نقصان، زبان۔ زبان ہے۔

ڈکرن نے محنت اور جانفشانی سے اپنے کام کو احسن طور پر انجام دیتے ہوئے وقت سے پہلے ہی B-707 کے چیک۔C عمل کر لیے تھے۔ یہ جہاز بوئنگ کو بروقت ڈیلیور کر دیے گئے۔ اب سعودیہ کے بیڑے میں کوئی B-707 باقی نہ بچا تھا۔

Opec کے وجود میں آنے کے بعد ترکی دہائی میں تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے باعث مغربی ملکوں کو جو معاشی جھٹکا لگا تھا اس کے نتیجے میں ان ملکوں نے بعض اہم قدم اٹھائے تھے جس کے نتیجے میں اتنی (80) کی دہائی کے شروعات سے ہی تیل کی قیمتیں گرنے لگی تھیں۔ Opec کے ملکوں کو شدید معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ تیل کی قیمتیں 36 ڈالر فی بیرل سے گر کر 9 ڈالر فی بیرل تک پہنچ چکی تھیں۔ ان حالات میں سعودیہ کو مزید دس B-747 جہاز خریدنے تھے۔ اس زمانے میں B-747 کا نیا ماڈل آچکا تھا یہ ماڈل B-747-300 کہلایا۔ اس سے پہلے سعودیہ نے آئندہ 100 - B-747 اور دو B-747-SP خرید رکھے تھے۔

B-747-300 کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی اوپری منزل کو پیچھے کی طرف کافی بڑھا دیا گیا تھا۔ اب یہاں پر سٹیش نصب کی جاسکتی تھیں جن پر مسافروں کو بٹھایا جاسکتا تھا۔ اس سے پہلے والے جہازوں پر اوپری منزل چھوٹی سی ہوتی تھی۔ اس میں مسافروں کے لیے صوفہ نما سٹیش تھیں جو فروخت نہیں کی جاسکتی تھیں اس لیے کہ ان میں وہ مضبوطی نہیں ہوتی تھی جو مسافروں کی سیٹ کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت ان سیٹوں کو خالی رکھنا لازمی تھا۔ ان صوفہ نما سیٹوں پر ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

B-747 کی عرفیت SUD پڑ گئی۔ اوپری منزل کی لمبائی کی وجہ سے SUD اسٹریچڈ اپر ڈیک (Stretched upper deck) کا مخفف تھا۔

اگلے روز بوئنگ کی مواصفات کی ٹیم کے ساتھ میٹنگ ہوئی۔

ٹیک کے اہم ترین جز یعنی چائے کے لوازمات

تھے۔ جہازوں کا چیک C شروع کروا دیا گیا۔ اس پروجیکٹ کا انچارج ڈکرن چودھان تھا۔ قومیت لبنانی۔

B-707 کے ایک اور واقعے کا ذکر کردوں جو دو سال قبل پیش آیا تھا۔ ایک دن انسپکشن کے دوران معلوم ہوا کہ جہاز چارلی چارلی (CC) میں بہت بڑا کریک ہے۔ جہاز فوراً گراؤنڈ کر دیا گیا۔ اس حالت میں اس کے اڑنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کریک اتنا بڑا اور گہرا تھا کہ مروجہ طریقوں سے اس کی مرمت ناممکن تھی یا تو بوئنگ کمپنی کوئی نیا طریقہ مرمت بتائے یا پھر ونگ بدلا جائے۔ بوئنگ کی ٹیکنیکل ٹیم کریک کا جائزہ لینے کے لیے جدہ آئی۔ واپس جا کر تجزیہ کر کے بوئنگ نے بتایا کہ مرمت ہو جائے گی مگر کام بہت بڑا ہے۔ بوئنگ کے اپنے آدمی کام کریں گے۔ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کتنا وقت اور کتنے آدمی لگیں گے۔ اس لیے کہ ایسا کام پہلے B-707 پر نہیں ہوا تھا۔ خرچا سات لاکھ ڈالر کے قریب اگر منظور ہو تو سعودیہ بتا دے۔

سعودیہ کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ کام ہو گیا۔ پیسے دے دیے گئے۔ چند مہینے بعد بوئنگ کے پاس سے پیغام آیا کام اندازہ سے زیادہ آسان نکلا۔ خرچہ صرف پانچ لاکھ ڈالر کا ہوا ہے۔ بوئنگ کے پاس سعودیہ کے دو لاکھ ڈالر جمع ہیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اور ہوا۔ سعودیہ نے جو آخری تین L-1011 جہاز خریدے تھے۔ اس میں ایک رعایت یہ تھی کہ لاکھ بیس سعودیہ کو چند لاکھ ڈالر کے پرزہ جات مفت فراہم کرے گا۔ لاکھ بیس کمپنی شہری ہوا پازری سے نکل کر اب صرف ملٹری جہازوں پر توجہ دینا چاہتی تھی۔ L-1011 کے سارے معاملات بند کر دیے گئے۔

یہ تین جہاز خریدے ہوئے تھے حال گزر چکے تھے۔ ایک دن لاکھ بیس کا خط آیا کہ ان چند لاکھ ڈالر کی رعایت سعودیہ نے استعمال میں کی ہے۔ وہ پیسے دے کر پرزہ جات خریدتے رہے ہیں۔ یہ ڈالر سعودیہ کی طرح لینا پسند کرے گی۔

ان واقعات کا ذکر صرف اس وجہ سے کیا گیا کہ جب جہاز ساز کمپنیاں مذاکرات کرتی ہیں تو ناکوں پہنے چوہا دیتی ہیں۔ خاص طور سے جہاں ذمہ داریوں کا ذکر ہو تو وہ اپنے کنٹریکٹ کے متن سے ایک لفظ ادھر سے ادھر نہیں ہوتیں مگر

مکمل تھے۔ دودھ کے ساتھ ساتھ لیموں اور پودینے کا بھی بندوبست تھا۔ اس دور سے گزرنے کے بعد مواصلات پر توجہ دی جانی تھی۔ اب تک سعودیہ دو کھپوں میں دس جہاز خرید چکی تھی۔ مواصلات کا مرحلہ دودھ طے کیا جا چکا تھا مگر اس دفعہ چند ایک نئی چیزیں تھیں۔

سعودیہ کی سب سے لمبی پرواز ریاض اور نیویارک کے درمیان ہو سکتی تھی جس کا دورانیہ نیویارک جاتے ہوئے پندرہ سولہ گھنٹے اور واپسی پر گیارہ پارہ گھنٹے ہو سکتا تھا۔ جانے اور آنے میں وقت کی کمی یا زیادتی ہوا کے رخ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کرۂ عرض پر ہوا میں مغرب سے مشرق کے رخ چلتی ہیں۔ جاتے وقت یہ باد مخالف ہوتی ہے۔ ہیڈ ونڈ کہلاتی ہے۔ جہاز کو ہوا کے خلاف اڑنا پڑتا ہے۔ واپسی میں ہوا ایک طرح سے جہاز کو دھکا دیتی ہے جہاز کی پرواز کا وقت گھٹ جاتا ہے۔ یہ ٹیل ونڈ کہلاتی ہے۔

کسی پائلٹ کو اتنے لمبے دورانیہ کے لیے جہاز اڑانے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے لمبی پرواز کے لیے ڈبل عملہ ساتھ چلتا ہے۔ ایک جتھا جہاز اڑاتا ہے۔ دوسرا آرام کرتا ہے۔ جب پہلے عملے کا وقت پورا ہو جاتا ہے تو وہ آرام کرتا ہے۔ جہاز کی کمان دوسرے عملے کو سونپ دی جاتی ہے۔

B-747-SP میں جگہ کی کمی کی وجہ سے دوسرے عملے کے لیے مسافروں کی سیٹوں کو استعمال کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ان سیٹوں کا کرایہ ضائع ہو جاتا تھا۔ B-747-300 میں جگہ بہت بڑھ گئی تھیں اب جو ائر لائن چاہیں ایسے جہازوں میں عملے کے آرام کرنے کے لیے گریوریٹ بنک لگاوا سکتی تھیں اس کی قیمت تھی۔

دوسری اہم چیز ایندھن کا ذخیرہ تھا کہ جہاز میں اتنا ایندھن ڈالنے کا بندوبست ہو کہ بلا کسی پریشانی کے جہاز ریاض سے نیویارک پہنچ جائے۔ اس کا بندوبست جہاز کے کارگو کمپارٹمنٹ میں فالٹو ٹینک لگا کر کیا گیا تھا۔ یہ جہاز میں قیمت ادا کر کے لگوائے جاسکتے تھے۔

زائد ایندھن کے وزن کے توڑ کے لیے ایسے انجن کی ضرورت تھی جس کی کارکردگی بہتر ہوتا کہ وہ کم سے کم ایندھن استعمال کر کے منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ یہ تمام چیزیں خالص مینیکل تھیں لیکن ایک اور اہم تبدیلی تھی جو سعودیہ کی انا کا مسئلہ تھا۔ سعودیہ کے جہازوں اور دوسری ہوا باز کمپنیوں کے جہازوں میں ایک خاص امتیاز یہ تھا کہ اپنے

مسافروں کے طور طریقوں کو مد نظر رکھتے ہوئے سعودیہ کے جہازوں میں فرسٹ کلاس کی سیٹیں بہت زیادہ تعداد میں ہوتی تھیں۔ سعودیہ کی خواہش تھی کہ سعودیہ کے B-747-300 کا فرسٹ کلاس کاسٹیشن ایسا ہو کہ دنیا کی کسی ائر لائن کا نہ ہو۔ سب سے بڑا سب سے اچھا سب سے بہتر وغیرہ کی ذہنیت کا فرما تھی۔ دنیا کی سب سے بڑی سائیکل جو سو فٹ سے بھی لمبی تھی۔ جدہ کی ایک چورنگی پر نصب تھی۔

بونگ کی ٹیم کو سیائل (Seattle) واپس جا کر ان سب امور پر کام کرنا تھا۔ اس کے بعد دوسری مینٹنگ سیائل میں ہوگی۔ اس مینٹنگ میں کافی وقت باقی تھا مگر مجھے اس سے پہلے ایک ضروری ذاتی کام کرنا تھا۔

میں آج تک براعظم جنوبی امریکا کے کسی ملک نہ گیا تھا۔ ریو ڈی جینیرو کا بہت شہرہ تھا۔ مگر مشکل یہی تھی لمبی چھٹیاں نہیں مل سکتی تھیں۔ صرف چار پانچ دن۔ وہی حیدرآباد دکن کی مثل نہیں ماموں سے ٹکٹے ماموں بہتر۔ جانا تو تھا۔

مراکش کا نام بھی بہت سن رکھا تھا لیکن کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ مراکش کی ائر لائن سعودیہ کے ملازمین کو 90 فیصد رعایتی ٹکٹ بھی دیتی تھی۔ رائل ائرموراک کی پرواز مراکش کے شہر کا سا بلا نکا سے براستہ ڈکار ریو جاتی تھی۔ ایک پختہ دو کاج مراکش اور ریو دونوں جگہ جایا جاسکتا مگر بہت کم عرصے کے لیے۔ سعودیہ کی فلائٹ سے میں کا سا بلا نکا پہنچ گیا۔ کا سا بلا نکا دو دن ٹھہر کر یہاں سے ریو براستہ ڈکار ائرموراک سے جانے کا پروگرام تھا۔

ساتویں صدی عیسوی میں کا سا بلا نکا پر بربر لوگوں کی بادشاہت تھی۔ پھر کا سا بلا نکا عربوں کے ہاتھ آیا پھر آخر میں پرتگالیوں اور ہسپانیہ کے ہاتھ۔ پرتگالیوں نے اس کا نام کا سا برا نکا رکھا جس کے معنی سفید گھر کے ہیں۔ جب ہسپانیہ نے اس پر قبضہ کیا تو کا سا برا نکا کو اس کے ہم معنی ہسپانوی زبان کے نام کا سا بلا نکا سے تبدیل کر دیا۔ عرب کا سا بلا نکا کو مدار البیض کہتے اس کے معنی بھی سفید گھر کے ہیں۔

کا سا بلا نکا مراکش کا سب سے بڑا شہر ہے جس کی آج کی آبادی تقریباً تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں شمالی افریقہ کا سب سے بڑی بندرگاہ بھی ہے لیکن مجھے کا سا بلا نکا سے زیادہ فیض جانے کا شوق تھا۔ میں کا سا بلا نکا کے بازار سے دوڑ رہا تھا مجھے مقامی سامان آرائش

کی تلاش تھی۔ ایک دکان پر رکا تو اس نے عربی میں بات کرنا شروع کر دی۔ میں نے بتایا کہ مجھے عربی نہیں آتی۔ ”تو کیا تم تیونس کے باشندے نہیں ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”نہیں میں پاکستان سے آیا ہوں۔“ اس نے عربی انداز سے میرے گل چوم کر خوش آمدید کہا۔ ”یہ ہمارے عزت اور شرف کا مقام ہے کہ ایک پاکستانی بھائی ہمارے پاس آیا ہے۔“ میرا دل مسرت سے بھر گیا کہ مسلم امہ کا فرد ہونے کے ناطے ہر مسلمان ملک میں ہمارا استقبال محبت اور عزت سے کیا جاتا ہے۔

فیض کی جامعہ القرویین دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی مانی جاتی ہے۔ یہ 895ء میں فاطمہ الفجری نے بنوائی تھی۔ فاطمہ کا خاندان تیونس سے فیض آکر بس گیا تھا۔ یہ دو بہنیں تھیں۔ ان کا باپ بہت امیر سوداگر تھا۔ فاطمہ کو جو دولت ورثے میں ملی تھی اس نے اس ساری دولت کو مسجد اور مدرسے کے لیے وقف کر دیا۔ شروع شروع میں یہ عمارت بہت سادہ طرز پر بنائی گئی تھی مگر پھر آنے والے حکمرانوں نے اس میں توسیع اور ترمیم کا اہتمام کیا۔ دیکھنے والی جگہ ہے۔

کاسابلانکا سے پرواز براستہ ذکر جاتی تھی۔ ایک گھنٹا کے قریب جہاز رکتا تھا۔ وہاں سے ریوی، جیرو، برازیل، براعظم جنوبی امریکا میں برازیل وہ واحد ملک ہے جہاں کی سرکاری زبان ہسپانوی نہیں ہے۔ برازیل میں پرتگالی زبان بولی جاتی ہے۔

ریو ڈی جنیرو، امارت اور غربت کا تضاد ہے۔ کم آمدنی والے لوگوں کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ بسیں بہت گنجان ہیں۔ ریو میں جرائم کی بھی کثرت ہے۔ غربت بہت ہے۔ ریو کے متعلق دنیا میں اتنا لکھا جا چکا ہے کہ میرے مزید لکھنے یا نہ لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں یہاں کے مشہور مقامات دیکھنے آیا تھا۔ جن میں کرائسٹ کا وہ مجسمہ شامل تھا جس کے ساتھ کھڑا ہو کر آدمی اپنے آپ کو ایک چونسے کی طرح محسوس کرتا ہے یہ مجسمہ اتنا ہی دو بقامت ہے مشہور شکر لوف چنان بھی دیکھی مگر میرا زیادہ مقصد اپنا بیچ دیکھنا تھا جس پر وہ گانا لکھا گیا تھا ”دی گرل فروم اپانیمہ“۔

میں ہوٹل سے باہر جانے لگا تو ہوٹل کے مینیجر نے کہا۔ ”سر یہاں آپ دو چیزوں کا خیال رکھیے گا پہلی چیز یہ کہ جب آپ بیچ پر جائیں تو تمام قیمتی سامان ہر وقت اپنے پاس

رکھیں۔ خاص طور سے کیمرا۔ یہاں بیچ پر گھومنے والے لڑکے اس قدر تیز رفتار ہیں کہ اگر وہ آپ کا کیمرا لے کر بھاگے تو آپ ان کو نہیں پکڑ سکیں گے۔ دوسرے کسی لڑکی کو ہوٹل مت لائیے گا۔ یہ لڑکیاں اکیلی نہیں ہوتیں۔ ان کا گروہ ہوتا ہے۔ جب لڑکی کمرے میں آ جاتی ہے تو اس کے ساتھی تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ لڑکی دروازہ کھول دیتی ہے یہ لوگ مہمان کو لوٹ لیتے ہیں۔ اگر مہمان مزاحمت کرے تو زبرد کو ب کرتے ہیں۔ میرا آج رات زبرد کو ب ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔“

مراکش اور ریو گھومنے کا شوق پورا ہو چکا تھا۔ سیٹل کی میٹنگ انجام پا چکی تھی۔ ایندھن کے زائد ٹینک، کریورسٹ بنک وغیرہ ملے ہوئے تھے۔ انجن کی کارکردگی کی ذمہ داری رولس راس کی تھی۔ جہاز کی قیمت ادا کرنا حکومت کی ذمہ داری تھی۔ فرسٹ کلاس کی سیٹوں اور قالین کی ذمہ داری سعودیہ کی تھی مگر اس سے پہلے اسپئر انجن کا ذکر۔

سعودیہ نے دس B-747-300 خریدے تھے۔ ان دس جہازوں پر کل ملا کر چالیس انجن نصب تھے۔ سعودیہ کی پروازوں کے دورانیہ وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادت سات اسپئر انجن کافی تھے مگر جو کنٹریکٹ رولس راس کے ساتھ ملے پایا وہ بیس اسپئر پاور پلانٹ کا تھا۔ کم سے کم تیرہ اسپئر انجن فالتو خریدے گئے تھے جن کی سعودیہ کو کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ بھی بنیادی انجن نہیں بلکہ پاور پلانٹ جو سادے انجن کی بہ نسبت زیادہ مہنگے ہوتے ہیں۔ یہ کنٹریکٹ سعودیہ نے نہیں ملے کیا تھا۔ تفصیل میں پردہ نشینوں کے نام آئیں گے۔ معذرت ہے کہ اس کا ذکر نہیں ہو سکتا۔

سعودیہ کے پاس ان انجنوں کے رکھنے کی جگہ نہ تھی یہ انجن شاپ کے باہر رکھے رہتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سے تین یا چار انجن کو ڈیٹا پلیٹ کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو پوری طرح سے کھول کر ان کے پرزہ جات کو بطور اسپئر پرزہ جات استعمال کیا گیا۔ چار انجن آنے والے وقت میں B-747 کے مال بردار جہاز میں لگائے گئے مگر پھر بھی کئی انجن بیچ رہے۔ ہر پاور پلانٹ کی قیمت اس وقت ساڑھے سات ملین ڈالر کے قریب تھی۔ انگلستان کے اخبار فنانشل ٹائمز نے اس سودے پر پورا ایک اخبار کے صفحے، مضمون بھی شائع کیا جس کا آخری جملہ تھا ”مگر ہر چیز قانون کے مطابق کی گئی تھی۔“ کیس کلوزڈ۔

لوٹ کلاس کے لیے فرانس کی کمپنی سکما کی بنا

ہوئی سیٹیں استعمال کی گئیں جن کا نام فارس سیٹ رکھا گیا یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ آرام دہ سیٹیں تھیں۔ قالین وہ لگایا گیا جس میں پاؤں دھنس جائیں۔ سامان رکھنے والے خانوں کی بنائیاں سونے کے پانی پھیرے ہوئے دھات کی بنائی گئی تھیں۔ سگریٹ کے راکھ دان بھی سونے پھرے دھات کے بنائے گئے تھے۔ ہر جہاز پر تقریباً چھ لاکھ ڈالر کا خرچہ آیا تھا مگر دنیا نے اس سے پہلے اتنا آرام وہ فرسٹ کلاس سیکشن نہ دیکھا تھا۔ وقت مقررہ پر یہ جہاز جدہ پہنچ گئے اور استعمال میں آ گئے۔

جب قاہرہ جانے والی پہلی پرواز جدہ واپس آئی تو سونے کے پانی پھرے ہوئی دھات کی ایئر ٹرے غائب تھیں۔ قاہرہ کے ملینکس کو ہتا چل گیا تھا کہ ان پر سونا پھرا ہوا ہے۔

قاہرہ اسٹیشن پر چوری معمول کی بات تھی۔ سعودیہ کے جہاز جب قاہرہ سے واپس آتے تھے تو پندرہ بیس ایرجنسی کٹ سیٹوں کے نیچے سے غائب ہوتی تھیں۔ مسافر ان کو بطور سوغات لے جاتے تھے اور سمندر میں تیرنے کے لیے استعمال کرتے۔ یہ ان کا حق تھا۔ آخر کو انہوں نے نکت خرید ہوا ہوتا تھا۔

قاہرہ کے حوالے سے ایک لطیفہ سعودیہ میں مشہور تھا کہ ایک دفعہ ایک مصری بدو جہاز میں داخل ہوا اس کو جو پہلی سیٹ ملی اس پر بیٹھ گیا۔ یہ فرسٹ کلاس کی سیٹ تھی۔ غلے کے ہرٹھن نے اس کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر میں ایک مصری اسٹیورڈ آیا اس نے بدو کے کان میں کچھ کہا جس پر بدو نے اپنا پونٹا سنبھالا اور پیچھے اکا نومی کلاس میں چلا گیا۔ اسٹیورڈ نے اس بدو سے کان میں صرف یہ کہا تھا۔ ”یہ سیٹ قاہرہ نہیں جائے گی۔ قاہرہ جانے والی سیٹ پیچھے ہے۔“

ضروری نوٹ: اس کتاب کے تمام لطیفے سناٹے ہیں۔ ان میں میرا ہنادماغ استعمال نہیں ہوا ہے۔ قاہرہ کی پرواز چند راکھ دانوں کی چوری کے کارکن معطل نہ کی جاسکتی تھیں لیکن یہ راکھ دان عام دھات کے بنائے جاسکتے تھے۔ یہی اس مسئلے کا حل نکالا گیا۔ قاہرہ کے ملینکس کی مایوسی کا کسی کو خیال نہ آیا۔ اب سعودیہ کے بیڑے میں بیس B-747 شامل تھے مگر ایک آخری B-747 اور خریدا جائے گا۔ یہ مال بردار B-747 ہوگا۔ سعودیہ کے B-747 کی پہلی کھیپ کی وصولی

شروع ہو چکی تھی۔ شاید تیسرا یا چوتھا جہاز تھا۔ سعودیہ کے پائلٹ اس جہاز کو وصول کرنے سائل ائر پورٹ پر اترے۔ کو پائلٹ اور فلائٹ انجینئر تو امیگریشن سے آسانی سے فارغ ہو گئے مگر کپتان کو روک لیا گیا۔ جب کپتان آگیا تو اس نے امیگریشن والوں سے کہا کہ میں واپس جا رہا ہوں مگر نقصان تمہارا ہو گا اڑتالیس ملین ڈالر کا۔ امیگریشن آفیسر جو نکلے۔ ”نقصان کیسے ہوگا۔“

”میں یہاں سعودیہ کے لیے جہاز وصول کرنے آیا ہوں۔ میں واپس چلا جاؤں گا اڑتالیس ملین ڈالر بھی میرے ساتھ واپس چلے جائیں گے۔“

اڑتالیس ملین ڈالر میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ ”یس سر۔“ کپتان کے پاسپورٹ پر ٹھہلا گ گیا۔

سعودیہ کو ایک مال بردار B-747 خریدا تھا لیکن تیل کی قیمتیں جو آسمان سے باتیں کرتی تھیں اب زمین پر اتر آئی تھیں۔ اڑتالیس ملین ڈالر نقد کا رعب ختم ہو چکا تھا۔ مال بردار جہاز حاصل کرنے کی دو صورتیں تھیں یا تو کسی ایک مسافر بردار طیارے کو مال بردار میں تبدیل کروا لیا جائے جس میں خرچہ چاکم تھا۔ یا نیا جہاز خریدا جائے۔

کارگو، انجینئرنگ اور کنسٹرکٹ کی ٹیم تشکیل دی گئی جس نے آدمی دنیا چھان کر مشورہ دیا کہ نیا جہاز خریدنا بہتر ہے۔ نئے جہاز کے کنسٹرکٹ پر دستخط ہو گئے۔ ایڈوانس پیسے بھی دے دیے گئے۔ اب جہاز تیار تھا باقی پیسوں کا بندوبست کرنا تھا جس کا درد سعودیہ نے پہلی دفعہ محسوس کیا۔ بینک سے قرض لیا جائے۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ سعودیہ نے پہلے بھی قرض پر جہاز نہ خریدا تھا ہمیشہ نقد کا سودا کیا تھا۔ اس کے علاوہ اور پیچیدگیاں بھی تھیں۔

عام طور سے جہاز کے انجن جہاز ساز کمپنی مہیا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ سعودیہ نے B-747-300 کے ساتھ بیس فالٹو انجن خرید رکھے تھے۔ جن میں سے زیادہ تر استعمال نہیں ہوئے تھے۔ ضرورت سے بہت زیادہ تھے۔ مال بردار جہاز کے انجن ان ہی فالٹو انجنوں میں سے مہیا کیے گئے تھے۔ اس کی وجہ سے انشورنس کی پیچیدگیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ان انجنوں کی وارنٹی بھی ختم ہو چکی تھی۔

ان تمام پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے فائننس، انشورنس، لیگل، کنسٹرکٹ کی ٹیم لندن پہنچ گئی۔ دو ہفتے کی مسلسل کوششوں کے بعد یہ معاملات حل ہو چکے تھے۔ جہاز کی وصولی کے لیے کپتان اپنے دوسرا عملہ سائل روانہ ہو چکا

تھا۔

سعودیہ کی پوری ٹیم کے لیے یہ نیا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے پیسوں کو ہم میں سے کسی نے اتنا اہم نہ سمجھا تھا۔

سعودیہ کے ڈائریکٹر جنرل کمپنیشن مطر نے سعودیہ کی ٹیم کے تمام شرکا کو تعریفی خطوط جاری کیے جن میں ٹیم کے شرکا کی کوششوں کو سراہا گیا تھا۔

اب جب بھی قرضہ لے کر جہاز خریدنا پڑا۔ ہماری ٹیم خدمت کے لیے تیار ملے گی۔

☆.....☆

سعودیہ کے ساتھ یہ میرا آخری پروجیکٹ تھا۔ مزید چھ B-747 جہاز خریدنے تھے۔

اس سے پہلے تین کھپ میں سعودیہ میں B-747-F مال بردار جہاز خرید چکی تھی۔ جتنے بھی مواصفاتی، قانونی، معاشی نکات ہو سکتے تھے ان پر کئی کئی دفعہ مذاکرات ہو چکے تھے یہ کنٹریکٹ بالکل سیدھا سادا تھا۔ اس کے دستخط ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے سوچا۔ ہمیشہ کی طرح میں اس دفعہ بھی غلط تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سلمان کوٹی تھے۔ وائس پریزیڈنٹ مینیکٹل۔ ”میرے کمرے میں آ جاؤ۔ نئے جہازوں کا کنٹریکٹ لیتے آنا۔“

”یا اللہ خیر۔“ میں نے سوچا۔ سلمان کے کمرے میں پہنچا تو ارشاد ہوا۔ ”اس کنٹریکٹ میں تبدیلیاں لا کر اس کو سعودیہ کے حق میں بہتر بنانا ہے۔“

بارہ سال پہلے کا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ میں شرمعی کے دفتر میں کھڑا تھا۔ شرمعی نے مجھے L-1011 کا کنٹریکٹ دکھا کر بالکل یہی بات کہی تھی جو آج سلمان مجھ سے کہہ رہے تھے۔ اس کنٹریکٹ کو سعودیہ کے حق میں بہتر بنانا ہے۔ پھر میں نے L-1011 کے کنٹریکٹ کو بہتر بنانے کے لیے جو شاندار کارنامہ انجام دیا تھا اس کے نتیجے میں شرمعی بولنا بھول چکے تھے صرف ہاتھ کے اشاروں سے مجھے اپنے دفتر سے دفع کیا تھا۔

لیکن پچھلے بارہ سال میں مجھے کنٹریکٹ کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔

”اس میں ہر چیز ملے ہے۔ تم کس قسم کی تبدیلی

چاہتے ہو۔“ میں نے سلمان سے تفصیل جانتی چاہئیں۔ سلمان چاہتے تھے کہ چند دوسری چیزوں کے علاوہ بونگ کی ذمہ داریوں میں بھی تبدیلی لائی جائے۔ میں نے سلمان سے کہا ”باقی چیزیں تو شاید بونگ کو قابل قبول ہوں مگر ذمہ داریوں میں وہ کس سے کس نہیں ہوں گے۔ ذمہ داری کی شقیں کنٹریکٹ میں ایسے لکھی جاتی ہیں جیسے جوہری انگوٹھی میں گھینے جوڑتا ہے ایک ایک لفظ سوچا سمجھا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں تبدیلی ناممکن ہے۔“ سلمان خود کنٹریکٹ کے مجھے ہوئے کھلاڑی تھے۔ ان کو بھی معلوم تھا لیکن بولے۔ ”تم بونگ کو لکھو۔ دیکھا جائے گا۔“ میں نے بونگ کو لکھ دیا۔ جواب وہی آیا جس کی توقع تھی۔

”یہ ایسے نہیں مانیں گے۔“ سلمان نے کہا۔ ”ان کے مقابلے پر دوسری کمپنی کو کھڑا کرنا پڑے گا۔ تم ڈگھس کو لکھو کہ ہم کو چھ MD-11 جہاز خریدنے ہیں۔“ سعودیہ کا دور دور بھی MD-11 خریدنے کا خیال نہ تھا یہ کھیل صرف سلمان اور میں کھیل رہے تھے۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ڈگھس کا نہ صرف جواب آیا بلکہ ان کی مارکیٹنگ ٹیم اگلے ہفتے جدہ میں موجود تھی۔ جواب میں سعودیہ کی ٹیم بھی ڈگھس اور G.E کی فیکٹریوں کے دورے پر گئی۔

سب کچھ ہو گیا مگر ذمہ داریوں کے ضمن میں ڈگھس کا موقف بالکل وہی تھا جو بونگ کا تھا۔ سلمان کو اور مجھے پہلے ہی اس کا اندازہ تھا مگر سلمان ایک دفعہ کوشش کر دیکھنا چاہتے تھے۔ سعودیہ کا MD11 خریدنے کا مطلق ارادہ نہ تھا۔

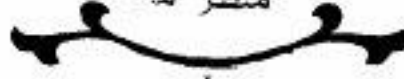
میں سعودیہ کو خبر یاد کہہ کر ٹورنٹو آ چکا تھا۔ چند ہفتے بعد معلوم ہوا کہ وہ آرڈر جو چھ B-747 سے شروع ہوا تھا بڑھ چڑھ کر ساٹھ جہازوں سے بھی اوپر پہنچ چکا تھا۔ سعودیہ نے نہ صرف MD-11 بلکہ ان کے ساتھ ہی ساتھ ڈگھس کے چھوٹے جہاز MD-90 اور G.E کے انجن خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میرے عزیز دوست اور G.E کے سعودی نژاد امریکی ڈائریکٹر مارکیٹنگ محمد لدانی کو ان کے دیرینہ سوال کا جواب مل چکا تھا۔

”یا شیخ رزاقی تم میرے انجن کب خریدو گے۔“ سعودیہ۔ الوداع۔

خزانہ

منظر امم



مدفون خزانے کی تلاش صدیوں سے انسان کو صحرائوں، پہاڑوں، جنگلوں میں بھٹکاتی رہی ہے۔ کچھ لوگ کامیاب بھی ہوئے ہیں مگر زیادہ تر ناکامیابی کا زخم کھا کر جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے آج بھی ایسے بے شمار سر پہرے موجود ہیں جو اپنی جان ہتھیلی پر لے کر سمندر کی گہرائی میں۔ فلک بوس برفیلی چوٹیوں پر اور جنگل بیابانوں میں مدفون خزانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسے بہت سے مدفون خزانے ہیں جن کی تلاش میں سر پہرے پاگلوں کی طرح بھٹک رہے ہیں۔

انسان بہت سے خوابوں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ نئے خواب دیکھ کر رہتا ہے۔ پر یوں کے خواب، شہزادوں کے خواب، انکی طاقتوں کے خواب جو اس کے کنٹرول میں آکر اس کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

ایسا ہی ایک خواب خفیہ خزانوں کا ہے۔ ہزاروں کہانیاں اس قسم کے خفیہ خزانوں پر لکھی جا چکی ہیں۔ رائیڈر ہیکر ڈک کے بیج سلیمان سے لے کر زید ولینڈ تک کا خزانہ کبھی پتا چلتا ہے کہ فلاں سمندر میں برسوں پہلے جو

ملتان کا خزانہ

ملتان کے محلہ باغ واڑہ دہلی گیٹ کے ایک مکان میں ہونے والا واقعہ بہت الم ناک اور سبق آموز ہے۔ یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم ابھی تک کن چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ جعلی عامل اور بابا قاسم کے لوگ کس طرح ہماری سادہ لوحی اور راتوں رات دولت مند بن جانے کے خوابوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ذیشان عالم قریشی نام تھا اس شخص کا جس کو ایک بابا نے بتایا کہ تمہارے مکان میں ایک خزانہ دفن ہے۔ عالم قریشی کی عمر 68 برس تھی۔ بے چارہ غریب انسان، جس نے کبھی اچھے دن نہیں دیکھے تھے جسے معلوم ہی نہیں تھا کہ دولت کیا ہوتی ہے اور مل جائے تو زندگی کتنی خوش گوار ہو جاتی ہے۔

عالم قریشی جس مکان میں رہتا تھا وہ کسی زمانے میں ایک سکھ خاندان کی ملکیت تھا۔ وہ سکھ خاندان 1947ء میں پاکستان سے ہندوستان چلا گیا تھا۔

بابا نے بتایا کہ وہ سکھ خاندان اس مکان میں بہت سی دولت دفن کر کے گیا ہے۔ کیوں کہ وہ اتنی دولت اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔

عالم قریشی نے دریافت کیا۔ ”بابا اب وہ خزانہ میرے ہاتھ کیسے آسکتا ہے؟“

”بہت آسان ہے۔ خزانہ تیرے گھر میں دفن ہے۔ گھر تیرے قبضے میں ہے۔ بس کھدائی شرع کر دو۔“

اور اس بد نصیب نے کھدائی شروع کر دی۔ محلے والوں کے بیان کے مطابق عالم قریشی کے مکان سے کئی مہینوں سے کدال اور بھادڑے چلنے کی آوازیں آتی رہی ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ گڑھے کی مٹی کو ٹوکاٹے لگانے کا تھا۔ اس کے لیے عالم قریشی نے یہ کیا کہ آنگن میں مٹی جمع کرتا چلا گیا۔

بالآخر 13 اپریل 2014ء کو خزانے کی تلاش رنگ لائی کہ وہ سرنگ ہی بیٹھ گئی جس میں عالم قریشی کھدائی کر رہا تھا۔ اس جنونی نے پچاس فٹ گہری سرنگ بنائی تھی۔ پچاس فٹ گہری بغیر کسی سہارے کی سرنگ کا یہی انجام ہونا تھا۔ وہ اچانک بیٹھ گئی اور عالم قریشی منوں منی تلے دفن ہو گیا۔

سنابے کہ پولیس نے اس بابا کو گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کچھ دنوں بعد وہ بابا رہا ہو کر پھر کسی اور کو بے وقوف بنارہا ہوگا۔



ذیشان قریشی کے گھر میں امدادی کارکن سرنگ معائنہ کرتے ہوئے

جہاز ڈوبا تھا اس کا خزانہ آج تک محفوظ ہے اور ہم جو حضرات ان خزانوں کی تلاش میں غوطہ خوری کرنے نکلتے ہیں۔

کبھی پتا چلتا ہے کہ فلاں گم شدہ تہذیب کا خزانہ فلاں جنگل میں محفوظ ہے اور لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر خفیہ خزانے کا ایک عدد نقشہ بھی ہوتا ہے جس کی مدد سے یہ بے چارے خواب دیکھنے والے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اس موضوع پر لا جواب فلمیں بھی بن چکی ہیں جیسے رائیڈ آف دی لوموسٹ آرک۔ ایسے خزانے اہرام مصر کی داستانوں سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے کے ان خزانوں کو تلاش بھی کیا جاتا رہا ہے اور تھوڑی بہت کامیابی بھی ہوئی ہے۔

خفیہ خزانے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو روایتی یا افسانوی ہوتے ہیں یعنی ان کی حقیقت کہانوں کی ہوتی ہے۔ جو صدیوں سے سنی جاتی رہی ہیں اور دوسری قسم کے خزانے وہ ہوتے ہیں جو تصدیق شدہ ہوتے ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ ان خزانوں کا واقعی کوئی وجود تھا اور اب وہ غائب ہو چکے ہیں۔

اس قسم کے حقیقی اور غیر حقیقی خزانے پوری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان میں بھی ہیں اور ہمارے یہاں ان کو حاصل کرنے کے لیے جعلی باباؤں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو اپنے نام نہاد عملیات کے ذریعے بتا دیتا ہے کہ جاؤ فلاں مقام پر کرڈروں کا خزانہ ہے، کھود کر حاصل کر لو۔

پچھلے دنوں ملتان میں ایسے خزانے کی تلاش کے دوران میں جو الم ناک واقعہ پیش آیا اس سے تو یوں ملک واقف ہے۔ آپ نے بھی اخبارات میں پڑھا اور ٹی وی چینلز پر دیکھا ہوگا۔ یہاں ہم آپ کو تھوڑی سی تحقیق دے کر دنیا کے دیگر ایسے علاقوں کی طرف لیے چلتے ہیں جہاں افسانوی اور حقیقی دونوں طرح کے خزانے موجود ہیں۔

بہر حال یہ تو تھا ملتان کا واقعہ۔ اب ہم دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرف چل کر دیکھتے ہیں کہ کہاں کہاں واقعی خزانے ہیں یا صرف روایات ہیں۔

کوسوناگی کا خزانہ

یہ ایک روایتی خزانہ ہے۔ اس کا تعلق جاپان کی ایک قدیم کہانی سے ہے۔

کوسوناگی ایک روایتی کوار کا نام ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے وہ کوار جو بادلوں کو بھی کاٹ کر رکھ دے۔ ممکن ہے کہ کسی اور کے لیے اس نام اور اس کوار کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو لیکن جاپانیوں کے لیے یہ بہت مقدس ہے اس لیے اس کی قیمت کروڑوں میں ہے۔



کہانی کچھ یوں ہے کہ قدیم زمانے میں ایک بلا تھی جس کے آنے سے اور آٹھ ہی دم تھیں۔ اتفاق سے اس بلا نے ایک غریب خاندان کو دکھ لیا جس کی آٹھ بیٹیاں تھیں۔ اب وہ بلا ہر صبح آتی اور اس غریب کسان کی ایک بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ اس طرح وہ اس کی سات بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جب وہ آٹھویں اور آخری بیٹی کو لینے آنے والی تھی۔ اس وقت دیوتا سکھ سانو کو اس بلا کے بارے میں بتایا گیا۔ اس نے اس کسان کو بچانے کا

فیصلہ کر لیا۔ اس نے معلوم کیا کہ اس بلا کو کھانے میں کیا پسند ہے۔ اس نے وہی چیز آٹھ مختلف مقامات پر زہر ملا کر رکھ دی۔ وہ بلا اپنے وقت پر آئی۔ اس نے اپنی من پسند چیز دیکھی اور ایک منہ سے کھالیا۔ زہر کھانے کی وجہ سے بلا کچھ کمزور ہو گئی۔ وہ آگے بڑھی تو اس نے دوسری جگہ بھی وہی چیز دیکھی۔ خود کو روک نہ سکی اور اس نے وہ بھی کھالیا۔ اس طرح اس نے سات مقامات سے وہ من پسند چیز کھائی لیکن آٹھویں مقام کی چیز نہیں کھائی۔ پھر دیوتا سانو باہر نکلا اور اس نے بلا کو مارنا شروع کر دیا وہ اپنی کوار سے اس کے سروں کو کاٹا چلا گیا۔ جب تک بلا زہر کھا کر کمزور ہو چکی تھی۔ سات دم بھی کٹ گئیں۔ لیکن آٹھویں دم نہیں کٹ پائی۔ دیوتا سانو بہت حیران اور مایوس ہو رہا تھا کہ یہ دم کیوں نہیں کٹ رہی۔ پھر اس کی نگاہ بلا کے پیٹ میں رہی ہوئی کوار پر پڑی۔ اس نے وہ کوار اٹھائی اور اس کوار سے وہ دم کٹ گئی۔ یہ وہی کوار ہے جس کو کوسوناگی کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کوار جاپان کے شای خزانے میں موجود تھی۔ 1185ء میں یہ کہیں غائب ہو گئی۔ اب یہ جاپان کا بہت قیمتی گم شدہ خزانہ ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ صرف ایک کہانی ہو لیکن جاپانیوں کے مطابق یہ صرف کہانی نہیں ہے بلکہ اس کی بہت اہمیت ہے۔

لانوچ کا خزانہ

یہ خزانہ روایتی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ کیوں کہ اس کے کردار اور واقعات حقیقی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا خزانہ موجود ہو۔



لانوچ کے خزانے کی منتظر

بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جب وہ آٹھویں اور آخری بیٹی کو لینے آنے والی تھی۔ اس وقت دیوتا سکھ سانو کو اس بلا کے بارے میں بتایا گیا۔ اس نے اس کسان کو بچانے کا

سونا ہے۔

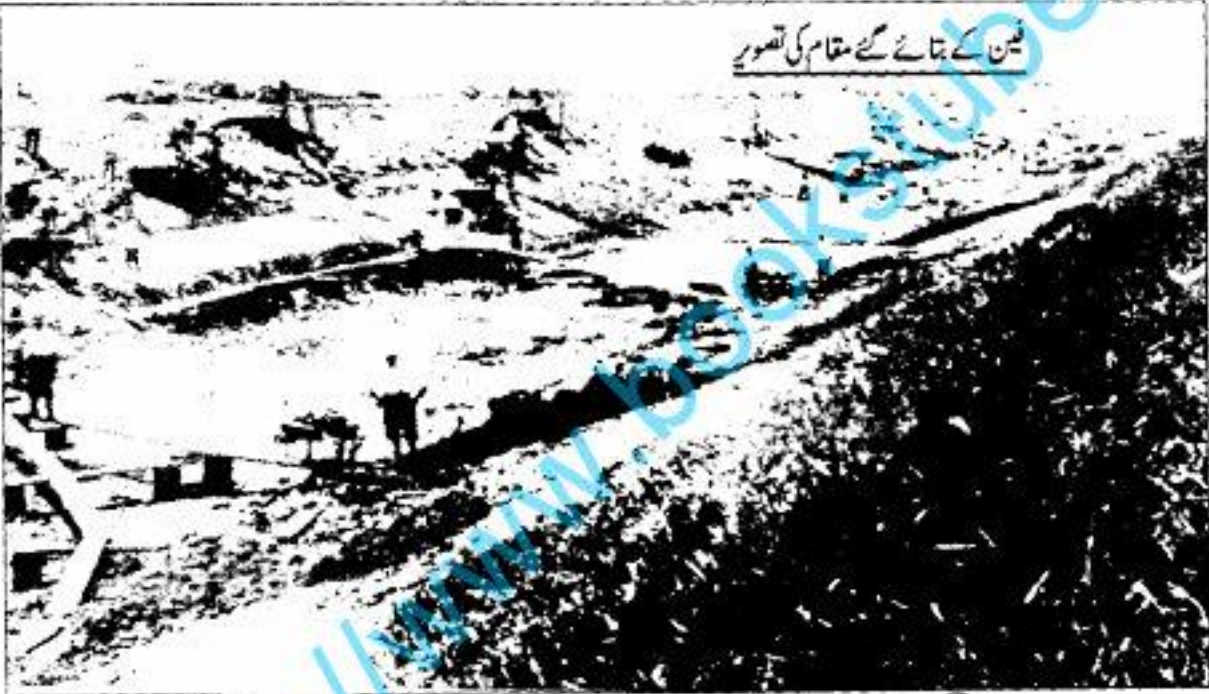
وہ سونا ایسی قوم کا ہو سکتا تھا جو سونا ذخیرہ کرنے کی شوقین ہو۔

فارمیٹ 1960ء میں پائلٹ بن گیا۔ پائلٹ بن جانے کے بعد اس نے اپنا ایک چھوٹا جہاز خرید لیا۔ وہ ان پہاڑیوں کے ارد گرد پروازیں کرتا رہتا جہاں اس نے پہلی بار سونے کا تیر دیکھا تھا۔ اس نے بیس سال اس جدوجہد میں لگا دیے۔ بالآخر 1980ء میں اس نے اعلان کیا کہ اس نے بہت کچھ پایا ہے لیکن وہ اپنی اس دریافت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ کیوں کہ اسے کینسر ہو چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنا خزانہ ان پہاڑوں کے دامن میں نہیں چھپا دیا ہے۔ اس نے ٹھیک مقام کی نشاندہی نہیں کی۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے جتنا خزانہ حاصل کیا اس کی

تاریخ بتاتی ہے کہ میکسیکو پر ازبیک حکمران تھے۔ یہ بہت تہذیب یافتہ اور دولت مند قوم تھی۔ اس کے آثار میکسیکو میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ ازبیک کے آخری حکمران کا نام میک فی زرماتھا۔ اس شخص کو سونا جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس سونے کے زیورات تھے، برتن تھے، سونے کا ایک تخت تھا اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

اسپین نے ازبیک سلطنت پر حملہ کر دیا۔ بہت زبردست جنگ ہوئی تھی اور ازبیک سلطنت کمزور پڑنے لگی۔ زوما کو یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اس جنگ میں شکست کھا جائے گا۔ اس نے اپنے سونے کے ذخائر میکسیکو کے ساحل پر نہیں چھپا دیے۔ وہ خزانہ آج تک معما بنا ہوا ہے کہ واقعی تھا بھی یا نہیں اور اگر تھا تو پھر کہاں ہے۔ اس کی تلاش بھی ناکام ہو چکی ہے۔

فین کے بتائے گئے مقام کی تصویر



فارمیٹ فین

یہ ایک شخص کا نام ہے جس نے خزانہ دریافت کر لیا تھا۔ یہ ایک حقیقی خزانہ ہے۔ یعنی اس کا وجود ہے۔ اب صدائے عام ہے یا رانہ کتہ داں کے لیے یعنی جو چاہے تلاش کر لے۔

فارمیٹ ٹیکساس میں رہتا تھا۔ جب وہ صرف نو جوان کا تھا تو اس نے اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی کے دامن میں ایک تیر پڑا ہوا پایا۔ وہ تیر خالص سونے کا تھا۔ اس کے بعد سے اس پر خزانہ حاصل کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ سونے کے اس تیر کا مطلب یہ تھا کہ آس پاس اور بھی

مالیت اس زمانے میں 3 ملین ڈالر بنتی تھی۔ اس حساب سے آج کی مالیت لگائیں۔ فارمیٹ خزانے کو چھپا کر مر گیا اور لوگ ابھی بھی اس خزانے کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

کیپٹن گرانٹ کا خزانہ

یہ خزانہ بھی حقیقی ہے۔ یعنی اس خزانے کا وجود ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی کی بات ہے جب لوگوں پر سونے کی تلاش کا جنون سوار تھا۔ ساحل کی ریت چھانی جاتی، دریاؤں میں ڈھونڈا جاتا، پہاڑوں میں تلاش کیا جاتا۔ یعنی جہاں جہاں سونا ملنے کے امکانات پائے جاتے لوگ وہاں بوریابسو لے کر پہنچ جاتے۔

عام ہوتے ہی مہم جو حضرات نے اس ڈوبی ہوئی لالچ کی تلاش شروع کر دی۔ بے شمار بارشیاں مختلف اوقات میں ان موتیوں کی تلاش میں جاتی رہیں لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر 1870ء میں لاس انجلس اسٹار نام کے ایک اخبار میں ایک شخص چارلی نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے وہ خزانہ تلاش کر لیا ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے کچھ موتی بھی دکھائے جو ویسے ہی تھے جیسے اس گم شدہ لالچ پر تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ لالچ سمندر کے اندر ایک بڑی پہاڑی کے درمیان پھنسی ہوئی ہے اور وہ اس مقام سے واقف ہے۔ وہ عنقریب ایک ٹیم لے کر جانے والا ہے۔ کیوں کہ اس خزانے کو کالنا ایک اسکیلے شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے کچھ لوگ بھی چاہئیں۔ لوگ



موتیوں کی تلاش جاری ہے

بھی آئے، تیاریاں بھی شروع ہو گئیں لیکن اس دوران میں اس شخص کا انتقال ہو گیا اور وہ خزانہ آج تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔

اوک آئی لینڈ کی دولت



ویسے تو یہ بھی ایک حوالاتی دولت ہے۔ ان کے



کپٹن گرانٹ مارشل ایک لالچ کا مالک تھا۔ وہ بھی اپنی لالچ لیے سونے کی تلاش میں بھٹکتا رہتا۔ کچھ لوگوں نے مونٹانا میں سونا تلاش بھی کر لیا تھا۔ سونے کے اس ذخیرے کے لیے جارج اے کسٹر اپنے فوجیوں کو لے کر پہنچ گیا اور اس نے بے شمار سونے کی سلاخیں مقامی لوگوں سے جنگ کرنے کے بعد حاصل کر لیں لیکن اس جنگ کے دوران میں اس کے بہت سے فوجی زخمی ہو گئے تھے۔ اسے یہ خبر ملی کہ کپٹن گرانٹ کی لالچ آس پاس ہی موجود ہے تو اس نے پیغام بھیجا کہ وہ زخمی فوجیوں اور سونے کی سلاخوں کو اپنی لالچ میں بھر کر لے جائے اور حکومت کے حوالے کر دے۔ کپٹن گرانٹ کی لالچ میں فوجی اور سلاخیں بھر دی گئیں لیکن کچھ آگے سمندر میں زیادہ بوجھ ہونے کی وجہ سے لالچ ڈوب گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کے لحاظ سے اس پر پونے چار لاکھ ڈالر کا سونا موجود تھا جس کا آج تک سراں میں رکھا ہے۔ اس کی تلاش میں بہت سے غوطہ خور ٹیمیں روانہ کی جا چکی ہیں اور خدا ہی جانے کہ وہ خزانہ کس کو ملتا ہے۔

موتی ہی موتی

یہ بھی ایک حقیقی خزانہ ہے۔ یعنی اس کا وجود ہے کیلی فورنیا کو لارا ڈور یا میں ایک لالچ ڈوب گئی تھی۔ وہ لالچ اسپین کی بھی اور اس میں بے شمار موتی بھرے ہوئے تھے۔ یہ خالص موتی تھے۔ جن کی مالیت کروڑوں کی ہو سکتی تھی۔ اس خبر کے



بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ 1795ء میں گم ہو گیا تھا۔ اس خزانے کی گمشدگی کا مقام کینیڈا کا ساحل نور اسکوشیا بتایا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق یہ خزانہ لاکھوں ملین ڈالر کا ہے۔ یہ ملا تو نہیں ہے اس کے باوجود اس کو تلاش کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں لیکن آج تک کامیابی نہیں ملی۔

پولینڈ کا شاہی خزانہ

ایک صدقہ خزانہ ہے۔ اس کی باقاعدہ ایک تاریخ ہے۔ یہ خزانہ بھی 1795ء میں کہیں گم ہو گیا ہے اور آج تک سراغ نہیں مل سکا۔

یہ پولینڈ کا شاہی خزانہ تھا۔ اس میں سونے اور جواہرات کے کئی تاج، تلواریں اور زیورات وغیرہ تھے۔ جرمنی کے فریڈرک ولیم (سوم) کے حکم پر لوٹا گیا تھا لیکن اس کے بعد ہی غائب ہو گیا اور آج تک غائب ہے۔ خزانے کی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ ایک چیلنج بن چکا ہے۔

لیما کا خزانہ

یہ بھی ایک صدقہ خزانہ ہے۔ یہ خزانہ 1820ء میں



چرا کر گوینڈا کا کے کوز جزیرے میں کہیں دفن کر دیا گیا تھا۔ مقام کی نشاندہی ہونے کے باوجود اس خزانے کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس کی مالیت 160 ملین کے قریب ہے۔

بے خانہ کا خزانہ

یہ اگرچہ ایک روایتی خزانہ ہے لیکن بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ موجود تھا۔ اس خزانے کی مالیت کا بھی تخمینہ لگا لیا گیا ہے۔ تقریباً 300 ملین ڈالر کا۔ یہ خزانہ حکومت کی ملکیت تھا۔ کہیں منتقل کیا جا رہا تھا کہ راستے میں لوٹ کر موجودہ ملبورن کے آس پاس کہیں دفن کر دیا گیا۔ اس خزانے کے گم ہونے کی تاریخ 1821ء ہے۔ اس کو ابھی تک تلاش کیا جا رہا ہے۔

ماہنامہ سرگزشت

Confidaratata gold

یہ بھی ایک صدقہ خزانہ ہے۔ 1865ء میں گم ہوا۔ یہ سونے کی وزنی سلاخیں تھیں جو امریکا کی خانہ جنگی کے دوران میں غائب ہو گئیں اور آج تک مل نہ سکیں۔

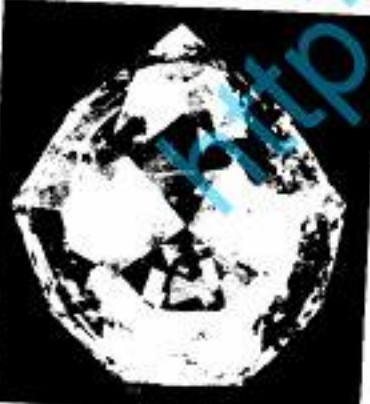
آئر لینڈ کے شاہی زیورات

یہ بہت قیمتی زیورات تھے جو 1907ء میں ڈبلن کے قلعے سے چوری ہو گئے اور کوئی نہیں جانتا کہ کون لے گئے اور کہاں لے گئے۔ اس زمانے اور اس کے بعد کئی حکومتوں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن وہ خزانہ آج تک نہیں مل سکا ہے۔

فلورینٹائن

کاہیرا

بیرے، جواہرات اور سونا ازل سے انسان کی کمزوری چلے آ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ انسان



ماہ 2015ء

اس کھوپڑی میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے لیکن پھر 1941ء میں وہ کھوپڑی کم ہو گئی۔ اسے ایک لالچ میں کہیں پہنچایا جا رہا تھا کہ بدقسمتی سے وہ لالچ ڈوب گئی اور اس کے ساتھ وہ کھوپڑی بھی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور آج تک اوجھل ہے اگر آپ میں ہمت ہے تو سمندر میں جا کر اسے تلاش کر سکتے ہیں۔

امبر روم

بادشاہوں اور ملکاؤں کے بھی کیا شوق ہوتے ہیں۔



ملکہ کتھیرین نے اپنی شب خوابی کے لیے یہ کمرہ بنوایا تھا۔ آپ اس کی تصویر دیکھیں تو آپ کے ہوش اڑ جائیں۔ کمرے کی دیواریں خالص سونے کی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ جن میں جگہ جگہ ہیرے لگے ہوئے تھے۔ چھت پر سونے کی زر دوزی کا کام تھا۔ کمز کیوں کے فریم اور چوکھٹ سونے کے تھے۔ فرش کی ٹائلز میں جگہ جگہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے کی مالیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکا ہے۔ اس کمرے کو جرمنوں نے دوسری جنگ عظیم میں جرمن بھجوا دیا تھا۔ وہاں یہ پورا کمرہ ہی غائب ہو گیا اور آج تک غائب ہے۔

یاما شینا کا خزانہ

یہ خزانہ بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے بے مثال اور اپنی مالیت کے لحاظ سے بے اندازہ تھا۔

1945ء میں جاپان کے جنرل تو مو یو کی نے لوٹا اور جاپانیوں کی شکست کے آثار دیکھ کر فلپائن کی ایک پہاڑی کے مختلف غاروں میں چھپا ہوا تانہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس خزانے کا آج تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔



کے کسی جسمانی کام میں نہیں آتے۔ اس کے باوجود ان کی اہمیت اور قیمت کسی زمانے میں کم نہیں ہوئی۔

دنیا میں ایک سے ایک خوب صورت ہیرے ہیں جن کی مالیت کروڑوں تک ہے۔ ان ہیروں کی پوری ایک تاریخ ہے لیکن اس وقت ذکر ہے فلورینٹائن کے ہیرے کا۔ یہ مکمل زر درگم کا اپنی مثال آپ تھا۔ ایسا زر درگم کا ہیرا دنیا بھر میں کہیں نہیں دیکھا گیا۔ یہ ہیرا 1914ء میں چوری کر لیا گیا تھا اور آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ اس قسم کی نایاب چیزوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ آسانی سے فروخت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ یہ مشہور ہوتی ہیں اور کوئی بھی اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتا۔ پھر چرانے والے نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا۔

Peking Man یہ کنگ کا آدمی

جی ہاں یہ بہت بڑا خزانہ ہے اور دل چسپ بات یہ



ہے کہ یہ نہ تو کوئی ہیرا ہے اور نہ ہی سونے سے بنی ہوئی کوئی چیز۔ یعنی اگر یہ آپ کے ہاتھ لگے تو آپ اسے فوراً پھینک دیں لیکن اس کی اہمیت اتنی ہے کہ آج تک کوئی اندازہ نہیں کر پایا ہے اور اس کی قیمت کروڑوں کی ہے۔ یہ ایک کھوپڑی ہے۔ جی ہاں انسانی کھوپڑی ہے۔ جب چارہ زندہ ہوگا تب ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی حاکم ہو۔ پتھروں کے غار میں رہتا ہو۔ اگلے سیدھے شکار کر کے اپنا پیٹ بھرتا ہو لیکن اپنی موت کے باوجود لاکھ سال بعد اس کی کھوپڑی کی قیمت کروڑوں میں جا پہنچی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ انسانی نسل کے پہلے انسان کی کھوپڑی ہے اس لیے ماہرین کے نزدیک اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے۔ وہ اس پر ریسرچ کرتے رہے ہیں۔ انسان کی ارتقا کے مختلف ادوار

آوامارو کا خزانہ

آوامارو ایک جاپانی بحری جہاز کا نام تھا۔ اس پر 5



بلین کے قریب سونا، پلاٹینم اور جواہرات وغیرہ تھے۔
آوامارو ڈوب گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خزانہ بھی
ڈوب گیا اور ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

پٹیاہ کا نیکلس

وہ بہت ہی قیمتی نیکلس ہندوستان میں پٹیاہ کے
مہاراجا بھوپندر کے پاس تھا۔ اس نیکلس میں 2930



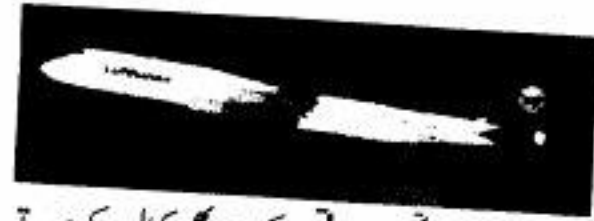
بیرے لگے تھے۔ اس میں دنیا کا ساتواں بڑا ہیرا بھی تھا
جس کا وزن 428 بیرے تھا۔

1948ء میں یہ نیکلس غائب ہو گیا۔ کہاں غائب
ہوا یہ کسی کو نہیں معلوم۔ آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔

لفت ہنسا کا خزانہ

لفت ہنسا جرمنی کی ایک فضائی کمپنی کا نام ہے۔
1978ء میں اس کمپنی کے ایک طیارے میں ایک صندوق
رکھا گیا۔ اس صندوق میں 5 بلین ڈالر تھے اور امریکا کے
جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر وہ صندوق غائب ہو گیا۔ کہا
جاتا ہے کہ اس وقت تک وہ چوری امریکا میں نقد رقم کی سب

ماہنامہ سرگزشت



سے بڑی چوری تھی۔ اس قسم کے چور بھی کمال کے ہوتے
ہیں جن کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہوگا کہ یہ
آنکھوں سے کا جل تک چرا لیتے ہیں۔ اسی طرح برسلز میں
بھی ایک طیارے سے 50 بلین کے جواہرات چوری ہو
چکے ہیں۔

یہ تو چند واقعات ہیں، چند خزانے ہیں، ان کے علاوہ
اور نہ جانے کتنے ایسے خزانے ہوں گے جن کی حضرت
انسان نے اپنی جانوں سے بڑھ کر حفاظت کی ہوگی لیکن آج
وہ غائب ہو چکے ہیں یا کم از کم ان کے استعمال میں تو نہیں
آ رہے جنہوں نے یہ خزانے جمع کیے تھے۔

انسان سب جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز اس کے
کام میں نہیں آنے والی۔ اس کے باوجود وہ دولت کے انبار
لگائے چلا جاتا ہے۔

ٹاپ لیز جھیل کا خزانہ

بے انتہاء دولت تھی۔ سونے کی سلاخیں، زیورات،
جواہرات اور نہ جانے کیا کیا۔ دوسری جنگ عظیم کی تباہ
کاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ سب سے بڑا مسئلہ اس خزانے
کو دشمنوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ اس کے لیے
طریقہ یہ سوچا گیا کہ لوہے کے صندوقوں میں بھر کر جھیل میں
ڈال دیا جائے اور جنگ کے خاتمے کے بعد ان صندوقوں کو
نکال لیا جائے۔

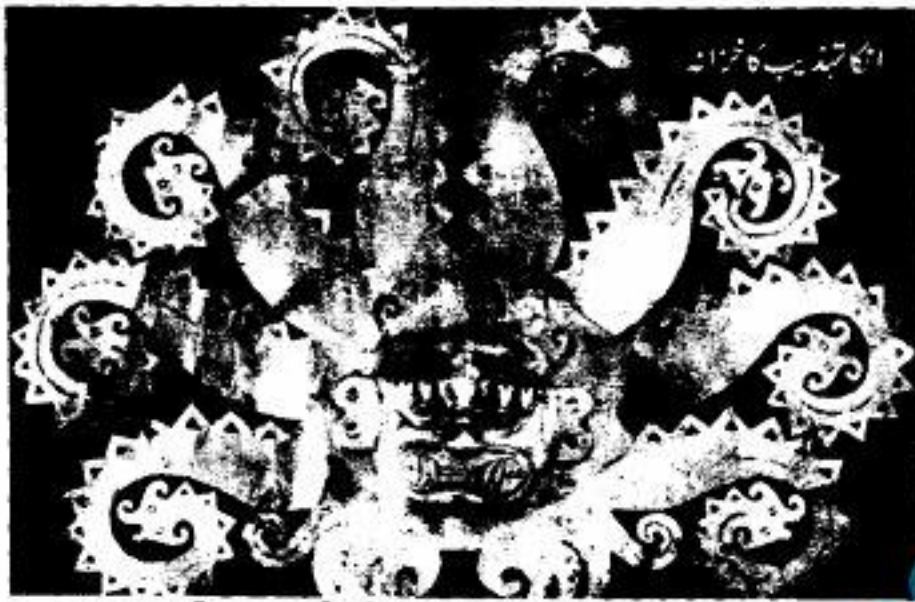
جنگ ختم بھی ہو گئی اس کے بعد جب اس خزانے کو
تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔
یا تو وہ صندوق چرا لیے گئے جو کہ بہت مشکل تھا یا پھر جھیل
میں ہونے والی کسی تبدیلی کی وجہ سے غائب ہو گئے۔

انکا تہذیب کا خزانہ

انکا تہذیب جنوبی امریکا کی بہت ترقی یافتہ تہذیب
تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انکا قوم تعمیرات، نجوم، طب وغیرہ جیسے
علوم میں مہارت رکھتی تھی۔ (پچھلے دنوں انکا تہذیب کے
کیلنڈر کا بہت چرچا رہا ہے)۔

اس ترقی یافتہ تہذیب کے آثار آج تک جنوبی
امریکا میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس قوم کے پاس بے اندازہ

مئی 2015ء



دولت تھی۔ ان کا ایک شہر

تھا۔ Paititi۔ جب یہ
تہذیب فنا ہونے لگی تو ان
کا یہ خزانہ اس شہر کے آس
پاس تھا لیکن برسوں گزر
جانے کے بعد بھی اس
خزانے کا پتا نہیں چل سکا
ہے۔

کن شی ہینگ

کا خزانہ

بیک سونے کی بنوا رکھی تھیں۔ اس قیمتی خواب گاہ کے
تذکرے چینی تاریخ میں موتے چلے آئے ہیں۔

پھر وہ پورا کمر اسی عائب ہو گیا۔ 1974ء میں اس
کی خواب گاہ کا صرف ایک حصہ دریافت ہوا لیکن بقیہ کمر
کہاں ہے اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ اس
کمرے کی گمشدگی بھی دنیا کے پراسرار واقعات میں سے
ایک واقعہ ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے خزانے
دفن ہوں جیسے ہمارے یہاں مختلف تہذیبیں گزری ہیں۔
موہن جو دڑو، ہڑپہ، نیکسلا اور گندھارا وغیرہ۔

کھدائی کے دوران میں چھوٹی موٹی چیزیں تو ملتی
رہی ہیں لیکن کوئی بڑا خزانہ ہاتھ نہیں لگا ہے۔

اس قسم کے خزانے کی تلاش کرنے والے دو کیمپری
کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو ریسرچ اور علم حاصل
کرنے کے لیے ان خزانوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے
ہیں اور دوسری کیمپری وہ ہے جو دولت کے لالچ میں ایسے
خزانے تلاش کرتے ہیں۔

اتفاق سے دوسری قسم کے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ
ہے اور ہمارے یہاں کے جالی عامل قسم کے لوگ اس
کام کی سہولت سے فائدہ اٹھا کر اٹے سیدھے طریقے بتاتے
رہتے ہیں۔

پوری دنیا میں حقیقی خزانے تو شاید کم ہی ہوں لیکن
روایتی اور افسانوی خزانے بہت زیادہ ہیں۔ ہماری کلاسیکی
کہانیاں ایسے خزانوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔





سراب

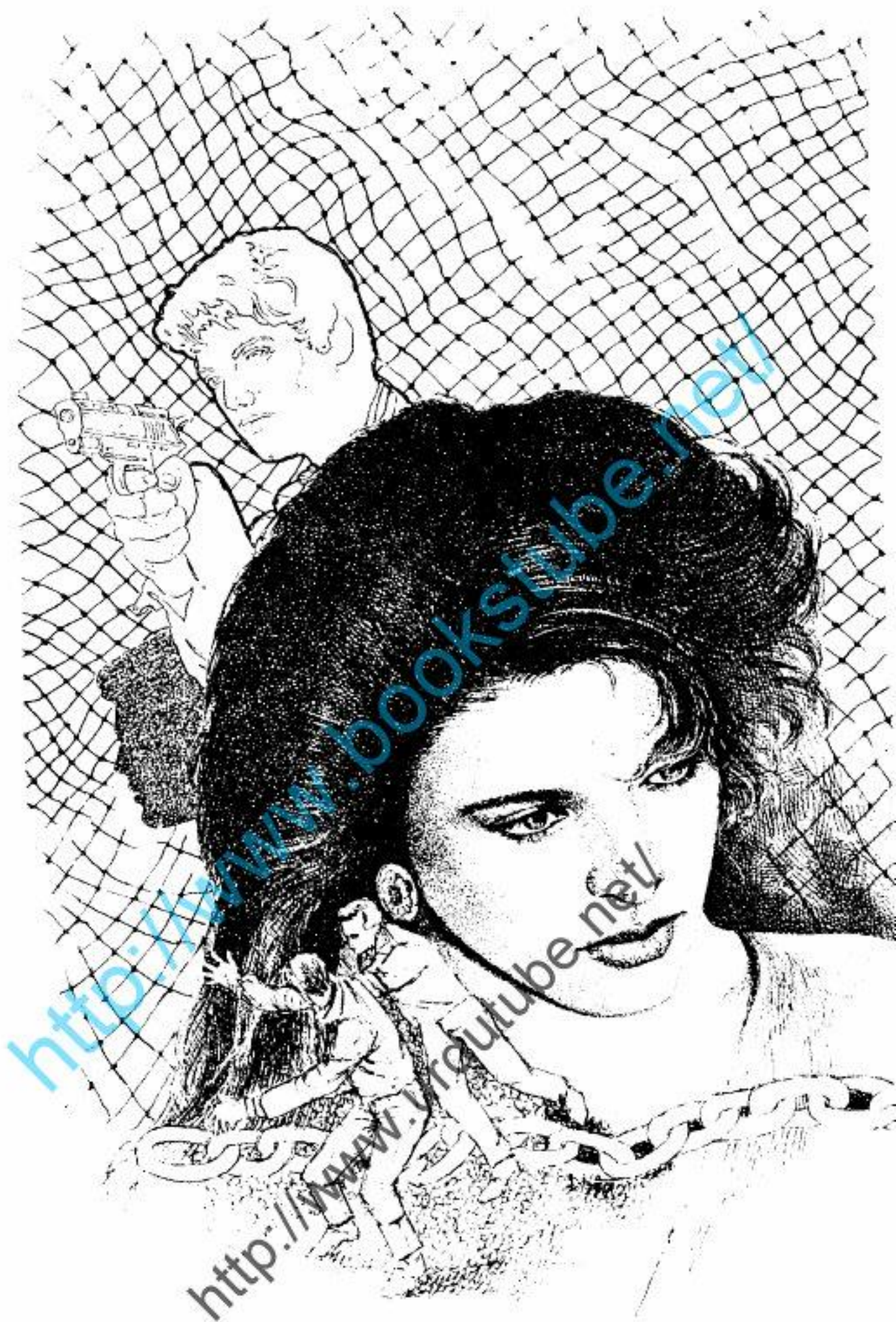
راوی : شہباز ملک

تحریر : کاشف زبیر

قسط نمبر: 95

وہ بیدار بنی ہوئی تھی۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں۔ برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدود سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری نہیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ بنا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بہنکاتا ہے۔ جذبیوں کو مہمیز دینا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لینا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزرتی اور گزرتی رہتی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبے ہوئے نوجوان کی سستی حسرت اور ولولہ انگیز داستان حیات

بندہ جو مصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہذیب خیز کہانی



میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادری سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہی جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور ویم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شاہی کے پیروں کی تلاش کرنے ہوں گے، میں پیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاش لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیسے تک پہنچا تھا کہ راج خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو کی کوزخی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر بیٹھ کر دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم ہانسمو پہنچے۔ وہاں دسم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو کی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو کی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ ہسپتال کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اسنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوزخی پر آ گئے۔ سفیر کو دعویٰ بھیجنا تھا اسے اتر پورٹ سے سی آف کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست دان کی بیٹی بیٹی کی تھی اور زبردستی ہمیں اپنی کوزخی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاک کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو زس مجھ سے چست گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ باؤنٹی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے چلے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ ٹائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پالیا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر مارا ہسپتال نکل کر دور جا کر پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیاہ کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اتر تو خبر ملی کہ سعد یہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے بمبلی کا پٹر لانے کو کہا۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناک بندی کرنے چاہیے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعد یہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی بیٹھنے لگی۔ سڑک پر نو کیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بیٹھ کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک بمبلی کا پٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بیٹھ کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر ارون اسے حراساں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دوطرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شاہی کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شاہی کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعد یہ کو کونسل سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجانی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ گھر سے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے فحشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شاہی کا وعدہ ہے سن نہیں پایا کیونکہ پوجانے نامک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر بمبلی پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ دیکھا فون لگا ہوا ہے۔ بھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے جیج کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر جمیر..... مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی جیج سنائی دی پھر فحشی دل نظر آیا۔ میں کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو شتم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانہ بنالیا۔ بھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیٹھ کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا ہسپتال راج کنور پر خالی کر دیا بیٹھ مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چٹا کے حوالے کیا اور ایک بمبلی کا پٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آئی۔ اس نے تصدیق کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم ہنگامے میں

بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شاکی قید میں شانے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہتا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہرا جیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنا لیا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہتایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائز زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیب کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شانے میرے چمپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے بیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گر پڑا تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی مار دی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دونو جوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

(اب آگے پڑھیں)

سے کہا۔ ”ہاں یہ غلطی کی مگر بہر حال تم قابو میں آ ہی گئے۔ اب اپنے ہاتھ پیچھے کرو۔“

میں نے ہاتھ پیچھے کیے تو اس نے پلاسٹک تار کی کس جانے والی جھکڑی سے میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے۔ شیر خان لہجے سے نہ تو قبائلی لگ رہا تھا اور نہ ہی اس طرف کاربے والا۔ البتہ اس نے حلیہ ضرور ایسا بنایا ہوا تھا۔ اس نے ڈھیلی شلوار قمیص اور اوپر پگڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے باقی دو ساتھیوں کا حلیہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔ مجھے بے بس کرنے کے بعد ان میں سے ایک کہیں گیا اور چند منٹ بعد ایک عجیب و غریب وجہ کے ساتھ نمودار ہوا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے لایا گیا اور جیب کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ دو میرے دائیں بائیں آگئے۔ شیر خان نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور ڈرائیونگ زینے کے حصے میں آئی جو بدستور اسی حلیے میں تھی۔ یہ لوگ مادر پدر آزاد لگ رہے تھے۔ البتہ سروی سے بچنے کے لیے اس نے ایک شال لے لی تھی۔ میرا اسلحہ اور دوسرا سامان انہوں نے میری ناکارہ ہو جانے والی جیب میں ڈال دیا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں کی بندش کی مضبوطی کا اندازہ کر رہا تھا اور جلد میں نے محسوس کر لیا کہ اسے کھولنا ممکن نہیں تھا زور لگانے سے یہ میری کلائیوں میں گزر رہی تھی۔ اس کی بندش ویسے ہی بہت سخت تھی اور ذرا سی دیر میں خون رکنے لگا تھا۔

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

ان کا رخ غریب کی طرف تھا یعنی وہ میدانِ علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ کہا گیا جاسکتا تھا۔ اس دشوار گزار علاقے میں بعض اوقات غریب کی طرف جانے کے لیے کئی

ابھی شیر خان کی رائفل سر پر موجود تھی کہ سامنے سے تارچ کی روشنی مجھ پر پڑی تھی۔ پھر دوسری تارچ آن ہوئی۔ میں ہر طرف سے گھر گیا تھا۔ زینے مجھ سے ڈرا دور سرک کر کھڑی ہوئی تو روشنی میں اس کی سڈول لمبی ٹانگیں نمایاں ہوئیں اور میں اس حالت میں بھی لاجول پڑھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شیر خان نے حکم دیا۔ ”ہتھیار آرام سے آگے ڈال دو جلد بازی مت کرنا۔“

”اگر میں جلد بازی کروں اور تم مجھے شوٹ کر دو تو ان لوگوں کو کیا جواب دو گے جنہوں نے مجھے زندہ سلامت لانے کو کہا ہے؟“

”انہوں نے ہم سے اپنی جان کی قیمت پر زندہ لانے کو نہیں کہا ہے۔ اگر ہمیں خطرہ ہوا تو ہم گولی چلانے میں دیر نہیں کریں گے۔“ شیر خان بولا۔ ”ہتھیار پھینک دو۔“ اس بار میں نے رائفل پھینک دی۔ ”مزید کوئی حکم؟“

”تمہارے پاس پستول بھی ہے۔“

”وہ جیکٹ میں ہے خود نکال لو۔“

شیر خان نے مجھے ٹٹولا اور جیکٹ سے پستول نکال لیا۔ اس نے میری مزید تلاشی لی اور باقی سب چیزیں بھی نکال لیں۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کا دم خیم قابلِ تعریف تھا۔ شاید گولی اس کے بازو کو چھوئی گزر گئی تھی۔ ورنہ وہ اتنے سکون میں نہ ہوتا۔ میں نے کہا۔ ”بہ قول اس خاتون کے تمہارے ساتھ اور افراد بھی ہیں تو تم نے مجھے اتنے گھٹیا انداز میں گرفتار کرنے کی کوشش کیوں کی؟“

”ہم بس چار ہی لوگ ہیں۔“ شیر خان نے آہستہ

عظیم سمجھتی ہے۔ صرف نصف صدی کے عرصے میں اس نے پے در پے ہمیں نقصانات اور صدمات سے دوچار کیا اور اس کے باوجود ہم اتنے سادہ ہیں کہ اب بھی اسے دوست بنانے کی سعی کر رہے ہیں۔ جب کہ وہ ہمیں برباد کرنے اور پاکستان کا نام دنیا کے نقشے سے مٹانے کے لیے ذرا بھی کوتاہی سے کام نہیں لے رہا۔ پتا نہیں کب ہمیں یہ بات سمجھ آئے گی۔ خوف اس کا ہے کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔

اچانک جیپ دھچکے سے رکی تو میں چونک کر خیالوں سے نکل آیا۔ جیپ سڑک کے ساتھ ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے رکی تھی اور شیر خان نے اتر کر لوہے کا گیٹ کھولا۔ زینی جیپ اندر لے آئی اور شیر خان نے عقب میں گیٹ بند کر دیا۔ میرے دائیں طرف موجود حصہ اتر اور اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے بھی نیچے اتارا۔ دوسرا اپنی طرف سے اتر آیا۔ زینی اب اندر جا رہی تھی۔ میں نے استہزاء بے انداز میں کہا۔ ”تم بٹے کٹے مرو پورے لباس میں ہو اس بے چاری نے کیا قصور کیا ہے؟“

”کیپ کو امیٹ۔“ میرے ساتھ موجود نوجوان نے کہا۔ میرا ہاتھ ٹکا کیونکہ وہ پہلی بار بولا تھا اب تک شیر خان یا زینی ہی بولتے آئے تھے۔ نوجوان کا لہجہ شہری اور تعلیم یافتہ تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہ نہیں تھے جو خود کو ظاہر کر رہے تھے۔ بلکہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے اوپری حصے میں شاید ایک ہی کمر تھا کیونکہ اس کی چھتیں ترجیحی اور لکڑی کی بنی ہوئی تھیں البتہ نیچے کی مکانیت زیادہ لگ رہی تھی۔ زینی نے لاک کھولا اور اندر چلی گئی۔ میں ان تینوں کے ساتھ اندر آیا۔ وہ میرے ہاتھ بندھے ہونے کے باوجود میری طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ شیر خان نے چاقو سے میری بندشیں کاٹیں اور انہوں نے مجھے ایک کمرے میں دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کمرہ چھوٹا تھا اور اس میں ایک سنگل بیڈ اور ایک طرف دیوار گیر الماری تھی۔ فرش پر قالین اور ایک کھڑکی پر اس کے ہم رنگ پردے لگ رہے تھے، میں نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کا معائنہ کیا تو اسے مضبوط گرل سے کور پایا۔

ظاہر ہے وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتے تھے کہ مجھے فرار کا راستہ عنایت کرتے۔ میں بازوؤں کو حرکت دیتا ہوا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ یہاں میرا قیام مختصر تھا اور جلد یا تو میرے خریدار مجھے لینے آجائے یا پھر یہ مجھے آگے بھجایا جاتا۔ انہوں نے جس طرح مجھے اپنا ٹھکانہ دیکھنے کا موقع دیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ یا تو یہ ان کا عارضی ٹھکانہ

بار جنوب کا رخ بھی کرنا پڑتا تھا کیونکہ سڑکیں اور راستے نایاب تھے۔ گنتی کی چند سڑکیں ہیں جو اس پورے علاقے کو آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم الائی سے کچھ ہی دور تھے۔ یہاں سے جیپ مغرب کی طرف مڑ گئی۔ یہ سڑک یتھورہ کی طرف بھی جاتی تھی اور اگر اس ردا میں طرف مڑ جاتے تو چترال کی طرف بھی جاسکتے تھے۔ صبح قریب تھی۔ میں ایک بجے سویا تھا اور ساڑھے تین بجے اٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد یہ چکر شروع ہوا اور اسے بھی اب ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ مشرقی افق پر سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اب ان لوگوں کا رویہ بہت پروفیشنل لگ رہا تھا۔ ذرا دیر میں روشنی ہونے لگی۔

میں سیٹ سے سر نکالے بظاہر آرام کر رہا تھا مگر نیم وا آنکھوں سے آس پاس کے مناظر دیکھ رہا تھا تا کہ مجھے معلوم رہے کہ یہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ چھ بجے ہم اس سڑک پر آ گئے جس کے ایک طرف یتھورہ تھا اور دوسری طرف چترال کو راستہ جاتا تھا۔ جیپ دوسری سمت مڑ گئی۔ گویا یہ مزید شمال کی طرف جا رہے تھے۔ میں کسی قدر مشکل میں تھا کہ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے میں پوری پشت نہیں لگا سکتا تھا اور نہ ہی آرام دہ طریقے سے بیٹھ سکتا تھا۔ دو گھنٹے کے سفر میں میرے بازو اکڑ گئے تھے۔ ان لوگوں سے پوچھنا بیکار تھا وہ اپنی منزل پہنچ کر ہی رکتے۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ مرشد یا کوئی اور دشمن نہیں ہو سکتا تھا جو مجھے یوں اٹھواتا۔ پھر اس طرف جانے کا کیا جواز تھا۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا۔ مجھے کرنل عبدالرحمن کا خیال آیا۔ کیونکہ وہ ایک بار اسی علاقے میں مجھے بلوا کر بھارتیوں کے حوالے کر چکا تھا۔ مگر اس سے میرا اب کوئی تنازعہ نہیں تھا۔ بلکہ آخری ہمدردی نے میری مدد بھی کی تھی۔ پھر یہ کون ہو سکتے تھے؟

بھارتیوں سے خیال آیا کہ کہیں ان لوگوں کو بھارتیوں نے ہار تو نہیں لیا تھا۔ بڑوسی ملک میں ہمارے اس ازلی دشمن نے اپنے پیچھے کا دل لے لیا تھا اور اب انہیں مضبوط کر رہا تھا۔ جگہ جگہ اس کے کوسلے تھے جو اصل میں را کے اڈے تھے۔ بھارتی سرگرم تھے اور میں ان کو مطلوب تھا۔ یہ سوچ کر میرے جسم میں پھر بری سی آگئی تھی۔ میں اس قوم اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ بھڑکی کھال میں بھیڑیا اور چرخ صفت قوم ہے۔ جب آپ کی زد پر آتی ہے تو قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے اور جب آپ کو اپنی زد میں لے لے تو رحم و مروت کرنا گناہ

تھا۔ اس خوب صورت پہاڑی علاقے میں بے شمار ایسے جنگلے اور کوٹھیاں ہیں۔ جو شہروں اور میدانوں میں رہنے والے صاحب ثروت لوگوں نے بنوا رکھی ہیں اور وہ سال میں چند مہینے یا چند ہفتے یہاں گزارتے ہیں باقی سارے سال یہ کوٹھیاں اور جنگلے خالی پڑے رہتے ہیں۔ چونکہ یہاں ہوتے ہیں مگر وہ آرام سے اپنے گھر میں بیٹھ کر خواہ لیتے ہیں اس لیے ان جنگلوں کو استعمال کرنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

دوسرا امکان یہ تھا کہ میری والدہ جی نہ ہوتی اور ان سے کوئی حساب نہیں لیتا اس لیے انہوں نے مطمئن ہو کر مجھے یہ ٹھکانہ دیکھنے کا موقع دیا تھا۔ ذرا آرام کے بعد میں نے اٹھ کر ہلکی پھلکی ایک سرسبز شروع کی تاکہ میرا جسم چاق و چوبند رہے۔ رات آرام کی کمی سے جو سہل مندی تھی وہ دور ہو جائے۔ دس پندرہ منٹ کی ایک سرسبز کے بعد میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ کمزری مشرق کی طرف تھی اس لیے دھوپ اندر آئی اور کمر روشن ہو گیا۔ میں نے الماری کھولنے کی کوشش کی تو وہ لاکڈنگل میں نے بلا تکلف اس کا ہینڈل پکڑ کر جھٹکا دیا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ لاک ٹوٹ گیا۔ اگر آواز باہر تک گئی تھی تب بھی مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مگر الماری سے کوئی ایسی چیز ملنے کی خواہش خرابی ہی رہ گئی جس سے میں آزادی حاصل کر سکتا۔ نہ کوئی ہتھیار تھا اور نہ ہی ایسی کوئی چیز۔ اندر صرف مردانہ اور زنانہ کپڑے تھے۔ نچلے حصے میں جوتے رکھے تھے۔ ایک دراز میں رومال، بنیان اور مردانہ انڈر ویئر تھے۔ دوسری دراز کھولی تو اس میں سے زنانہ اشیاء نکل آئیں۔ میں نے اسے بند کر کے مردانہ حصے کا جائزہ لیا۔

مردانہ کپڑے زیادہ تر مقامی ساخت تھے اور زنانہ ملبوسات بھی شریفانہ تھے۔ یعنی فیشن۔ سیل نہیں تھے۔ شاید میرا پہلا خیال درست تھا کہ یہ جگہ ان لوگوں کی نہیں تھی۔ یہ باقاعدگی سے زندگی گزارنے والے لوگ نہیں لگ رہے تھے۔ میرا نہیں خیال کہ زینی جیسی عورت اس جگہ کے لباس استعمال کرتی ہوگی۔ درازیں اور الماری کے پٹ جھٹکے میں واپس بیڈ پر آ بیٹھا۔ انہوں نے میری کمزری بھی لے لی تھی۔ راستے میں مجھے جیب کے ڈیش بورڈ پر لگی گھڑی سے وقت کا پتا چلتا رہا تھا۔ ہم تقریباً سات بجے یہاں پہنچے تھے اور مجھے بند ہوئے ایک گھنٹا مزید گزر گیا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے۔ اگرچہ مجھے نہ تو بھوک پیاس لگ رہی تھی اور نہ ہی کوئی دوسرا مسئلہ تھا مگر میں نے دروازہ بجانے میں حرج نہیں سمجھا۔ دوسری بار بجانے پر زینی کی آواز آئی۔ ”کیا مسئلہ

ہے؟“ ”مسئلہ فطرت کا ہے کس زینی۔“ میں نے ذرا فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”تم جانتی ہو تا جب فطرت آدمی کو آواز دیتی ہے تو اسے کہاں جانا ہوتا ہے۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ”دس منٹ رکو ہم ذرا مصروف ہیں۔“ ”او کے دس منٹ۔“

جب میرے خیال میں دس منٹ پورے ہو گئے تو میں نے پھر دروازہ بجانا شروع کر دیا اور اس وقت تک بجاتا رہا تھا جب تک وہ کھل نہیں گیا۔ سامنے ایک کلین شیو خوبرو نوجوان تھا جو مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اس نے غرا کر کہا۔ ”تمہیں مسئلہ ہے؟“ ”بالکل بھی نہیں کیونکہ میں اس صاف ستھرے کمرے کو ہاتھ روم کی جگہ استعمال کرنا نہیں چاہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تمہاری جون ہی بدل گئی ہے۔ داڑھی موچھیں ہٹا کر بہت چمکنے لگے ہو۔“

ایک لمحے کو اس کی آنکھیں سرخ ہوئی تھیں مگر اس نے سر دلچہ میں صرف اتنا کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ نوجوان نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ باقی یارنی ڈرائنگ روم میں تھی اور کھانے پینے سے مشغول کر رہی تھی ان کا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ داڑھی موچھیں غائب تھیں اور وہ پینٹ شرٹ میں تھے۔ زینی نے بہت کئی ہوئی چیز کے ساتھ نہایت ڈھیلی موٹے نیٹ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا گلا ایک شانے سے ڈھلک کر بازو تک آ گیا تھا۔ میز پر کھانے پینے کی تیار چیزیں تھیں۔ ان کے ساتھ بیئر کی بوتلیں اور گولڈ ڈرنک کے ٹن تھے۔ نوجوان مجھے ساتھ والے کمرے کے واش روم تک لایا اور اس نے کہا۔ ”جلدی کرو جو کرنا ہے۔“

”ذرا دیر لگے گی۔“ میں نے کہا اور اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ مگر جب میں نے واش روم کا جائزہ لیا تو وہاں سے بھی نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ ایک نہایت چھوٹا سا روشن دان تھا اور اس پر بھی شیشہ فکس تھا۔ میں نے ٹیڈی سانس لے کر سرد پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور ضروریات سے فارغ ہوا۔ پھر باہر آیا تو نوجوان وہیں موجود تھا۔ ”مجھے لے کر واپس آیا تو زینی نے آواز دی۔“ ”ایک منٹ اسے بھی کھانے کو دے دو، آگے طویل سفر ہے۔“

مجھے ایک ٹھنڈا چھوٹا پڑا اور چند نان خطائیوں کے

مت کرو۔ میں جان گئی ہوں تم عورت سے متاثر ہونے والے آدمی نہیں ہو۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ میں نے کہا اور باہر آیا تو ایک بار پھر میرے دونوں ہاتھ پشت پر پلاسٹک ڈور سے باندھے گئے۔ اس کی گرفت اور سختی اذیت ناک ہوتی ہے جو دوران خون روک دیتی ہے اور کھلنے کے بعد بھی خاصی دیر ہاتھ کسی قابل نہیں رہتے ہیں۔ وہ باہر آئے اور مجھے جیب میں بٹھایا۔ کل رات کی طرح ڈرائیونگ زینی نے سنبھالی تھی۔ اس وقت اس نے اپنی سنسنی خیز شرٹ پر ایک ہلکی جیکٹ پہن لی تھی۔ شیر خان اس کے برابر میں تھا اور اس کے دونوں سامی میرے دائیں بائیں تھے۔ وہ سب ہی نو جوان اور خاصے خوب صورت تھے۔ عمریں تیس کے اندر تھیں۔ میں نے شیر خان سے کہا۔ ”کیا میرے کچھ اور سوالوں کے جوابات مل سکتے ہیں؟“

”کیسے سوالات؟“

”تم لوگوں کے بارے میں۔“

”پوچھو اگر دے سکا تو دوں گا۔“

”تمہارا تعلق پاکستان سے ہے؟“

”میرا ہے۔“ شیر خان بولا۔ ”یہ تینوں باہر سے ہیں۔“

”لیکن تم چاروں ایک ٹیم ہو؟“

”ہاں ہم چاروں ایک ٹیم ہیں۔“ اس نے تسلیم کیا۔

”اسی قسم کے کام کرتے ہو؟“

”ظاہر ہے۔“ شیر خان نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کافی سوالات ہو گئے ہیں۔“

”مہربانی تمہاری کہ تم نے جواب کی زحمت کی۔“

”میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں اس لیے ذرا فکر مند بھی تھا کہ تم شاید اتنی آسانی سے ہاتھ نہ آؤ جتنی آسانی سے آ گئے۔“

”میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”تمہارا عمل بیک گراؤنڈ۔“ شیر خان بولا۔ ”بھی بات ہے میں تم سے متاثر بھی ہوا تھا؟“

”گو یا اب نہیں ہو؟“

”نہیں اب بھی ہوں۔“ وہ یوں بولا جیسے کہتا چاہ رہا ہو کہ انسان کو اپنا خیال اتنی جلدی نہیں بدلنا چاہیے ورنہ وہ اب تک بدل چکا ہوتا۔

”لگتا ہے تمہیں میرے بارے میں کچھ غلط معلومات ملی ہیں میں ایک عام آدمی ہوں بس ذرا مختلف طرز زندگی

ساتھ کولڈ ڈرنک کا ایک ٹن عینایت کیا گیا اور واپس بند کر دیا گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا کہ یہاں قیام عارضی تھا۔ انہیں آگے جانا تھا مگر کہاں جانا تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ اس خبر نے میرے خدشات بڑھا دیئے تھے کہ کہیں مجھے پھر تو بھارتیوں کے حوالے کرنے کا کوئی پلان تو رو بہ عمل نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بھارتی دو بار مجھے لے جانے کی کوشش کر چکے تھے اور انہیں دونوں کوششیں خاصی مہنگی پڑی تھیں جب انہیں اپنے پہلی کا پٹر اور کمانڈوز سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ یہاں سے اگرچہ افغانستان کی سرحد زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر خط مستقیم میں سفر کیا جائے تو فاصلہ ساٹھ کلومیٹر بھی نہیں بنتا تھا لیکن دشوار اور پہاڑی راستوں کے گھماؤ پھراؤ کی وجہ سے یہ تین گنا بھی ہو سکتا تھا۔ شاید اسی لیے زینی نے کہا تھا کہ دور جانا ہے۔ کھانے کے دوران میں نے سوچا کہ کہیں میں کچھ زیادہ تو نہیں سوچ رہا ہوں ممکن ہے یہ مجھے یہاں سے کسی میدانی علاقے کی طرف لے جائیں۔ آدھے گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور شیر خان کے ساتھ زینی اور وہی خوبرو نو جوان موجود تھے۔ وہ سچ اور چوکنا تھے۔ شیر خان نے کہا۔

”باہر آؤ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔“

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر پوچھا۔ ”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو اور کن کے حوالے کرو گے؟“

”سوال مت کرو۔“ خوبرو نو جوان غرایا۔ ”شرافت سے باہر آ جاؤ۔“

”اگر میں نہ آؤں تو تم کیا کرو گے؟ مجھے گولی مار دو گے؟“ میں نے نیم سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

”ہاں تمہارے گھنٹے پر گولی ماریں گے اور پھر تمہیں سمجھ کر کھینچ جائیں گے۔ زندہ لانے کو کہا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ سلامت بھی ہو۔“ شیر خان نے اپنی رائفل کا رخ میرے پیر کی طرف نہ کر دیا۔ ”میرے تین تک گھنٹے سے پہلے فیصلہ کر لو کہ کس طرح چاہو گے؟“

”اوکے۔“ میں نے اس کے تین کہنے سے پہلے ہاتھ اٹھا دیا۔ ”میں آ رہا ہوں لیکن مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کن لوگوں نے اٹھوایا ہے۔“

”جلد تمہارے سامنے آ جائے گا مسٹر مہربان۔“ زینی بولی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ لباس بھی تم پر ہی ہے۔“

”لیکن رات تو تم قیامت لگ رہے تھیں۔“

”شٹ اپ۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”جمہونی تعریف

ماہنامہ سرگزشت

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ لباس بھی تم پر ہی ہے۔“

”لیکن رات تو تم قیامت لگ رہے تھیں۔“

”شٹ اپ۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”جمہونی تعریف

ماہنامہ سرگزشت

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ لباس بھی تم پر ہی ہے۔“

”لیکن رات تو تم قیامت لگ رہے تھیں۔“

”شٹ اپ۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”جمہونی تعریف

ماہنامہ سرگزشت

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ لباس بھی تم پر ہی ہے۔“

”لیکن رات تو تم قیامت لگ رہے تھیں۔“

”شٹ اپ۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”جمہونی تعریف

ماہنامہ سرگزشت

گزارنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں۔“
شیر خان چپ رہا۔ جیب کا رخ میری توقع کے مطابق شمال کی طرف تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”شیر خان اور زینی کیا یہ اصل نام ہیں؟“
”میرا نام اصل ہے۔“ زینی بولی۔ ”لیکن یہ یک نام ہے۔“

”وہ تو ظاہر ہے، اس کا مطلب ہے شیر خان نام نہیں ہے؟“

”ہاں میرا نام کچھ اور ہے مگر تم چاہو تو مجھے شیر خان ہی کہہ سکتے ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارے بازو کا زخم کیسا ہے؟“
”ٹھیک ہے کوئی چھوٹی ہوئی کز رنگی تھی۔“

وہ چاروں یقیناً کل شام سے اس مشن پر تھے انہیں اس جگہ پہنچنے اور مجھے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا ہوگا۔ پھر وہ مجھے یہاں لائے اور اس کے بعد بھی آرام نہیں کیا۔ اپنا گیٹ اپ تبدیل کیا اور کھاتے پیتے رہے۔ اس کے باوجود وہ چاروں تازہ دم لگ رہے تھے۔ شاید انہوں نے کوئی دوا استعمال کی تھی۔ آج کل ایسی دوائیں عام ہو گئی ہیں جو انسان کو بہت بری حالت میں بھی یوں چاق و چوبند کر دیتی ہیں جیسے وہ بھر پور آرام کر کے اٹھا ہو۔ اگرچہ ان دواؤں کے سائیڈ ایفیکٹس بھی ہوتے ہیں مگر وقفے سے استعمال کرنے سے خاص اثر نہیں پڑتا ہے۔ وسیم نے مجھے ان دواؤں کے بارے میں بتایا تھا جو وہ طویل مشن کے دوران استعمال کرتے تھے۔ یہ ٹھکان اور اس کے اثرات غائب کر کے انہیں چاق و چوبند کر دیتی تھیں۔ اس میدان میں جدید ایجادات کا فائدہ شیر خان جیسے لوگ زیادہ اٹھا رہے ہیں کیونکہ وہ اس سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔ اب دہشت گرد ایسی ادویات کا فائدہ اٹھاتے ہیں جو ان کے مشن میں کارآمد ہوں جیسے بہتے خون کو روکنے والی دوا، خند اڑانے اور ٹھکان بھگانے والی دوائیں، ایسٹرائیڈز جو کچھ دیر کے لیے انسان کو سپر مین بنادیتے ہیں۔ اب سنا ہے حواس تیز کرنے والی دوائیں بھی میدان میں آگئی ہیں۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد ہم انسان اور مشین کا ملاپ یعنی سائی بورگ بھی اپنی زندگی میں دیکھ سکیں۔

جیب اسی سڑک پر تیزی سے آگے جا رہی تھی۔ اگرچہ راستہ بہت اچھا نہیں تھا مگر جیب کا طاقتور انجن اور بہترین ریڈیل ٹائرز کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی اچھی کوالٹی کی ہائی وے پر سفر کر رہے ہوں۔ زینی اچھی ڈرائیور

تھی۔ اسپیدومیٹر کی سوئی مستقل چالیس کے پاس تھی مگر اس نے ایک بار بھی گاڑی کو قابو سے باہر ہونے نہیں دیا تھا۔ ورنہ یہاں بہت تنگ اور پوٹرن ٹائپ موڑ تھے۔ ایک جگہ سڑک کا تقریباً ایک کلومیٹر کا ٹکڑا بارش کی وجہ سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا صرف اسی حصے میں رفتار ڈراما ہوئی تھی اور اس کے بعد جیب پھر اپنی رفتار سے دوڑنے لگی۔ یہاں بلندی بھی کم زیادہ ہو رہی تھی۔ ایک مقام پر ہم نو ہزار فٹ کی بلندی سے بھی گزرے اور اکثر مقامات چھ سے سات ہزار فٹ بلند تھے۔ بلندی پر سردی بڑھ جاتی تھی اور نیچے آتے تو موسم معتدل ہو جاتا۔

راجا عمر دراز سے ملاقات کا فیصلہ مجھے مسلسل مہنگا پڑ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک مصیبت میں گرفتار ہوتا رہا اور اللہ کے فضل سے اس مصیبت سے نکلتا رہا۔ مگر اس آخری مصیبت سے چھٹکارے کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ جیب کے ٹائر برسٹ ہو جانے کے بعد اگر میں تجسس میں پڑنے کی بجائے فرار کو ترجیح دیتا تو شاید اس مصیبت میں نہ پڑتا۔ بہر حال یہ مقدر میں بھی تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم کھوسے اور مغرب کی طرف جانے لگے مزید آدھے گھنٹے بعد ہمارا رخ جنوب مغرب کی طرف ہو گیا یعنی اب ہم الٹی سمت میں جا رہے تھے۔ سڑک نازک اور پتلی ہوئی جا رہی تھی مگر اس پر بھی ٹریفک تھا۔ بڑے ٹرکوں سے لے کر مسافر بردار کوچز، دین اور چھوٹی بڑی ہر طرح کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ سیزن کی وجہ سے سیاح بھی محو سفر تھے اور درے کھل جانے کی وجہ سے آنے والے سرما کے لیے ابھی سے سامان زندگی جمع کیا جا رہا تھا۔ سارے سال باہر رہ کر کمانے والے گرمیوں میں اپنے علاقے میں آتے جاتے تھے۔

شہنشاہ ال کے پاس رک کر جیب کا انجن ٹھنڈا کیا گیا اور ان لوگوں نے بھی ہاتھ پاؤں کھولے مگر مجھے نیچے اترنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ نیچے اترنے پر بھی ان میں سے ایک میرے پاس ہی رہتا تھا۔ جب شیر خان کی باری آئی تو میں نے اس سے کپ شپ شروع کر دی۔ ”تم تعلیم یافتہ لگتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر کیا ہے۔“

”لیکن یہ بعد از یادہ نفع بخش لگا ہوگا؟“
”درست کہا، لیکن دو سال ملازمت میں جھک ماری۔ اتنی تنخواہ بھی نہیں ملے گی۔ اچھا ہی گزارہ کر سکتا۔ اس لیے

یہ لائن پکڑ لی۔“

”تم تربیت یافتہ لگ رہے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے ایک سال کی ٹریننگ حاصل کی ہے۔“

”کہاں سے؟“

”یہیں سے، باہر کے لوگ آئے تھے انہوں نے بے شمار لوگ ہار کیے، ہمیں تربیت دی، کچھ کام لیے اور پھر واپس چلے۔ اب میں اور مجھ جیسے دوسرے بے شمار لوگ آزاد ہیں۔“

”نہیں وہ اب بھی غلام ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ اس ملک کو انتشار اور افراتفری کی نظر کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ انہوں نے بے شمار افراد کو مسلح تربیت دے کر آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اب ان کا روزگار گمن سے وابستہ ہے۔ جیسے کہ تمہارا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”فرق تو پڑتا ہے پہلے جرائم کم ہوتے تھے مگر اب جرائم زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس سے معاشرے کا ایک مجموعی تاثر کیا جاتا ہے؟ ملک کا کوئی گوشہ خرابی کا دروازیوں سے خالی نہیں ہے۔ جن لوگوں نے تمہیں تربیت دی انہوں نے ساتھ ہی یہاں اسلحہ کی بھرمار بھی کی ہے۔“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم کیسی باتیں کر رہے ہو کیا تم گمن استعمال نہیں کرتے۔“ اس نے اپنا پی بندھا بازو آگے کیا۔ ”یہ کس نے کیا ہے؟“

”یہ میں نے اپنے دفاع میں کیا ہے۔ میں نے آج تک گمن سے کوئی نفع یا مفاد نہیں کیا۔ صرف اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دفاع کیا ہے۔ اگر میں تمہیں بتا دوں کہ میں نے چند دن پہلے کیا چھوڑا ہے تو تم یقیناً مجھے پاگل سمجھو گے۔“

”میں بھی آپ کا دفاع کر رہا ہوں بھوک اور افلاس کے خلاف۔“ اس نے سر دھجھکیا۔

”غلط، جب تم جاب سے ملے تھے تو بے شک تم کو کم تنخواہ مل رہی تھی مگر یہ تنخواہ ہمیشہ اسی رہتی۔ ایک وقت آتا جب تمہیں تمہارے تجربے اور قابلیت کے مطابق تنخواہ ملتی۔ یہاں نہ ملتی تو تم بیرون ملک جا سکتے تھے مگر تم نے آسان راستہ اختیار کیا۔“

”یہ آسان راستہ ہے؟“ اس نے ایک بار پھر اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا وہ برا فروختہ نظر آیا تھا۔

میں نے سر ہلایا۔ ”ہاں دوسری دنیا کی طرف آسان

راستہ۔ آدمی جلدی اور بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی اور ان سے چلنے کو کہا۔ اس بار ڈرائیونگ میرے ساتھ بیٹھے خود نو جوان نے سنبھال لی اور زبانی اس کی جگہ آگئی۔ وہ جان بوجھ کر مجھ سے ذرا لگ کر بیٹھی تھی۔ عورت ہونے سے قطع نظر وہ ان تینوں کے لیے صرف ایک ساتھی تھی اس لیے کسی کو نہ تو اس کے عریاں ہونے پر اعتراض ہوا تھا اور نہ ہی میرے ساتھ لگ کر بیٹھنے پر۔ میں گسمسایا اور اسے نرمی سے پیچھے دھکیلا تو وہ مسکرانے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چیلنج تھا کہ ایک عورت سے ڈرتے ہو اور میں نے آنکھوں میں اعتراف کیا کہ عورت سے ہی ڈرتا ہوں کیونکہ وہ کبھی شکست تسلیم نہیں کرتی ہے اور بالآخر مرد کی عقل کو گھاس چرنے بھیج دیتی ہے۔ انسان کو موت سے اتنا نہیں ڈرنا چاہیے جتنا کہ بے باکی پر آمادہ عورت سے ڈرنا چاہیے۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے شیر خان سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہم دیر کی طرف جا رہے ہیں۔“

”ہماری منزل اس سے آگے ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

وہ سے آگے چترال کی طرف جاتے ہوئے بہت وقت لگتا لیکن اگر ان لوگوں کی منزل افغانستان تھا تو ہم شام سے پہلے سرحد پار کر سکتے تھے۔ آج سے چند سال پہلے یہ سارا علاقہ دونوں طرف فوجوں کے اجتماع کی وجہ سے متحرک سرحد بن چکا تھا۔ آئے دن سرحد پار سے حملے اور جانی نقصان معمول کی بات تھی۔ جو پاکستان کو اتحادی کا درجہ دیتے ہیں وہ اس کی فوجی چوکیوں پر فضائی حملے کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔ کسی زمانے میں یہاں صرف نام کی سرحد ہوتی تھی اور دونوں طرف بسنے والے لوگ یوں سرحد پار آتے جاتے تھے جیسے ہم پنڈی سے اسلام آباد آتے جاتے ہیں۔ کاروبار سے لے کر رشتے داریاں تک سب چلتی تھیں۔ مگر فی الحال یہ سب بند تھا۔ پھر ایک بار خدشہ میرے ذہن میں سرسرا نے لگا کہ مجھے بھارتیوں کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

دوبارہ روانہ ہونے کے بعد سب میں لُج تقسیم ہوا۔ خشک ہو جانے والے میٹھے روغنی تان اور کولڈ ڈرنکس پر مشتمل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان لوگوں کو چائے کافی کا شوق نہیں تھا۔ کیونکہ بیٹلے میں بھی ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی جس سے وہاں چائے کافی کا سامان ہو سکتا تھا۔ انہوں نے

راستے کے لیے آسان خوراک رکھی تھی جو سادہ بھی تھی اور توانائی بخش بھی۔ ان کے پاس پانی بھی تھا مگر کولڈ ڈرنک کی بہتات تھی ایک پورا بیک کولڈ ڈرنک ٹنوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے بیک میں بیئر کی بوتلیں تھیں مگر ان سے صرف وہی شغل کر رہے تھے جنہوں نے ڈرائیو نہیں کرنی تھی۔ یعنی شیر خان اور میرے برابر میں بیٹھا ہوا دوسرا آدمی۔ میں نے بندھے ہاتھوں سے یوں بچ کیا کہ زنجی مجھے کھلاتی اور پلاتی رہی۔ انہوں نے میرے ہاتھ نہیں کھولے تھے۔ تین بجے تک ہم دیر اور چترال جانے والی سڑک پر آگئے تھے۔ دیر کا علاقہ شروع ہو گیا تھا مگر چترال یہاں سے خاصا آگے تھا۔ سڑک زیادہ خراب ہو رہی تھی اور اب جھکے گئے گئے تھے۔ کہیں کہیں یہ اتنی تنگ ہو جاتی تھی کہ اس پر سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ مگر ایسے ٹکڑے زیادہ طویل نہیں تھے۔ عام طور سے سڑک ایسی ڈھلان پر تنگ ہوتی تھی جو بہت ترچھی ہو اور اس پر چوڑی سڑک بنانا ممکن نہ ہو۔ یہاں بہت گھنے اور آسان سے باتیں کرتے درختوں پر مشتمل جنگلات تھے اور جنگل سے بہت انوکھی مہک اٹھ رہی تھی۔ اب یہاں کثرت سے چشمے نظر آنے لگے تھے اور بیشتر سڑک سے گزر رہے تھے۔ بعض مقامات اتنے حسین اور نظر نواز تھے کہ دل چاہتا آدمی وہیں رک جائے۔ مگر وہ رک نہیں سکتے تھے اور میں ان کا قیدی تھا۔ میں کئی بار اس سڑک پر سفر کر چکا تھا۔ دیر سے اوپر ایک راستہ افغانستان کی طرف جاتا تھا۔ اس سڑک سے یہاں بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی اور اسمگلنگ کی جاتی تھی۔ مگر جنگ کے بعد صورت حال بدل گئی تھی۔ اب اس راستے کی بجائے خفیہ راستے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر اسمگلنگ پہلے جیسی کھلی نہیں رہی ہے۔ البتہ مقامی ضرورت کے تحت کی جاتی ہے اور سرحدی حکام اس سے چشم پوشی بھی کرتے ہیں۔ ایسا کرنا ان کی مجبوری ہے۔ اب یہ سڑک زیادہ تر فوجی نقل و حرکت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس لیے جب یہ سڑک گزر رہی تھی سمجھا کہ یہ آگے چترال کی طرف ہی جا رہے ہیں مگر آدھے گھنٹے بعد جیب ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی جھکوں کا آغاز ہوا۔ جھکے بھی ایسے تھے کہ کبھی ہم بائیں طرف گرتے تھے اور کبھی دائیں طرف۔ آگے جانے سے روکنے کے لیے مجھے پاؤں استعمال کرنے پڑتے تھے۔ میں دوہری مصیبت میں تھا کیونکہ ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور ہر جھکے پر یا تو میں زنجی پر گرتا تھا یا وہ مجھ پر آتی تھی اور مجھے خاصے امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے

بدن کے نرم و نازک حصے مجھ سے پھست کر دیتی تھی۔ چند بار ایسا ہی ہوا تو میں نے تکلف بالائے طاق رکھ کر دونوں پاؤں اوپر کیے اور سیٹوں کی پشت پر جما دیے اور یوں میں ایک جگہ پوز ہو گیا۔ اگرچہ یہ بھی مشکل تھا کیونکہ پیچھے بندھے بازوؤں پر زور آ رہا تھا۔ بعض مقامات پر یہ پوز بھی لڑھکنے سے نہیں بچاتا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر جیب کا ڈھانچا بول رہا تھا اور اس کی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ جیب کو کتنے مشکل مراحل سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ایک بار خود کو روکنے کے باوجود زنجی پر گرا تو اس نے مجھے داہیں دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تم بیکار کی کوشش کر رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے کوشش نہیں کرتا۔“ میں نے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس بار جھکا آیا تو میں پورے وزن سمیت اس پر گیا اور اس کی پیچ نکل گئی تھی۔ اس نے مجھے برہمی سے دھکیلا۔

”یہ کیا ہے؟“

”بیکار کی کوشش نہ کرنے کا انجام۔“ میں نے جواب دیا۔ شکر ہے اسی وقت دشوار راستہ گزر گیا۔ سڑک ابھی بھی پہلی ہی تھی مگر ہموار ہو گئی تھی اور اب جیب بنا آواز کے چل رہی تھی۔ ”ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“

میرے سوال پر شیر خان نے جیب کا کپاس دیکھا اور بولا۔ ”ٹھیک مغرب کی طرف۔“

”یعنی افغانستان کی طرف، کیا میرے طلب گار وہاں بیٹھے ہیں۔“

”پتا نہیں کیونکہ تمہاری ڈیلیوری یہیں ہوگی۔“

”باپ رہے۔“

”ڈرومست۔“ زینی فنی۔ ”یہ دوسری ڈیلیوری کی بات کر رہا ہے۔“

”تم سخت واہیات عورت ہو۔“ میں نے جڑبڑ ہوتے ہوئے کہا۔

”شکر ہے تم نے عورت تسلیم کیا۔ ورنہ میں سمجھی کہ تم مجھے مرد سمجھ رہے ہو۔“ اس نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔

جیب جس راستے پر چل رہی تھی اس کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ اس پر انسانوں اور گاڑیوں کی آمد و رفت باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ راستے میں ایک جگہ نشیب میں آبادی بھی دکھائی دی تھی مگر جیب اس کے اوپر سے گزر گئی۔ اب تک کسی انسانی صورت نظر نہیں آئی۔ ایک بڑا جنگل آیا اور اس سے گزرے کے بعد جیب ایک وسیع چراگاہ

سست میں اونچا ہوتا پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر برف نظر آ رہی تھی اور کئی مقامات پر آبشاریں گر رہی تھیں۔ دامن میں گھٹا جنگل تھا۔ جیب درختوں کے درمیان روک کر انہوں نے اسے جھاڑیوں اور شاخوں سے ڈھک دیا۔ وہ کیموفلاج کر رہے تھے۔ یہ علاقہ غیر تھا اور وہ یہاں بغیر اجازت کے آئے تھے اس لیے احتیاط لازمی تھی۔

ہم جس طرح سفر کرتے رہے تھے میرا اندازہ تھا کہ ہم افغانستان کی سرحد کے پاس کہیں تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی یہ لوگ احتیاط کر رہے تھے۔ انہوں نے جیب کے عقبی حصے سے سلپنگ بیگز نکالے۔ اترنے کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ کھول دیئے تھے۔ مگر اب وہ پوری طرح ہوشیار تھے۔ کھانے میں وہی تیشی روغنی روئیاں اور کولڈ ڈرنک تھی۔ میں نے چائے کافی کا پوچھا تو جواب ملا کہ ایسی عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کھانے کے فوراً بعد مجھے سلپنگ بیگ میں جانے کا حکم ملا۔ خود میرا تھکن اور بازوؤں میں دھن سے حال اچھا نہیں تھا۔ میرا بایاں ہاتھ جو حکیم قادس کے علاج سے بچ گیا تھا اور تقریباً ٹھیک ہو گیا تھا اس وقت سن ہو رہا تھا۔ بہت دیر تک یہ حرکت کے قابل نہیں رہا تھا میں مسلسل اس کی مالش کرتا رہا تب کہیں جا کر یہ ٹھیک ہوا تھا۔

حکم ملنے پر میں سلپنگ بیگ میں داخل گیا۔ یہ ہلکا گرم تھا اور اصل میں کھردری زمین اور کٹڑے مکوڑوں سے بچاؤ کے لیے تھا۔ اس کا نصف اوپری حصہ نیٹ پر مشتمل تھا۔ نیچے دبیز تہ کی وجہ سے جسم کو آرام ملا تھا۔ سارے سلپنگ بیگز پاس پاس اور درختوں کے نیچے تھے۔ لگ رہا تھا کہ وہ اپنا قیام خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جگہ بھی ایسی منتخب کی تھی جہاں سے کسی کا گزر نہ ہو۔ کچھ دیر بعد ان میں سے دو سلپنگ بیگز میں لیٹ گئے تھے اور باقی دو پہرے پر تھے۔ وہ مجھ پر اور آس پاس نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں لیٹا اور چند منٹ بعد سو گیا۔ پھر رات کسی پہر مٹانے پر دباؤ آیا تو میں جاگ گیا۔ میں نے زب نیچے کی تو نزدیک موجود زینچی چوکی اور اس نے رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔ ”کیا ہے؟“

”پھر سے..... فطرت کی پکار۔“

”ہے بڑی۔“ اس نے امریکن اسٹائل میں اپنے

ساتھی کو آواز دی۔ ”اسے نیچر کال کر رہی ہے۔“

بڑی وہی خوب روٹو جوان تھا۔ وہ مخالف سست سے آیا اور اس نے زینچی سے کہا۔ ”آواز کم رکھو۔“

میں داخل ہوئی جو دو پہاڑوں کے درمیان تقریباً ایک کلومیٹر چوڑی پٹی میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میدان سے بے شمار ندیاں گزر رہی تھیں اور دبیز و اونچی گھاس میں لائقہ اور بھیڑیں، بکریاں اور دوسرے پالتو جانور چر رہے تھے۔ انسان یہاں بھی چند ایک ہی تھے اور انہوں نے سرسری سی نظروں سے ہمیں دیکھا تھا۔ جیب چراگاہ سے بھی گزر کر ایک دریا کے کنارے چلنے لگی۔ موسم کی مناسبت سے دریا میں زیادہ پانی نہیں تھا۔ کچھ دیر دریا کے ساتھ چلتے رہے۔ یہ افغانستان اور پاکستان میں بہنے والا دریا کنہار تھا۔ جو کبھی سرحد کے اس طرف ہوتا ہے اور کبھی دوسری طرف چلا جاتا ہے اور بالآخر بعد میں اس کا پانی پاکستانی دریائی سسٹم میں شامل ہو جاتا ہے۔

سفر جس طرح جاری تھا صاف لگ رہا تھا کہ ان کو اپنی منزل اور وقت کا علم تھا۔ وہ کسی مرحلے میں نہ توڑ کے تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی سے رابطہ یا آپس میں کوئی مشورہ کیا تھا۔ سب پہلے سے طے شدہ تھا۔ جیب ایک خستہ حال ہل کی طرف مڑی اور بہت احتیاط سے اسے گراس کر لیا۔ ہل رسوں اور لکڑی کے موٹے تختوں کا بنا ہوا تھا اور اس سے ایک وقت میں ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ جب تک جیب ہل سے گزرتی رہی سب دم سادھے بیٹھے رہے اور ہل کے بعد سانس میں سانس آئی تھی۔ ہل گراس کرنے کے بعد ہم ایک تیشی جنگل سے گزرنے لگے۔ اس کے چاروں طرف بلندی تھی اس لیے بارش کا پانی اس جگہ جمع ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ یہاں سبزے اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ اونچے درخت بھی تھے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ آبادی سے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے یہاں پرندوں کی بہتات تھی۔ خاص طور پر چکورو اور غیر دکھائی دیئے تھے۔ پاس آبادی ہوتی تو شکاری انہیں کہاں بچھتے۔

جنگل کے بعد ایک ندی آئی اور سفر جاری رہا۔ اب سورج مغرب کی طرف چمک گیا تھا اور کچھ دیر میں رات ہو جاتی۔ یہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں اور ان پر بے شمار ندیاں بہہ کر اوپر سے نیچے دریا کی طرف جاری تھیں مگر کوئی ندی اتنی بڑی نہیں تھی کہ رکاوٹ بنتی۔ ان لوگوں نے راستے میں جیب میں پیٹرول بھروا لیا تھا اور پیچھے دروازے کے ساتھ تین عدد بڑے جہری کین بندھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں دس لیٹرن پیٹرول تھا۔ اس لیے وہ آرام سے سفر کر رہے تھے۔ سورج ڈوبنے تک سفر جاری رہا اور پھر انہوں نے ایک ندی گراس کی اور رک گئے۔ مغرب

میں سلپنگ بیک سے نکل آیا۔ نو جوان مجھے ایک طرف لے آیا اور دو درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”جو کرنا ہے یہیں کرو اور صرف دو منٹ میں۔“

ہم واپس آئے تو میں سلپنگ بیک میں جانے کی بجائے اس پر بیٹھ گیا۔ زہنی نے کہا۔

”اندر جاؤ۔“

”میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں رات میں بھی ہوا نہیں چل رہی۔“

”ہوا پہاڑ کے دوسری طرف طے گی۔“ اس نے کہا۔

”تم نہیں سوئیں؟“

”میں سو کر اٹھ گئی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی صبح کے چار بج رہے ہیں۔“

”یعنی کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔

”میرا اندازہ ہے ہم سرحد کے پاس ہیں۔“

”صرف ایک کلومیٹر دور ہیں۔“

”آگے تم لوگ جاؤ گے یا وہ آئیں گے؟“

”صبح پانچ بجے گا۔ حالات دیکھ کر فیصلہ ہوگا۔“ اس نے مبہم انداز میں کہا جیسے واضح جواب دینے سے گریز کر رہی ہو۔

”تم جارہیں ہوتی دور کہاں سے آئیں؟“ میں نے موضوع بدل دیا۔

”میں آئی نہیں لائی گئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جب یہاں امریکی آئے تو دوسری گندگیوں کے ساتھ یہاں جسم فروشی کا کاروبار بھی چلک اٹھا۔ ڈالرز کے لیے عورتیں خود بھی آئیں اور زبردستی لائی بھی گئیں۔“

”تم زبردستی لائی گئیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”اس وقت میں صرف چودہ سال کی تھی۔ میرا کزن ہی مجھے بہکا کر لے گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ان لوگوں کا ایجنٹ تھا۔ مجھے ایک افغان وار لارڈ کو فروخت کیا گیا۔ میرے ساتھ بارہ لڑکیاں اور کچھ جن میں سے مجھ سمیت تین اس وار لارڈ کے حصے میں آئیں۔“

”اس کے چنگل سے کیسے نکلیں؟“

میں تین سال اس کے پاس رہی اور یہ میری زندگی کے بہت مشکل تین سال تھے۔ پھر میں نے پہلا ٹل اسی وار لارڈ کا کیا۔ اس کے ساتھ اس کے چھ اہم ترین ساتھی بھی مارے تھے۔ میں نے ان میں سے کسی کی کلاشنوف کا پورا میگزین ان پر خالی کر دیا اور فرار ہو گئی۔ کچھ عرصے چھٹی رہی پھر یہاں آ گئی۔ مجھے شیر خان مل گیا اس نے اپنے ساتھ

سونے (Gold) کے معیار کے پیمانے کو کیرٹ (Carat) کہا جاتا ہے۔

24 کیرٹ اصلی اور خالص

22 کیرٹ 91.67 فی صد خالص

18 کیرٹ 75 فی صد خالص

14 کیرٹ 58.3 فی صد خالص

پاکستان اور بھارت میں روایتی طور پر 22 کیرٹ کے سونے سے زیورات تیار کیے جاتے ہیں جبکہ یورپی ممالک میں عمومی طور پر 14 سے 18 کیرٹ کا سونا استعمال کیا جاتا ہے لیکن امریکا میں 10 سے 14 کیرٹ کا سونا استعمال ہوتا ہے۔

سونا اعصابی بیماریوں کے علاج میں معاون ہے۔ اگر سونے کی ”ڈلی“ کورات کے وقت بھرے گلاس میں رکھ دیا جائے اور صبح یہ پانی پیا جائے تو اعصابی تناؤ میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ پانی انسانی چہرے کو خوبصورت اور پرکشش بھی بناتا ہے۔

حقیق: سرور منیر راؤ

مرسلہ: عبدالغفور چغتائی، انارک

شامل کر لیا۔

”اب تم مطمئن ہو؟“

”انسان کسی حال میں مطمئن نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”صرف مطمئن ہونے کا دھوکا دیتا ہے۔“

”تو تم دھوکا دے رہی ہو؟“

”سب دیتے ہیں۔“ اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔ ”صرف میں ہی نہیں ہوں۔“

اس وقت مجھے لگا کہ اس کے ظاہری روپ سے قطع نظر اس کے اندر بہت کچھ بھری ہوئی تھی۔ شاید اس نے استحصال کا جو وقت دیکھا تھا یہ اس کا فطری رد عمل تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بھی شاکي ہو۔ عورت کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو وہ استعمال ہونا پسند نہیں کرتی ہے۔ یہ لوگ اسے استعمال کر رہے تھے جس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”تم اپنے ساتھیوں سے خوش نہیں ہو؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”یہ تمہیں استعمال کر رہے ہیں جیسے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کیا۔“

”مگر تم ہوئے نہیں۔“

”میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ دوسرے میں جن حالات سے گزر رہا ہوں اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ورنہ تم میں اور تمہاری کوشش میں کوئی کمی نہیں تھی۔“

وہ مسکرائی۔ ”تم نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس گن ہوتی تو تم ابھی زندہ نہ ہوتے۔“

”تب مجھے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہارے پاس گن نہیں تھی۔“

باتوں کے دوران میں صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ زینی اور اس کا ساتھی رات دو بجے اٹھ گئے تھے۔ وہ اس سے پہلے چھ گھنٹے تک سوتے رہے تھے اور اب ان لوگوں کی باری تھی۔ روشنی ہوئی تو زینی نے نوجوان کو بلایا اور میرے سر پر چھوڑ کر خود جیب کی طرف گئی۔ وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا برنز اور دھات کی کیتلی تھی۔ اس نے پانی بھر کر کیتلی برنز پر رکھی اور جب پانی کھولنے لگا تو اس میں چائے کی پتی ڈال دی۔ چند لمحے بعد فضا میں چائے کی خوشبو تیرنے لگی۔ جب زینی نے کانڈ کے ٹمک میں مجھے بھی چائے دی تو میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جو اپنے بندے کی فضول عادات بھی یوں پوری کر رہا تھا۔ چائے بہت اچھی بنی تھی اگرچہ دودھ اور چینی کے بغیر تھی۔ میں چینی لیتا ہوں مگر اس وقت اس چائے نے بھی بہت مزہ دیا۔ سات بجے شیر خان اور اس کا دوسرا ساتھی اٹھ گئے تھے۔ انہوں نے سلیپنگ بیک واپس جیب میں رکھے۔ سب نے باری باری ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھوئے۔ میں شیر خان کے ساتھ گیا۔ مجھے روغنی نان سے ناشتا کیا گیا اور پھر انہوں نے سفر کی تیاری شروع کی مگر یہ سفر پیدل تھا۔ انہوں نے اپنا اسلحہ لے لیا اور میرے ہاتھ پھر پشت پر باندھ دیئے۔ پھر وہ اس طرح آگے بڑھے کہ سب سے آگے شیر خان تھا اور پیچھے زینی۔ اس کے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے باقی دو تھے۔ میں ایک بار پھر مضطرب ہوئے گا تھا۔ انہوں نے اب تک مجھے کوئی موقع نہیں دیا تھا لیکن میں نے سوچ لیا کہ اگر معاملہ بھارتیوں کا ہوا تو میں اپنی جان پر کھیل کر بھی فرار کی کوشش کروں گا چاہے آگے نتیجہ جو بھی نکلے۔ بھارتیوں کے ہاتھ آتا مجھے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔ پہاڑی ڈھلان کے کھٹے جنگل کے ساتھ ساتھ چلتے

ہوئے ہم ایک کھلی مگر چھوٹی وادی میں نکلے۔ شیر خان نے ہمیں روک دیا۔ اس نے کہا۔ ”بس یہیں رک جاؤ۔ ہمیں یہیں رک کر انتظار کرنا ہے۔“

میں نے شیر خان سے کہا۔ ”تم نے جو کام کیا ہے کیا اس کا معاوضہ لے لیا ہے؟“

”تمہیں اس سے کیا؟“ وہ کھردرے لہجے میں بولا۔ ”کیونکہ سودا میرا ہورہا ہے۔ لیکن میرا پوچھنے کا مقصد کچھ اور ہے۔ تم جس طرح مجھے زیادہ نہیں جانتے اسی طرح میرے دشمنوں سے بھی واقف نہیں ہو گے وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو کسی قسم کا معاوضہ دینے کی بجائے چند گولیاں خرچ کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ اس لیے اگر تمہیں معاوضہ نہیں ملا ہے تو ہوشیار رہو کہ ادائیگی کا طریقہ کار تمہاری توقع کے خلاف نہ ہو۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا لیکن پھر اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ درختوں میں غائب ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد زینی بولی۔ ”تم کس کی باتوں میں آرہے ہو؟“

”احتیاط کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ شیر خان نے دانش مندی کی بات کی۔

زینی نے اختلاف جاری رکھا۔ ”یہ ہمارا قیدی ہے ہمیں کبھی ٹھیک مشورہ نہیں دے گا۔“

”تم میرے براہ راست دشمن نہیں ہو صرف پیسوں کے لیے کام کر رہے ہو۔“

زینی مجھے گھورتی تھی۔ حالانکہ صبح اس نے مجھ سے بہت کھل کر گفتگو کی تھی۔ مگر اس وقت اس نے میری مخالفت کی تھی۔ نونج رہے تھے۔ شیر خان کی گھڑی پر میری نظر تھی۔ سورج بلند ہوتے ہی جنگی تیزی سے غائب ہو رہی تھی اور گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ شاید یہ جگہ سطح سمندر سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اچانک شیر خان کے پاس سے ہلکی سی ٹون کی آواز آئی اور اس نے اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹا واک ٹاکی برآمد کر کے اس کا بٹن دبایا۔ ”ہم پہنچ گئے ہیں۔“

اس نے صرف ایک یہی جملہ کہہ کر واک ٹاکی واپس رکھ لیا۔ پھر اس نے ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ یہ اشارہ یقیناً اپنے چھپے ساتھیوں کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا کہ زینی بھی اٹھ بیٹھی اور ایک طرف درختوں میں چلی گئی۔ اب وہاں میں اور شیر خان تھے۔ ہم جس جگہ تھے اس کے تین طرف پہاڑ کی ڈھلان اور جنگل تھا صرف جنوبی سمت خالی تھی۔ چند منٹ بعد اسی سمت سے چار افراد نمودار ہوئے۔ میں چونکا کیونکہ

خان بولا۔ ”آدی لو اور معاوضہ دو۔“

اچانک ہی میرے اندر سے چھٹی حس نے اشارہ کیا اور میرا جسم سنسنا اٹھا تھا۔ یہاں کچھ ہونے والا تھا۔ میری نظر ان چاروں پر تھی لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا اس کی بجائے اچانک جنگل کی طرف سے تڑا ہٹ کی آواز آئی اور ایک مردانہ چیخ گونجی جس میں موت کا کرب رہا ہوا تھا۔ فوراً ہی کسی دوسری رائفل نے موت کا نغمہ گایا۔ شیر خان چونکا تھا کہ باس نے اس کے پیروں پر برسٹ مارا۔ وہ شاید اسے مارنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اوپر فائر کرتا۔ شیر خان دھاڑ کے ساتھ نیچے گرا اور باس نے آگے بڑھ کر اس کی رائفل لات مار کر دور پھینک دی پھر جبکہ اس کی ہیلٹ سے بندھا ہوا پستول نکال لیا۔ اس کے ہاتھ تین ساتھی تیزی سے جنگل کی طرف بڑھے تھے جہاں اب دورا نقل رہ رہ کر گرج رہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے درست خبردار کیا تھا۔ وہاں زندگی و موت کا کھیل جاری تھی اور لگ رہا تھا کہ اس کھیل میں شیر خان اینڈ کمپنی کو موت نصیب ہوگی۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی جنگل کی طرف سے دوسری چیخ سنائی دی اور یہ بھی مردانہ تھی جس میں موت کا کرب رہا ہوا تھا۔ اب صرف زینہ باقی رہ گئی تھی۔ مگر دوسری چیخ کے بعد فائرنگ رک گئی تھی۔

شیر خان کی دونوں ٹانگیں جھٹکی ہوئی تھیں۔ خاص طور سے گھٹنے چکنا چور ہو گئے تھے اور وہ شدید اذیت میں تھا۔ اگر اسے فوری طور پر کسی بہت اچھے آرٹھوپیدک سرجن کی خدمات حاصل ہو جاتیں تب بھی اس کا امکان بہت کم تھا کہ وہ دوبارہ پہلے کی طرح اپنے پیروں پر چل سکے۔ مگر فی الحال تو اس کی زندگی کا امکان بھی کم ہی نظر آ رہا تھا۔ باس اس کی اور میری طرف سے پوری طرح چونکا تھا۔ شیر خان ہوش میں تھا اور کراہ رہا تھا میں نے ذرا جھک کر افسوس سے کہا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا تا تم نے آسان راستہ اختیار کیا ہے انجام کی طرف۔“

جواب میں اس کے منہ سے جو نکلا وہ سب ناگفتنی تھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا کہ دم توڑنے آدی کو کیا کہتا۔ ایک منٹ بعد درختوں کی طرف سے زینہ نمودار ہوئی اور آنے والے تینوں افراد اس کے پیچھے تھے۔ ایک لمحوں کو لگا کہ وہاں کو ہینڈ زاپ کر کے لایا جا رہا ہے۔ مگر پھر میری نظر اس کے ہاتھ میں موجود رائفل پر گئی اور وہ شکست خوردہ نہیں بلکہ فاتحانہ تھا۔ میں آ رہی تھی۔ میں نے شیر خان سے کہا۔ ”تمہاری ایک اور شکست..... ذرا دیکھنا زینہ کیسے

انہوں نے پتلون شرٹ پر بلٹ پروف پہن رکھی تھیں اور وہ پوری طرح مسلح نظر آ رہے تھے۔ دور سے ان کی چال و حال بتا رہی تھی کہ وہ تربیت یافتہ تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ گورے تھے۔ مگر نزدیک آنے پر پتا چلا کہ وہ مقامی تھے۔ شاید افغانی تھے۔ مگر بہت گورے چٹے تھے اس لیے دور سے سفید فام لگ رہے تھے۔ چاروں کے سر پر جھوٹے بال تھے جیسے کہ فوجیوں کے ہوتے ہیں۔ نزدیک آنے پر ان میں سے ایک آگے آیا اور اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”شیر خان، اسے ہمارے حوالے کرو۔“

مجھے شبہ ہوا کہ وہ پاکستانی تھا کیونکہ اس نے یہ جملہ بہت اچھی اردو میں کہا تھا۔ شیر خان نے میری طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارا آدی یہ رہا لیکن پہلے مجھے معاوضہ دیا جائے۔“

”معاوضہ مل جائے گا لیکن پہلے میں تصدیق کروں گا۔“ اس نے کہا اور آگے آیا۔ وہ شاید ان کا باس تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا آلہ نکالا جو سائز میں موبائل فون جتنا تھا مگر اس سے مختلف تھا اس کے اوپر جسے میں ایک چھوٹا سائینس لگا ہوا تھا۔ اس نے لینس میری دائیں آنکھ کے سامنے کیا اور بولا۔ ”اس میں دیکھو۔“

میں نے آنکھ بند کر لی اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”فکر مت کرو یہ تمہاری پتلی کی تصدیق کرے گا۔“ اس نے کہا۔ ”اپنی آنکھ کھولو۔“

میں نے آنکھ کھولی اور لینس میں دیکھا۔ چند لمحوں بعد اس کے نیچے موجود سبز لائٹ آن ہو گئی اور اس نے آلہ بند کر کے واپس رکھ لیا۔ اس کے تاثرات سپاٹ تھے اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ تصدیق ہوئی ہے یا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری آنکھ کی پتلی کا نقش کس کے پاس ہوگا۔ یہ کسی آدی کی تصدیق کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے۔ جس طرح ہر آدی کے فنگر پرنٹ جملہ ہوتے ہیں اسی طرح ہر آدی کی پتلی کے اندر بنا ہوا ڈیزائن بھی مختلف ہوتا ہے۔ آج کل اس سے بھی آدی کی تصدیق کی جاتی ہے۔ آنکھ کی پتلی بھی انسان کے بائیومیٹرکس میں شامل ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو فنگر پرنٹ لینے اور رکھنے کا نظام بھی ڈھنک کانٹیں ہے۔ آنکھ کی پتلی سے تصدیق ابھی دور کی بات ہے۔ باس کے تین ساتھی ذرا فاصلے پر اور بہت چوکنا موجود تھے۔ اگرچہ ان کی رائفلوں کا رخ نیچے کی طرف تھا مگر ان کی انگلیاں ٹریگرز سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ باس نے شیر خان سے پوچھا۔ ”تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟“

”تمہیں ان سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“ شیر

آ رہی ہے۔“

شیر خان نے سرگھا کر زینی کو دیکھا اور اس کی ناگفتی کا رخ اس کی طرف مڑ گیا۔ زینی نے اس کا جواب یوں دیا کہ آتے ہی اس کے ماتھے پر گولی ماری اور شیر خان فوراً مر گیا۔ مجھے اس کی جوان مرگی کا کوئی افسوس نہیں ہوا۔ ایسے لوگ اسی طرح دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ میں زینی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”تم نے ٹھیک کہا تھا کوئی آج کل مطمئن نہیں ہوتا صرف دھوکا دیتا ہے۔ جیسا کہ تم نے دیا۔“

”اے لے چلو۔“ زینی نے سر دلچے میں کہا تو ان چاروں نے مجھے گھیر لیا اور ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ زینی ایک طرف ہو کر الگ چل رہی تھی۔ اس کا تھکنا نہ رویہ اور ان چاروں کی نیاز مندی بتا رہی تھی کہ اب وہ باس تھی۔ سفر طویل نہیں تھا اور ہم آدھے گھنٹے بعد پہاڑ کی ڈھلان کے اوپری حصے میں پہنچ گئے تھے یہاں ایک باقاعدہ راستہ تھا جو صدیوں سے اس راہ پر چلنے والوں نے بنایا تھا۔ دور مجھے پاکستان کا پرچم لہراتا دکھائی دے رہا تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر افغانستان کا پرچم تھا۔ گویا یہ سرحد تھی مگر ہم اس سے فاصلے پر تھے۔ ہم ڈھلان سے اترنے لگے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ہم پاکستان کی حد میں تھے یا افغانستان کی حد میں داخل ہو چکے تھے۔ اوپر چڑھتا میرے لیے زیادہ دشوار نہیں تھا مگر نیچے اترتے ہوئے مجھے مشکل پیش آنے لگی۔ بندھے ہاتھوں سے توازن بگڑ رہا تھا۔ بعض جگہ قدم لڑکھڑاتے تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔

”میرے ہاتھ کھلو اور نہ نیچے کراؤ شاید ہڈیوں اور گوشت کا ڈھیر ملے تم کو لے جانے کے لیے۔“ وہ رکی اور پھر اپنی جیکٹ سے خنجر نکال کر میری طرف آئی اور ہاتھوں کی منہیں کاٹ دیں۔ ”تھینک یو۔“ میں نے ہاتھ مل کر کہا۔

ہم ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ زینی نے اب سر پر بڑی سی ادنی ٹوپی پہن لی تھی جس سے اس کے سنہری بالوں کی پونی ٹیل چھپ گئی تھی۔ غالباً وہ اپنی سوانی شناخت چھپاتا جا رہی تھی۔ حالانکہ اس کی لپکتی چال بھی بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق کس صنف سے ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ اپنی چال بدل لیتی مگر شاید وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں تھی۔ آنے والے چاروں افراد پوری طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی زینی کی طرف متوجہ ہونے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ایسا لگ رہا تھا۔ وہ اس سے مرعوب لگ رہے تھے اور اس کے تیور بھی کچھ ایسے ہو گئے

تھے جیسے وہ اس کے بہت ادنیٰ درجے کے خادم ہوں۔ ڈھلان سے اترتے ہی ایک مختصر لیکن بہت ترچھی چڑھائی آئی اور اس پر چڑھتے ہوئے صحیح معنوں میں کوہ پیما کی کرنا پڑی تھی۔ اکثر مقامات پر چاروں ہاتھوں پیروں سے اور پتھروں یا درختوں کا سہارا لے کر چڑھنا پڑ رہا تھا۔

جب اوپر پہنچے تو سامنے پیالہ نما وادی نظر آئی جو آخری حصے میں جا کر دو پہاڑوں کے بیچ آگئی تھی۔ ہم نیچے اترنے لگے اس طرف ڈھلان شریفانہ تھی اور ہم آرام سے اتر گئے اور دس منٹ بعد وادی سے نکل رہے تھے۔ وادی پھر چوڑی ہونے لگی اور اس کے دونوں طرف بلند پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے لگا کہ ہم سیدھے جانے کی بجائے بہت محوم پھر کر جا رہے تھے اور غالباً ایسا اس لیے کیا جا رہا تھا کہ کسی سرحدی چوکی سے مڈ بھیڑ نہ ہو۔ مگر وادی کے آخری حصے میں جو پہاڑ نظر آ رہا تھا وہ خاصا بلند تھا اور اس کے سب سے اوپر والے حصے میں برف کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی یعنی یہ پہاڑ کم سے کم پندرہ ہزار فٹ بلند تھا بھی اس پر گرمیوں میں بھی برف تھی۔ ہم نے چڑھنا شروع کیا۔ اس سفر نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے جب خطرناک والی چڑھائی شروع ہوئی تو زینی نے آدھے گھنٹے کے لیے رکنے کا اعلان کیا۔

میں ایک درخت سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں سائے میں خنکی تھی جب کہ دھوپ میں ذرا گرمی محسوس ہوتی تھی۔ شاید ابھی ہم سات یا آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ سب کے پاس پانی کی ڈھائی لیٹر والی بوتلیں تھیں۔ اس لیے پانی کی کمی نہیں تھی۔ میں نے راستے میں آنے والی تمام ندیوں سے دل کھول کر پانی پیا تھا اس لیے پیاس نہیں تھی مگر جیسے جیسے بلندی پر جاتے پیاس لگتی۔ سب مختلف جگہوں پر اس طرح بیٹھے تھے کہ میں ان کے درمیان میں تھا یعنی مجھے گھیرا ہوا تھا۔ زینی ایک کسی قدر بلند چٹان سے لگی کھڑی تھی اس نے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سورج سر پر آگیا تھا۔ وہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی پھر اس نے آدھا گھنٹا پورا ہوتے ہی کہا۔ ”ایس مووناؤ۔“

اس بار مجھے اس کے لہجے نے چونکا دیا کیونکہ اس نے بہت صاف اور شیطانی انگریزی لہجے میں یہ بات کہی تھی۔ مشرقی یورپ کے رہنے والے لی کوئی بولتے ہیں جب کہ اس نے لی ہی کہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جیسے اس کی شخصیت پر عجیب لگی تھی کیا اس کی جارجمین ہونے والی بات بھی غلط تھی؟ ہم نے اوپر چڑھنا شروع کیا اور اس بار

چڑھائی خاصی مشکل ثابت ہوئی کیونکہ یہ ایک مسلسل چڑھائی تھی اور اس میں راستے بھی نایاب تھے۔ ہمارے قدم ان راستوں پر پڑھ رہے تھے جن پر شاید پہلے کبھی کوئی انسان نہیں گزرا تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف جا رہے تھے سردی بڑھ رہی تھی اور سائے میں سے گزرتے ہوئے باقاعدہ سردی لگتی تھی۔ خدا خدا کر کے ہم اس پہاڑ کی اوپری حصے میں پہنچے یہاں سے ایک راستہ نشیب کی طرف جا رہا تھا اور دوسرا پہاڑ کی چوٹی تک تھا۔ ظاہر ہے ہمیں نیچے کا رخ کرنا تھا۔

اب سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور جب سانس کھینچتے تو ہوا جیسے خالی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا جیسے سینے میں کم ہوا لگی ہو۔ میرا تجربہ بتا رہا تھا کہ ہم دس ہزار فٹ کے آس پاس کہیں تھے۔ مگر اب نیچے اترنا نہ اور ہماری منزل دور تک نشیب میں پھیلے تھے درتہ درتہ پہاڑوں میں کہیں تھی۔ ذرا نیچے آئے تو ایک جگہ ڈنڈی مل گئی جو انسانی قدموں سے آشنا تھی۔ اس لیے اس پر سفر آسان ثابت ہوا۔ ہم ایک اوپر چوٹی کے نیچے سے گزرے جس پر برف جمی تھی اور اس کی خلی یہاں تک آ رہی تھی۔ اس شفاف برف سے بہہ کر آنے والا پانی برف سے زیادہ سرد تھا مگر اسے پی کر میں تروتازہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک ایسے راستے پر چلنے لگے جو پہلے صراط سے مشابہ تھا اور اس کے دونوں طرف تا حد نگاہ ڈھلان تھی مگر یہ سیدھی ڈھلان نہیں تھی بلکہ گرنے کی صورت میں بہت سا حصہ آوی کوہا میں طے کرنا پڑتا۔ جس کا لازمی نتیجہ فوجی کی صورت میں نکلتا۔ اس لیے سب بہت محتاط ہو کر ایک قطار میں اس ڈھلان سے گزر رہے تھے۔

پہلے کو عبور کر کے ہم نے ایک اور ڈھلان پر قدم رکھا جس پر ایک بار پھر اونچے درخت نظر آنے لگے تھے اور اس سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک چوڑی وادی میں داخل ہوئے۔ یہ وادی اصل میں دریا کا پاٹ تھا مگر فی الحال پانی اس کے وسط میں کسی ندی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ٹھن سے سب کا برا حال تھا اس لیے ایک اسٹاپ آدھے گھنٹے کا اور روک لیا اور اس دوران میں ہم نے گڑے خشک چٹانوں سے پیٹ لیا۔ یہ توانائی بخش کھانا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد پھر سے روانہ ہوئے۔ دریا کی وادی کے ساتھ چلتے ہوئے۔ ہم شام پانچ بجے کے قریب ایک چکی سڑک تک پہنچے جہاں ایک بڑی آرمی جیب ہماری منتظر تھی۔ یہ اس قسم کی جیب تھی جیسی امریکی فوج استعمال کرتی ہے مگر اس پر نشانات نہیں تھے اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سولین افغانی بیٹھا ہوا تھا۔

اب میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ چاروں بھی افغانی تھے۔ یہاں آتے ہی انہوں نے اپنی ہلٹ پر دف جیکٹس اتار دیں اور روشن خیال افغانوں والے طیلے میں آگئے۔ وہ سب کلین شیو تھے اور سروں پر چھوٹے بال تھے اس لیے انہیں سروں پر اڑتے ڈرون طیاروں سے خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر دوسرے خطرات تو تھے۔ پورے افغانستان میں جاہل جامزاجی گروہیں ہیں۔ دارلارڈز اور ڈرگ لارڈز ہیں۔ ان کے علاوہ جرائم پیشہ گروہوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر فرد مسلح ہوتا ہے اور سامنا ہونے پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا سامنے بددوق بدست شخص جو چلا آ رہا ہے وہ کوئی ڈاکو ہے یا پھر شریف آدمی۔ چل چل کر سب کا برا حال ہو گیا تھا اس لیے گاڑی دیکھ کر مجھ سمیت سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ہم اس کے عقبی وسیع کیمین میں آگئے جس میں آنے سے سامنے نشتریں لگی تھیں۔ زینی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر آگئی۔ جیب آگے بڑھی اور کچے راستے پر اس کی رفتار سست مگر ایک گھنٹے بعد ایک کسی قدر پختہ سڑک آگئی اور اس کی رفتار بڑھ گئی تھی میں نے زینی سے کہا۔ ”ہم یقیناً افغانستان میں ہیں؟“

”ہاں تم اس وقت افغانستان میں ہو۔“

”رات میں بھی سفر جاری رہے گا؟“

”نہیں آج رات ہم ایک جگہ رکیں گے۔“ زینی نے کہا۔ ”یہاں رات کے وقت سفر کرنا مناسب نہیں ہوتا ہے۔“

جیب سورج غروب ہونے کے بعد بھی چلتی رہی تھی۔ یہ علاقائی سڑک تھی مگر اس کا معیار بہت اچھا تھا۔ امریکیوں نے آنے کے بعد سب سے پہلے ذرائع مواصلات پر توجہ دی تھی اور یہاں بننے والی سڑکیں عالمی معیار کی تھیں۔ تار کی چھانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد جب ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوئی۔ یہاں اس وقت بجلی نہیں تھی مگر جزیئر چل رہے تھے اور روشنی کے لیے دوسرے ذرائع سے بھی کام لیا جا رہا تھا۔ یہاں خاصی پہل پہل تھی اور بازار کھلا ہوا تھا۔ جیب ایک چھوٹے دو منزلہ ہوٹل کے سامنے رکی اور ہم اتر کر اندر آئے۔ انہوں نے تین کمرے لیے۔ ایک زینی کے لیے تھا اور باقی دو ہمارے لیے تھے۔ کھانا اور پی طلب کیا تھا۔ جب اس نے رقم دی تو مجھے ہاتھ چلا کہ اصل مہنگائی تو یہاں تھی۔ تین کمروں اور رات کے کھانے کے چار سو امریکی ڈالرز چارج کیے گئے تھے یعنی چالیس ہزار پاکستانی روپے، اتنے میں تو پاکستان میں ہم

فانیو اشار نہ صحیح فور اشار ہوئل میں قیام کر سکتے تھے۔ امریکیوں کے بارے میں بالکل درست کہا ہے کہ یہ جہاں جاتے ہیں چیزوں کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

کھانے میں دینے کا بھنا گوشت اور خاص طریقے سے پکی ہوئی روٹی تھی۔ کھانا بے شک مہنگا تھا مگر اتنا ہی لذیذ بھی تھا۔ اس کے بعد قبوہ آیا۔ میرے لیے ایک شل آیا تھا کیونکہ قبوہ ختم کرتے ہی میرے ذہن پر نیند نے یلغار کی تھی اور جب تک میں سوچتا کہ کیا ہوا ہے میں سوچکا تھا۔ ظاہر ہے یہ انتظام مجھے سکون سے سنانے کے لیے تھا تا کہ وہ بھی آرام سے سو سکیں یا آرام ہی کر لیں کیونکہ اس سفر نے سب کے انجیر بخر ڈھیلے کر دیئے تھے۔ میں بے ہوشی جیسی نیند میں تھا مگر فائرنگ کی آواز نے میرے شعور کو بھنجوڑا اور میں نے محسوس کیا کہ آس پاس شور ہو رہا تھا۔ بے مشکل میں نے آنکھ کھولی اور جھومتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ میرا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ کمرابھی خالی تھا اور ہوئل کے آس پاس سے رہ رہ کر فائرنگ کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر تاریکی تھی یعنی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک چھوٹا انرجی سیور روشن تھا اور دیوار گیر گھڑی صبح کے چار بج رہی تھی۔ جاگنے کے باوجود میرے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت فی الحال خوابیدہ تھی۔ مگر میرا شعور اشارہ کر رہا تھا کہ آس پاس گڑبڑ ہے اور دراصل اسی نے مجھے بیدار کیا تھا ورنہ میری بیدار ہونے والی حالت نہیں تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور زینی اندر آئی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہینچا۔

”چلو یہاں گڑبڑ ہے؟“

”کیسی گڑبڑ؟“ میں نے خواب کی سی کیفیت میں کہا۔

”پتا نہیں کچھ لوں آگئے ہیں میرے آدمی مقابلہ کر رہے ہیں مگر ہمیں یہاں سے بھاگنا ہوگا۔“

عجیب بات تھی میرا رد عمل تو یوں ہوتا چاہیے تھا کہ میں سب سے پہلے اسے ہی دشمن سمجھتا اور اس کا ہارنے کی کوشش کرتا۔ یا پھر فرار کی راہ تلاش کرتا مگر اس کی بجائے میں اس کے ساتھ بھینچا چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم آپس میں دوست اور ساتھی ہیں۔ باہر آتے ہی اس نے ہوئل کے اوپری حصے کا رخ کیا اور گھڑی کی سیرھیاں چڑھ کر ہم چھت پر آئے۔ آس پاس گولیوں کے شعلے چمک رہے تھے اور حملہ آور نے دو طرف سے ہوئل کو گھیرا ہوا تھا۔ زینی کے آدمیوں کی طرف سے جوابی کارروائی جاری تھی۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ

مابینا ہمسرگزشت

دیر حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہتھیاروں سے لگ رہا تھا حملہ آوروں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ شاید اسی لیے زینی مجھے یہاں سے نکال لے جانا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ہم کس طرف جائیں یہاں تو دشمن ہیں۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ بولی اور برابر والے مکان کی طرف بڑھی۔ یہ بھی دو منزلہ تھا مگر ہوئل سے ذرا نیچا تھا۔ زینی نے مجھ سے کہا۔ ”نیچے اتر جاؤ اور پھر سہارا دے کر مجھے اتارو۔“

میں دیوار سے لٹک کر آرام سے چھت پر اتر گیا اور پھر میں نے ہاتھ اوپر کیا تو زینی میرے بازوؤں میں آگئی۔ میں نے اسے نیچے کیا تو اس نے پھر میرا بازو پکڑا اور زینوں کا رخ کیا۔ اس بار بھی میں نے بلاچوں پر اس کا ساتھ دیا مگر میرے اترنے سے نیچے موجود افراد کو ہٹا چل گیا تھا کہ کوئی چھت پر آیا ہے۔ زینوں پر ایک نوجوان آدمی نمودار ہوا اور زینی کی رائفل کا رخ اپنی طرف دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ زینی نے آہستہ سے کہا۔ ”شور مت کرنا ہم صرف یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں پیچھے ہمارے دشمن آ رہے ہیں۔ وہ آگئے تو تم بھی مارے جاؤ گے۔“

نوجوان نے سر ہلایا اور بولا۔ ”تم دونوں چلے جاؤ۔“ ہم نیچے آئے تو ایک کمرے میں بستر پر ایک لڑکی چادر میں دبی ہوئی تھی ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف آیا اور اس نے چادر مزید مضبوطی سے خود پر لپیٹ لی۔ شاید وہ اس نوجوان کی بیوی تھی۔ اس فلور پر بس دو کمرے تھے اور ان میں یہی دو افراد تھے۔ معمولی سا فرنیچر اور ساز و سامان تھا۔ ہم اسے دیکھ کر نچلے والے فلور پر آگئے۔ یہ حصہ بند تھا صرف سیرھیاں اور باہر جانے والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ یہاں کوئی اور رہتا تھا یہ مشکل سے ستراتی گزرتے پر بنا ہوا کمر تھا۔ جس میں آنے جانے کا راستہ مشترک تھا۔ زینی نے نوجوان سے کہا۔ ”اب تم جاؤ اور اپنے فلور پر رہو وہاں سے باہر مت آنا۔“

نوجوان سر ہلاتا ہوا اوپر چلا گیا۔ زینی نے باہر جھانکا تو سامنے ہی دو سب افراد ایک کنکریت کی دیوار کی آڑ سے ہوئل کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔ میں ان کو دیکھ رہا تھا کہ کب زینی نے پستول پر سائیکسنگ لگا یا اور پھر اس نے ہاتھ آگے کر کے ایک فائر کیا اور دیوار کے پیچھے موجود افراد میں سے ایک غائب ہو گیا۔ دوسرا اسے دیکھنے کے لیے جھکا اور پھر اس نے اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر جوش میں ہوئل کی طرف پورا پورا حصہ مارا اور اس کے خاتمے پر خود بھی مارا گیا۔

”وہ دور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں گاڑی کی ضرورت ہوگی۔“

”یہاں گاڑی نہیں ہے ہمیں پیدل جانا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”چلو میرے ساتھ۔“

ہم درختوں اور مکانوں کی آڑ میں اس طرف روانہ ہوئے۔ فاصلہ ایک کلومیٹر سے کچھ کم تھا۔ اب فائرنگ کی آوازیں سہم گئی تھیں اور اگر دشمن ہمارے پیچھے آیا تھا تو وہ ہمارا نشان کھو چکا تھا۔ جب ہم پل کے پاس پہنچے تو روشنی اتنی ہو گئی تھی کہ پل پر موجود ایک گاڑی اور اس کے آس پاس موجود مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چونکنا تھے جیسے کسی کے منتظر ہوں۔ زینی نے تشویش سے کہا۔ ”یہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ان کو کیسے پتا کہ ہم یہاں آئے ہیں؟“

”اب تک ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہوگا اس لیے ان لوگوں کو اطلاع مل گئی ہوگی۔ یہ ہمیں دریا کر اس کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔“

”جب ہم پار کیسے جائیں گے؟“

”تیر کر۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں نے اس بار بھی کوئی اعتراض نہیں کیا کہ دریا کا پانی بے پناہ سرد ہوگا اور ہماری قلبی جم سکتی تھی۔ درحقیقت میں اعتراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس وقت زینی مجھ سے کہتی کہ میں آگ کے دریا میں کود جاؤں تو میں سوچے سمجھے بغیر اس کی بات پر عمل کرتا۔ زینی ذرا پیچھے آئی اور اس نے اپنے جوتے اتار کر گھر سے باندھ لیے۔ میں نے جوتے نہیں اتارے۔ اس نے اسلحہ اپنی پشت پر بندھے بیگ میں ڈال لیا تھا اور پھر ایک چھوٹی سی رسی نکال کر اسے اپنی اور میری چٹون کی بیلٹ سے باندھ لیا تاکہ ہم دریا میں الگ نہ ہو جائیں۔ پانی میں اترنے سے پہلے اس نے پوچھا۔ ”تم تیرنا جانتے ہو؟“

”بہت اچھی طرح۔“ میں نے کہا۔ مگر جب ہم دریا میں آئے اور ٹھنڈے پانی نے استقبال کیا تو اندازہ ہوا کہ میدانِ دریاؤں اور پہاڑی دریاؤں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ میں پانی نے ہمارے جسموں کی حرارت چوسنا شروع کر دی اور جب ہم دریا کے وسط تک پہنچے تو ٹھنڈے ٹھار پڑ چکے تھے۔ ہمیں طاقت جیسے سلب ہو گئی تھی اور ہمارے ہاتھ اب سلوموشن میں چل رہے تھے اور آگے جانے کی بجائے ہم دھارے کے ساتھ بہ رہے تھے۔ زینی کی حالت بھی بری ہو رہی تھی۔ اس سے یوں بھی مشکل سے تیرا جا رہا تھا کہ اس

زینی نے اس کے سر میں گولی ماری تھی اور اس کا نشانہ بہترین تھا کوئی تیس گز کے فاصلے سے اس نے دونوں افراد کو ایک ایک گولی سے نشانہ بنایا تھا۔ پھر اس نے جھانک کر باہر دیکھا اور بولی۔ ”آؤ راستہ صاف ہے۔“

ہم باہر نکلے اور ہوٹل سے مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ ہم جھگے ہوئے تھے اور رفتار تیز تھی۔ ایک گلی تک پہنچے تھے کہ عقب سے فائر ہوا اور ہم تیزی سے گلی میں گھس گئے۔ ہم بال بال پہنچے تھے کیونکہ چلائی جانے والی گولیاں ہمارے پاس سے گزری تھیں۔ عقب میں ہونے والی فائرنگ کے شور میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ گلی مڑتے ہی زینی نے دوڑنا شروع کر دیا اور میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اب تک میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میری دشمن ہے مجھے قیدی بنا کر لائی ہے اور اب میرے پاس موقع ہے کہ میں آزادی حاصل کر سکوں مگر میں بنا سوچے سمجھے اس کا ساتھ دے رہا تھا جیسے وہ کہہ رہی تھی ویسا ہی کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ مجھے فرار ہو جانا چاہیے یا اسے قابو کر لینا چاہیے۔ میں یوں اس کے ساتھ لگا ہوا تھا جیسے ہم ایک ہی ہوں اور دشمن وہ ہے جو ہمارے پیچھے آیا ہے۔ یہ گلی چوڑی بھی مگر آگے زینی جس گلی میں مڑی وہ تنگ تھی۔ ہم قصبے کی اندرونی آبادی میں گھس گئے تھے۔

یہاں دشمن نہیں تھے مگر وہ پیچھے ضرور آتے۔ اس لیے زینی تیز رفتار سے گھیاں کر اس کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس آبادی سے واقف تھی۔ یہ چھوٹا سا قصبہ پہاڑوں کے درمیان میں دریا کے کنارے تھا۔ کچھ دیر بعد ہم ایسی جگہوں سے گزرنے لگے جہاں مکانات فاصلے پر تھے اور درمیان میں باغات اور خالی جگہیں تھیں۔ فائرنگ کی آوازیں پیچھے رہ گئی تھیں مگر وہ دھڑکنے لگی تھیں۔ بھاگ دوڑ سے میری غنودگی غائب ہو گئی تھی مگر دشمن کو سن کرنے والی کیفیت برقرار تھی۔ اب بھی میں کچھ سوچنے سے قاصر تھا۔ ہم جس سڑک سے آئے تھے وہ دریا کے دوسری طرف تھی اور قصبہ دریا کے اس طرف تھا اس لیے ہمیں ہائی وے تک جانے کے لیے دریا کر اس کرنا پڑتا۔ درختوں اور کھیتوں کا ایک مختصر حصہ آیا اور اس کے بعد قصبے کا دوسرا حصہ سامنے آیا جو اصل میں دریا کے بالکل ساتھ تھا اور اس سے ایک سڑک نکل کر مخالف سمت میں جا رہی تھی جہاں دریا پر پل تھا اور وہاں سے اسے کراس کیا جاسکتا تھا۔ زینی نے صبح کی نمودار ہوئی روشنی میں پل کی طرف اشارہ کیا۔

”ہمیں وہاں جانا ہے۔“

کے پشت پر دس بارہ کلو گرام وزنی بیک تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے غوطے کھانا شروع کر دیئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اپنی تیراکی کی صلاحیت کا درست اندازہ نہیں تھا۔ خاص طور سے جب واسطہ ایسے شوریدہ سرد دریا سے ہو تو۔ ایک بار وہ پانی کے اندر گئی تو مجھے اس کو کھینچنا پڑا تھا اور اس کے بعد میں ہی اسے سنبھالنے لگا۔ مگر ہم تیرنے کی بجائے خود کو سطح پر برقرار رکھ رہے تھے۔ اس لیے کنارے کی طرف جانے کی بجائے دھارے کے ساتھ بہنے لگے اور اب ہل کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے زینی سے کہا۔

”ہل نزدیک آرہا ہے۔“

”وہ..... دیکھ لیں..... گے۔“ زینی نے اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”ان کی نظروں سے بچنا۔“ نیچے دریا میں ابھی نیم تاریکی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ زینی نے کسی قدر شوخ اور بے رحم کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ یہ پانی میں نمایاں ہو رہی تھی۔ میں نے اسے گھما کر اپنی آڑ میں کر لیا۔ میں آگے تھا اور وہ میرے پیچھے تھی۔ میری جیکٹ نیا لے رنگ کی تھی اور دریا کے پانی سے ہم رنگ ہو رہی تھی۔ اس کی جیکٹ مزید چھپانے کے لیے میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔ یوں وہ پانی میں زیادہ اندر چلی گئی تھی اور اس کی جیکٹ چھپ گئی تھی۔ اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ عجیب سچویشن تھی کہ ذہنی لحاظ سے میں اس کے بس میں تھا مگر جسمانی طور پر اس نے خود کو مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ ہم ہل کے نزدیک آئے تو میں نے دیکھا ایک آدمی کنارے پر کھڑا ہوا تھا مگر وہ نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر قصبے کی طرف تھی۔ پانی ہل سے کوئی تیس پینتیس فٹ نیچے تھا۔ مین اس وقت جب ہم ہل کے نیچے آرہے تھے اس آدمی نے نیچے دیکھا اور اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ فوراً ہی اس کے چلانے کی آواز آئی۔

”وہ دریا میں ہیں۔“

”گھرے سانس لو اور سانس روک لو۔“ میں نے زینی سے کہا اور خود بھی گھرے سانس لیے لگا اور پھر پھپھڑوں میں ممکنہ حد تک ہوا بھر کر میں نے زینی سمیت پانی میں غوطہ لگایا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم ہل کے دوسری طرف لگے تو پانی کے اندر تھے۔ مگر فوراً ہی ہمارے آس پاس گولیاں برسنے لگی تھیں۔ فائرنگ کی آواز تو نہیں آرہی تھی مگر جب گولی پانی میں اترتی تو مرغولے دار لکیری منچ جاتی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ مزید نیچے جاؤں۔ زینی تنزی سے سانس خارج کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے مسلسل بلبلے نکل رہے تھے۔ جب

ماہنامہ سرگزشت

کہ میں نے اپنی سانس اب تک روک رکھی تھی۔ ہمیں پانی میں آئے ہوئے دو منٹ ہو گئے تھے اور زینی نے اپنی سانس مکمل خارج کر دی تھی اب وہ سطح پر جانے اور سانس لینے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی مگر گولیاں ہمارے آس پاس گر رہی تھیں یعنی ہم فائرنگ کی زد میں تھے۔ اس لیے میں زینی کو اوپر جانے سے روک رہا تھا۔ ایک خطرہ یہ تھا کہ وہ پانی ہل لے گی اس لیے میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جما لیا۔ وہ سانس کے لیے پھلنے لگی۔ مگر میں اس کا منہ نہیں چھوڑ سکتا تھا ورنہ پانی اس کے پھپھڑوں میں چلا جاتا اور اس کا بچنا مشکل ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد اس کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ تیسرے منٹ تک ہم ہل سے اتنا دور نکل گئے تھے کہ اب گولیاں ہم تک نہیں آرہی تھیں۔ اس لیے میں نے اوپر آنا مناسب سمجھا۔ زینی نے پھلنا بند کر دیا تھا اور اب ڈھیلے انداز میں تیر رہی تھی۔ باہر نکلتے ہی میں نے دیوانہ وار سانس لیے اور پھر زینی کو بلایا۔ ”مراس کا سانس رکا ہوا تھا۔“

”اے سانس لو۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ مگر وہ ساکت رہی۔ مجبوراً میں نے اسے گھما کر سامنے کیا اور پہلے اس کے منہ سے منہ ملا کر اس کے پھپھڑوں میں ہوا بھری اور پھر اس کے سینے پر کئے مارے۔ نسوانی جسم کے نازک حصے پر یہ ضرب خاصی سخت تھی مگر مجبوری تھی۔ ایک بار کئے مارنے پر وہ بے حس رہی۔ مگر دوسری بار یہ عمل کرنے پر اس نے گھٹائیں کر سانس لی اور پھر گھرے گھرے سانس لینے لگی۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا اور اس کا سر پانی سے باہر رکھا کیونکہ وہ اس قابل نہیں تھی کہ از خود تیر سکتی۔ اس دوران میں ہم دریا میں بہتے جا رہے تھے اور مجھے ارد گرد کی خبر نہیں تھی۔ زینی کے سانس لینے کے بعد میں نے آس پاس دیکھا تو ہل پیچھے رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد زینی نے آنکھیں کھول دیں اور آس پاس دیکھا۔

”ہم کہاں ہیں؟“

میں نے اسے آگاہ کیا ”ہل سے آگے نکل آئے ہیں دھارے کے ساتھ جا رہے ہیں۔“

”ہم دوبارہ قصبے کی طرف جا رہے ہیں۔“ وہ مضطرب ہوئی۔ ”ہمیں کنارے پر جانا ہے۔“

وہ رہ رہ کر کھائیں رہی تھی اور میرے کموں سے یقیناً اسے تکلیف پہنچی تھی۔ قصبے کے پاس دریا کا پاٹ چوڑا اور دھارا بہا ہوا تھا۔ میں نے کنارے کی طرف دیکھا تو دور ایک گاڑی ہائی وے پر نظر آئی مجھے شبہ ہوا کہ یہ وہی گاڑی تھی جو میں نے ہل پر دیکھی تھی۔ پھر ہائی وے دریا

سے دور ہونے لگی اور گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ زینی نے کہا۔ ”چلو ہمیں اس کنارے چلنا ہے۔“

”اس طرف دشمن ہے۔“

”اسی لیے تو اس طرف جانا چاہیے وہ سمجھے گا کہ ہم قصبے کی طرف جا رہے ہیں۔“

اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں صرف منطقی اعتراض کر سکتا تھا اگر زینی کوئی بات کہہ دیتی تو اسے لازمی تسلیم کرنا چاہیے وہ عقل و منطق کے بالکل ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ میں نے اس کے ساتھ مخالف کنارے کی طرف تیرنا شروع کر دیا۔ دریا کا پاٹ چوڑا ہوا تھا مگر اس کی تندی ختم ہو گئی تھی اور اب ہم آرام سے تیر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم کنارے پہنچے۔ میں اوپر چڑھا اور پھر زینی کو بھی کھینچا۔ میں بھی ہانپ رہا تھا مگر اس کی حالت بری تھی۔ وہ دیوانہ دار سانس لے رہی تھی اور بالکل ڈھیر ہو گئی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا اور پھر اس سے کہا۔ ”ان جھاڑیوں تک چلو یہاں دیکھ لیے جانے کا خطرہ ہے۔“

”میں نہیں جا سکتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم مجھے لے چلو۔“

میں اٹھا اور اسے سہارا دے کر ان جھاڑیوں تک لے آیا۔ اس نے اپنا بیک اتارا اور اس کی زپ کھولی تو اندر سب خشک تھا گویا یہ واٹر پروف بیک تھا۔ اس نے اندر سے ایک میڈیکل پیک نکالا اور اس میں موجود چھوٹا سا انجکشن نکال کر اپنے دائیں بازو میں انجکٹ کر دیا۔ اس کی رنگت نیلی ہو رہی تھی اور وہ کھانسنے لگی تھی۔ اس نے رنگت بھالنے سے انجکشن نکلنے کے ایک منٹ بعد اس کی رنگت بحال ہونے لگی اور اس کی سانس بھی ہموار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میڈیکل پیک میں اور بھی کئی انجکشن اور دوایاں تھیں۔ مگر اس نے صرف وہی انجکشن لے کر پیک بند کیا اور اسے واپس بیک میں رکھ لیا۔ حالت ٹھیک ہوتے ہی اس نے اٹھ کر اپنی جیکٹ اتاری۔ پھر شرٹ کے بٹن کھولنے لگی تو اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ رکی اور اس نے تحسنا نہ انداز میں کہا۔ ”اے میری طرف دیکھو۔“

میں نے نہ جانتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھا تو وہ دوبارہ بٹن کھولنے لگی تھی۔ اس نے شرٹ اتار دی۔ اس کے نیچے زیر جامہ تھا۔ پھر اس نے اپنی بھاری.... اور کسی ہوئی پتلون کی قدر دقت سے اتاری۔ بھیک کر وہ اور چمٹ رہی تھی۔ نیچے بھی زیر جامہ تھا اور اب وہ نہ ہونے کے برابر لباس میں تھی۔ مگر میں تو اسے اس سے بھی زیادہ کھلے ڈالے

حلیے میں دیکھ چکا تھا۔ دوسرے اسے یوں دیکھ کر بھی مجھے کوئی احساس نہیں ہوا جب کہ میں پہلے سننا گیا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے نچوڑے اور پھر ان کو جھٹک کر ممکنہ حد تک پانی نکال دیا۔ وہ بلاشبہ نہایت حسین عورت تھی۔ بعض عورتوں کے نقوش حسین ہوتے ہیں اور بعض جسمانی لحاظ سے جاذب نظر ہوتی ہیں۔ مگر زینی میں یہ دونوں خصوصیات تھیں۔ اس کے نقوش جتنے دل فریب تھے جسمانی زاویے اس سے زیادہ حسین تھے۔ اس نے دوبارہ کپڑے پہن لیے اور مجھ سے کہا۔ ”تم بھی اپنے کپڑے خشک کر لو۔“

میں ایک جھاڑی کی آڑ میں آیا اور لباس اتار کر نچوڑا۔ جوتوں میں پانی بھر گیا تھا انہیں جھٹک کر صاف کیا اور پھر پہن لیے۔ میں جھاڑی سے باہر آیا تو وہ جیکٹ پہن کر بیک پشت پر باندھ چکی تھی مگر اس نے اسلحہ نکال لیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی اور پستول اس نے جیکٹ میں رکھا ہوا تھا۔ اگرچہ میں اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا مگر اس نے اب تک اسلحے کے معاملے میں مجھ پر اعتبار نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس اضافی اسلحہ تھا۔ دریا کے ساتھ ڈھلان تھی دراصل یہ دریا کافی حصہ تھا۔ کئی سالوں بعد جب سیلاب آتا ہوگا تو دریا کا پاٹ اوپر ہائی وے کے پاس پہنچ جاتا ہوگا۔ اسی وجہ سے یہاں صرف چھوٹی جھاڑیاں اور درخت تھے۔ ہم اوپر جانے لگے۔ مگر جھاڑیاں زیادہ نہیں تھیں اس سے اوپر کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دریا نزدیک ہونے کی وجہ سے انہیں آبپاشی کے لیے پانی آسانی سے مل جاتا تھا۔ اس لیے سیلاب کے خطرے کے باوجود یہاں کاشت کاری کی جا رہی تھی۔ ہم اوپر آئے تو ہائی وے پر ویرانی تھی۔ روشنی زیادہ ہو چکی تھی اور سورج کسی لمحے نکل سکتا تھا۔ ہائی وے کے پار بھی دور تک سیر می نما کھیت نظر آ رہے تھے۔ زینی نے ان سے اوپر اشارہ کیا۔

”ہمیں اس طرف جانا ہے۔“

”درمیان میں لوگ مل سکتے ہیں۔“

”لوگوں کا مسئلہ نہیں ہے ان دشمنوں سے پیچھا چھڑانا ہے۔“

”لوگ ان کو بتا سکتے ہیں کہ ہم کہاں گئے۔“

”ہمیں ایسی جگہوں سے گزرتا چاہیے جہاں لوگ نہ ہوں۔“

زینی نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ سامنے کی بات ہے لیکن اس وقت میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔“

”ایسی عقل کا کیا فائدہ جو وقت پر کام نہ آئے۔“
 میں نے کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“

”چلو میرے ساتھ۔“ وہ بولی اور ہم ہائی وے کے متوازی چلنے لگے۔ ممکن حد تک آڑ میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ زینی کر رہی تھی میں تو اس کے حکم کا غلام بنا ہوا تھا۔ چند منٹ بعد ہم ہائی وے کے ایک ایسے حصے میں تھے جس کے پار دوسری طرف ویران پہاڑ اور گھانیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم نے ہائی وے کو اس کی اور دوسری طرف پہنچ گئے۔ ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا زینی نے بیک سے ایک نقشہ نکالا اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ میں بھی دیکھ رہا تھا اس نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”ہمیں یہاں پہنچنا ہے۔“

”اسد آباد۔“ میں نے غور کیا۔ ”ہم اس وقت کہاں ہیں؟“

”یہاں۔“ اس نے ایک اور جگہ انگلی رکھی۔ یہاں اسرار لکھا تھا۔ گویا اس قصبے کا نام اسرار تھا۔ یہ جگہ پاکستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اسرار سے اسد آباد تک وہی ہائی وے جاری تھی جو اصل میں پاکستان سے آرہی تھی۔ میں نے کہا۔

”لیکن اس علاقے سے ایک ہی ہائی وے جاتی ہے اور تمہارے دشمن تمہیں کہیں بھی روک سکتے ہیں۔“

”ہم پیدل اور ہائی وے سے ہٹ کر سفر کریں گے۔“ اس نے جواب دیا اور نقشہ تہہ کر کے واپس جیکٹ میں رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”چلو ہمیں گھوم کر جانے میں بہت وقت لگے گا۔“

”ہم شام تک پہنچ سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس طرف دریا اور سڑک کے ساتھ آبادی ہے۔“

”ہاں اسی وجہ سے مشکل ہوئی۔ مگر ہم دوسروں کی نظروں سے بچ کر سفر کر سکیں گے۔“

ہم چل پڑے۔ میری کیفیت ایسی تھی کہ مجھے تجسس تک نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور زینی نے اپنے ہی ساتھیوں کو کیوں مروادیا تھا پھر یہ کون تھے جو اس کے حکم کے غلام بنے ہوئے تھے اور اب اس کے کچھ دشمن بھی نکل آئے تھے جنہوں نے ہمیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ علاقہ نہایت مشکل اور دشوار گزار تھا اس لیے آبادی کے پاس ہونے کے باوجود اسے استعمال میں نہیں لایا جاسکا

عابدنامہ سرگزشت

تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر کی طرف جا رہے تھے راستے کی دشواری بڑھ رہی تھی مگر یہی دشواری ہمیں پیچھے آنے والوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ مگر اس مشقت سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ بخ پانی میں رہنے سے جسم کی حرارت جو زائل ہو گئی تھی دوبارہ لوٹنے لگی اور ہمارے کپڑے خشک ہونے لگے۔ سورج بلند ہونے کے بعد یہ عمل تیزی سے ہوا تھا اور ایک گھنٹے سے بھی پہلے ہمارے کپڑے خشک ہو گئے تھے۔ بلکہ اب کسی قدر گرمی لگ رہی تھی۔

ہم سیرمی دار کھیتوں کے اوپر موجود پہاڑی سلسلے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ جگہ بلندی پر تھی اور یہاں سے برف پوش پہاڑ زیادہ دور نہیں لگ رہے تھے۔ دھوپ خاصی تیز تھی مگر جہاں سائے سے گزرتے تھے خشکی ایک لمحے کو کاپنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم ویرانے میں سفر کر رہے تھے۔ تب پہلی بار میں نے اپنے اندر تبدیلی محسوس کی اور مجھے لگا کہ میری کیفیت بدل رہی ہے۔ میرا ذہن جو سن ساتھ اب بہتر ہو رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں زینی کے ساتھ اتنے سکون سے سفر کیوں کر رہا تھا؟ جب کہ وہ مجھے قیدی بنا کر لائی تھی اور مجھے کسی کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ تھا۔ پھر مزید ذیلی سوالات ذہن میں پکرانے لگے کہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیا کیا تھا اور یہاں کس پکر میں تھی؟ مگر مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا یعنی یہ موقع نہیں ملا کہ میں زینی سے چھٹکارے کا سوچتا۔ کیونکہ اچانک زینی رک گئی اور اس نے کہا۔

”وقت ہو گیا ہے۔“

”کس چیز کا؟“

”بھئیو۔“ اس نے حکمانہ انداز میں کہا اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے بیک سے میڈیکل پیک نکالا اور اس میں سے ایک چھوٹا انجکشن نکال کر مجھ سے بازو سامنے کرنے کو کہا اور میں نے بازو اگے کیا تب میں نے اس پرنس کی جگہ انجکشن کا نشان دیکھا۔ مجھے پہلے بھی انجکشن لگا تھا اور زینی نے اسی جگہ یہ انجکشن بھی لگا دیا۔ یہ نزو کا تھا۔ انجکشن لگنے کے چند منٹ تک میرا سر پکراتا رہا۔ زینی نے اس دوران میں مجھے نہیں چھیڑا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے کہا۔ ”اٹھو۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اگلا حکم دیا۔ ”اس چٹان پر جاؤ اور نیچے کود جاؤ۔“

میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ نیچے کودنے کی صورت میں میرے نیچے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چٹان کی طرف

بڑھا اور اس پر چڑھ کر کنارے جا رہا تھا کہ عقب سے زینہ نے کہا۔ ”رک جاؤ۔“

میں رک گیا تو اس نے حکم دیا۔ ”واپس آ جاؤ۔“
میں واپس آ گیا۔ اس دوانے مجھے اس کا غلام بنا دیا تھا۔ یہی حربہ میں بھارت میں دشمنوں پر استعمال کر چکا تھا اور اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا تھا۔ یعنی زینہ نے میرا جوتا میرے ہی سر مارا تھا۔ اگرچہ اب ایسی اودیات کا استعمال کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن میرے ساتھ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ قبوے میں نیند کی دوا دینے کے بعد مجھے انگلشن دیا گیا تھا بھی جاننے کے بعد اور موقع ملنے پر بھی میں نے فرار کی کوشش نہیں کی بلکہ زینہ کا ساتھ دیتا رہا اور اس کی جان بھی بچائی۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسے موت کے منہ سے بچھ لیا تھا۔ ورنہ اس کا سانس تو رک گیا تھا۔ گویا اپنے پاؤں پر میں نے خود کھپاڑی ماری تھی۔ اگر وہ مر جاتی تو اس وقت میں آزاد ہو چکا ہوتا۔ میرے اس طرح رویہ بننے پر وہ خوش تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تم نے دیکھا کہ میرے اشاروں پر کیسے ناچ رہے ہو؟“

میرے اندر کوئی لہر نہیں اٹھی میں سن کھڑا رہا۔ اس لیے میں نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی، پھر میرے پاس آئی اس نے اپنی بانٹیں میرے گلے میں ڈال دیں اور ذرا چمک کر ہونٹ میرے ہونٹوں کے سامنے لے آئی۔ وہ اپنی من مانی کر رہی تھی اور میں اسے روک نہیں سکتا تھا مگر میں کچھ محسوس بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بھی میرا سیاٹ پن محسوس کر لیا اور کسی قدر جھنجھلاہٹ کے ساتھ الگ ہو گئی۔ ”تم بالکل ٹھس ہو گئے ہو میرا ساتھ دو۔“
میں نے ساتھ دیا مگر اسے مزہ نہیں آیا۔ اسی نے ٹھس کیا تھا ورنہ اسے پاس آنے پر مشکل ہی آسانی اس کی گردن مروڑ دیتا۔ اس نے بیک سے ایک بول وعلانی ڈبا نکالا اور اسے کھول کر اس میں سے ایک درمیانے سائز کا بسکٹ نکالا اور اسے منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ پھر اسے حلق سے اتارنے کے لیے اس نے پانی کا سہارا لیا۔ اس نے اب بھی ایک بسکٹ مجھے بھی دیا۔ میں نے اس بد مزہ سے بسکٹ کو بڑی مشکل سے پانی کی مدد سے نیچے کیا۔ مگر اسے کھاتے ہی مجھے لگا جیسے میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا ہو۔ زینہ بولی۔ ”یہ ہائی پروٹین بسکٹ ہے سمجھ لو ایک بسکٹ میں ایک وقت کے کھانے کی مکمل غذا سمیت ہوتی ہے۔“
میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے لگ رہا ہے میں نے اچھی طرح کھایا ہو۔“

میسویں صدی میں جینیاتی انجینئرنگ کی بنیاد رکھی گئی اسی صدی کے دوران انسان نے خلاؤں کو مسخر کیا چاند پر پہلا قدم رکھا اور مریخ کی طرف قدم بڑھائے۔ مواصلاتی سیاروں نے دنیا کے فاصلوں کو مٹا ڈالا۔ کمپیوٹر اور سپر کمپیوٹر کی ایجاد نے حیات انسانی کو ترقی کی ایک نئی شاہراہ پر لاکھڑا کیا۔ کیا طب ہو یا کیمیا طبعیات ہو یا حیاتیات فلکیات ہو یا ارضیات زمین سے آسمان تک سطح زمین سے نہ زمین تک ہر جگہ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے نقش ستاروں جیسے دھکتے نظر آتے ہیں۔ جوہری ٹیکنالوجی ہو یا انفراریڈ ٹیکنالوجی کمپیوٹر ٹیکنالوجی ہو یا بیو ٹیکنالوجی سب ہی میسویں صدی میں انسانی فہم و فراست کی عظمت کی دلیل ہیں۔

”بس اب چلو۔“ وہ کھڑی ہو گئی مگر اس بار اس نے بیک مجھے تھما دیا اور میں نے اسے پشت پر باندھ لیا۔ یہاں ڈھلان اترتی تھی اور زینہ نے دو عدد ککڑیاں تلاش کیں جن سے ہم اسٹک کا کام لے سکتے تھے۔ سہارے کے بغیر اترنا مشکل کام تھا۔ اسٹک سے یہ آسان ہو گیا۔ سورج سر پر آ گیا تھا اور اس کی تپش اب بڑھ گئی تھی۔ خاص طور سے سر جیسے براہ راست حرارت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنا رومال سر پر باندھ لیا۔ زینہ کے پاس ڈھیلی اوٹی ٹوپی تھی اس نے وہی پہن لی۔ اگرچہ یہ گرم تھی مگر ٹی الحال دھوپ سے بچا رہی تھی۔ بلندی پر پانی نہیں تھا اس لیے ہمیں اسی بوتل پر گزارا کرنا تھا۔ دوپہر تک جب کہیں پانی نہیں ملا تو زینہ بوتل خود استعمال کرنے لگی۔ اس نے مجھے پانی دینا بند کر دیا۔ ایک گھنٹے میں میرا حلق خشک ہو گیا اور اس میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے۔ یہاں گرمی سے زیادہ خشکی تھی جس نے پیاس کو ذرا سی دیر میں شدید کر دیا تھا۔ جب میرے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو میں نے اس سے پانی مانگا۔

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“
”مجھے نہیں پانی نہیں ملے گا۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔

”تب میں پانی کہاں سے لوں؟“
”دیکھو شاید راتے میں کوئی ندی یا تالاب آئے گا تو پی

”چشموں کا پانی ایسے ہی نہیں پینا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”بعض اوقات اس میں زہریلی معدنیات یا پودوں کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ویسے یہ پانی ٹھیک ہے۔“

میں نے دل بھر کر پانی پیا اور زینی نے اپنی بوتل بھی بھری۔ یہ ڈیڑھ لیٹر کی بوتل تھی۔ بلکہ اسے پانی اتنا اچھا لگا کہ اس نے اپنا پہلے والا پانی پھینک کر چشمے سے پانی بھر لیا۔ اس دوران میں میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ دھوئے اور اپنا تپ جانے والا سر کچھ دیر کے لیے پانی میں رکھ کر ٹھنڈا کیا۔ اس ٹھنڈک نے مجھے بالکل تروتازہ کر دیا تھا۔ سیراب ہو کر ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ زینی نے نقشہ نکال کر دیکھا اور روٹ ڈرا بدل دیا۔ ہم واپس ڈھلان کی طرف جانے کی بجائے اسی چشمے سے اوپر چڑھنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”اس طرف سے کیوں جا رہے ہیں؟“

”یہ شارٹ کٹ ہے۔“ وہ بولی۔

مگر شارٹ کٹ خاصا طویل ثابت ہوا کیونکہ ترچھا ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں راستہ اتنا زیادہ گھوم رہا تھا کہ اس کی بجائے اگر ہم واپس ڈھلان پر جا کر چڑھتے تو اب تک دوسری طرف پہنچ چکے ہوتے۔ زینی تھک گئی تھی اور سیرا حال بھی اچھا نہیں تھا لگا تار تین دن سے پہاڑی راستوں پر سفر کر رہے تھے۔ جب ہم اوپر پہنچے تو دوسری طرف بھی اتنی ہی مشکل اترائی تھی اور شام سر پر تھی۔ اس اترائی کے بعد ایک وسیع میدان نما پلیٹو دکھائی دے رہی تھی۔ مگر یہ بھی پہاڑوں کے اوپر تھی۔ یہاں دور ہائی دے بھی نظر آرہی تھی۔ میں نے زینی سے کہا۔ ”اگر تم نے آج ہی اسد آباد پہنچنا ہے تو ہائی دے تک جانا ہوگا ہم کسی گاڑی میں ہی وہاں تک جاسکتے ہیں۔“

غالباً وہ بھی یہی سوچ رہی تھی اس لیے فوراً مان گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں ہائی دے کی طرف جانا چاہیے۔“

اس دشوار ڈھلان سے کسی نہ کسی طرح نیچے آئے تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ ہم نے شاید دس کلومیٹر کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا اور سارا دن گزر گیا تھا۔ میدان سے ہوتے ہوئے ہم ہائی دے کے پاس آئے۔ اس پر ٹریفک گزر رہا تھا مگر اس طرح کہ چند منٹ بعد کوئی گاڑی آئی یا جاتی نظر آتی تھی۔ ہم ہائی دے کے نزدیک آئے تو خود کو چھپانے لگے۔ اس کا امکان تھا کہ پیچھا کرنے والے یہاں بھی ہوں۔ ایک موزوں جگہ ہم نے

ہم نے سفر جاری رکھا مگر ہر گزرتے لمحے پیاس کی شدت بڑھ رہی تھی اور اگر جسم میں پانی ایک حد سے کم ہو جاتا تو ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت ہو جاتی۔ مجھے چکر آنے لگتے اور نظر دھندلانا شروع کر دیتی۔ مگر فی الحال صرف تسکینی تھی۔ میں چلتے ہوئے ایسی جگہوں پر جھانک رہا تھا جہاں گڑھوں میں گزشتہ بارش کے پانی کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا مگر قسمت کہ بارش کو اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ اگر پانی تھا بھی تو اب خشک ہو چکا تھا۔ ہمارا رخ نیچے کی طرف تھا اور اس کا امکان بڑھ رہا تھا کہ راستے میں کوئی ندی یا نال لٹ جائے۔ سبہ پہر تک ہم ایک ڈھلان عبور کر کے نیچے پہنچے تو اوپر چڑھائی مختصر تھی۔ بائیں طرف نشیب میں گہرائی تھی میں نے زینی سے کہا۔ ”اب مجھ سے پیاس برداشت نہیں ہو رہی ہے وہاں نیچے پانی ہو سکتا ہے۔ مجھے پانی دو یا وہاں تک چلو ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا؟“ اس نے تیز لہجہ میں پوچھا۔

”مجھے ڈی ہائیڈریشن کی کیفیت شروع ہو جائے گی اس وقت بھی میرا سر ہلکا سا چکر رہا ہے۔“

اس نے سوچا اور سر ہلکا کر پہلے بوتل میری طرف بڑھائی۔ ”اس سے دو گھونٹ لے لو۔“

میں نے دو گھونٹ لے کر بوتل اسے واپس کی اور اب میری حالت بہتر ہوئی تھی۔ زینی میرے ساتھ اس نشیب کی طرف بڑھی۔ یہاں سبزہ گہرے رنگ کا تھا جو اس بات کی نشانی تھی کہ یہاں پودوں کو زیادہ پانی ملتا تھا۔ پہاڑی علاقے پانی کے لحاظ سے صحرا سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے ہیں یعنی ان کی زمین میں پانی زیادہ دیر نہیں ٹکتا ہے۔ اس لیے پودوں کو اپنے پاس پانی محفوظ کرنا پڑتا ہے۔ البتہ پہاڑوں میں بارش ٹپکنا زیادہ ہوتی ہے اور پھر برف بھی پگھلتی ہے۔ اس لیے یہاں ہریالی پائی جاتی ہے۔ ہم ذرا نیچے آئے تھے کہ پانی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ چشمہ تھا جو زمین سے ابل رہا تھا مگر ایک ہی جگہ دوہوتا تھا۔ میں تیزی سے پانی کی طرف بڑھا۔ پانی شفاف اور ہلکوں رنگ کا تھا اس سے نباتات کی مخصوص مہک آ رہی تھی میں نے ٹھیکے میں لے کر پہلے اسے چکھا اور صرف پانی کا ذائقہ محسوس کر کے ایک بار منہ میں لیا۔ اس بار بھی پانی میں کوئی خرابی محسوس نہیں کی اس لیے چند گھونٹ پی کر دیکھا۔ زینی میرے عقب میں موجود احتیاط پسندی کا مظاہرہ دیکھ رہی تھی اور جھنجھلا رہی تھی۔

قیام کیا۔ یہاں سے ہم ہائی وے پر دونوں طرف نظر رکھ سکتے تھے اور کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ویسے بھی اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب ہوا میں خنکی محسوس کی جاسکتی تھی۔ مگر مجھے بھوک لگ رہی تھی عام حالات میں میں کبھی اپنے دشمن سے اس طرح کھانے کا سوال نہیں کر سکتا تھا مگر میں جس کیفیت میں تھا میں نے آرام سے زینے سے کہہ دیا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”کچھ دیر صبر کر لو اگر گاڑی مل گئی تو ہم کھانا بھی کھا سکیں گے۔ یہ انرجی بسکٹ ہنگامی حالات کے لیے ہیں۔“

”ہم یہاں کس کا انتظار کر رہے ہیں؟“

”بس کا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہم چھوٹی گاڑی والوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے وہ دشمن بھی ہو سکتے ہیں اور چور ڈاکو بھی۔“

”یہ دشمن کون ہیں؟“

”میں نہیں جانتی مگر اندازہ ہے۔ یہاں کا ایک طاقتور سردار میرے پیچھے پڑ گیا ہے یہ اسی کے آدمی ہیں جو مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

”یعنی یہ میرے چکر میں نہیں ہیں؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”یہاں تمہیں کون جانتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے کوئی نکل آئے۔“ میں نے کہا۔ ”یقین سے مت کہو۔“

اس کا منہ بن گیا اس کے خیال میں میں نے اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”اس طاقتور سردار کو تم سے کیا مطلب ہے؟“

”یہ اس سردار کا بھائی ہے جسے میں نے قتل کیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”وہ اپنے بھائی کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔“

”تم نے شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو کیوں مارا؟“

”وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کے بس میں ہوں۔“ زینے کا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔ ”اس لیے وہ مجھ سے جیسا چاہے سلوک کر سکتے ہیں۔“

”اگر تم ان سے خوش نہیں تھیں تو ان کے ساتھ کیوں تھیں؟“

”میں اصل میں تمہارے لیے پاکستان گئی تھی۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”وہ سمجھے کہ میں مجبوری میں ان کے ساتھ شامل ہوئی ہوں۔ یہ کام بھی بد ظاہر میں نے ہی ان کو دلایا تھا۔ میں تم کو لے آئی اور ساتھ ہی ان کو بھی کیفر کردار تک

پہنچا دیا۔“

میں نے اس کی بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی۔ ”میرے لیے کیوں؟“

”کسی کو تمہاری تلاش ہے۔“

”میری تلاش کس کو ہے؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ ”میں تم کو اس کے پاس لے جانے کی کوشش کر رہی ہوں اگر کامیاب رہی تو تم دیکھ ہی لو گے۔“

”تم نے مجھے انجکشن کس چیز کا لگایا ہے؟“

”شریف بتائے رکھنے کا۔“ وہ ہنسی۔ ”اگر میں تمہیں یہ انجکشن نہ لگاتی تو اس وقت تم میرے قابو میں کہاں ہوتے؟“

میں نے سوچ کر کہا۔ ”ہاں میں بھاگ جاتا۔ آج تک کوئی دشمن مجھے زیادہ دیر قید نہیں رکھ سکا۔“

”تم بہت خطرناک آدمی ہو، مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ آ گئے۔“

”شیر خان اور اس کے ساتھی۔“

”انہیں بھول جاؤ۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”وہ گھٹیا درجے کے جرائم پیشہ تھے اور ان کا انجام یہی ہوتا تھا۔“

”میں نے شیر خان سے کہا تھا۔“

”تم نے ٹھیک کہا تھا میرے پاس وقت ہوتا تو میں انہیں تڑپا تڑپا کر مارتی۔“

میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”دیکھنے میں اتنی ظالم نہیں لگتیں مگر تم نے کیسے آرام سے ان تینوں کو مار دیا۔“

”میں نے قسم کھائی تھی مجھے جب موقع ملا میں انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گی۔“

”یہ چاروں جو ہمارے ساتھ آئے کیا تمہارے پرانے ساتھی ہیں؟“

”نہیں انہیں اس شخص نے ہار کر کے میری مدد کے لیے بھیجا جس کے لیے میں کام رہی ہوں۔ ورنہ میں ان کو جانتی بھی نہیں ہوں۔“

”شاید وہ چاروں مارے گئے ہیں۔“

اس نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ ”حملہ آور زیادہ تھے میں انہیں اسی لیے ہار کیا گیا تھا۔ ویسے بھی اس ملک میں مرنے والے کے سوا اور ہے ہی کیا؟“

”تب تک یہاں کیوں آئی ہو؟“

”صرف اسی کام کے لیے اس کے بعد میں واپس

جار جیا چلی جاؤں گی۔ وہاں میرا خاندان ہے۔“
”تم نے جو وقت گزارا ہے کیا اس کے بعد نارمل زندگی گزار سکو گی؟“

”ہاں نہیں۔“ اس نے مجھے گھورا۔ ”تم کچھ زیادہ ہی بات نہیں کر رہے ہو اس انجکشن کے بعد آدمی چپ رہتا ہے۔ مگر تم ہو کہ بولے جا رہے ہو۔“

”میں زیادہ بولتا ہوں۔“ میں نے اعتراف کیا۔ زینی نے سڑک کی طرف دیکھا اور بولی۔
”میرا خیال ہے بس آگئی ہے۔“

بس اسی سمت سے آ رہی تھی جس طرف سے ہم آئے تھے۔ زینی نے رانفل بیک میں کر لی اور اب بیک اپنے قبضے میں لے لیا البتہ اس نے پستول جیکٹ تلے چلون کی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”آؤ۔“

ہم سڑک پر آئے اور زینی نے خود کو نمایاں کرتے ہوئے بس روکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے پہلے ہی بیک لگا دی اور ہمیں بس تک جانا پڑا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو بس کچھ کھینچ بھری ہوئی تھی اور اس میں خواتین اور حضرات کے ساتھ ساتھ چرند پرند بھی تھے۔ بس میں بیٹھیں چند ایک تھیں جو دی آئی لی حضرات کے لیے مخصوص تھیں باقی سینیٹ نکال کر جگہ کشادہ کی تھی جس میں زیادہ سے زیادہ افراد کو ٹھونسا ہوا تھا۔ اندر کا حال دیکھ کر زینی نے آگے جانا مناسب نہیں سمجھا اور ڈرائیور نے فوراً اسے اپنے ساتھ والی نشست پیش کی اور اس پر براجمان کنڈیکٹر کو وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ زینی بیٹھ گئی اور میں دروازے پر ہی کھڑا ہو گیا۔ آگے جانے کا کوئی چانس ہی نہیں تھا۔ بس آگے بڑھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر پیچھا کرنے والوں میں سے کوئی بس میں ہوا تو اس کا ریوئل کیا ہو گا؟ اس سے پہلے بھی ہم پر براہ راست فائرنگ کی گئی تھی اور اب بھی امکان یہی تھا کہ ہمیں مارنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر شکر ہے بس میں کوئی دشمن نہیں تھا اور ہم آرام سے اسدا کا پیچھے گئے۔

جس جگہ ہم بس پر سوار ہوئے وہاں سے اسدا آباد مشکل سے دس بارہ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا اور ڈرائیور تیز رفتاری کا مریض تھا اس نے یہ فاصلہ مشکل سے چند منٹ میں طے کر لیا اور جب اسٹاپ پر ہم اترنے لگے تو ڈرائیور مایوس ہوا تھا کہ اس نے اتنی جلدی کیوں دکھائی مزید کچھ دیر زینی کا ساتھ رہتا۔ زینی نے راستے میں مکٹ لے لیے تھے۔ اسدا آباد بڑا قصبہ یا پھونٹا شہر ہے اور رات کے وقت بھی یہاں خاصی چہل پھل تھی۔ زینی نے نیچے اترتے ہی

ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ٹیکسی والا اسے اڑا کر لایا تھا۔ بہ مشکل ہم اس کی زد سے بچے اگر ٹیکسی کے بریک بہت اچھے نہ ہوتے تو وہ ہم پر چڑھ جاتی۔ اس کے بریک تو اچھے ہونے تھے کیونکہ یہ سننے ماڈل کی ٹویونا کرولا تھی اور یہاں ٹیکسی کے طور پر کام کر رہی تھی۔ افغانستان میں گاڑیاں اسمگل ہو کر آتی ہیں۔ کوئی ڈیوٹی ٹیکس اور رجسٹریشن نہیں ہے اس لیے نہایت سستی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ اعلیٰ درجے کی گٹھڑی گاڑیوں سے ٹیکسی حتیٰ کہ بار برداری کا کام بھی لیا جا رہا تھا۔ اگر انہیں بنانے والی کمپنیاں اپنی گاڑیوں کا استعمال دیکھتیں تو یقیناً صدمے میں آجائیں۔

کار میں کم نظر آ رہی تھیں جب کہ بڑی گٹھڑی فور وہیل ڈرائیور کی بھر مار تھی۔ بازاروں کی رونق بتا رہی تھی کہ فی الحال یہاں لوگوں کے پاس خاصا پیسا آیا تھا۔ زینی نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو کسی جگہ کا بتایا۔ اس نے سر ہلایا اور ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ عام سی گلیوں اور سڑکوں پر وہ بہت تیز ڈرائیور کر رہا تھا اور یہاں لوگ اس کے عادی تھے کیونکہ کسی نے اسے گالی نہیں دی اور نہ لعنت دکھائی جیسا کہ ہمارے ہاں کا رواج ہے۔ شہر دو دریاؤں کے سنگم پر آباد ہے اور اس کا بڑا حصہ جزیرہ نما جگہ پر ہے جس کے تقریباً چاروں طرف پانی بہتا ہے۔ ہم اسی جزیرہ نما حصے میں اترے تھے اور اسی میں کہیں جا رہے تھے۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد ٹیکسی ایک بڑے سے مکان کے سامنے رکی۔ یہ جدید طرز کا اور ماربل سے ڈھکا ہوا مکان تھا۔ یقیناً کسی دولت مند کا تھا۔ فولادی گیٹ پر نہ صرف دو عدد سگ گارڈز تھے بلکہ مکان کی چھت پر باقاعدہ سور چھینا کر اس میں ایل ایم جی نصب کی گئی تھی۔ ہم نیچے اترے تو ایک گارڈ آگے آیا۔

”ادھر کیوں آیا ہے؟“

”رنی شاہ سے کہو زینی آئی ہے۔“ زینی نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔ گارڈ کچھ دیر اسے نظروں سے ٹٹولا رہا پھر مرکز گیٹ تک گیا اس نے آگے پیغام پہنچایا اور اس نے آگے کسی سے کہا کیونکہ پیغام خاصی دیر میں پہنچا اور نتیجے میں رنی شاہ خود آ گیا۔ اس نے والہانہ انداز میں زینی سے ہاتھ ملایا۔

”تم ادھر کب آیا مجھے بتایا ہوتا میں گاڑی بھیجتا۔“

”میرے پاس گاڑی اور آدمی تھے۔“ زینی نے اندر جانے ہوئے کہا۔ ”لیکن سب راستے میں رہ گئے۔“

رنی شاہ چونکا۔ ”کیا ہوا؟“

”میرا خیال ہے گہرام کے آدمی تھے۔ انہوں نے

رفی شاہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”وہ انڈیا والا۔“
 ”پاکستانی۔“ زینی نے صحیح کی۔ ”ہاں وہی جس نے
 انڈیا میں تباہی پھیلائی تھی۔“
 رفی شاہ کی آنکھوں میں بدستور شک تھا بس شک کی
 نوعیت بدل گئی تھی۔ ”دیکھنے میں تو یہ عام سا آدمی لگ رہا
 ہے۔“

”انسان کا کام ہی دھوکا دینا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ہم
 اندر آئے۔ مکان باہر سے جتنا شاندار تھا اندر سے اس سے
 کہیں زیادہ شاندار تھا۔ ہر چیز غیر ملکی اور اعلیٰ درجے کی
 تھی۔ یہاں بجلی تھی اس لیے پورا گھر جگمگ کر رہا تھا۔
 زینی نے اندر آتے ہی بے تکلفی سے کہا۔ ”اپنے باورچی
 سے کہو جلد از جلد کھانا بنا دے اور کچھ پیئے کو دو۔“

رفی شاہ نے دونوں چیزوں کا کہا۔ یہ جاننے کے بعد
 کہ میں شہباز ملک ہوں اس کا رویہ کسی قدر بدل گیا تھا۔
 میں اگر اپنی درست کیفیت میں ہوتا تو لازمی حیران ہوتا کہ
 میری شہرت سرحد پار تک موجود تھی۔ ایک ملازم ام النجاشٹ
 کی بوتل اور بلوریں جام ایک شیشے کی ٹرے میں رکھ کر لے
 آیا اور اس نے سلیقے سے جام بنا کر سب کے سامنے رکھے۔
 میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں پیتا ہوں۔“

رفی شاہ کی رنگ خباثت پھڑکی اور اس نے زینی سے
 کہا۔ ”تم تو کہہ رہی تھیں یہ تمہارے قابو میں ہے۔“
 ”ہاں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اپنا ماضی
 بھول گیا۔“

”لیکن ہے تو تمہارے حکم کا غلام اسے کہو کہ شراب
 پیے۔“

”کیا ضرورت ہے جب کہ یہ نہیں پیتا۔“ زینی نے
 بے پروائی سے کہا اور ایک ہی سانس میں اپنا جام خالی کر
 دیا۔ وہ بلا نوش لگ رہی تھی۔ ورنہ یہ خامی حیرت انگیز تھی۔
 ”تمہیں پتا تو چلے کہ یہ کچھ تمہارے قابو میں ہے یا
 نہیں۔“

اس کی بات پر زینی نے پہلے اسے گھورا اور پھر مجھے
 دیکھنے لگی۔ رفی شاہ نے کسی شیطان کی طرح اس کے دل
 میں وہم ڈال دیا تھا۔ میں سن کیفیت کے باوجود اندر سے
 عجیب سا محسوس کرنے لگا۔ مجھے خوف آرہا تھا کہ اگر زینی
 نے مجھے شراب پینے کا حکم دیا تو میں کیسے مزاحمت کروں گا
 جب کہ حکم میں کا حکم ماننا آیا تھا اور میں نے ایک بار بھی
 مزاحمت محسوس نہیں کی تھی۔ مگر پہلی بار میں محسوس کر رہا تھا کہ
 مجھے اس کا حکم نہیں ماننا چاہیے۔ زینی کچھ دیر بعد

اسمار میں ہم پر حملہ کیا۔“
 رفی شاہ متحکک ہو گیا۔ ”مہرام خان..... ان دنوں وہ
 بہت اونچا اڑ رہا ہے۔“
 ”جو جتنا اونچا اڑتا ہے اتنی ہی بلندی سے نیچے گرتا
 ہے۔“ زینی نے جواب دیا۔ رفی شاہ پہلی بار میری طرف
 متوجہ ہوا اور اس نے حاسدانہ لہجے میں پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“
 ”ایک قیدی ہے۔“ زینی بولی۔
 ”خدا۔“ رفی شاہ نے کسی کو آواز دی۔ ”اسے نیچے
 لے جا کر بند کر دو۔“

”یہ میرے ساتھ رہے گا۔“ زینی بولی۔ ”میں اسے
 ایک لمحے کے لیے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتی۔“
 ”کیوں؟“ رفی شاہ کے انداز میں شک آ گیا۔ وہ
 خش خشی داڑھی اور بھاری جسامت والا پستہ قد شخص تھا اس
 میں سوائے دولت مندی کے اور کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ
 کوئی عورت اس کی طرف متوجہ ہوتی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا
 کہ وہ زینی کا نیاز مند تھا اور شاید اس کی دلنواز قربت سے بھی
 لطف اندوز ہو چکا تھا۔ اس لیے مجھ سے بلاوجہ خار کھا رہا تھا۔
 زینی کی بات پر اس نے نہایت کینہ تو نظروں سے مجھے
 دیکھا۔

”یہ کیسا قیدی ہے جسے تم ساتھ رکھنا چاہ رہی ہو۔“
 ”کیونکہ یہ میرا قیدی ہے۔“ زینی نے ایک ادا سے
 اپنے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”اگر میں اسے آزاد چھوڑ دوں
 تب بھی یہ کہیں نہیں جائے گا۔“

”مجھ سے شاعری میں بات مت کرو۔“ رفی شاہ نے
 لہجہ بدل کر کہا۔ ”تم جانتی ہو میں صرف ایک زبان جانتا
 ہوں۔“

زینی نے گہری سانس لی اور اپنے بیک سے انجکشن
 نکال کر اسے دکھایا۔ ”امید ہے اب تم کچھ گئے ہو گے، ورنہ
 یہ اتنا خطرناک آدمی ہے کہ تمہارے یہ آدمی اس کے سامنے
 کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔“

”ایسا کون سا سورا پیدا ہو گیا ہے۔“ اس نے
 حقارت سے کہا۔ واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو افغانی پشتو میں
 ہو رہی تھی۔ یہ کسی حد تک پاکستانی پشتو سے مختلف ہے لیکن
 اسی طرح جیسے جنوبی پنجاب کی بولی پونٹوہار کی پنجابی سے
 الگ ہے۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا۔ زینی بہت روانی سے
 بول رہی تھی۔ زینی نے آگے جھک کر کہا۔

”شہباز ملک کا نام سنا ہے۔“

بولی۔ ”شہباز بچو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم جانتی ہو میں نہیں چیتا۔“
رہی شاہ نے قہقہہ مارا۔ ”یہ تمہارا حکم ماننے سے انکار کر رہا ہے۔“

زینی اب تشویش زدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”نہ میرا حکم ماننے سے انکار کر رہے ہو؟“
”تم جو کہتی ہو میں کرتا ہوں۔“ میں نے دفاعی انداز میں جواب دیا۔ ”لیکن شراب نہیں پی سکتا۔“
وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”شہباز ملک یہ جام بچو۔ یہ میرا حکم ہے۔“

میری مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ بلکہ مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے اتنی مزاحمت بھی کیسے کی۔ میں تو کسی کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر عمل کر رہا تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے جام اٹھالیا۔ مگر میں اسے منہ کی طرف نہیں لا پا رہا تھا۔ میرے اندر سے کوئی منع کر رہا تھا کہ میں اس حرام شے کو منہ نہ لگاؤں۔ اسے حلق سے نہ اتاروں۔ رہی شاہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میری ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے زینی نے پھر زور دے کر کہا۔ ”شہباز اسے پی لو۔“

میں بے ساختہ جام منہ کے پاس لے کر آیا اور اس سے اٹھتی کراہیت آمیز بو سے میرا دل متلا یا اور میں نے بے ساختہ ہی ہنسنے لگا۔ ایسا کیسی اور الٹی کی پھوار میرے منہ سے نکل کر رہی شاہ تک لگتی تھی۔ اس کی شلووار اور میض کا دامن داغ دار ہوا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ سے گالی اور زینی کے منہ سے قہقہہ نکلا تھا۔ ابکائی کے لیے جھکا تو جام قالین پر گر گیا تھا۔ رہی شاہ نے پاؤں سے کراپے خادم کو پکارا اور خود وہاں سے چلا گیا۔ خادم آیا اور اس نے صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے میری ہاتھ روم تک رہنمائی کی اور میں نے کئی کر کے منہ دھویا۔ میرے لباس پر جہاں جہاں دھبے آئے تھے۔ ان کو صاف کیا۔ واپس آیا تو خادم نشست گاہ کو صاف کر چکا تھا۔ زینی سکون سے بے نواشی میں مصروف تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم بہت چالاک ہو، تم نے جان بوجھ کر تھکے کی ہے۔“

”کوئی اس طرح جان بوجھ کر تھکے کر سکتا ہے؟“
اس نے شانے اچکائے۔ ”کر بھی سکتا ہے۔“

میرا تو خیال تھا کہ اللہ نے مجھے اس حرام شے سے بچا لیا تھا۔ مگر ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ میری سن کرنے والی کیفیت ختم ہو رہی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا اور مجھے زینی

اور رہی شاہ پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے میرے ساتھ ایسی حرکت کرنے کی کوشش کی۔ شاید تھے کرنے سے دوا کا اثر قبل از وقت زائل ہو رہا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ ایسے انجکشن کا اثر بارہ گھنٹے رہتا تھا اور اس کے بعد دوسرا انجکشن دینا پڑتا تھا۔ زینی نے مجھے دس بجے کے قریب انجکشن دیا تھا۔ لازمی بات ہے رات کا انجکشن بارہ گھنٹے پہلے دیا گیا ہوگا۔ میں تو بجے سے بھی پہلے سو گیا تھا بلکہ دوا کے اثر سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس وقت نو بج رہے تھے اور زینی ایک گھنٹے بعد مجھے انجکشن دیتی۔ صبح میں دس بجے بھی سن والی کیفیت میں تھا اور زینی کے احکامات کی پوری طرح تعمیل کر رہا تھا۔ مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کسی صورت انجکشن نہیں لینا چاہیے۔ ورنہ میں اس عورت کا غلام بن رہا ہوں گا۔ واپس آ کر میں سعادت مندی سے کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک زینی نے نہیں کہا۔

”کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔“

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”مجھے پانی چاہیے۔“
زینی کے اشارے پر خادم پانی لے آیا۔ چند منٹ بعد رہی شاہ آیا اور اس نے کینہ تو نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا تم اسے پھر شراب پینے کا حکم نہیں دو گی۔“
”میں حکم دوں گی اور یہ مانے گا۔“ زینی نے بے پروائی سے کہا۔ ”لیکن کیا فائدہ تمہارا لباس اور خوب صورت ڈرائنگ روم بھر سے گندہ نہ ہو جائے۔“
”اس کی فکر مت.....“

”پلیز۔“ زینی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں یہاں صرف کھانے پینے نہیں آئی ہوں۔“
رہی شاہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“
”مجھے بہر صورت کاٹل پہنچنا ہے۔“

رہی شاہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”موجودہ حالات میں یہ آسان کام نہیں ہے تم جانتی ہو یہاں سے جلال آباد تک گہرام خان کے آدمیوں کی چیک پوسٹیں ہیں۔ ان سے گزرے بغیر کوئی کاٹل نہیں جاسکتا ہے۔“

”یہ کام تم ممکن بناؤ گے۔“ زینی بولی۔ ”یہ بتاؤ یہاں آس پاس کوئی ائر فیلڈ ہے جہاں چھوٹا طیارہ اتر سکے۔“
رہی شاہ نے اپنی شخصیتی دائرہ می سہلاتے اور سوچتے ہوئے کہا۔ ”روسیوں کے زمانے کی ایک ائر فیلڈ ہے مگر وہ استعمال نہیں ہوتی ہے۔“

”کاٹل استعمال ہے؟“

”ہاں کاٹل استعمال ہے۔“

”تب کام چل سکتا ہے۔ مجھے اور اسے لینے کا مل سے طیارہ آجائے گا۔“
 رنی شاہ کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ ”لگتا ہے آج کل تم بھی بہت اونچا اڑ رہی ہو۔“
 ”میں اپنی بلندی پر ہوں۔“ اس نے کہا اور میری طرف اشارہ کیا۔ ”سب اس کے لیے ہو رہا ہے۔ یہ اصل آدمی ہے۔“

”طیارہ کیسے منکواؤ گی؟“
 ”کال کر کے۔“ زینی نے کہا۔ ”مجھے لوکیشن بتاؤ۔“
 ”یہاں سے دور سے نقشے پر بتا سکتا ہوں۔“ رنی شاہ نے کہا تو زینی نے نقشہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔
 ”اس میں بتاؤ۔“

رنی شاہ نے اسد آباد کے جنوب مشرق میں ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”یہاں ہے مگر یہ بہت چھوٹا ہے۔ روسیوں نے اسے چھوٹے طیاروں اور ہیلی کاپٹر کی ری فوٹنگ کے لیے بنایا تھا۔“

”رات کے وقت لینڈنگ ہو سکتی ہے؟“
 ”میں معلوم کرتا ہوں۔“ رنی شاہ نے کہا۔ ”اس زمانے میں یہاں کا ایک سابق ایوی ایشن مین میرا جانتے والا ہے۔“

”تم معلوم کرو۔“ زینی بولی اور پھر اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ”یقین کرو تم خسارے میں نہیں رہو گے۔“
 رنی شاہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”کیسے تم تو چلی جاؤ گی۔“

”نوراً تو نہیں جا رہی ابھی چند گھنٹے یہاں رکوں گی۔“ زینی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا چند گھنٹے کافی نہیں ہیں؟“
 ”تمہارے ساتھ کے لیے تو چند دن اور ہفتے بھی کم لگتے ہیں۔“

”میں واپس بھی آؤں گی۔“ زینی نے اسے یقین دلایا تو وہ اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی زینی نے زیر لب ایک ایسی گالی دی کہ میرے کان گرم ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے بیک سے ایک چھوٹا سا موبائل نکال کر آن کیا اور کسی کو کال کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ”مجھے رات دو بجے اس لوکیشن پر چھوٹا طیارہ چاہیے۔۔۔۔۔ ہاں لوکیشن نوٹ کر دو۔“
 اس نے مخصوص اصطلاحات کے ساتھ لوکیشن نوٹ کرائی۔ یہ ہوا بازی کی زبان تھی۔ اس نے موبائل آف کر کے واپس بیک میں رکھ لیا۔ اس وقت خادم وہاں نہیں

تھا۔ یہ کام کر کے زینی نے بیک سے میڈیکل پیک نکالا اور اس میں سے انجکشن برآمد کیا تو میں سمجھ گیا کہ اگلے انجکشن کا وقت آگیا ہے حالانکہ ابھی دس بجتے میں آدھا گھنٹا تھا مگر ہوشیار زینی نے قبل از وقت مجھے انجکشن لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور سرخ پرائنگی مارتے ہوئے بولی۔ ”بازو سامنے کرو۔“

میں نے بازو سامنے کیا اور جیسے ہی اس نے انجکشن کے لیے ہاتھ آگے کیا میں نے اس کا انجکشن والا ہاتھ پکڑ کر اسے گھمایا اور وہ مل کھا کر بہت آسانی سے میرے بازوؤں کے پچھلے میں آگئی۔ اس کا ہاتھ میں نے پکڑا ہوا تھا اور انجکشن کی سوئی اب اس کی گردن کو چھو رہی تھی۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جما ہوا تھا اور اس کے پچھلے جسم کو میں نے ایک پاؤں سے قابو کیا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ ”ہماری زبان میں ایک محاورہ ہے آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ اس کے علاوہ بھی بی شمار محاورے ہیں مگر فی الحال یہ بھی کافی ہے۔“

میں نے کہتے ہوئے انجکشن کی سوئی اس کی گردن میں داخل کر دی۔ وہ تڑپا رہی لیکن مجھے ہیشن دبانے سے نہیں روک سکی تھی۔ دوا اس کی گردن میں اتر گئی۔ گردن میں گوشت میں لگنے والا انجکشن بھی تقریباً نرو کے انجکشن کی طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔ انجکشن لگنے کے بعد بھی وہ مزاحمت کرتی رہی اور اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح اسے پاس موجود افراد کو متوجہ کر لے مگر اس کی بد قسمتی اور میری خوش قسمتی کہ اس دوران میں کوئی نہیں آیا تھا۔ جب اس نے مزاحمت ترک کی تو میں نے گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس کے باوجود میں پوری طرح ہوشیار تھا اور ایک سیکنڈ کے نوٹس پر اسے دوبارہ دبوچ سکتا تھا۔ مگر اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھوں میں سپاٹ بن آگیا تھا اور وہ یوں پٹکیں جھپک رہی تھی جیسے الوکوتیز روشنی میں بٹھا دیا جائے۔

میں نے میڈیکل پیک واپس زینی کے بیک میں رکھا۔ اس میں سے پستول نکال کر اپنی ٹائیس کے نیچے پتلون میں اڑسا اور واپس اپنی جگہ آگیا۔ اب یہ ظاہر سب پہلے جیسا تھا مگر رنی شاہ اینڈ کمپنی کو قطعی خبر نہیں تھی کہ بازی پلٹ گئی تھی اب جو صیاد محاذ قیدی بن گیا تھا اور جو بہ ظاہر قیدی ہے وہ صیاد بن چکا تھا۔ پھر آدس منٹ بعد میں نے زینی سے کہا۔

”تم بالکل باطل رہو گی اور ابھی جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں کسی سے نہیں ہوگی۔“

”میں کسی سے نہیں ہوں گی۔“ زینی نے کہا اور اسی

مجھے رنی شاہ وہاں آگیا۔ اس نے آتے ہی سرور لہجہ میں کہا۔

”کام ہو گیا ہے۔ میرے آدمی زمین گل کا کہنا ہے کہ دن وے اس قابل ہے کہ اس پر طیارہ اتر سکے اور وہاں روسیوں نے زیر زمین سیٹ اپ لگایا تھا وہ بھی موجود ہے۔ اگر وہاں موجود ہنگی کا نظام کام کر رہا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اسے دن وے لائسنس آن کرنے کے لیے جزیئر لے جانا پڑے گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ جزیئر کا بندوبست کرے۔ کیونکہ جیسے پچیس سال سے بند پڑا سسٹم کہاں کام کرے گا؟ ویسے تمہیں کب جانا ہے؟“ سوال کرتے ہوئے رنی شاہ کی آنکھیں گدھ نما ہو گئی تھیں جیسے اسے گوشت نظر آگیا ہو۔

”رات دو بجے۔“ زینی نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ نارمل تھا۔

”کافی وقت ہے۔“ رنی شاہ کی باغیچیں کھل گئیں۔ ”یہاں سے مشکل سے آدھے گھنٹے کا فاصلہ ہے۔“

”دو بجے طیارہ وہاں پہنچ جائے گا۔“

”کوئی بات نہیں وہ کچھ دیر انتظار کر لے گا۔ ویسے زمین گل وہاں پہنچ جائے گا۔ انتظام تو اسے ہی کرنا ہے۔ آؤ کھانا لگ گیا ہے۔“

شاندار ڈائننگ روم میں بڑی سی میز پر کھانا لگایا جا چکا تھا اور نہایت پر تکلف تھا۔ اس میں افغانی پلاؤ تھا۔ بکرے کی ہنگی جو ظاہر ہے کہ ہماری آمد سے پہلے بن رہی تھی اور کباب تھے۔ یہ خاص ڈشیں تھیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ چل چل کر معدے کی چکی بھی تیز ہو گئی تھی اور مجھے کئی دن سے ڈھنگ کا کھانا نصیب نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے تکلف کو بالائے طاقت رکھ کر کھایا۔ البتہ سیر ہوتے ہی ہاتھ روک لیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ معدے کی گرائی مجھے ست کر دے اور کی سوخ پر بازی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ کھانے کے بعد میٹھا کیک اور نہایت میٹھا تھا اس لیے میں نے صرف چکھا البتہ خاص ہلیم قہوے کی کئی پیالیاں خالی کر گیا تھا۔ رنی شاہ نے کسی رغبت سے کھایا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر بھی بہت انگوڑے دور ہوئے کو سنا رہی تھی اور یقیناً زینی کے لیے بے تاب تھا کہ وہ کب اپنا علاوہ وفا کرتی ہے۔

اگرچہ زینی کوئی پاکباز عورت نہیں تھی اور نہ ہی اسے اپنی عزت کی پروا تھی وہ اسے سکے رائج الوقت سمجھنے والی عورتوں میں سے تھی اس لیے اگر وہ رنی شاہ کے بیڈروم سے

ماہنامہ مسرگزشٹ

ہو آتی تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر میرے ضمیر کو گوارہ نہیں تھا کہ ایک عورت جو اصل میں اب میرے قبضے میں تھی میں اسے اپنی آزادی کے لیے یوں استعمال کروں۔ رنی شاہ بے خبر تھا کہ اصل بازی میرے ہاتھ میں ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ زینی سے چلنے کو کہتا تو وہ تیار ہو جاتی کیونکہ میں نے ہی اسے حالات کو نارمل ظاہر کرنے کا حکم دیا تھا۔ اگر میں رکاوٹ بناتا تو راز فاش ہو جاتا کہ اب میں زینی کا معمول نہیں ہوں اور پھر مجھے رنی شاہ سمیت اس کے بہت سارے سسٹم گرگوں سے نمٹنا پڑتا جو بالکل بھی آسان کام نہیں تھا۔ جب میں نے زینی کو قابو کیا تو مجھے خود کو اس کام پر آمادہ کرنا پڑا تھا کیونکہ دوا کا کچھ اثر باقی تھا۔ البتہ کھانے کے بعد میں خود کو بالکل نارمل محسوس کرنے لگا تھا۔ خاص طور سے سیاہ سٹخ قہوے نے دوا کا رہا سہا اثر بھی ختم کر دیا تھا۔ اب میں چاک و چوبند تھا۔ گیارہ بجے تک طعام ختم ہو چکا تھا اور رنی شاہ نشے میں خاصا دھت ہو گیا تھا۔ اس نے زینی سے کہا۔

”اب مجھے اور مت تڑپاؤ۔“

وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہوا تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم یہیں رکو گے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”زینی نے کہا ہے میں ہر وقت اس کے ساتھ رہوں۔“

”ہاں میں نے اس سے یہی کہا ہے۔“ وہ فرمانبرداری سے بولی مگر رنی شاہ نہیں سمجھ سکا تھا اس نے پاؤں میخ کر کہا۔

”تو کیا اسے میرے بیڈروم میں بھی لے جاؤ گی۔“

”نہیں جناب میں باہر رکوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے تازیانی؟“

یہ ظاہر ہے سوال تھا مگر درحقیقت حکم تھا اور زینی اس سے سرتابی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ ”ہاں یہ باہر رک جائے گا۔“

رنی شاہ کا بس چلتا تو وہ مجھے اپنے محل نما گھر سے باہر پھنکو ادیتا۔ مگر وہ زینی کی وجہ سے مجبور تھا اور اس نے سوچا کہ کہیں وہ پورے کے چکر میں آدھی سے بھی نہ جائے۔ اس لیے بادل ناخواستہ مان گیا۔ ”ٹھیک ہے یہ باہر رہے گا۔“

وہ ہمیں لے کر اپنے خاص حصے میں آیا۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ وہاں صرف عورتیں اور لڑکیاں تھیں اور وہ نہایت کھلے ڈالے چلیے میں تھیں۔ ظاہر ہے یہ اس کا حرم تھا مگر وہ اس رنی شاہ کا حرم نہیں تھیں ورنہ وہ انہیں اس چلیے

ماہ 2015ء

196

استعمال کی جاتی تھی مگر زہنی نے اس کا استعمال رنی شاہ کی گردن پر کیا تھا۔ وہ بستر پر صرف شلواریں پہن کر تھا کہ اس کے پاؤں نیچے تھے اور دونوں ہاتھ گردن پر جھے ہوئے تھے مگر وہ اس خون کو روکنے میں ناکام رہا تھا جو چھری کے وار کے بعد کٹ جانے والی شہرگ سے بہہ رہا تھا۔ زیادہ خون بہنے کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ میں نے قریب سے اس کا معائنہ کیا اور پھر زہنی سے پوچھا۔ ”تم نے اسے کیوں قتل کیا؟“

”میں اس کام کے لیے بھی آئی تھی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”یہ ان درندوں میں سے ہے جنہوں نے میری آبرو لوٹی تھی۔“

میں نے سوال کرنے سے گریز کیا کہ اس کے پاس اس نام کی کوئی چیز بھی تھی؟ یہ ذاتیات میں آ جاتا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس کی بجائے میں نے کہا۔ ”اپنی شرٹ بند کرو اور جا کر یہ خون صاف کرو۔ ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔“

وہ فرمانبرداری سے بیڈروم کے ساتھ موجود ہاتھ روم میں چلی گئی۔ بستر خون سے تر ہو رہا تھا۔ رنی شاہ کے پلے پلائے جسم میں خاصا خون تھا۔ میں نے اسے ہاتھ لگائے بغیر بستر کے دونوں طرف موجود سائڈ درازوں کی تلاشی لی۔ مجھے کسی ہتھیار کی تلاش تھی۔ اگرچہ زہنی والے بیک میں ایک رائفل بھی تھی مگر ہمیں زیادہ ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ رنی شاہ کے مرنے کے بعد صورت حال خراب ہو گئی تھی۔ اگر اس کے آدمیوں کو پتا چل جاتا تھا کہ وہ مارا گیا ہے اور زہنی نے مارا ہے تو یہاں سے صحیح سلامت نکلنا محال ہو جاتا۔ اسلحہ مجھے ایک الماری میں ملا۔ اس کے ایک خانے میں جدید ترین ایم سولہ رائفلیں اور ان کا بے شمار ایمونیشن بھرا ہوا تھا۔ چند عدد ہینڈ گرنیڈز اور کچھ اسموک گرنیڈز بھی تھے۔ میں نے دو عدد رائفلیں دسٹے الگ کر کے بیک میں رکھ لیں۔ ان کے اضافی میگزین، ہینڈ گرنیڈز اور اسموک گرنیڈز بھی بیک میں ڈال لیے تھے۔ زہنی ابھی تک ہاتھ روم سے نہیں نکلی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اس نے اندر سے کہا۔

”آ جاؤ۔“

میرا خیال تھا کہ وہ شاک میں ہوگی اور شاید اب تک خود کو صاف بھی نہیں ہو مگر وہ تو حڑے سے جھاگ سے بھرے ٹب میں نیچے ہوئی خوشبودار گرم پانی کے حڑے اٹھا رہی تھی۔ اس نے نشی نظر میں سے مجھے دیکھا۔ ”آؤ تم بھی

میں کسی اجنبی کے سامنے آنے کی اجازت کیسے دیتا۔ یہ آج کے جدید دور میں انسانی غلامی کی بدترین صورت تھی۔ وہ مجبور عورتیں تھیں جو اس طاقتور اور دولت مند شخص کے قبضے میں تھیں۔ ان کی صورتوں پر خوف اور بے بسی بتا رہی تھی کہ وہ اپنی خوشی سے یہاں نہیں تھیں۔ زہنی کا بیک اسی کے پاس تھا اور میں نے یوں نہیں لیا کہ کہیں رنی شاہ کو شک نہ ہو۔ اس گھر کے عام حصے میں صرف مرد ملازم تھے۔ مگر یہاں کوئی مرد ملازم نہیں آسکتا تھا۔ میں بھی زہنی کی وجہ سے آ گیا تھا۔ جیسے ہی رنی شاہ زہنی کو لے کر اندر گیا میں حرکت میں آ گیا۔ میں پستول نکال کر اس طرف آیا جہاں رنی شاہ کے حرم کی عورتیں موجود تھیں ان کی تعداد نصف درجن تھی۔ ان میں سے دو تو نہ ہونے کے برابر لباس میں تھیں اور باقی بھی ناکافی کپڑوں کے ساتھ تھیں۔ یہاں موسم کا اثر نہیں تھا مگر ان عورتوں کو اس حلیے میں رکھنا سوائے نفسانیت کے اور کچھ نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔ میں نے ان سے کہا۔

”شاہ جی نے حکم دیا ہے کہ تم سب ایک کمرے میں چلی جاؤ یہاں خطرہ ہے۔ کمرہ اندر سے بند کر لیتا۔ جب تک شاہ جی خود آواز نہ دیں باہر مت آنا۔“

وہ بے چاری حکم کی غلام تھیں۔ خطرے کا سن کر سب ہی افراتفری میں ایک کمرے میں جا کھیں اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ میں نے اطمینان کیا کہ اب وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ پھر میں نے اس حصے میں آنے والا واحد دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں واپس رنی شاہ کے بیڈروم تک آیا تو اندر مجھے عجیب سی آواز آئی ایسا لگا جیسے کوئی خرخرار رہا ہو۔ یہ خراٹے لینے کی آواز بھی نہیں تھی۔ میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے لاک لکلا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔ مجھے اُمید تھی کہ رنی شاہ جھنجھلائے مگر دروازہ کھول دے گا اور اس کے بعد وہ میرے قابو میں ہوگا۔ جب دروازہ نہیں کھلا اور کوئی آواز بھی نہ آئی تو میں نے پھر دستک دی۔ اب خرخراہٹ کی آواز بھی رک گئی تھی۔ ایک منٹ بعد میں یہی دستک دینے جا رہا تھا کہ دروازہ جھککے سے کھلا اور زہنی میرے سامنے اس ہیبت کدائی میں کھڑی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھری تھی اور اس کی شرٹ سامنے سے نہ صرف کھلی بلکہ خون میں بھیگی ہوئی تھی۔

”واؤ۔“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”یہ کیا؟“ اس نے کچھ بولے بغیر چھری سے اندر اشارہ کیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ چھری معمولی سی تھی اور پھل کاٹنے کے لیے

ملہنامہ سرگزشت

”وہ خراب ہو گیا ہے میں نہیں پہن سکتی۔“

”تب کیا پہنوں گی؟“

”یہاں کپڑے ہوتے ہیں۔“ اس نے معنی خیز انداز

میں کہا۔ ”تم نے دیکھا نہیں کتنی عورتیں ہیں یہاں۔“

”تب جلدی کرو ہمیں یہاں سے نکلتا ہے۔“ میں

نے بے تابی سے کہا۔ وہ باہر چلی گئی۔ دس منٹ بعد واپس

آئی تو اس کا منہ بنا ہوا تھا اس نے مقامی طرز کا شلوار سوٹ

پہنا ہوا تھا جو اس کے لحاظ سے بہت زیادہ تھا اسنے کپڑے

میں تو اس کے تین چار سوٹ آرام سے بن سکتے تھے۔ اس

نے بھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہی کپڑے ہیں یہاں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس لباس کے ساتھ

بھاگ دوڑ مسئلہ ہو جائے گی۔ ایسا کرو تم اپنی جینز اور اوپر

جیکٹ پہن لو شرٹ چھوڑ دو۔“

”یہ لھیک رہے گا۔“ اس نے خوش ہو کر کہا اور ہاتھ

روم چلی گئی۔ واپس آکر اس نے اپنے کیلے بالوں کی ہی

کشھی کر کے ان کو پونی ٹیل کی صورت دے دی۔ ہال

شلک کرنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ موسم ہیٹر والا نہیں

تھا۔ ورنہ اس سے کام چلایا جاتا۔ دوا کے زیر اثر ہونے کے

باوجود اس کی فطرت نہیں بدلی تھی اس نے جان بوجھ کر

جیکٹ کی زپ خاصی نیچے کی ہوئی تھی اور اس کا گلابی بدن

جھلک رہا تھا۔ میں نے زپ اوپر کرنے کو کہا۔ وہ بولی۔

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”اس سے پتا چل رہا ہے کہ تم نے اندر شرٹ نہیں

پہنی ہے۔“ میں نے سمجھایا تو اس نے بادل نا خواستہ زپ

اوپر کر لی۔ میں نے بیلنس کے بارے میں پوچھا۔

”پتا نہیں مجھے یہ سیل دیا گیا تھا یہ نہیں بتایا تھا کہ اس

میں بیلنس کتنا ہے۔“

میں نے سوچا کہ ایک بار یہاں سے نکل جائیں پھر

میں موبائل استعمال کر سکوں گا۔ ایک بجے ہم باہر

نکلے۔ میں نے زینی والی رائفل اپنے شانے پر ٹانگ لی

تھی۔ رنی شاہ کے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند دبا کر

لاک کر دیا اب یہ صرف چابی سے کھل سکتا تھا۔ یہی سلوک ہم

نے باہر والے دروازے کے ساتھ کیا اور باہر آئے تو ایک

ظلام موجود تھا۔ زینی نے اس سے کہا۔

”ہیس گاڑی چاہیے۔“

”کاشی۔“ اس نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ

کہا۔ ”پروہ ہو گا۔“ اس کے کہنے پر مل سکتی ہے۔“

پارہت سرہا رہا ہے۔“

میں پہلے ہی لا حول پڑھ چکا تھا۔ اس لیے اسے صرف

اتنا کہا۔ ”ابھی رنی شاہ کے آدمیوں کو علم ہو جائے گا کہ وہ

جنم رسید ہو چکا ہے تب زیادہ مزہ آئے گا۔ بہتر ہو گا تم غسل

صحّت سے جلد فارغ ہو جاؤ ہمیں ابھی یہاں سے نکلتا اور اتر

فیلڈ تک بھی جانا ہے۔“

کیونکہ میرا علم تھا اس لیے وہ سنجیدہ ہو گئی اس نے سر

ہلایا۔ ”میں بس ابھی آئی۔“

وقت بارہ بجے سے اوپر ہو چکا تھا۔ زینی نے دو بجے

کا وقت دیا تھا۔ مگر میرا ایئر فیلڈ تک جانے کا کوئی ارادہ نہیں

تھا۔ طیارے میں بھلا میں کہاں جاتا؟ دوسرے غیر ملکی فوج

اور اتر فورسز کے ہوتے ہوئے طیارے میں پرواز نہایت

خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف میزائل

سسٹم تھے جو طیارے کو آسانی سے گرا سکتے تھے۔ اس لیے

میرا ارادہ اسی راستے سے واپسی کا تھا جہاں سے زینی مجھے

لے کر آئی تھی۔ لیکن حفظہ باقاعدہ کے طور پر طیارے کا آپشن

بھی برقرار رکھنا تھا۔ میں زینی کے ان دشمنوں کو نہیں بھولا

تھا جو اسار سے ہمارے پیچھے لگے تھے اور رنی شاہ کا کہنا تھا

کہ گہرام نامی اس دشمن سردار کی کاٹل تک چیک پوسٹیں

تھیں۔ میں نے واپس آکر رنی شاہ کا موبائل تلاش کیا جو

اس کی قمیض کی جیب میں مل گیا۔ میں نے اس کی ڈائل

ہسٹری میں جا کر دیکھا تو دس بجے سے ذرا پہلے ایک ہی کال

کی تھی۔ میں نے وہ نمبر زینی کے موبائل میں نوٹ کر لیا۔

بستر کی ایک سائیڈ دراز میں دو عدد جدید موبائل اور بھی تھے

لیکن میں نے ان کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بعض

اوقات بلاوجہ کی پٹکے بازی انسان کے گلے پڑ جاتی ہے۔

اس کام کے لیے زینی کا موبائل کافی تھا۔ البتہ اس

سے بیلنس کا پوچھ سکتا تھا کہ وہ اتنا ضرور ہو کہ بہ وقت

ضرورت کال کرنے سے مسئلہ نہ ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر

بیلنس کافی ہوا تو میں پاکستان گالری کے اپنی خیریت کی

اطلاع دے دوں گا۔ اسلئے کے ساتھ واسے خانے میں ایک

لاکر نصب تھا اور اس کا تالہ نمبروں سے کھلتا تھا۔ یقیناً اس

میں مال و دولت تھی۔ مگر رنی شاہ کے پرس اور سائیڈ دراز

سے خاصی مل گئی تھی۔ یہ ڈالرز تھے اور تقریباً دو ہزار کی رقم

بتی تھی۔ وہ میں نے جیب میں رکھ لی۔ اب میں زینی کا

انتظار کر رہا تھا پندرہ منٹ بعد وہ یوں باہر آئی کہ اس نے

اوپر صرف تولیہ باندھ رکھا تھا۔ جو بہ مشکل اس کی رانوں تک

آ رہا تھا۔ میں نے لباس کا پوچھا تو اس نے کہا۔

”میں اس کے بیڈروم سے آرہی ہوں۔“ زینی نے وہابیات انداز میں کہا۔ ”اس نے مجھ سے کہا ہے کہ میں اس کی گاڑیوں میں سے جو چاہے لے جاؤں۔ کیا میں اسے اٹھاؤں کہ وہ تمہیں بھی کہہ دے؟“

خادم ڈر گیا کہ کھل کر عیاشی کے بعد اس وقت رنی شاہ مکمل آرام کے موڈ میں ہوگا اور اس میں غفل اندازی کے نہ جانے کیا نتائج نکلیں۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”شاہ جی نے آپ سے کہہ دیا تو ٹھیک ہے۔“

ہم باہر آئے جہاں پورچ میں کئی طرح کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور یہ سب اعلیٰ درجے کی لکڑی گاڑیاں تھیں۔ میں نے ایک چھوٹی فور و جیل ڈرائیو کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا طاقتور انجن اسے ناموار راستوں پر بھی بہت تیزی سے دوڑا سکتا تھا۔ ہمارے کام کے لیے یہ موزوں تھی۔ میں نے سوچا کہ اس میں جتنی دور جا سکا جاؤں گا اور اس کے بعد باقی فاصلہ پیدل بھی طے کیا جا سکتا تھا۔ جانی انجین میں مگی ہوئی تھی اور نینک فل تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور زینی میرے برابر میں آگئی۔ اس نے اسلحہ والا بیگ عقبی نشست پر ڈال دیا تھا۔ میں نے رائفل بیروں کے پاس رکھ لی۔ خادم کے اشارے پر گارڈز نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی باہر نکالی تھی کہ اچانک ایک طرف سے دو تیز رفتار گاڑیاں نمودار ہوئیں اور تیزی سے اسی طرف آنے لگیں۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں نے گاڑی کا رخ ان کے مخالف سمت میں موڑ دیا۔ زینی نے بھی خطرہ بھانپ لیا تھا اس نے مڑ کر دیکھا اور تشویش سے بولی۔

”یہ کون ہیں؟“

”پتا نہیں۔“ میں نے کہا تھا کہ عقب سے فائرنگ کا شور بلند ہوا۔ اگلی والی گاڑی سے ایک فائرنگ کی گئی تھی اور یہ کوئی بڑی اور بھاری گن تھی جس کی فائرنگ باور اور شور بے پناہ تھا۔ یہ گاڑی فائرنگ کے دوران میں ٹرک مگی مگر دوسری اس کے پیچھے سے نکل کر ہمارے پیچھے آگئی۔

”سیٹ بیلٹ باندھ لو۔“ میں نے کہا اور اپنی سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ زینی نے بھی باندھ لی اور میں نے اسے رائفل اٹھا کر تھمادی۔ ”اسے سنبھال کر رکھنا۔“

اس کے ساتھ ہی میں نے ایسی لیزر دیا اور تنک گلیوں میں گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ مگر پیچھے آنے والی گاڑی بہت زیادہ رفتار سے آرہی تھی۔ پانچ منٹ سے پہلے ہم ہائی وے تک پہنچ گئے تھے۔ مگر اس پر آتے ہی بائیں طرف سے ایک گاڑی نمودار ہوئی اور ہماری طرف

آنے لگی تو میں نے اسٹرنگ دائیں طرف کاٹا۔ مجھے دائیں طرف ہی جانا تھا مگر دشمن پیچھے آ رہا تھا پہلے اس سے چھٹکارا لازمی تھا۔ زینی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ میرے قابو میں ہے لیکن پھر بھی میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ ہم ارفیلڈ کی طرف نہیں جا رہے تھے۔ ارفیلڈ تک جانے کے لیے اوپر سے ہائی وے سے ایک پل دریاے کنہار پر نکلتا تھا اور اس سے گھوم کر ہم ارفیلڈ کی طرف جاتے اس لیے اگر زینی سمجھ رہی تھی کہ ہم اسی طرف جا رہے تھے تو وہ سمجھنے کے لیے آزاد تھی۔ مگر یہ دو اسب سے پہلے انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم کرتی ہے۔

دونوں گاڑیاں ہائی وے پر آگے پیچھے آچکی تھیں اور اب تنک میں فاصلہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا تھا کیونکہ تنک گلیوں میں بڑی گاڑی ایک حد سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتی تھی۔ البتہ ہائی وے پر آتے ہی اس کے ڈرائیور کو اپنی گاڑی کی رفتار آزمانے کا موقع ملا تھا اور وہ اب نزدیک آرہی تھی۔ پہلی گاڑی جس نے رنی شاہ کے مکان پر دھاوا بولا تھا اس پر بھاری مشین گن نصب تھی مگر اس گاڑی پر ایسی کوئی گن نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے باوجود اس میں موجود افراد کا مسلح ہونا یقینی تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔ ”تیار ہو جاؤ۔ سن روف سے نکل کر جواب دینے کے لیے۔“

”کس بات کا؟“ اس نے پوچھا۔

اسی لمحے عقب سے پہلا برسٹ چلا مگر گولیاں گاڑی کے اوپر سے گزرنی تھیں۔ گاڑی کی دونوں کھڑکیوں سے دو افراد نمودار ہوئے تھے اور خود کار رائفلوں سے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، میں نے کہا۔ ”اس کی بات، جلدی کرو وہ نزدیک آرہے ہیں۔“

زینی نے اٹھ کر سن روف ہٹایا اور سیٹ پر کھڑے ہو کر چھت پر رائفل نکالتے ہوئے جوانی برسٹ مارا اور عقبی گاڑی کی رفتار فوری کم ہو گئی اور وہ اب دور ہونے لگی تھی میں نے رفتار میں مزید اضافہ کیا اور اب اسپید میٹر کی سوئی ایک سو بیس کلو میٹر پر تھی۔ ہائی وے بہت اچھی تھی اور فی الحال سپر می جا رہی تھی اس لیے رفتار بڑھانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر رات کے اس پہر ٹریفک بھی نہیں تھا۔ ٹھیک کے پاس آتے ہی مجھے مخالف سمت میں ایک دین سڑک پر پہنچی کھڑی نظر آئی۔ اس نے راستہ بند کیا ہوا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ ایک گالی نکل گئی اور میں نے رفتار کم کرتے ہوئے گاڑی کی طرف موڑ دی۔ پل کی حد تک سڑک ٹھیک تھی لیکن جب ہم دوسری طرف اترے تو

سڑک نارمل ہو گئی تھی۔ دائیں طرف یہ آبادی میں گم ہو رہی تھی اور اس طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بائیں طرف موڑ دی۔ آگے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمیں کس طرف جانا ہے؟ زینی کی فائرنگ سے نہ صرف گاڑی پیچھے ہوئی تھی بلکہ اس میں سے جھانکنے والے افراد بھی اندر چلے گئے تھے۔ میں نے زینی سے کہا۔ ”نقشہ نکال کر دیکھو ہمیں کس طرف جانا چاہیے۔“

وہ اندر آئی اور پیچھے سے بیگ اٹھا کر نقشہ برآمد کیا۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”اسی سڑک پر چلو۔ ہمیں گھوم کر آنا ہو گا سڑک دریا کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور اسی پر اڑ فیلڈ ہے۔“

اگرچہ میرا اڑ فیلڈ کی طرف جانے کا ارادہ نہیں تھا مگر قدرت اسی طرف لے جا رہی تھی اور طیارے میں فرار ہونا پڑتا تب بھی یہ عقب سے آنے والے دشمنوں سے بہتر تھا۔ نصف کلومیٹر بعد سڑک گھوم کر آبادی کے اوپر سے ہوتی ہوئی دوبارہ دریا کے پاس آنے لگی۔ پیچھے آنے والی گاڑی اس لحاظ سے مشکل میں تھی کہ تاہوار سڑک پر اسے قابو کرنا مشکل تھا۔ اس کا وزن زیادہ تھا اور وہ بے قابو ہو کر الٹ سکتی تھی۔ ہماری گاڑی ہلکی تھی اور اس وجہ سے رفتار کے باوجود اس پر کنٹرول آسان تھا۔ پیچھے آنے والی گاڑی تقریباً تین سو میٹر دور تھی۔ پہلے برسٹ کے بعد اس کی طرف سے چند ایک برسٹ اور مارے گئے تھے مگر اتنی دوری سے نشانہ ٹھیک نہیں بینہ رہا تھا۔ میں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور اس سے ایک گرنیڈ نکال کر اس کی پین مینجی اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اسے پیچھے اچھال دیا۔ زینی چونکی۔

”یہ کیا تھا؟“
”دیکھو۔“ میں نے عقبی آئینے میں دیکھا اور ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد گرنیڈ دھماکے سے پھٹا اور سڑک کے وسط میں بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا تھا۔ دشمن کی گاڑی اس سے چند گز کی دوری پر تھی۔ دھماکے سے براہ راست تو اتنا نقصان نہیں ہوا تھا مگر اس کی شاخ دیوے نے گاڑی کو جلا دیا اور ڈرائیور کے حواس اڑ گئے۔ گاڑی لہراتے ہوئے سڑک سے اتری اور پھر بے قابو ہو کر اس نے قلابازی کھائی اور مزید چند قلابازیوں کے بعد وہ دریا میں جا گری۔ زینی خوشی سے چلائی۔

”شاندار، گرنیڈ کہاں سے آیا؟“
”رفی شاہ کے کمرے سے ملا تھا۔“ میں نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ دوسری گاڑی پاس آ

رہی تھی اور اس کے پیچھے ذرا فاصلے پر ایک گاڑی اور تھی جو یقیناً وہی وین تھی جس نے پل کے بعد راستہ روکا ہوا تھا۔ اب سڑک دریا کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے ایک طرف کھیت تھے اور اب علاقہ کسی میدان کی طرح ہموار تھا۔ درنہ یہ سارا علاقہ پہاڑی تھا اور ہموار زمین بہت کم تھی۔ شاید اسی وجہ سے یہاں اڑ فیلڈ بنائی گئی تھی۔ میں نے زینی سے کہا۔ ”اپنے موبائل میں ڈائل پہلا نمبر ملاؤ اور اس پر موجود زمین گل نامی شخص سے بات کرو اس سے کہو کہ ہم اڑ فیلڈ کے پاس ہیں کیا طیارہ آ گیا ہے؟“

اس وقت پونے ایک بج رہا تھا۔ زینی نے کال کی اور امین گل سے بات کرنے لگی۔ اس سے بات کر کے مجھے مطلع کیا۔ ”زمین گل نے لائسنس کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ جزیرے لے آیا ہے، مگر طیارہ ابھی نہیں آیا وہ دو بجے تک آئے گا۔“

”طیارہ نہیں آیا مگر دشمن پیچھے ہیں۔“ میں نے پھر عقب میں دیکھا۔ ”سوال یہ ہے کہ ہمیں اتنی آسانی سے پرواز کی اجازت دے دیں گے؟“
”اس کا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ طیارے کے ساتھ میرے آدمی بھی آئیں گے اور وہ ان سے نمٹ لیں گے۔“
میں چونک گیا۔ ”تمہارے آدمی؟ تم نے پہلے نہیں بتایا۔“

”تم نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ سادگی سے بولی خیر یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا زینی میرے قابو میں تھی اور میں اس سے کام لے سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم اپنے آدمیوں کو یہی تاثر دو گی کہ میں تمہارے قابو میں ہوں۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ اس نے سپاٹ لیج میں کہا۔ گل کھاتے دریا پائے کنہار کے ایک ٹکڑے پہلو کے ساتھ اڑ فیلڈ شروع ہو جاتی تھی۔ اس کے آغاز میں ایک بڑی سی عمارت تھی اور اس کے بعد دن دے تھا۔ عمارت تاریک نظر آرہی تھی۔ جب ہم اس کے پاس پہنچے تو اس پر اسکول کا بورڈ نظر آیا تھا۔ گویا یہاں اب اسکول تھا جب کہ عمارت کی اصل ساخت بتا رہی تھی کہ یہ فوجی مقاصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ ہم اس کے ساتھ سے ہوتے ہوئے دن دے کی طرف آئے اور اس کے آخری حصے میں موجود دوسری عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ وہاں روشنی نظر آرہی تھی۔ دن دے تقریباً پانچ سو گز لمبا تھا۔ جو عام پروں والے چھوٹے طیارے کی پرواز اور اترنے کے لیے کافی تھا۔ ایک پک اپ ٹرک گاڑی کے ساتھ دو افراد کھڑے تھے۔ اس کے

پچھلے حصے میں موجود جزیرہ چل رہا تھا اور اس کے ہونے پائپ سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ میں نے گاڑی ان کے ساتھ لے جا کر روکی اور نیچے اترتے ہوئے کہا۔

”تم میں سے زمین گل کون ہے؟“
دونوں میں سے ادھیر عمر شخص آگے آیا۔ ”میں زمین گل ہوں اور یہ میرا بیٹا امن گل ہے۔“

”دشمن ہمارے پیچھے آرہے ہیں انہوں نے رنی شاہ کے گھر پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت ہم وہاں سے نکل رہے تھے۔ ہم نے ایک گاڑی تباہ کر دی مگر دو پیچھے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم مسلح ہو۔“

زمین گل فکر مند ہو گیا۔ ”شاہ جی نے ایسا بات تو بتائی نہیں ورنہ اسلحہ لے کر آتے ابھی تو صرف پستول ہے۔“

گویا پستول کوئی چھری چاقو جیسا اسلحہ تھا۔ پتا نہیں دکن ہتھیاروں کی صورت میں خود کو کس بجھتے تھے۔ میں نے بیک سے ایم سولہ رائفلیں نکال کر ان کے حوالے کیں اور پوچھا۔ ”انہیں استعمال کر سکتے ہو؟“

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”ادھر بچہ بچہ ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہے۔“
”تب تیار ہو جاؤ وہ آنے والے ہیں اور ہاں رن وے لائنس آن کر دو۔“

وہ اپنی گاڑی میں ایک چھوٹا جزیرہ لائے تھے اور اس کی وائرنگ اندر بجلی کی تنصیبات تک پہنچا دی تھیں۔ فی الحال جزیرہ سے صرف عمارت کی روشنیاں جلائی گئی تھیں۔ رن وے کی روشنیاں بند تھیں۔ زمین گل اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ادھر تعاقب میں آنے والی دوسری گاڑی نمودار ہوئی اور ادھر رن وے لائنس آن ہو گئیں۔ میں نے اور امن گل نے بیک وقت فائر کیے۔ میں نے برس بھر توڑ رکھا تھا مگر زمین نے سنگل موڈ پر فائر کیا اور بہترین نشانہ لگایا تھا کیونکہ گاڑی کی وینڈ اسکرین ٹکھڑی گئی تھی۔ گاڑی تیزی سے ریورس ہوئی اور اسکول کی عمارت کے عقب میں چلی گئی۔ وین بھی وہاں آگئی تھی اور اس سے نکل کر مسلح افراد پھیل رہے تھے۔ مگر وہ اس دور تھے کہ ان کا نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح ہم بھی اتنے دور تھے کہ وہ آسانی سے ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

سوا ایک بج رہا تھا اور زمینی نے طیارہ دو بجے تک منگوا یا تھا مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ ٹھیک دو بجے آتا وہ اس سے پہلے بھی آ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ طیارہ آ بھی جائے تو وہ اسے لینڈ کرنے کی اجازت کہاں دیں گے؟ فضا اور رن وے پر اسے نشانہ بنانا بہت آسان ثابت ہوگا۔ میں

سوچ ہی رہا تھا کہ ہلکی سی مستحکم ہٹ کی آواز آئی اور پھر آواز طیارے کی صورت اختیار کر گئی۔ تاریکی میں اس کی نیچے کی جلتی بجھتی سرخ روشنی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی ساخت واضح نہیں تھی لیکن آواز سے یہ چھوٹا طیارہ لگ رہا تھا۔ زمینی نے موبائل نکال کر کسی کو کال کی اور اسے بتانے لگی کہ نیچے سب افراد ہیں اور کس پوزیشن پر ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسے کال کر رہی تھی کیونکہ اس موبائل کی مدد سے طیارے سے رابطہ تو ممکن نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے کال ختم کی میں نے پوچھا۔

”کسے کال کر رہی تھیں؟“

”کابل میں اپنے آدمی کو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ طیارے کے پائلٹ کو صورت حال سے آگاہ کرے گا۔“

چند لمحوں بعد طیارہ جو رن وے کی سیدھ میں آچکا تھا اچانک بلند ہوا اور گھومتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف جانے لگا۔ ایک چکر لگا کر وہ اوپر سے گزرا تو نیچے سے اس پر مشین گن سے فائرنگ کی گئی مگر طیارے کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ رن وے کی روشنیوں کے پاس آیا تو میں نے پہلی بار اسے دیکھا۔ یہ ایک پروپلر انجن والا چھوٹا طیارہ تھا جس میں چار پانچ افراد کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ کابل میں موجود شخص نے یقیناً پائلٹ سے رابطہ کر کے اسے نیچے موجود خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے نیچے موجود افراد کے خلاف کیسے کارروائی ہوگی؟ مگر جلد مجھے اس کا جواب مل گیا۔ دوسری بار طیارہ گھوم کر اسکول کی عمارت کی سیدھ میں آیا اور دریا کے دوسری طرف سے پرواز کرتا ہوا نزدیک آنے لگا۔ اچانک اس کے پردوں کے نیچے سے شعلے سے نکلے اور چند لمحوں بعد اسکول کے دوسری طرف دھماکوں کے ساتھ شعلے بلند ہوئے تھے۔

طیارے میں راکٹ پوڈ فٹ تھی۔ جواب میں نیچے موجود افراد نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی مگر اپنا کام کر کے طیارہ فوراً اوپر اٹھ گیا تھا اور واپس دوسرے حملے کے لیے جا رہا تھا۔ اب مجھے پتا چلا کہ زمینی اتنی مطمئن کیوں تھی کہ طیارے میں موجود افراد نیچے موجود دشمن کا بند بست کر لیں گے۔ اسے معلوم تھا کہ طیارہ مسلح ہوگا۔ شعلوں کا مستقل انکاس بتا رہا تھا کہ کوئی گاڑی نشانہ بنی تھی اور اب جل رہی تھی۔ نصف گلوبل دھماکے کے باوجود ان لوگوں کی چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی میں سے کچھ افراد فری میں اسکول کے دوسری طرف بھاگ رہے تھے۔ میں نے اور امن

مگل نے بیک وقت انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ زمین مگل کو دشمن سے زیادہ رنی شاہ کی فکر تھی اور وہ بار بار اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا میں نے تنگ آ کر کہا۔ ”ہمیں کیا پتا، جب ہم نکلے تب دشمن آیا تھا۔ اب اللہ جانے وہاں کیا ہوا ہے؟“

زینی نے آہستہ سے انگریزی میں کہا۔ ”تم نے انہیں اسلحہ دے کر اچھا نہیں کیا۔“

”یہ رنی شاہ کے آدمی ہیں لیکن اس وقت ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس لیے تم فکر مت کرو۔“

ہماری طرف سے فائرنگ ہوئی تو ادھر پناہ کے لیے آنے والے مشکل میں پڑ گئے۔ وہ واپس بھاگے تھے مگر ان کے لیے کہیں امان نہیں تھی۔ اسی اثنا میں طیارے سے دوبارہ فیلنگ ہوئی اور شاید دوسری گاڑی بھی نشانہ بن گئی۔ کیونکہ اس بار دھماکے اور شعلے کہیں زیادہ بلند تھے۔ فیلنگ کے بعد طیارہ بلند نہیں ہوا بلکہ اس نے مزید نیچے آتے ہوئے مشین گن سے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ گاڑیاں تباہ ہونے کے بعد کام آسان ہو گیا تھا مسلح افراد کے پاس اب بچنے کے لیے کوئی آڑ نہیں تھی۔ میں نے زمین مگل سے کہا۔ ”ہمیں ان کا ساتھ دینا ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“ زمین مگل نے پوچھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے کہا اور گاڑی کا میٹر نیوٹرل کر کے اسے آگے دھکیلنے لگا۔ ”تم دونوں میرے دائیں بائیں سے ان لوگوں کو نشانہ بناؤ گے۔“

وہ میری حکمت عملی سمجھ گئے۔ میں درمیان میں رہ کر گاڑی کو دھکا لگا رہا تھا اور وہ میرے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ خود کار ریفلیکس کے لیے پانچ سو میٹر زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کی مار اس سے زیادہ ہوتی ہے مگر پھر کوئی خطرناک نہیں رہتی ہے۔ ساڑھے تین سو چار سو میٹر کا فاصلہ مناسب تھا۔ طیارے کی مشین گن سے بچنے کے لیے دشمن کے نصف درجن آدمی اس طرف آ چکے تھے۔ جب ہم ان کے قریب آنے لگے تو ان کو یہاں بھی لالے پڑ گئے۔ چار سو میٹر کی دوری سے ان دونوں باپ بیٹے نے دو افراد کو نشانہ بنایا تو باقی افراد کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ اندھا دھند گولیاں برساتے ہوئے رن وے کے ساتھ کھلے میدان کی طرف بھاگ نکلے تھے مگر بد قسمتی سے وہ غلط وقت پر آڑ سے نکلے تھے۔ طیارہ پھر چکر کاٹ کر اس طرف آ گیا تھا اور اس نے بجھوڑوں پر مشین گن آزمائی ان میں سے دو اور گرے تھے اور باقی تارکی میں غائب ہو گئے۔ اب میدان صاف تھا۔

میں گاڑی میں آ گیا۔ میرے ساتھ زمین مگل تھا اور امین مگل پیچھے آ گیا۔ ہم نے اسکول کی عمارت کے گرد چکر لگایا۔ دونوں گاڑیاں راکٹوں کا نشانہ بن چکی تھیں۔ پائلٹ ماہر نشانے باز بھی تھا اس نے دونوں بار درست جگہ پر راکٹ مارے تھے۔ ہم واپس آئے اور زینی کو آل کلیر کا سگنل دیا۔ اس نے پھر اسی شخص کو کال کی اور اس نے پائلٹ کو پیغام بھیجا کہ اب طیارہ لینڈ کر سکتا ہے۔ پائلٹ نے طیارے کو رن وے کی سیدھ میں لا کر نیچے کیا اور بہت آرام سے اتار لیا۔ چند منٹ بعد طیارہ ہمارے پاس آ کر رکا اور اس میں سے پائلٹ کے ساتھ ایک شخص اتر اٹھا۔ یہ چار نشستوں والا طیارہ تھا۔ اترنے والے دونوں افراد سفید فام تھے۔ انہوں نے زینی اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ زینی سے ان کا انداز بے تکلفانہ تھا جیسے وہ اسے جانتے ہوں۔ البتہ مجھ سے رکھائی سے ملے تھے۔ میں نے امین مگل سے کہا۔ ”جب ہم پرواز کر جائیں تو تم چلے جانا اور اس کا ذکر کسی سے مت کرنا رنی شاہ خود تم سے رابطہ کرے گا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

میں اور زینی طیارے میں آئے پائلٹ نے انجن بند نہیں کیا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے سیٹ سنبھالی اور طیارے کا رخ موڑنے لگا۔ میں پائلٹ کے برابر والی نشست پر تھا کیونکہ زینی اور دوسرا آدمی مجھ سے پہلے پچھلی نشست پر آ گئے تھے۔ پائلٹ نے ہم سے کہا۔ ”جب تک فلائٹ لیول نہیں ہو جاتی تم لوگوں کو پریشر برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر تنگی ہو تو سیٹ کے سائیڈ میں شاپر موجود ہے۔ زینی نے جواب دیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

پائلٹ نے سر ہلایا اور تھروٹل آگے کیا تو طیارہ تیزی سے آگے بڑھا اور رن وے پورا ہونے سے پہلے طیارہ فضا میں بلند ہو گیا۔ طیارے کے آگے میٹر کے مطابق یہاں کی بلندی سولہ سو ساٹھ میٹر تھی اور اس میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ تین ہزار میٹر پر پہنچ کر پائلٹ نے طیارہ سیدھا کر لیا۔ انجن کا شور اور کانوں پر آنے والا پریشر کم ہو گیا تھا مگر یہاں کسی مسافر بردار طیارے جیسا آرام وہ ماحول نہیں تھا کیونکہ طیارے میں کیمین پریشر نہیں تھا۔ تین ہزار میٹر کا مطلب تھا کوئی دس ہزار فٹ کی بلندی اور یہاں فضا کی دباؤ سطح سمندر سے نصف رہ جاتا ہے۔ انجن کا شور تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ زینی اپنے ساتھ بیٹھے سفید فام سے کیا بات کر رہی تھی مگر وہ دونوں آپس میں محو گفتگو تھے۔ گفتگو کرتے ہوئے ان کے سر ملنے سے نزدیک آ گئے تھے۔ مشرق

میں اسے برا سمجھا جاتا ہے مگر مغرب میں یہ عام سی بات ہے۔ انجینیئرز مرد عورت بھی دوران گفتگو ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ جاتے ہیں۔

سفید فاموں کو دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھنکا تھا کیونکہ اب تک اس معاملے میں کوئی سفید فام نظر نہیں آیا تھا۔ پائلٹ اور دوسرا شخص دونوں غیر فوجی تھے۔ افغانستان میں غیر ملکی افواج کے ساتھ بے شمار عام افراد بھی آئے تھے۔ ان میں اکثریت کنٹریکٹرز کی تھی جنہوں نے افغانستان میں مختلف کاموں کے ٹھیکے لیے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ ظاہر ان کی موجودگی کوئی خاص تعجب انگیز نہیں تھی۔ طیارہ اڑانے جیسے فی کام زیادہ تر غیر ملکی کر رہے تھے۔ ان کی خدمات کرائے پر حاصل کی جاسکتی تھیں۔ اس کے باوجود مجھے کھٹکا ہوا تھا۔ انہوں نے جتنی مہارت سے راکٹ جیسا پیچیدہ ہتھیار استعمال کیا تھا اور منوں میں زمین پر موجود گاڑیاں تباہ کر دی تھیں اس سے لگ رہا تھا کہ وہ باقاعدہ تربیت یافتہ تھے۔ زینی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ دو اے کے زیر اثر تھی مگر دوسرا تو ایسا نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ زینی کی باتوں سے بھانپ نہ لے کہ جو یہ ظاہر قیدی ہے وہی اصل ماسٹر ہے۔

اسد آباد سے کاہل کا فاصلہ سو کلومیٹر بھی نہیں ہے اور طیارے نے مشکل سے نصف گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کر لیا۔ کاہل شہر کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ خاصا بڑا شہر ہے اور سنا ہے کہ اس کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یعنی یہ دارالحکومت ہی نہیں افغانستان کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ دریائے کاہل کی وادی میں اس کے دونوں اطراف بسا یہ شہر گزشتہ چار عشروں سے جنگ دیکھ رہا ہے۔ یہ ظاہر روس 1979 میں یہاں وارد ہوا تھا مگر کاہل کی جنگ اس سے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ ان چار عشروں میں یہاں امن اور سکون کا دور بہت کم گزرا اور اس شہر کے باشندوں نے زیادہ تر وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور گولوں کے دھماکے سننے ہی گزارا ہے۔ طیارے نے چکر لگایا اور پائلٹ کی طرف اشارے سے ہدایات لے رہا تھا ان ہدایات کی روشنی میں اس نے چکر لگایا اور ایک دن دے پر اتر گیا۔ اترنے کے بعد طیارہ رکنا نہیں بلکہ ٹیلی کرتا ہوا ایک بیگر میں داخل ہو گیا۔ یہ بیگر چھوٹے طیاروں کے لیے مخصوص تھا۔

میں نے طیارے کے ذریعے یہاں آ کر رسک لیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ارفیلڈ سے فرار ہونے کے بعد بھی وہ لوگ ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ان کا علاقہ تھا اور

وہاں سے ہمارا صحیح سلامت نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ کاہل میں بھی خطرہ تھا مگر میں پاکستانی سفارت خانے میں پناہ لے سکتا تھا اور سفارت خانے کی مدد سے واپس جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی نکلنے کے اور راستے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ یہاں بھی پاکستانی مشکوک سمجھے جاتے ہیں اور انہیں فوری طور پر عسکری تحفظوں یا خفیہ اداروں کا آدمی تصور کر لیا جاتا ہے جیسا کہ انڈیا میں ہوتا ہے اور ان کے ساتھ تقریباً وہی سلوک بھی ہوتا ہے۔ پچھلے دنوں ایسے واقعات بھی سننے میں آئے جب صرف پاکستانی ہونے کے جرم میں یہاں عام افراد کو قتل کر دیا گیا۔ حالانکہ وہ تاجر تھے یا کہنیوں کی طرف سے یہ طور لیبر آئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہاں برسرِ اقتدار طبقہ پاکستانیوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا ہے۔ سرکاری اہل کار عام طور سے پاکستانیوں کے ساتھ دوستانہ رویہ نہیں رکھتے ہیں۔ ہمارے مقابلے میں انڈیز کو یہاں نہ صرف پسند کیا جاتا ہے بلکہ انہیں افغانستان کی تعمیر نو میں کروڑوں ڈالرز کے ٹھیکے بھی ملے ہیں۔

افغانستان میں پاکستانیوں کی تعداد شاید دس پندرہ ہزار سے زیادہ نہ ہو لیکن پاکستان میں کم سے کم پچاس لاکھ افغانی موجود ہیں اور ان میں سے بیشتر نہ صرف پاکستانی شناختی کارڈ بلکہ پاسپورٹ بھی رکھتے ہیں اور اس پر ساری دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ پنڈی جیسے درمیانے شہر میں بہت سے محلے اور بازار ایسے ہیں جہاں صرف افغانی پائے جاتے ہیں اور کھلے عام رہتے ہیں۔ انہیں کوئی صرف اس بنیاد پر کچھ نہیں کہتا کہ وہ افغانی ہیں۔ حالانکہ وہ پاکستان میں پائی جانے والی بیشتر خرابیوں کے ذمے دار ہیں۔ اسلحہ یہ لوگ لائے، منشیات کا پورا کاروبار ان کے ہاتھ میں ہے اور دوسرے جرائم میں بھی یہ ملوث ہوتے ہیں۔ پنڈی اور اس کے گرد و نواح میں منظم ڈکیتیوں میں افغان گروہ ملوث ہیں جو حاصل ہونے والی رقم کو پھر دہشت گردانہ مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر ہونے والی دہشت گردی کے تانے بانے بھی ان ہی لوگوں سے ملتے ہیں۔

ہمارے ہاں دہشت گردی میں ملوث اکثر افراد کا تعلق کسی بڑی ملکی سے نکلتا ہے۔ اس کے باوجود افغانیوں کی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جب کہ افغانستان میں پاکستانیوں کا تاثر شاید انڈیا سے کچھ ہی اچھا ہو۔ آئے دن سرحد کے دوسری طرف سے زبان کے اور عملی گولے : سائے جاتے ہیں۔ ہماری چیک پوسٹوں پر حملہ

ہوتا ہے۔ جب کہ ہمارے پاس دہشت گردی میں مطلوب افراد افغانستان میں کھلے عام کھوتے ہیں اور اس کے باوجود لعن طعن ہم پر کی جاتی ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی میں استعمال ہونے والا اسلحہ اور بارود افغانستان سے لایا جاتا ہے۔ پروسی ملک ہونے کے باوجود ہمارے یہاں اسے کونسلٹ نہیں ہیں جتنے کہ انڈیا نے کھول رکھے ہیں اور یہ کونسلٹ ہماری سلامتی کے خلاف دن رات کام کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اکثر افغانی پاکستان کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ پاکستان کے بہت زیادہ حامی بھی نہیں ہیں۔ عام طور سے ان کا رویہ بھی سرد مہری لیے ہوتا ہے۔

آج میں اسی افغانستان کے دارالحکومت میں تھا جو آج بھی جنگ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اگرچہ دنیا کی اکلوتی (فی الحال) سپر پاور یہاں مزید تین درجن سے زیادہ ممالک کے ساتھ براجمان تھی۔ مگر حالات اس کے قابو میں نہیں آ رہے تھے اور آنے والے دنوں میں مزید ابتری کی پیشگوئی تھی۔ صرف افغانستان ہی نہیں بلکہ اس خطے کے دوسرے ممالک کے لیے بھی حالات کچھ اچھے نہیں ہیں جن میں سرب فہرست وطن عزیز ہے۔ مگر یہ وقت سیاست پر غور کرنے کی بجائے ذاتی فکر کرنے کا تھا کہ میں کس طرح جلد از جلد واپس اپنے ملک جاسکتا تھا۔ طیارہ بیگر میں رک گیا تھا اور اس کا انجن بند ہو گیا تھا مگر پر اب تک محوم رہا تھا۔ میں نے مرکز زینی کی طرف دیکھنا چاہا تھا کہ میری گردن میں کوئی چیز چھبی اور خواب آور سیال میری گردن میں اتر گیا کیونکہ فوراً ہی میرا دماغ پکڑنے لگا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو انجکشن لگانے والی زینی تھی جو مسکرا رہی تھی۔ میں نے یہ مشکل کہا۔ ”تم... یہ کیسے...؟“

”ایسے۔“ اس نے انجکشن کا ایک سیٹ میرے سامنے کیا۔ ”یہ اینٹی ڈوٹ ہے اس کا نالہ... کیا سمجھے؟“ بے ہوش ہونے سے پہلے میں سمجھ گیا تھا کہ زینی نے دوا کے اثر سے کیسے چھٹکارا پایا تھا۔ اس نے سامنے سے کسی وقت اینٹی ڈوٹ لے لیا تھا جس نے دوا کا اثر ختم کر دیا اور اس کا اعتاد بحال ہو گیا اس کے بعد بھی وہ یوں بنی رہی تھی میرے قابو میں ہو اور جب حالات پوری طرح اس کے قابو میں آ گئے تو اس نے اصلیت پر آنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ طیارہ رکتے ہی اس نے میری گردن میں بے ہوشی کا انجکشن اتار دیا تھا اور آخری سوچ جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں خوش فہمی میں مارا گیا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک سادہ کمرے میں سادہ لیکن آرام دہ بستر پر تھا اور میرے سر کے مین اور ایک پیلی روشنی والا انرجی سیور روشن تھا۔ جاگنے کے بعد بھی کچھ دیر تک میرا ذہن غنودگی کا شکار رہا اور پھر میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں آمدورفت کے لیے ایک ہی دروازہ تھا اور ایک طرف روشن دان نما جالی لگی تھی۔ یہ شاید اسے سی کا ڈکٹ تھا۔ میرے جسم پر اب ہلکی بڑی ٹنگائی ٹی ٹی ٹی اور اسی رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ پاؤں خالی تھے البتہ بیڈ کے ساتھ میرے جوتے رکھے تھے اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گردن میں جہاں انجکشن لگا تھا وہ جگہ دکھ رہی تھی مگر اس کے علاوہ میں بالکل فٹ فاٹ تھا۔ زینی نے مجھے پھر انجکشن نہیں دیا تھا جو اعتماد ختم کر دیتا ہے کیونکہ میں خود کو نارمل محسوس کر رہا تھا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں تھی اور ایک حد سے زیادہ ان انجکشنوں کا استعمال خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

میں نہ جانے کہاں تھا کیونکہ اس پاس مکمل سناٹا تھا اور کسی قسم کی معمولی سی آواز بھی نہیں تھی۔ ایک بار پھر میرے اندر بھارتیوں کا خوف سرسرا نے لگا کہ کہیں میں ان کے ہاتھ تو نہیں آ گیا تھا۔ اگرچہ زینی نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے کسی آدمی نے مانگا ہے اس کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا۔ وہ جھوٹ بول سکتی تھی اور میں بے بس تھا کہ کسی طرح اس کی بات کی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔ ایک خیال ڈیوڈ شا کا بھی آ رہا تھا مگر کچھ عرصے پہلے ہی وہ پاکستان میں مجھ سے دست بردار ہو کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے اتنی عجلت میں اور اتنے گھماؤ پھراؤ کے ساتھ مجھے قبضے میں کرنے کی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اگر کوئی تک تھی تو اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں کم سے کم چھ سات گھنٹے تک بے ہوش رہا تھا اور اس دوران میں مجھے کاہل سے کہیں دور بھی لے جایا جاسکتا تھا۔

مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں کاہل یا اس کے آس پاس ہی کہیں تھا۔ موسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے دروازہ چیک کیا یہ پلائی کا بنا ہوا مضبوط دروازہ تھا جو باہر سے بند تھا اور اس کے اندر نہ تو ہینڈل تھا اور نہ ہی ہینڈل تھی۔ میں نے دستک دی اور پھر زور سے بجایا مگر دونوں صورتوں میں کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔ اب میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جب دروازہ کھلے اور صورت حال سامنے آئے۔ میں واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ کم بجٹوں نے پانی کی ایک بوتل تک نہیں رکھی تھی اور

اب مجھے پیاس لگنے لگی تھی۔ میں نے بیڈ کا جائزہ لیا کہ یہ لوہے کا بنا ہوا چھ بالی تین فٹ کا بیڈ تھا جس کے بائیں فرش میں پیوست تھے اور اس کے وسط میں ہر چھ انچ کے بعد فولادی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر اسپرنگ میٹریس تھا اور یہ انتظام یقیناً ایک قیدی کے لیے کیا گیا تھا۔ گویا میں کسی ایسی جگہ تھا جہاں قیدی رکھے جاتے ہیں۔

یہ جان کر میری تشویش میں اضافہ ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹا ہو گیا تھا مجھے بیدار ہوئے اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کسی کو متوجہ کروں کہ دروازہ کھلا اور زینتی قیامت بنی ہوئی اندر آئی۔ اس نے جسم سے چپکلی ہوئی مٹی کی شرٹ پہن رکھی تھی جسے جدید قسم کا بلاؤز بھی کہا جاسکتا تھا۔ بازو دھار تھے اور گلا فراغ دلی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ ایک مختصر سی پٹی کے بعد پیٹ شروع ہو گیا تھا جو ناف سے نیچے تک کسی بھی لباس کی گرفت سے آزاد تھا۔ اس نے جو مٹی اسکرٹ پہن رکھا تھا اس میں اس کی ٹانگیں نمایاں تھیں۔ اس کا قدمناسب تھا یعنی پانچ پانچ انچ مگر اس نے تین انچ کی ٹیکل کے ساتھ اس میں مزید اضافہ کر لیا تھا۔ میری توجہ پا کر اس نے خود کو مزید ملاحظے کے لیے پیش کیا۔ میں نے گہری سانس لی اور کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم میرے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیل رہی ہو؟“

”بس اس کھیل کا آخری حصہ شروع ہو گیا ہے۔“

اس نے ٹارٹل انداز میں کھڑے ہوئے کہا۔ ”تم تیار ہو؟“

”کس کام کے لیے؟“

”ناشتے کے لیے۔“

”کیوں نہیں۔“ میں کھڑا ہوا تو وہ ذرا محتاط ہو گئی اور دروازے کے پاس ہو گئی۔ میں مسکرایا۔

”ڈر رہی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”حالانکہ میں عورتوں کا بہت احترام کرتی ہوں۔“

”مجھ جیسی عورتوں کا نہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں اس وقت انجکشن میسر نہ ہوتا تو تم میری گردن توڑنے میں دیر نہیں لگاتے۔“

وہ مجھے باہر لائی۔ یہ چھوٹی سی عمارت تھی اور یہاں کم سے کم چھ مسلح افراد تھے۔ مجھے دوش روم جانے کا موقع ملا اور پھر ریڈی میڈ ناشتا نصیب ہوا۔ زینتی نے صرف سیاہ چائے لی تھی۔ اس نے بہت نفاست سے میک اپ کیا ہوا تھا اور اس کی تیاری بتا رہی تھی کہ ہمیں کہیں جانا ہے۔ اس کے پاس

ایک چھوٹا بینڈ بیک تھا مگر اس کی جسامت سے قطع نظر مجھے یقین تھا کہ اس میں کوئی ہتھیار لازمی ہوگا۔ کمرے سے باہر آتے ہی دو افراد مجھ پر مسلط کر دیئے گئے تھے اور اس وقت میرے پاس تھے۔ یہ چہرے مہرے سے افغانی ہی لگ رہے تھے۔ زینتی نے مجھ سے کہیں پوچھا کہ میں قبل از وقت انجکشن کے اثر سے کیسے نکلا اسی طرح میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ قوت ارادی ختم ہونے کے بعد بھی اس نے اپنی ڈوٹ کیسے لیا۔ ہم عام افراد نہیں تھے۔ میں ناشتے کے دوران میں محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کسی چیز میں کوئی الگ سے ذائقہ آرہا ہے مگر میں ناکام رہا اور ناشتے کے بعد بھی ٹھیک رہا۔ زینتی سکون سے انتظار کر رہی تھی جیسے ہی میں نے ہاتھ روکا اس نے کہا۔

”چلو۔“

”کیا تم بذات خود مجھے بینڈ اور کر دو گی۔“

اس نے میری طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”کاش کہ میں تمہیں اپنے پاس رکھ سکتی۔“

”میں کسی کے پاس رہنے والا شخص نہیں ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جلد یہ بات تم اور وہ شخص جان جائے گا جس نے مجھے بلوایا ہے۔“

”میری ذمے داری ختم ہو جائے گی۔“ زینتی نے شانے اچکائے۔ ”میں چاہتی ہوں اب تم ٹارٹل رہو لیکن اگر تم نے مزاحمت کی تو مجبوراً تمہیں بے بس کرنا پڑے گا۔“

”میں تعاون کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو۔“

”کس بات کا اور کیا تم میرے جواب پر یقین کرو گے؟“

”ہاں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کیا تم مجھے بھارتی حکومت یا اس کی کسی ایجنسی کے حوالے کرنے جا رہی ہو؟“

”تمہیں اس شخص کا بھارتی حکومت یا اس کی کسی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”وہ بھارتی ہے؟“

”نہیں وہ بھارتی بھی نہیں ہے۔“

میں اس کے لہجے اور الفاظ پر غور کر رہا تھا اور مجھے لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“

”چلو۔“

ہم عمارت سے باہر آئے یہ ایک وسیع احاطے میں تھی جو بھارتی سی جھونپڑی جی اور خاص بات یہ تھی کہ وہاں

”اٹھو۔“ کرل نے کہا۔

”ڈیوڈ شاد ہیں ہے؟“

”ظاہر ہے۔“

معاملات اس طرف جارہے تھے جہاں میں لے جاتا نہیں چاہتا تھا یعنی اس پر اسرار وادی تک۔ مگر میں بے بس تھا۔ میں طیارے میں تھا اور اس کا رخ اٹھیا کی طرف تھا۔ میں نے سیٹ بیلٹ کھولنا چاہی تب ہتا چلا کہ وہ نہیں کھل رہی تھی۔ کرل مسکرایا اور بولا۔ ”صرف دو گھنٹے کا سفر ہے پھر تم آزاد ہو گے۔“

زینی نے ایک توبہ شکن اٹھرائی لی اور بولی۔ ”اب تم اور ہم آرام سے سفر کر سکیں گے۔“

اگلے دو گھنٹے تک میں اسی طرح بندھا بیٹھا رہا۔ طیارہ اتنی بلندی پر تھا کہ نیچے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر جب برف پوش پہاڑ نظر آتا شروع ہوئے تو میں چونکا تھا۔ ہم ہمالیہ کے آس پاس تھے۔ پریشور کیمن اور نرسکون ہموار پرواز کی وجہ سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ طیارہ کس رفتار سے اڑ رہا ہے لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ کم سے کم آواز کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا اور اتنی رفتار سے وہ دو گھنٹے میں بھارت کے دوسرے سرے تک پہنچ سکتا تھا۔ پھر طیارے کی بلندی کم ہونے لگی اور ذرا دیر بعد وہ ایک عام سی ائر فیلڈ پر اتر رہا تھا۔ یہ کوئی پبلک ائر پورٹ نہیں تھا بلکہ شاید نجی یا کلب ائر پورٹ تھا۔ طیارہ اتر اور رک گیا۔ ایک کار طیارے کی طرف آئی اس دوران میں ائر ہوسٹس نے دروازہ کھول دیا اور میری سیٹ بیلٹ بھی خود بہ خود کھل گئی۔ میں، زینی اور کرل نیچے اترے۔ کار کے ساتھ دو افراد تھے اور یہ مقامی تھے۔ انہوں نے دروازے کھولے اور ہم تینوں عقبی نشست پر آگئے۔ زینی مجھ سے لگ کر بیٹھی تھی اور اس نے میرے کان میں کہا۔ ”ہم بس جینے والے ہیں۔“

”اطلاع کا شکریہ۔“

یہ نیم پہاڑی علاقہ تھا کار ائر کلب سے نکل کر مل کھاتی سڑکوں پر سفر کرنے لگی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ایک پہاڑی سیشن میں تھے اور کار رکھتے ہی میں نے لان میں دھوپ اور فوریک سے لطف اندوز ہوتے ڈیوڈ شا کو دیکھ لیا۔ ہم کار سے اتر کر براہ راست اس کی طرف آئے تھے۔ زینی سب سے آگے تھی اور مجھے قطعی حیرت نہیں ہوئی جب وہ لپک کر ڈیوڈ شا کے گلے لپک گئی۔ مگر اس کے کہنے الفاظ پر میں اچھل پڑا تھا۔ اس نے کہا تھا ”ایا میں شہباز کو لے آئی ہوں۔“ (جاری ہے)

ممارے غیر ملکی نظر آ رہے تھے۔ یہ شاید کابل میں غیر ملکیوں کے لیے مخصوص کپاؤنڈ تھا جہاں وہ محفوظ زندگی گزار رہے تھے۔ یہ عام سویلین لوگ تھے جو زیادہ تر مغربی اور مشرقی بعید کے ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ میں ایک بڑی گٹھری وین کے پچھلے حصے میں ہوں آیا کب میری دائیں بائیں دو افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص بھی مسکرتھا۔ زینی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے ایک شال نما چادر لے لی تھی۔ کابل کی گرد آلود سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم آدھے گھنٹے بعد کابل ائر پورٹ پہنچے جہاں گاڑی براہ راست ایک پرائیویٹ جیٹ ڈیٹیکٹ پہنچی۔ یہاں ایک چھوٹا جیٹ طیارہ منتظر تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔

”یہ میرے لیے ہے؟“

”بالکل خاص طور سے تمہارے لیے۔“

”ہمیں کہاں جانا ہے۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے کہا اور گاڑی سے اتر گئی۔ میں بھی نیچے آیا میرے گمران پہلے ہی اتر گئے تھے۔ ان کے ساتھ میں طیارے کی سیڑھیوں تک آیا اور دروازے پر موجود شخص کو دیکھ کر چونکا۔ وہ ڈیوڈ شا کا خاص آدمی کرل جیمز بیکسٹر تھا۔ وہ سوٹ میں تھا اور اس نے سر پر فلیٹ ہیٹ لگا رکھا تھا۔ تو لمبی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ مجھے ڈیوڈ شانے بلوایا تھا اور وہی میرے لیے اس طرح کے انتظامات کر سکتا تھا۔ میں طیارے میں داخل ہوا۔ میرا خیال تھا کہ زینی وہیں رہ جائے گی مگر وہ بھی طیارے میں آگئی۔ ہم کل تین مسافر تھے اور ایک ائر ہوسٹ سمیت عملے کے کل تین افراد تھے۔ دروازہ بند ہوتے اور ہمارے نشستوں پر بیٹھے ہی طیارے کے انجن اشارت ہوئے اور اس نے ڈیٹیکٹر سے نکل کر رن وے پر ٹیکسی شروع کر دی۔ میں اور کرل آگے سامنے بیٹھے تھے اور زینی آگے کے صوفہ نمائش پر تھی۔ طیارے میں آتے ہی وہ مجھ سے بے نیاز ہو گئی تھی اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ یہ پوز بھی خاصا سنسنی خیز تھا مگر فی الحال میری توجہ کرل پر تھی جو طیارے کی پرواز سے پہلے سگار نوشی میں مصروف تھا۔ جیسے ہی طیارے نے پرواز شروع کی اور بلندی پر آیا سیٹ بیلٹ سائن بجھا اور اس نے سگار جلایا۔

”تو ڈیوڈ شا کو پھر میری یاد آگئی؟“

کرل نے سر ہلایا۔ ”وہ تمہیں کبھی بھولا نہیں۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”باقی

دی وے ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

برہان تبسم..... سرگودھا
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے مولے کو شہباز سے
اذان احمد..... لاہور

اسی محاذ پر مجھ کو شکست ہوتی ہے
میں جب بھی ہارا ہوں اپنی اتا سے ہارا ہوں
سندس جمالی..... ہالہ نیو

اک نظر میں اس نے مجھ سے کر لیے اتنے سوال
میں بھی کیا کرتا کہ بس نظریں جھکا کر رہ گیا
نظیر حسن..... سکھر

اب اٹھیں، تنہائی بولی
دس بچے ہیں دفتر جائیں
انیس اچکڑنی..... پشاور

اسی رنگ کا پھول اس نے چنا
جو ایک رنگ میری وفا میں نہیں
جمیل احمد..... حضرو

آج بھی یاد کے دشت کا دامن کیوں گیلا کر جاتی ہیں
آنکھ سے اشکوں کی برساتیں صبح سے پہلے شام کے بعد
نصیر احمد..... پشاور

اجنبی لگتا ہے سارا منظر
اف خدا جانے کہاں ہیں ہم لوگ
ناصر ارشد خان..... شادی پور

اہل دانش عام ہیں کیا اب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایوان
(ایم افضل کھرل ننگانہ کا جواب)

عرفانہ مقصود جہلم
بے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوا بیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد

(احمد جاوید ملتان کا جواب)

سیف الف..... ملک وال
کیا اس لیے چنوائے تھے تقدیر نے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

مہتاب فاطمہ..... جہلم
اجنبی لگتا ہے سارا منظر
اف خدا جانے کہاں ہیں ہم لوگ

(رانا حبیب الرحمن لاہور کا جواب)

انیس امام..... لاہور
نہ کوئی چارہ نہ حسرت نہ آرزو نہ طلب
قمر کے واسطے بس آپ کی دعا ہے بہت

(تکلیل الرحمن کھاناں کا جواب)

نسیم مرزا..... لاہور
وجہ رسوائی نہ بن جائے ضرورت میری
مجھ کو نیلام نہ کر دے کہیں غربت میری

صباحت جول..... لاہور
وقت کا فیصلہ ضروری ہے
بھرموں کو سزا ضروری ہے

جاوید احسن..... مظفر گڑھ
وہ دیکھ شام کے بستر پہ مگر کیا سورج
بدن سے پھوٹ رہی ہے مکان کی خوشبو

(منشی محمد عزیز مئے لندن کا جواب)

فدا حسین طوری..... پاڑا چنار
یہ راز سمجھ پائے ہیں اب تک کتنے
اسرار کہیں اور کہیں مجرم بھی

عظیم حسن خان..... کراچی
ایک عمل کے ساتھ وہ رہتا نہ تھا کبھی
بیگانہ تھا کبھی تو وہ تھا آشنا کبھی

(آفتاب احمد نصیر اشرفی لاہور کا جواب)

نگار قریشی..... حیدر آباد

نفسا نفسی کا ایسا عالم ہے
دایاں کھیلے ہے بائیں ہاتھ سے کھیل
(وحید ریاست بھی لکھ سیداں کا جواب)

نوازش علی..... لاہور

روپ ملتے ہیں خدو خال ملتے ہیں
آدمی نہیں ملتا آدمی کے پیکر میں
نصیر ممتاز..... ساہیوال

رات اک بچتے ہوئے جگنو نے مجھ سے یہ کہا
پوچھ مت کتنا مجھے بھی روشنی کا شوق تھا
اشرف بھی..... سرگودھا

روانی دل کے دریا میں کہاں تھی
محبت نے رواں رکھا ہوا ہے
(سلیم کامریڈ کھاناں کا جواب)

نوشین ملک..... جہلم

نت نئے خواب کے اشارے ہیں
یہ محبت کے استعارے ہیں
(مہوش سلطان سکھر کا جواب)

محمد فرقان..... ملائکہ سوداگر پورہ

تخیلات کی دنیا غریب سے لیکن
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا
(آصفہ بتول واہ کینٹ کا جواب)

خوش بخت الرحمن..... لاہور

یہ زمیں کائناتوں سے مزین ہوتی تب بھی چلے آتے
پتھروں پہ چل کے تیرے گھر آتے ہیں دشواری ہے
(نزهت احمد گجرات کا جواب)

قرآن..... ساہیوال

اک بار گلاب عارض و لب کے ترے ہیں
اک برق تبسم پھر جو چمک جائے تو اچھا
عبدالرحمن..... میرپور

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ دے
پھر التفات دلِ دوستان رہے نہ رہے
انصار حسین..... حامد پور کنور

نہ کر محبت سے اتنی ہی نفرت کہ سمجھے کوئی
کہ تجھ کو بھی کوئی ٹوٹ کر چاہتا ہے

ماہنامہ سرگزشت

(محمد ندیم اختر گلگت کا جواب)

شگفتہ مشتاق..... لاہور

وقت نے وہ خاک اڑائی ہے کہ دل کے دشت میں
قافے گزرے بھی ہیں مگر نقش پا کوئی نہیں

(عدنان مسین کراچی کا جواب)

ناصرہ تحریم..... کراچی

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برے

(فرخندہ قاضی لاہور کا جواب)

رانا حبیب الرحمن..... لاہور

یہ خام خیالی ہے کہ یہاں تقدیر بنائی جاتی ہے
ہم تو خود تقدیر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں
آصفہ بتول..... جھنگ

یہ مانا ضبط غم میں گریہ و زاری نہ کر پائے
چھپایا گل سحر خوشبو کی نہ داری نہ کر پائے
(ناصر حسین حیدر آباد کا جواب)

ضیا احمد..... ڈی آئی خان

غم کے دو انداز ہیں وجدان و عرفان
دونوں کی تصویر ہے شاعر کا دیوان

(فدا محمد رک لاہور کا جواب)

نیاز ملکھانی..... سکھر

جو آتش خاموش سلگتی ہے دلوں میں
اٹھ اٹھ کے اسے اور ہوا دیتی ہیں آنکھیں

(اشفاق احمد ملتان کا جواب)

نازش سحر..... ملتان

لہو کا دریا عبور کرنے کو لازمی ہے جنوں لیکن
جو صاحب ہوش بھی تھا تیرا کہ سب سے آگے نکل گیا وہ

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی
لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تکلف کر دیے
جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



ہے۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سپنس □ پائیزہ □ سرگزشت □ بجوایا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

اگرین کے مطابق جزیات نمبر 30 مارچ 2015 تک علمی آزمائش 112 کے لیے نمبر 983 گراہی 74200



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہنامہ سپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پائیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں وقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے
علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور
آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل نیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
شرعباس 0301-2454188
سرکولیشن مینجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551



مارچ 2015ء



قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی
تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی"
شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر
کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر
ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم! متحرکہ..... کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعرا لگ کاغذ پر ہے) **72**



بیت نمبر 983 گراہی 74200

209

ماہنامہ سرگزشت

علمی آزمائش 112

انارہ

ماہنامہ سرگزشت کائنات و انعامی مسئلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سپینر ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیرہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک مصلیٰ سرگزشت" کے عنوان تلے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیں کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 مارچ 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

14 فروری کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ 1938ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے وقت اسٹاف کالج کے واحد مسلمان انسٹرکٹر تھے مگر بعد میں وہ تاریخ پاکستان کے سب سے متنازع کردار قرار دیے گئے۔

علمی آزمائش 110 کا جواب

مولانا غلام رسول مہر 15 اپریل 1895ء میں پھول پور جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ گیارہ برس کے سن میں یتیم ہو گئے۔ تعلیم سے خصوصی دلچسپی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے تھا۔ اپنی عمر پر پہنچتے پہنچتے کافی نام پیدا کر لیا اور صحافت کی آبرو کے خطاب سے نوازا گیا۔

انعام یافتگان

1- عنایت علی۔ لاڑکانہ 2- دیکھ بادی۔ چنیوٹ 3- انعام الحق جاوید۔ سکھر

4- زاہدہ ادریس۔ میرپور آزاد کشمیر 5- نیاز کھوکھر۔ لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نعمان اشرف، رسول بخش پلیجو، ارباب حسین ہارون صدیقی، اسرار احمد، باسط فاروقی، علی زبیر سید، زاہد حیات، نعمت گل، عنبرین احمد، کلیم صدیقی، عنایت کبیر، یاسین خان، مختار جتوئی، کاوش ارشد، صدق فاطمہ، انعام حیات، خاقان احمد، فرحت عباس نقوی، علی نظیر، نیاز احسن، اکبر حسین، اشرف اللہ خان، عبدالحمید، سبطین سید، طفیل احمد، غلام حسن، مولا بخش بٹ، نبیل اختر، الیاس محمد، قیام الدین انصاری، توصیف احمد انصاری، عنایت مسیح، صباحت مرزا،

سمیل احمد کھتری۔ سید توفیق احمد اڈام رضوی، مسز زبیدہ خاتون، سہیلی کا دوانی، محمد فیضان، نیاز احمد، شاہد فاروقی، فتح احسان، آس محمد، محسن اختر بلوچ، احمد اعجاز، اختیار الدین صدیقی، سلیم بھٹا، شاہد، بول، امجد سعید عطاری، عاصم ملک، شکیلہ فاروقی، خالدہ اورلیس سلفی، شوکت علی، تسلیم ضیا، کوثر جہاں، آفتاب منصور ملک، غلام علی، سنجیدہ احمد، حسن خان، چکڑی، سید عزیز الدین، پروین کنول، جمیل عثمانی، نعمت مرزا، اختر عباس، اطہر حسین، تانیہ احسن، امیر الاسلام، زبیر ملک، جبینا کوثر، نوید حسن، زبیر اختر، جاوید اقبال، توقیر حسین، غلام شہر عابدی، خاقان خان، نرجس فاطمہ، وردہ بٹول، انیس احمد، چاؤلہ، محمد فتح یاب خان، چکڑی، محمد فیضان، محمد سلیم کھوکھر، ہارون محمد، سعید الدین مروت، فہیم بٹ، خواجہ خیر محمد، خیر پور سے احمد علی زیدی، نورین اصغر، قیام الدین، ارشاد انصر۔ گجرات سے ذیشان علی سید، محمد طاہر، دانش علی، ارشاد زیدی، نعمان فاروق۔ شادی پور سے احمد علی، نسیم نیازی، ہارون اشرف، نیاز بٹ۔ خانیوال سے ارشد علی، تفسیر حسین، عابد سلطان، عمران حیات خان، ڈی آئی خان سے یاد حسین، زاہد علی، اللہ بخش، سلمان اشرفی۔ ڈی جی خان سے یونس احمد، نذر علی سید، خاقان اشرف، نصیر علی نصیر۔ جھنگ سے نورین ملک، التماس عباس، کائنات فاطمہ، زاہد علی، وقار علی۔ تلہ گنگ سے فصیح الدین، مرزا انعام، کلیم الدین، اختر عباس، توصیف حسین سید۔ شجاع آباد سے غلام بخش، عباس حیدر، نبیل خان، جنید علی صدیقی۔ چنیوٹ سے فتح یاب خان، ماہا زیدی، فرمان علی، صولت حیات، اشرف علی خان، سرگودھا سے محمد یامین، الیاس صادق بٹ، انعام حسین، محمد سلیم الدین۔ حاصل پور سے فرمان الیاس، فرہین، کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ لدن سے انیس احمد، غیاث الدین۔ سیالکوٹ سے شفیق شکی۔ بھکر سے محمد عارف قریشی، زکس خان۔ میرپور خاص سے نوشین فاطمہ زیدی، علی عباس، حیات محمد، رخسانہ چانڈیو، فرحین رضا، نعمان قائم خانی، شہر حسن۔ جھکین فرحت الاسلام، محمد عاقل، ارشد سلیم، شاہد اسلام خان، غزالہ شاہین، عبدالقیوم شہزاد بھٹی، صنوبر جونجو، فرحت اللہ بھٹی، انم خورشید، فاضل جتوئی، نعمت جوکیو، محمد عطاء اللہ، یاسین، نسیم اشرف، نزہت، پروین، زینب فرید، اصفہانی، کوبک نسیم۔ سوئی بلوچستان سے محمد اکمل قر۔ فیصل آباد سے: متیق اسلم، منور سلیم، نصرت جہاں، عباس علی اصفہانی، خاقان خان، ذرا نیور، ولاور حسن، ولد ار بھٹی، کاشف شفیق خاقان، عرفان مروت، تمین اختر، زیب علی، ملک شفیق، نعمان حسن، شازیہ احسن۔ رحیم یار خان سے: ظہور الامین، پناوئی، زیب، کاشان لاشاری، فاطمہ فرحت، نصرت اسماعیل، شیر حسین شیری، اسماعیل اچانک، امتیاز احمد، نازش عمار، یاسر محمد عابد، کیف سردی، گل باز خان، زیب النساء، بدین سے: عباس علی ساند، شاہد علی۔ چکوال سے: عارف احمد، جاوید وسع احمد، صاحب جان، سنی ممتاز۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، سرفراز خان، قیام الحسن، کاظم جعفری، حیات محمد، یامین محمد، قیام الحسن، انصار الدین، احسن ممتاز، فرقان جعفری، صدف حسن، عنبرین عنایت علی، ذیشان مصطفیٰ، طفیل احمد، محمد ذیشان، رفیق مصطفیٰ، نظیر حسین، انیسہ جعفری، نیاز علی، گل فراز، کلیم ریسائی، سلمان توقیر، ارباز خان، وردہ علی سید۔ اسلام آباد سے: نیو شاہین۔ لاہور سے مسرت اسلم ملک۔ ظفر الحسنین، عباس علی سید، فیضان بٹ، عارف صدیقی، رشید علی، محمد یاسین، کائنات بٹ، نیاز چوہان، متین لاہوری، سلمان احمد بٹ، اشرف علی، تاشیر احسن، رحیم بخش، فہیم احمد۔ علی مصطفیٰ، میاں ساجد، واگھری (گجرو) محمد نوید اختر، عبدالباق (کمالیہ) خان بیلہ سے: عائشہ عبدالرشید۔ مسلم باغ (بلوچستان) سے: رحمت اللہ باغ۔ قصور سے: رائے عبد الوحید کھل (پتوکی) میرپور آزاد کشمیر سے: محمد حسین۔ ساہیوال سے ارباز خان، زویا بٹول۔ شیخوپورہ سے انیس احمد۔ پشاور سے عباسی طور، الیاس گل، فرحان خان، نوازش کاظمی، فصیح الدین، کبیر الحسن، رحیم اللہ، نجم الدین، نوشین ملک، ارشد مہدی، نیانکھو، فرقان سید، مظہر حسین بھیکو، شاہد خان آفریدی، سلمان اچکڑی، سلمان محمد، احمد شاہین، عتک، فرزانہ ملک، نسیم الحسن۔ پشاور خان گل عزیز، سرفراز گل۔ بہاولپور سے کاظم علی، شاکوثر، رحیم داد چودھری، نور الہی فضل، فیضان مصطفیٰ، عباس علی، منظر حسین، کاظم علی، انیس احمد صدیقی، ماہا نیازی، بلو نیازی، شاکوثر نیازی۔ میانوالی سے عبدالحق (کالا باغ)

بیرون ملک سے احمد خان، یاسین گل، احمد صدیقی (شارجہ)، علی خان (دہلی)، اسلم شاہد (جرمنی)، محمد اسرائیل (مسقط)، ارباز خان (ٹوکیو جاپان)، گل صنوبر (بحرین)۔

بچانے والا

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم

مارنے والے سے بچانے والا قوی ہوتا ہے۔ یہ معقولہ بچپن سے سنتی آئی ہوں۔ میری زندگی میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ رونما ہوا ہے جو خود میں منفرد ہے۔ آپ یقین کریں میری زندگی دائو پر لگ گئی تھی مگر بچانے والے نے بچا لیا۔
نازی
(سرگودھا)

جھکڑے کا ماہر تھا۔ بڑا ہوا تو بری صحبت میں پڑ گیا۔ تعلیم اس نے اسکول کے زمانے میں چھوڑ دی تھی۔ ایسے لوگوں کا آخری ٹھکانا مظفر چودھری جیسے بد معاشوں کے ڈیرے ہوا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ بچپن میں سیکنہ اس کی منگ بھی مگر اس کے کرتوت دیکھتے ہوئے سیکنہ کے گھر والوں سے پہلے خود فضل کے باپ نے یہ رشتہ ختم کر دیا۔ حالانکہ شکل و صورت کا اچھا تھا اور سیکنہ کے ساتھ اس کی جوڑی بچی مگر اب سیکنہ اپنی خالہ کے گھر جانے والی تھی۔ اس نے انٹر کر لیا تھا اسی سال اس کی شادی متوقع تھی۔

ماضی میں ایسے واقعات ہو چکے تھے کہ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں بڑا سرا ر طور پر غائب ہوئیں اور پھر پھر بڑا سرا ر طور پر واپس آئیں۔ عزت کے لیے ان کے گھر والے دم سا بھٹکا بیٹھ گئے یا پھر گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ دو بار ایسا ہوا کہ انھوں نے والی لڑکیوں کی لاشیں نکلیں۔ پولیس نے ان کی موت کو منسلق کر دیا اور ان میں سے ایک لڑکی کے بھائی نے مظفر کے ڈیرے پر جا کر اسے قتل کرنے کی کوشش کی اور خود مارا گیا۔ بعد میں اس کی لاش بھی غائب کر دی گئی۔ ان واقعات کے بعد گاؤں والے محتاط ہو گئے تھے مگر

سیکینہ نے مجھے بتایا کہ چودھری مظفر کی مجھ پر نظر ہے تو میں پریشان ہو گئی۔ چودھری مظفر ہمارے علاقے کا نامی گرامی بد معاش اور جرائم پیشہ تھا۔ چوری، ڈکیتی، مویشی چوری، شراب و نشے کی فروخت اور اسمگلنگ اس کے دھندوں میں شامل تھا۔ گاؤں کے باہر اس کا بڑا سا ڈیرہ تھا۔ جہاں وہ اور اس کے حالی موالی رہتے تھے۔ وہ سب بھی چھپے ہوئے بد معاش تھے۔ گاؤں کے لوگ چودھری مظفر اور اس کے کرگوں سے ڈرتے تھے۔ ان کے منہ کھلنے سے گریز کرتے تھے بلکہ سامنا ہونے پر راستہ بدل لیتے تھے۔ خاص طور سے عورتیں ان سے دور ہی رہتی تھیں۔ عورتوں کے حوالے سے بھی ان کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ اس حوالے سے کتنے ہی واقعات گاؤں میں پیش آچکے تھے۔ اس لیے سیکنہ کی بات سن کر میرے ہاتھ پاؤں منڈے پڑ گئے تھے۔ میں۔۔۔ پوچھا۔۔۔ ”تجھے کیسے پتا چلا؟“

”میرے چاچے کا لڑکا فضل بھی مظفر کے ڈیرے پر جا رہا ہے اس نے سنا اور پھر مجھے بتایا ہے۔“

ہم فضل کے بارے میں جانتے تھے۔ وہ اچھے ندان سے تھا مگر مختلف فطرت کا تھا۔ مزاج کا تیز اور لڑائی

وہ کتنی احتیاط کر سکتے تھے۔ گاؤں دیہات میں عورتوں کو بھی گھروں سے نکلنا پڑتا ہے اور نچلے طبقے کی تمام ہی عورتیں کھیتوں کے کام اور جانور چراگنے میں حصہ لیتی تھیں۔ اس لیے لوگ بس اتنی احتیاط کر سکتے تھے کہ اکیلی عورت یا لڑکی کو جانے نہیں دیتے تھے۔ بہت سوں نے تو معاشی مجبوری کے باوجود اپنی عورتوں اور لڑکیوں کو گھر بٹھالیا تھا۔ مگر سب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی عورتیں اور لڑکیاں مجبوری کے عالم میں باہر جاتی رہیں۔

اس گاؤں میں ہماری بھی زمین تھی اور میرے بابا گاؤں کے ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور ہمارا سارا گھرانہ پڑھا لکھا اور ملازمتوں سے منسلک ہے۔ میرے دو بڑے بھائی شہروں میں ہوتے ہیں۔ میری بڑی بہن جس کی شادی ہو گئی ہے وہ بھی ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر ہے۔ لڑکیوں کا برائٹری، بابا کے اسکول کے ساتھ ہی

ہے مگر اسے مڈل کا درجہ نہیں ملا تھا۔ بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی اسکول اس وقت بننا جب میں پہلی کلاس میں آئی اور اس کے بعد اسکول درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا رہا۔ لڑکیوں کا ہائی اسکول ہمارے گاؤں سے ذرا دور ایک قصبے میں تھا۔ بابا نے مجھے وہاں داخل کرا دیا۔ میں تانگے میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ اسکول آتی جاتی تھی۔ وہیں سے انٹر پاس کیا۔ مگر اس پاس کالج نہیں تھا اس لیے بابا کے کہنے پر میں نے ابھی سے پرائیوٹ بی اے کی تیاری شروع کر دی تھی۔

میرے ساتھ میری سہیلیوں ماہم اور سہیلہ بھی انٹر کیا تھا۔ ماہم میری طرح پرائیوٹ بی اے کر رہی تھی۔ سہیلہ کو انٹر کرنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس کا باپ زمیندار تھا اور ان کے ہاں لڑکیوں کو اسکول سے آگے پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ آگے بھی پڑھے۔ زمینداری تو ہمارے ہاں بھی تھی لیکن ہمارے ہاں لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ بہر حال اب کالج

جانا نہیں تھا اس لیے ہم ساتھ ہی رہتے۔ میں نے سیکنڈ سے کہا کہ وہ بھی کتابیں حاصل کر لے اور ہمارے ساتھ پڑھ لیا کرے اس کی تیاری ہو جائے گی اور وہ شادی کے بعد بھی پیپرز دے سکتی ہے۔ مگر سیکنڈ نہیں مانی۔ ماہم کو تعلیم کا شوق نہیں تھا وہ صرف اپنے منگیتر کے کہنے میں بی اے کر رہی تھی۔ میرا ارادہ بی اے کرنے کے بعد بی ایڈ کرنے کا تھا۔ مگر ماں جی نے کہہ دیا تھا کہ بی اے کے بعد مجھے جو پڑھنا ہے وہ اپنے شوہر کے گھر جا کر پڑھوں۔ وہ مجھے صرف بی اے ہی کرائیں گی۔

ہمارا گاؤں شکر گڑھ تحصیل میں پاک بھارت سرحد کے پاس ہے۔ مشکل سے دو کلومیٹرز کا فاصلہ ہوگا۔ جن دنوں دونوں ملکوں میں کشیدگی ہوتی ہے یہاں رہنے والوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ بھارتی بے دریغ آبادی پر فائرنگ اور گولہ باری کرتے ہیں۔ میرے بچپن میں یہاں بھی سرحد تھی۔ جس پر نہ کوئی رکاوٹ تھی اور نہ کوئی باڑھ لگی ہوتی تھی۔ اس لیے جب بھارتی فوج فائرنگ کرتی

تو ہمارا بہت نقصان ہوتا تھا۔ لوگ مارے جاتے تھے اور جانور بھی فائرنگ کی زد میں آتے تھے۔ بلکہ جانوروں کا جانی نقصان کہیں زیادہ ہوتا تھا۔ بابا بتاتے ہیں کہ ایک بار تو مسلسل فائرنگ کی وجہ سے ہم سرحد کے پاس کھیتوں سے گندم بھی نہیں کاٹ سکے تھے اور فصل خراب ہو گئی تھی۔ پھر کوئی دس بارہ سال پہلے جب دونوں طرف سے سرحدوں پر فوج جمع ہوئی تو ہماری طرف بھی مورچے بنائے گئے اور سرحد کے ساتھ پٹے تعمیر کیے گئے۔ ان سے یہ ہوا کہ ہم براہ راست فائرنگ سے محفوظ ہو گئے تھے۔ مگر گولہ باری سے اب بھی محفوظ نہیں تھے۔ ایک بار چند گولے ہمارے گاؤں پر بھی گرے تھے۔ اللہ نے کرم کیا کہ جانی نقصان نہیں ہوا مگر چند گھر گرے تھے۔

میرے دادا گورداسپور سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے اور وہاں اپنی زمینوں کے بدلے انہیں یہاں بارہ ایکڑ زمین مل گئی تھی۔ مشرقی پنجاب میں وہ اچھے خاصے زمیندار تھے مگر یہاں انہوں نے اپنی اولاد کو زمینداری پر لگانے کی بجائے تعلیم دلا کر نوکریوں پر لگایا۔ میرے تایا اور بچا فوج میں گئے۔ ان کے بچے بھی فوج میں تھے۔ بابا نے تعلیم کا شعبہ پسند کیا۔ انہوں نے بی ایڈ کیا اور استاد بن گئے پھر نوکری کے دوران میں انہوں نے ایم ایڈ بھی کیا اور اب وہ اسکول پرنسپل تھے۔ روایتی سرکاری اسکولوں کی نسبت بابا نے اپنے اسکول کا ماحول اور تعلیمی معیار بہت اچھا رکھا تھا۔ اسکول کے بچے ہمیشہ سالانہ امتحانات میں کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بابا کا اسکول آگے رہتا تھا۔ یہاں کے لڑکے تقریری اور دوسرے مقابلوں میں بھی اعزازات جیت کر آتے تھے۔ کئی سال تک بابا کے اسکول نے تحصیل کے بہترین اسکول کا ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ یہ سب بابا کی محنت کا نتیجہ تھا۔

ہمارے گاؤں کی زمین زرخیز ہے۔ یہاں بہترین فصل حاصل ہوتی ہے۔ پانی بھی اچھا ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تب یہاں بجلی آئی، پھر فون اور ٹیکس کی سہولت بھی آ گئی۔ آخر میں یہاں موبائل فون کی سہولت آئی۔ سڑکیں بنیں اور نزدیکی نہر پر پل بنے تو آنے جانے کے کئی راستے بن گئے۔ اس سے یہاں کے لوگوں کے لیے بہت آسانی ہو گئی تھی۔ نئی نسل کو اتنا محسوس نہیں ہوا لیکن بابا بتاتے ہیں کہ ان کے زمانے میں بہت مشکل تھی۔ ہمیں کھانا بنانے کے لیے لکڑیاں خریدنا پڑتی تھیں اور کچا باورچی خانہ ہوتا تھا

کیونکہ جدید باورچی خانے میں لکڑی کہاں جلاتے۔ اسی طرح لائٹیں کی روشنی ہوتی تھی۔ ٹی وی نہیں تھا۔ اخبار بھی ایک دن بعد آتا تھا۔ اب تو ٹی وی کھولو اور چینل لگاؤ تو پورے ملک کی خبریں ایک منٹ میں مل جاتی ہیں۔ انٹرنیٹ کی سہولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دنیا جہان کی معلومات گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔

میرے بڑے بھائی عبدالرحمن اور عبدالرحمن شہروں میں ہوتے تھے۔ عبدالرحمن بھائی ایک سیلر کمپنی میں اچھے عہدے پر تھے جب کہ عبید بھائی اپنا بزنس کرتے تھے۔ میرے تایا اور چچا کے گھرانے پہلے ہی لاہور اور اسلام آباد منتقل ہو گئے تھے۔ اب گاؤں کی حویلی میں صرف بابا کا یعنی ہمارا خاندان تھا۔ وہ بھی کل چار افراد پر مشتمل تھا۔ میں یعنی نازیہ، مجھ سے چھوٹا سیف الرحمن، بابا اور ماں جی۔ مجھ سے بڑی بہن رضیہ کی شادی میرے تایا کے لڑکے شہریار بھائی سے ہوئی تھی۔ میری نسبت چچا کے بیٹے وحید اللہ سے ملے ہوئی تھی۔ وحید ان دنوں کاکول اکیڈمی میں تربیت مکمل کر رہا تھا اور آنے والے بہار میں اس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی۔ بابا اور چچا کا ارادہ تھا کہ بی اے مکمل ہوتے ہی ہماری شادی کر دی جائے۔ یہ ارشاد میرج ہوتی لیکن نسبت ملے ہونے کے بعد وحید خود بہ خود میرے دل میں گھر کرنا چلا گیا۔ اب اس کا نام بھی سنتی تھی تو دل کی دھڑکن خود بہ خود تیز ہو جاتی تھی۔

عید کے موقع پر عام طور سے پورا خاندان حویلی میں جمع ہوتا تھا اور اس وقت اگر وحید آیا ہوتا تو میں مشکل میں پڑ جاتی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمروں تک محدود رہنا پڑتا تھا۔ صحن اور حویلی کے دوسرے حصوں میں بھی اس وقت جاتی جب مجھے پتا چل جاتا کہ وحید گھر میں نہیں ہے۔ مجھے بہت شرم آتی تھی۔ دو تین بار وحید سے اتفاقاً سامنا ہوا تو میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ سب میری حالت دیکھ کر ہنستے تھے اور میرا مذاق اڑاتے، مجھے پرانی روح قرار دیتے۔ خود رضیہ باجی کہتیں کہ اب لڑکیاں کہاں شرماتی اور مٹھیتروں سے چھٹی پھرتیں ہیں اب تو وہ ان سے گپ شپ کرتی ہیں اور موبائل پر بات کرتی ہیں۔ وحید نے دو تین بار مجھ سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر مجھ سے بات ہی نہیں ہوئی۔ میں نے رضیہ باجی سے کہا کہ وہ ابھی مجھ سے بات نہ کرے۔

چاچا کی بیٹی بڑی عید پر ہمارے ہاں آئی تھی اور ہمیں قربانی کی تھی۔ وحید بھی آئے ہوا تھا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ

اس نے نہ صرف چھپ کر مجھے دیکھا بلکہ میری تصویریں بھی لی تھیں۔ مجھے بعد میں پتا چلا تو بہت شرم آئی۔ مگر ساتھ ہی اچھا بھی لگا۔ وحید نے بعد میں میرا موبائل نمبر کسی سے لے کر مجھے ایس ایم ایس کیا۔ ”قسم سے دل چاہ رہا ہے بس پاس آؤٹ ہوتے ہی تجھے لے جاؤں۔ تازہ خدا کی قسم تو بہت خوب صورت ہے۔“

یہ ایس ایم ایس پڑھتے ہی میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے کیونکہ میرا موبائل بھی بابا بھی استعمال کر لیتے تھے۔ اگر وہ پڑھ لیتے تو نہ جانے دل میں کیا سوچتے۔ میں نے وحید کو منع کیا کہ اب وہ ایسے ایس ایم ایس نہ کیا کرے۔ مگر وہ باز نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی اس کے ایس ایم ایس آتے تھے۔ ہمارے ہاں ماحول ایسا نہیں تھا اور نہ ہی میری سہیلیوں میں ایسی کوئی تھی جو میری صورت سفل پر بات کرتی۔ ہمارے ذہن میں ایسی باتیں آتی ہی نہیں تھیں۔ حالانکہ ہم تینوں ہی صورت شکل کے اچھے تھے۔ مگر جب وحید نے کہا کہ میں بہت خوب صورت ہوں تب میں نے پہلی بار خود پر توجہ دی۔ نین نقش اچھے تھے۔ میرے براؤن بال بہت لمبے اور گھنے تھے۔ میرا قد پانچ فٹ چار انچ سے ذرا زیادہ تھا۔ میں نہ تو طویل قامت لگتی تھی اور نہ پست قامت۔ جسم متناسب تھا۔ اگرچہ وزن کی قدر زیادہ تھا مگر گاؤں دیہات میں یہ عام سی بات سمجھی جاتی ہے۔ پہنا اور ہا بھی چمکا تھا۔

وحید شکل و صورت میں بابا پر گیا تھا۔ ان کی طرح سرخ و سفید اور کھڑے نقوش والا۔ مگر میں نے کبھی اس کی شکل و صورت کے بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے تو اس سے محبت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی انتظار تھا کہ وہ کب آئے اور مجھے ہمیشہ کے لیے لے جائے۔ مگر مجھے تو یہ بات سوچ کر حیا آتی تھی وحید سے کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے اپنی محبت کا اظہار میں چیزوں سے کرتی تھی۔ عیدوں پر اس کے لیے خود کرتے گاڑا کر بھیجتی تھی۔ اس کے لیے رومال بناتی تھی۔ سردیوں میں سرکے میوے رکھتی تھی۔ وہ جب حویلی آتا اس کے لیے تینوں وقت کا کھانا بھی ہی بناتی تھی۔ وحید یہ سب جانتا تھا اس لیے اس نے کبھی اصرار نہیں کیا کہ میں عام لڑکیوں کی طرح اس سے بات کروں یا بے تکلف ہوں۔ بس وہ بھی کبھی ایس ایم ایس کر دیا کرتا تھا اور میری جان پر بن جاتی تھی۔ برقع یا عبا یا

نہیں پہنتی تھی مگر چادر سے خود کو پوری طرح ڈھک کر جاتی تھی۔ شروع میں چہرہ کھلا ہوتا تھا۔ مگر ذرا بڑی ہوئی تو چہرہ بھی چھپانے لگی تھی۔ صرف اسکول ہی نہیں بلکہ گاؤں میں بھی کہیں جاتی تو پردہ کر کے جاتی تھی۔ گاؤں کے سارے ذی حیثیت لوگ آس پاس تھے اور ان ہی سے ہمارے تعلقات تھے۔ یعنی مردوں کی مردوں سے اور عورتوں کی عورتوں سے۔ میری دوستی سکینہ اور ماہم سے زیادہ تھی۔ دو تین لڑکیاں اور بھی تھیں مگر ہم تین کا گروپ ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھا۔ ماہم کا خاندان بھی زمیندار تھا اور ان کی گاؤں کے آس پاس اچھی خاصی زمینیں تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے کارخانے بھی تھے اور گاؤں میں ان کا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔

حویلیوں کے درمیان ایک مشترکہ سی زمین تھی اور اس پر باغ بنا کر اسے عورتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا یعنی حویلیوں کی عورتیں یہاں تفریح اور ہوا خوری کے لیے آتی تھیں۔ کناروں پر چارنٹ اونچی چار دیواری تھی اور اس میں آمد و رفت کے کئی راستے تھے۔ گھاس کے تنخے تھے۔ پھولدار بودوں کی کیاریاں تھیں۔ لکڑی اور ماربل سے بنی نشستیں تھیں۔ درختوں پر چنگیس بندھی تھیں اور ہم لڑکیاں ان پر چنگیس لیتے تھے۔ عام طور سے شام کے آس پاس ہم یہاں آتے تھے۔ گپ شپ ہوتی اور پھر مغرب سے پہلے سب یہاں سے چلے جاتے تھے۔ حویلیوں کے محافظ نظر رکھتے تھے کہ کوئی باہر کا فرد اس طرف نہ آئے۔ اگر کوئی آنے لگتا تو وہ اسے پہلے ہی روک دیتے تھے۔ اس لیے ہم لڑکیاں یہاں کھل کر تفریح کرتے تھے اور آپس میں ہنستے بولتے تھے۔ ہمیں خوف نہیں تھا کہ کوئی وہاں آجائے گا۔ اتفاق سے اس روز میں اور سکینہ تھے اور سکینہ نے مجھے موقع پا کر خبردار کیا۔ میں مظفر چودھری کا نام سن کر سہم گئی تھی۔ وہ تھا بھی ایسا فرد جس سے انسان کو خوف آئے۔

اس وقت وہ تقریباً چالیس سال کا نومند اور صورت سے ہی خطرناک نظر آنے والا شخص تھا۔ وہ گورا چمکا تھا مگر اس کی آنکھوں کی سرخی اور مکروہ سے نقوش اسے ہیبت ناک بناتے تھے۔ میں نے اسے دو تین بار ہی دیکھا تھا اور ہر بار مجھے اس کی صورت سے خوف اور کراہیت آتی تھی۔ کھلے کمرے اور شلوار میں اس کا ڈیل ڈول اور زیادہ لگتا تھا ہمیشہ اس کے ہاتھ میں بڑی سی گن ہوتی تھی۔ وہ مکھی جیپ میں گاؤں اور علاقے کی سڑکوں پر دندناتا پھرتا تھا۔ اس کے

مسلم گارڈ گاؤں والوں کے لیے انوکھی چیز تھی۔ پہلے صرف بڑے جاگیردار مسلح گارڈز رکھتے تھے اور ان کا مقصد بھی حفاظت سے زیادہ اپنی شان و شوکت اور قوت کا مظاہرہ کرنا ہوتا تھا۔ مگر اب تو ہر صاحب حیثیت مسلح گارڈ رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا اور یہ سب تبدیلیاں میرے دیکھتے دیکھتے آئی تھیں اور میں ان کے ساتھ ہی بڑی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ سب مجھے نامانوس نہیں لگتا تھا پھر جب بابا اور ماں جی سے سنتی تو مجھے لگتا کہ واقعی تبدیلی آگئی ہے۔ مگر اس روز سیکنڈ سے یہ خوفناک بات سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی اور تب مجھے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ واقعی تبدیلی آچکے ہیں۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ کوئی میرے بارے میں بھی سوچ سکتا ہے۔ سوچنا تو دور کی بات ہے کسی نے نظراٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

مظفر چودھری ہمارے علاقے کا ہوا تھا اور کوئی بھی اسے غیر سنجیدہ نہیں لیتا تھا۔ آغاز میں معمولی بد معاش نظر آنے والا مظفر چودھری اب اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ علاقے کے جدی پشتی جاگیردار بھی اس سے ڈرنے لگے تھے۔ وہ اس کے منہ کھلنے سے گریز کرتے اور اس کی سرگرمیوں سے نظریں چراتے تھے۔ شروع میں علاقے کے بااثر لوگوں نے پولیس اور انتظامیہ کی مدد سے اسے لگام ڈالنے کی کوشش کی مگر جلد ایک پڑوسی گاؤں کے جاگیردار کے گھر ایسا ڈاکا پڑا کہ ڈاکو مال کے ساتھ عزت بھی لے گئے تھے۔ تب سے ان طاقتور لوگوں نے بھی مظفر چودھری کا راستہ چھوڑ دیا۔ اب وہ جنگل کے کسی درندے کی طرح آزاد تھا جو چاہتا کرتا کوئی اسے روکنے والا نہیں تھا۔ پولیس والوں سے اس کے تعلقات تھے اور اس کی طرف سے انہیں باقاعدگی سے بھاری رقم ملتی تھی اس لیے اب پولیس بھی اس کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔

ایسے شخص کے بارے میں جب کسی لڑکی کو پتا چلے کہ وہ اس پر بری نظر رکھتا ہے تو اس کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ وہی حال میرا ہوا تھا۔ پھر مجھ سے باغ میں نہ ٹھہرا گیا۔ نئی بات ہے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں سیکنڈ سے معذرت کر کے گھر آئی تو خال کے ابتدائی موسم میں بھی مجھے سردی لگ رہی تھی۔ ماں جی نے مجھے دیکھا تو فکر مند ہو گئیں۔ "نازی کیا ہوا ہے تیری رنگت بلی جھک ہو رہی ہے۔"

"کچھ نہیں ماں جی۔" میں نے کہا تو ماں جی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ جھک گئیں۔

ساتھ اس کے چار پانچ کرگے بھی ہوتے تھے۔ پندرہ سال پہلے کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اس علاقے کے نامی گرامی بد معاش اور اسمگلر صوفی شاہ کا آدمی تھا۔ مگر صوفی شاہ صرف اسمگلر تھا اور وہ عام لوگوں سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی عام افراد کو اس سے کوئی پریشانی ہوتی تھی۔ بلکہ سننے میں آیا ہے کہ وہ غریب غربا کی مدد بھی کرتا تھا۔ ایک بار سرحد پار مال لے جاتے ہوئے وہ فارنگ کا نشانہ بن گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے پاکستان اور انڈیا کے سرحدی محافظوں نے مارا تھا اور بعض اس کا الزام اس کے دشمنوں پر لگاتے ہیں مگر آج تک پتا نہیں چل سکا کہ اس کا قاتل اصل میں کون تھا۔

مظفر چودھری صوفی شاہ کا معمولی درجے کا کارندہ تھا مگر اس کی موت کے بعد اس نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ وہ چند سالوں میں گروہ کا سرغنہ بن گیا۔ شروع میں اس نے اسمگلنگ کی مگر اس کے بعد دوسرے جرائم بھی شروع کر دیے اور اس کی وجہ سے عام لوگوں کی زندگی متاثر ہونے لگی۔ اس نے نئی نسل کو شراب، منشیات اور دوسرے غلط کاموں پر لگا دیا۔ کتنے ہی گھر اس کی وجہ سے برباد ہو گئے۔ جب نشہ کی برائی آئی تو لوگوں میں شرم و حیا اٹھ گئی اور وہ اپنی عزتوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ گاؤں میں تو بیٹیاں اور عزت سانبھی سمجھی جاتی مگر دوسری بہت ساری قدروں کی طرح اب یہ بھی گاؤں سے غائب ہو چکی ہے۔ اب سب اپنی اپنی عزتوں کے خود ڈتے دار ہیں۔

ہماری حویلی کے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں ہوتا تھا بس ایک ملازم راحت بابا تھا وہی گیٹ بھی کھولتا اور بند کرتا تھا مگر جب آس پاس ڈکیتیاں پڑیں تو بابا نے ایک مسلح محافظ رکھ لیا۔ یہ راحت بابا کا جینا صاحب تھا اور ریٹائرڈ فوجی تھا۔ ہم اس خاندان کو نصف صدی سے جانتے تھے۔ اس کے پاس لائسنس بھی تھا۔ پستول اور شاٹ گن بابا نے اسے دلوادی۔ اب وہ ہمہ وقت گیٹ پر رہتا تھا۔ رات میں گیٹ کے ساتھ ہی چوکی میں سوتا تھا۔ شروع میں ہماری حویلی کی دیوار مشکل سے سات فٹ اونچی تھی۔ جب حالات بدلے تو بابا نے اس کی اونچائی دس فٹ کرا دی اور اس پر دو فٹ کی خاردار تار لگوا دی جس میں بہ وقت ضرورت کرنٹ بھی دوڑ سکتا تھا۔ خود بابا بھی پستول اور ریوالور رکھتے تھے۔ شام ہوتے ہی مین گیٹ بند ہو جاتا تھا اور اس کے بعد صباحت کسی کے لیے بھی پورے اطمینان کے بعد ہی چھوٹا دروازہ کھولتا تھا۔

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلپھری

قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

کے لیے اور پاکستان کا معتبر ترین مرکز

اجل زیدی

ملتی ایوارڈ بولڈر



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

9- اپریل 30 تک
9- اگست 30 تک
9- دسمبر 30 تک
کان نمبر 62 سرحد پر 20 تک 8-1
سرحد کا قصبہ چوک اسلام آباد
فون: 2854595 - 2255880 (051)
سویل: 0300-8566188
تھیں: 2261636



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

گل ف سینٹر
16 نمبر
فیروز آباد روڈ احسن چوک
نور محمد (آئیڈی 9)
سویل: 0300-8566188
14- فروری 27 فروری
14- جون 27 جون
14- اکتوبر 27 اکتوبر

پشاور

ہیٹل لائیو
کیم فروری 11 فروری
کیم جون 11 جون
کیم اکتوبر 11 اکتوبر
نی روڈ نزد بھٹری چوک چارٹرڈ
فون: 2218215-8 (0521)
سویل: 0300-8566188

ملتان

ہیٹل سائبر سیٹھ
28 مارچ 6- اپریل
28 جولائی 6- اگست
28 نومبر 7- دسمبر
سویل: 4518061-62 (061)
4582803 (0300-8566188)

کراچی

لیو چوک سٹور
13 مارچ 27 مارچ
13 جولائی 27 جولائی
13 نومبر 27 نومبر
فون: 706، 707، 708
نری سٹاپ چوک KFC
فون: 021-7012068-9
سویل: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

http://www.pdfbooksfree.pk

”کیسے نہیں ہو رہا، تیرا ماتھا گرم ہے۔ بخار ہو گیا ہے چل اندر میں تیرے لیے الائچی والی چائے بنا کر لائی ہوں۔“

مجھے سچ بخار ہو گیا تھا۔ جب مظفر چودھری کا خیال آتا میرا جسم لرز اٹھتا تھا۔ پھر میں خود کو تسلی دیتی تھی کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ کوئی میری طرف غلط نظر سے دیکھے۔ میرے بابا ہیں میرے بھائی ہیں۔ میرا منگیتر ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے کس کی جرات ہے میری طرف ہاتھ بڑھا سکے۔ اس کے باوجود میری بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ رات تک مجھے تیز بخار ہو گیا تھا۔ بابا نے پریشان ہو کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا مگر میں نے منع کر دیا میں رات کے اس پہر باہر جانے کے خیال سے خوفزدہ تھی۔ اسپتال شکر گڑھ کے قصبے میں تھا اور وہ یہاں سے کوئی دس کلومیٹر دور تھا۔ کچی سڑک کی وجہ سے آدھے گھنٹے کا راستہ تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں حویلی میں محفوظ تھی یہاں سے نکلی تو کوئی مجھے اچک کر لے جائے گا۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔

”میں باہر نہیں جاؤں گی۔“
 ”بیٹا ایک گھنٹے میں آجائیں گے۔“ بابا نے کہا۔
 ”آپ نے دوا دے دی ہے میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

پہلے ماں جی نے پٹیاں رکھ کر میرا بخار کم کیا تھا پھر بابا نے دوا دی تھی۔ میں باہر جانے سے اتنا ڈری کہ کچھ دیر میں سچ مجھ پر بخار اترنے لگا اور ایک گھنٹے بعد میں پسینے میں نہا چکی تھی اور بخار مکمل طور پر اٹھ گیا تھا۔ ماں جی نے مجھے گھوڑوں پر دودھ دیا اور میں سو گئی۔ صبح اٹھی تو کھانسی ہو رہی تھی اور میں نے پہلی بار اللہ کا شکر ادا کیا کہ میری اسکول کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی ورنہ مجھے باہر جانے کے خیال سے پھر بخار چڑھ جاتا۔ اب خوف بھی پہلے جیسا نہیں تھا بس مجھے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ یہ بات ماں جی کو بتاؤں یا نہیں۔ مجھے شرم آ رہی تھی اور اس سے زیادہ یہ خیال تھا کہ ماں جی پریشان ہو جائیں گی۔ وہ لازماً بابا کو بتائیں گی اور وہ بھی فکر مند ہو جائیں گے۔ بس اسی خیال سے میں نے زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے اب میرا خیال زیادہ بہتر ہو گیا تھا کہ مظفر چودھری کتنا بڑا بد معاش سچ لیکن ہم بھی کوئی گمراہ نہیں تھے جو وہ اپنی مرضی کر جاتا۔ میرے گرد

مضبوط دیواروں اور ان سے زیادہ مضبوط بازوؤں کا گھیرا تھا۔

اب میں باہر جانے میں احتیاط کرنے لگی تھی۔ ہماری حویلی میں کئی ملازمین تھے۔ ان میں ایک سفینہ بی بی بھی تھی۔ وہ تقریباً چالیس برس کی تنومند اور دلیر عورت تھی۔ مردوں کی طرح لائٹھی لے کر چلتی تھی اور اس کا استعمال بھی جانتی تھی۔ جب میں چھوٹی تھی اور گاؤں کے اسکول میں پڑھتی تھی تو اسی کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ ایک بار سفینہ بی بی نے ایک پاگل کتے کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ وہ اچانک جھاڑیوں سے نکل کر ہم پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ ہم میں سے کسی کو کاٹ لے مگر سفینہ نے نہایت حوصلے سے اسے لائٹھی کی مدد سے ہم دونوں سے دور رکھا۔ اتنے میں میری چھین سن کر آس پاس کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ آگئے اور انہوں نے کتے کو مار مار کر بھاگ دیا۔ اگر اس روز سفینہ بی بی نہ ہوتی تو شاید کتا مجھے کاٹ ہی لیتا۔ مجھے اس پر اعتماد تھا۔ بڑے ہونے کے بعد میں نے سفینہ بی بی کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا مگر اب اسے ساتھ لے جانے لگی تھی۔ اسے ذرا تعجب ہوا تھا۔

”کیا ہوا نازی بی بی اب تک تو آپ اکیلے ہی چلی جاتی تھیں۔ پھر اب مجھے کیوں لے جا رہی ہیں؟“
 ”بس مجھے ڈر لگتا ہے آج کل حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں اس لیے تمہیں ساتھ لے جاتی ہوں۔ تم بہت بہادر ہونا اس لیے۔“
 ”جیسی آپ کی مرضی بی بی۔“ وہ بولی۔

سفینہ بی بی کا اس دنیا میں سوائے ایک بیٹے کے اور کوئی نہیں تھا۔ ریحان سترہ اٹھارہ سال کا جوان لڑکا تھا مگر سفینہ بی بی کے برعکس اس میں ہمت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ نہایت بزدل اور ہر کسی سے دب جانے والا لڑکا تھا۔ بابا نے کوشش کر کے اسے اسکول میں چڑا اسی لگوایا تھا۔ مگر اس کی ملازمت کئی نہیں تھی۔ یہ کنٹریکٹ جاب تھی اور بابا نے کہا تھا کہ ریحان کے پکا ہونے کا امکان زیادہ نہیں تھا۔ اس پر بھی سفینہ بی بی بہت خوش تھی کیونکہ اس ملازمت سے پہلے ریحان کچھ نہیں کرتا تھا۔ اس نے بہ مشکل میٹرک تک پڑھا تھا اور اس کے بعد سے آوارہ گھوم رہا تھا۔

سفینہ بی بی اس کے لیے بہت فکر مند رہتی تھی۔ اس نے بابا سے منت سماجت کر کے اسے نوکری پر رکھوایا تھا۔ ورنہ بابا کسی کی سفارش نہ سننے والے آدمی نہیں تھے وہ تو

خلاف میرٹ کسی بچے کو پاس کرنا دور کی بات تھی اس کے نمبر تک نہیں بڑھاتے تھے۔ وہ اسکول کے ہر بچے پر نظر رکھتے تھے اور اگر انہیں شبہ ہو جاتا کہ کسی بچے نے کسی بچے کو پاس کی استعداد سے زیادہ نمبرز دیئے ہیں تو وہ خود اس کے پرچے نکلوا کر چیک کر لیتے تھے اور اگر بچے نے زیادہ نمبرز دیئے ہوتے تو اس کی شامت آ جاتی۔ ریحان کے بارے میں بابا کا کہنا تھا کہ وہ ان کے اسکول کے غبی ترین طلباء میں سے ایک تھا اور اس نے میٹرک کا امتحان نہ جانے کیسے پاس کر لیا تھا ورنہ وہ اس قابل نہیں تھا۔ بہر حال ملازمت میں اپنا کام ٹھیک سے کر رہا تھا اسی لیے ملازمت پر برقرار تھا ورنہ بابا نے سفینہ کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر اس نے ٹھیک سے کام نہیں کیا تو ٹھکے سے پہلے وہ خود اسے ملازمت سے نکال دیں گے۔ سفینہ بی بی نے یقین دلایا تھا کہ ریحان دل لگا کر کام کرے گا۔

میں نے بتایا کہ میں آس پاس کی حویلیوں میں اپنی سہیلیوں کے پاس جاتی تھی یا پھر مشترکہ باغ میں چلی جاتی تھی۔ میں نے اب جانا کم کر دیا اور جاتی بھی تو سفینہ بی بی کے ساتھ جاتی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی باغ میں رکتی تھی اور میں اسی کے ساتھ واپس آتی تھی۔ سفینہ بی بی کی وجہ سے نکلنا کم ہو گیا کہ اسے حویلی میں کام ہوتے تھے۔ وہ نہ تو ہر وقت میرے ساتھ نکل سکتی تھی اور نہ ہی میرے ساتھ زیادہ دیر تک سکتی تھی سیکینہ اور ماہم کے ہاں جانا ہوتا تو سفینہ بی بی مجھے چھوڑتی اور پھر مقررہ وقت پر واپس لینے آتی تھی۔ سیکینہ اور ماہم حیران تھے کہ میں نے اچانک آنا جانا کم کیوں کر دیا تھا۔ میں نے بہانہ کیا کہ میں بی بی اے کے پیپرز کی تیاری کر رہی ہوں اور کیونکہ خود سے پڑھ رہی ہوں اس لیے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔

بابا نے میرا رجسٹریشن بکاپ یونیورسٹی میں کرادیا تھا اور مجھے تمام ضروری کتابیں منگوا دی تھیں۔ میں نے سال اول کے پیپرز کی تیاری شروع کر دی تھی۔ میں کئی گھنٹے پڑھنے میں مصروف رہتی تھی اس کے باوجود میرے پاس کئی گھنٹے رہتے تھے۔ مگر میں باہر کم ہی جاتی تھی۔ حویلی میں تفریح کی تمام سہولیات تھیں۔ ٹی وی اور کمپیوٹر تھا مگر میں کو پسند نہیں تھا کہ میں ایک حد سے زیادہ ٹی وی یا کمپیوٹر کے سامنے بیٹھوں اس لیے میں انہیں کم استعمال کرتی تھی۔ کمپیوٹر تو صرف انٹرنیٹ کے لیے استعمال کرتی تھی۔ ٹی وی بھی زیادہ تر حالات حاضرہ کے لیے دیکھتی تھی یا پھر کھانے بنانے والے پروگرام دیکھتی تھی، باقی مجھے ڈراموں اور شو بزز سے

کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میرا اصل شوق مطالعہ تھا۔ جب میں فارغ ہوتی تو میرے ہاتھ میں کوئی کتاب اور رسالہ ہوتا تھا۔ عام گھرانوں کے برعکس جہاں بچوں کو ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ استعمال کرنے کی پوری آزادی ہوتی ہے اور ماں باپ آنکھیں بند کر لیتے ہیں مگر جہاں بچوں کے ہاتھ میں کوئی کتاب یا رسالہ نظر آتا ماں باپ کو بچوں کی تربیت میں خرابی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ مگر بابا نے ہم بہن بھائیوں کی حوصلہ افزائی کی کہ ہم پڑھیں اور سب پڑھیں۔ اس لیے ہم سب بہن بھائیوں کو مطالعے کا شوق ہے۔ کچھ پڑھے بغیر ہمیں نیند ہی نہیں آتی ہے۔

ایک صیبنے بعد موسم بدل گیا تھا۔ سردی آگئی تھی۔ ایک دن ماں جی نے کہا۔ ”چل سردیوں کے کپڑے لے آتے ہیں۔“ میں خود بھی ضرورت محسوس کر رہی تھی کیونکہ پچھلے ایک سال میں میرا قد اور وزن کسی قدر بڑھا تھا اور مجھے پچھلے سال کے کپڑے چھوٹے اور تنگ ہو گئے تھے اس لیے میں نئے کپڑے بنانا چاہتی تھی۔ میں تیار ہو گئی۔ ماں جی نے بابا سے کہہ دیا کہ اگلے روز ہم شاپنگ کے لیے جائیں گے۔ کپڑوں کی خریداری ہم سیالکوٹ سے کرتے تھے۔ وہاں ہر طرح کے کپڑے مل جاتے تھے۔ شکر گڑھ کی مارکیٹ اتنی بڑی نہیں تھی۔ اس لیے ہم سیالکوٹ جاتے تھے۔ بابا نے کہا کہ ہم صباحت کے ساتھ جائیں۔ جب بابا ساتھ نہیں ہوتے تھے تو صباحت کے ساتھ ہی بھیجتے تھے وہ ڈرائیو بھی کرتا تھا۔ ہم اگلے دن اسی کے ساتھ نکلے۔ ہمارے گاؤں سے سیالکوٹ کوئی پچاس کلومیٹر دور اور راستہ مشکل سے ایک یا سوا گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے پہلے ہائی وے بہت خراب تھی مگر اب بہترین بن گئی ہے۔ وقت کا تباہی نہیں چلتا ہے اور راستہ کٹ جاتا ہے کیونکہ دوپہر تک واپس آنا تھا اس لیے ہم نو بجے نکلے۔ مارکیٹ بھی اس وقت تک کھل جاتی تھی۔ دو سے تین گھنٹے میں خریداری مکمل کر کے ہم دو بجے تک واپس آ جاتے۔

جب میں نے میٹرک کیا تو بابا نے مجھے موبائل فون رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ پچھلے دنوں سبید بھائی آئے تو میرے لیے پاس ہونے کا گفٹ اسمارٹ فون کی شکل میں لائے تھے۔ سیکنڈ ہانڈ میں، میں نے بابا سے اسمارٹ فون مانگنے کا کہا مگر ماں جی نے منع کر دیا تو دل مسوس کر رہ گئی۔ اب غیر متوقع طور پر بھائی نے گفٹ کر دیا تو میں خوش ہو گئی تھی۔ سفر کے دوران میں اسی میں لگی رہی اسی لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ ایک جیب ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔

صباحت کے چوکس ذہن نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ گھاؤں سے نکلنے ہی یہ سیاہ جیب ہماری کار کے پیچھے لگ گئی تھی۔ اس نے راستے میں کئی بار رفتار بڑھا کر اور کم کر کے چیک کیا تو جیب کی رفتار بھی کم اور زیادہ ہوئی تھی۔ سیالکوٹ پہنچ کر اس نے ہمیں مارکیٹ میں چھوڑا اور کار کا آئل چیک کرانے کا کہہ کر چلا گیا۔ البتہ اس نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ ”بی بی جی جب تک میں نہ آؤں مارکیٹ سے باہر مت آئیے گا۔ جب میں کال کروں تب آئیے گا۔“

ماں جی حیران ہوئیں۔ ”مگر کیوں پتر؟“ اس وقت صباحت نے ہمیں اصل وجہ نہیں بتائی اور بہانہ کیا۔ ”ماں جی آج کل یہاں وارداتیں بہت ہو رہی ہیں۔ اکیلی عورتوں کو دیکھ کر ڈاکو آجاتے ہیں۔ اندر مارکیٹ میں خطرہ نہیں ہے۔“

ہم مارکیٹ میں آئے اور خریداری میں لگ گئے۔ اس میں تین گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ اس دوران میں صباحت نے اس جیب کو اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کی مگر وہ مارکیٹ کے باہر رہی۔ تب اس نے یہ کیا کہ مارکیٹ کے دوسری طرف آیا اور اس نے ماں جی کو کال کر کے اس طرف سے باہر آنے کو کہا۔ یہ کپڑا مارکیٹ کا بیرونی حصہ تھا مگر مارکیٹ کے اندر ہی واقع تھا۔ ماں جی اور میں حیران ہوئے تھے کہ اس نے ہمیں وہاں کیوں بلایا ہے؟ ہم باہر آئے تو وہ غلجٹ میں تھا۔ اس نے جلدی سے سامان رکھا اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ جیسے ہی ہم بیٹھے اس نے کار چلا دی تھی۔ مارکیٹ سے باہر آنے پر ماں جی نے پوچھا۔ ”پتر کیا بات ہے تو نے وہاں کیوں بلایا میں؟“

تب صباحت نے اصل بات بتائی۔ ”ماں جی گاؤں سے نکلنے ہی ایک سیاہ جیب ہمارے پیچھے لگ گئی تھی اور وہ مارکیٹ تک ساتھ رہی۔ میں یہی چیک کر کے لے گیا تھا کہ وہ صرف پیچھے آتے ہیں یا نہیں مگر وہ مارکیٹ کے باہر ہی رہے۔“ صباحت نے بتایا۔ ”اس لیے میں پیچھے کی طرف آیا اور آپ دونوں کو بھی وہیں بلایا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ صاحب سے کال کر کے مشورہ کر لوں۔“

ماں جی نے اپنے موبائل سے بابا کو کال کی اور انہیں صورت حال بتا کر موبائل صباحت کو تھما دیا۔ وہ بابا سے بات کرنے لگا۔ میں نے محسوس نہیں ہونے دیا مگر سیاہ جیب کا سن کر میں اندر سے سہم گئی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کا تعلق مظفر چودھری سے ہو گا۔ میں ماں جی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس

لیے دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ ہم خیر خیریت سے واپس جو ملی پہنچ جائیں۔ صباحت کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ بابا بھی یہ سن کر فکر مند ہو گئے تھے۔ انہوں نے صباحت سے کہا کہ وہ واپسی میں دوسرا راستہ اختیار کرے۔ اس نے سیالکوٹ سے پرسور جانے والی سڑک پکڑی اور بڑا ٹکا سے اسے شکر گڑھ کی طرف موڑ دیا۔ مظفر وال سے ہوتے ہوئے ہم شکر گڑھ کی طرف آئے۔ شکر ہے اس راستے میں ہمیں سیاہ جیب نہیں ملی۔

مگر جیسے ہی ہم شکر گڑھ سے آگے نکلے سیاہ جیب پھر ہمارے پیچھے آنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سیالکوٹ کی مارکیٹ میں ہمارا سراغ کھونے کے بعد انہوں نے اس جگہ انتظار کرنے کا سوچا تھا کیونکہ گاؤں کی طرف جانے کے لیے اس جگہ سے لازماً گزرتا پڑتا تھا۔ اس ہانکی دے کا سب سے سنسان حصہ یہی تھا اور یہاں دن میں بھی ٹریفک بہت کم ہوتا تھا۔ بابا نے دو سال پہلے یہ نسان کار لی تھی اس کا انجن بہت طاقتور تھا۔ پھر صباحت ماہر ڈرائیور بھی تھا۔ اس نے رفتار تیز کی۔ اب گاؤں زیادہ دور نہیں تھا۔ عام طور سے شکر گڑھ سے بیس پچیس منٹ کا راستہ ہے لیکن اس روز صباحت نے اسے صرف پندرہ منٹ میں طے کیا اور ہم حویلی پہنچ گئے۔ ان پندرہ منٹوں میں ہمارا یعنی میرا اور ماں جی کا ذمہ دار خون خشک ہوا تھا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ سیاہ جیب گاؤں کے باہر تک پیچھے رہی پھر وہیں رک گئی۔ اس نے گاؤں والے راستے پر آنے کی کوشش نہیں کی۔

حویلی میں آکر میں نے سکون کا سانس لیا۔ ماں جی پریشان تھیں۔ صباحت نے جیب کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ کچھ دیر میں بابا آگئے تو اس نے انہیں جیب کا نمبر بتایا۔ نمبر سیالکوٹ کا تھا۔ اتفاق سے بابا کا ایک شاگرد وہی کل رجسٹریشن آفس میں کام کرتا تھا۔ بابا نے کال کر کے اسے نمبر بتایا اور جیب کے مالک کے بارے میں پوچھا۔ اس نے چھان بین کر کے اگلے دن بتایا کہ جیب کا مالک کوئی میاں نیاز احمد ہے اور پتا شکر گڑھ کا ہے۔ مگر جب مزید چھان بین کی گئی تو پتا چلا کہ جیب میاں نیاز احمد کے نام پر تھی لیکن یہ وہ جیب نہیں تھی جو ہماری گاڑی کے پیچھے لگی رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ جعلی نمبر پلیٹ استعمال کر رہی تھی۔ بابا اور ہم مزید پریشان ہو گئے تھے۔ بابا اور ماں جی کے ذہن میں وہی بات تھی کہ سیاہ جیب میں ڈاکو تھے مگر مجھے یقین تھا کہ اس میں مظفر چودھری خود یا اس کے آدمی تھے اور وہ میرے پیچھے

آئے تھے۔

سوار مشکوک افراد کے بارے میں بتا دیا تھا۔ سیف الرحمن ان دنوں بی بی اے میں داخلے کا ٹیسٹ دینے اسلام آباد عبید بھائی کے پاس گیا ہوا تھا۔ اگر اس کا داخلہ ہو جاتا تو وہ وہیں رہتا۔ گویا حویلی میں صرف بابا رہ جاتے۔ سیف اگرچہ صرف سولہ سال کا تھا مگر مرد تھا اس کے ہونے سے جو ڈھارس ہو سکتی تھی اب وہ نہیں تھی۔ بھائیوں نے بابا کو مشورہ دیا کہ وہ اضافی کارڈ رکھ لیں اور اب مجھے اور ماں جی کو باہر بھیجنیں تو ہمارے ساتھ کم سے کم دو افراد ہوں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں بھی عبید بھائی کے پاس چلی جاؤں۔ بے شک کچھ عرصے کے لیے تو شاید میرے لیے بہتر ہو۔ میں نے ماں جی سے کہا تو انہوں نے منع کر دیا۔ ”میں اکیلی رہ جاؤں گی۔“

”ماں جی بس کچھ عرصے کے لیے۔“

ماں جی نے پھر انکار نہیں کیا مگر ان کے موڈ سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے شاید ہی اجازت دیں۔ میں نے بابا سے اجازت لینے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے سوچا کہ سرمایہ پیپر کی تیاری کر لوں اور بہار میں اسلام آباد جاؤں۔ ابھی تو وہاں یہاں سے زیادہ ٹھنڈ شروع ہو گئی تھی۔ سیف کی کال آئی تو اس نے بتایا کہ غضب کی سردی ہے اور کمرے سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔ سردی یہاں بھی تھی مگر اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ہاں شام کے بعد کھلے میں نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ میں پیپر کی تیاری اور گھر کے کام دن میں نمٹا لیتی تھی۔ شام سات بجے ہم کھانا کھا لیتے تھے اور اس کے بعد میرا وقت شروع ہوتا جب میں ہوتی اور کتابیں رسالے ہوتے تھے۔

بابا نے نہ صرف ہمیں مطالعے کا شوق دلایا تھا بلکہ ہمارے گھر میں ڈیروں کتابیں بھی تھیں۔ ایک بڑا سا کمرہ لائبریری کا روپ اختیار کر گیا تھا اور اس میں بلاشبہ ہزاروں کتابیں تھیں۔ ہر مہینے درجنوں کے حساب سے نئی کتابیں، درجنوں سے اوپر مختلف رسائل اور روزانہ کئی اخبارات آتے تھے۔ ہفتہ وار رسائل اس کے علاوہ تھے۔ کتابیں بابا خود لاتے تھے۔ مجھے دقیق موضوعات پسند نہیں تھے۔ فلشن کے علاوہ ہلکے پھلکے موضوعات پر کتابیں پڑھتی تھی۔ رات کو پڑھنے کے لیے پہلے سے کچھ منتخب کر لیتی اور موڈ کے لحاظ سے اسے لے جاتے یا کافی بنا کر میں رضائی میں گھس کر مطالعے میں لگ جاتی تھی۔ اگر کوئی ایس ایم ایس آ جاتا تو اسے دیکھ لیتی، جواب دینے کا موڈ ہوتا تو دیتی ورنہ صبح تک

مجھے ایک بار پھر خیال آیا کہ بابا نہ سہی ماں جی کو بتا دوں کہ مظفر چودھری میرے پیچھے ہے۔ مگر میں کہہ نہ سکی شرم، جھجک اور خوف سب مانع آئے تھے۔ سیکینے نے جب مجھے یہ بات بتائی تو اس کو مہینے سے اوپر ہو گیا تھا اور میرا خوف کسی قدر کم ہو گیا تھا مگر آج کے واقعے نے اس خوف کو نہ صرف تازہ کر دیا تھا بلکہ بڑھا دیا تھا۔ بابا نے پابندی لگا دی کہ اب میں اور ماں جی ان کے بغیر حویلی سے باہر نہیں جائیں گے۔ صبح کو حکم دیا کہ حویلی کا بڑا گیٹ اب دن میں بھی بند ہو گا اور چھوٹا گیٹ اچھی طرح دیکھ بھال کے بعد کسی کے لیے کھولا جائے گا۔ میں تو خود یہی چاہتی تھی کہ گھر میں رہوں اور باہر نہ جاؤں۔ اس لیے بابا کے فیصلے سے خوش ہوئی۔ مگر بابا اور ماں جی دونوں سمجھ رہے تھے کہ یہ ڈاکوؤں کا چکر تھا۔ ماں جی نے بابا سے کہا کہ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ”آپ پولیس میں رپورٹ کریں آخر آپ کے اتنے شاگرد پولیس میں ہیں۔“

”وہ بھی کروں گا اور یہ مسئلے کا حل نہیں احتیاط ہے۔“ بابا نے سمجھایا۔

”بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمیں باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ میں نے بابا کی تائید کی تو وہ خوش ہو گئے۔

”میری بیٹی ماں سے زیادہ سمجھدار ہے۔“

ماں جی خفا ہو گئیں۔ ”ہاں، میں ہی نا سمجھ ہوں۔“

ہماری زمینیں ٹھیکے پر تھیں۔ دادا نے بارہ ایکڑ زمین لی تھی مگر بعد میں بابا اور ان کے بھائیوں نے کوشش کر کے اسے ایک مربع کر لیا تھا اور اب بھی زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی سے وہ نئی زمینیں لے رہے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ بے شک زمین پر زمت یا بزنس کیا جائے گا مگر ایک بنیاد کے طور پر زمین رکھی جائے اور اسے بڑھایا جائے۔ یہ اب تک مشترک تھی اور ان کو کوئی اسے جسے سے دست بردار ہو گا تو دوسرا اسے خرید لے گا۔ کسی اور کو فروخت نہیں کی جائے گی۔ مگر ساتھ ہی زمین کے معاملے کو بین رکھے جائیں گے ہر کسی کو معلوم تھا کہ اس کی زمین اتنی کی اور یہاں تھی۔ بعد میں تنازعات سے بچنے کے لیے بابا اور ان کے بھائیوں نے یہ انتظام کیا تھا۔ انہوں نے اگلی نسل سے کہہ دیا تھا کہ ان کے بعد زمین خاندان کی سطح پر تقسیم کر لی جائے اور ہر خاندان اپنی زمین کا خود سے دار ہو گا۔

بابا نے دونوں بھائیوں کو بھی سیاہ جیپ اور اس میں

کے لیے ملتی کر دیتی۔ میں نے ماہ کا ایک ڈائجسٹ دیکھ رہی تھی کہ ایس ایم ایس ٹون بجی۔ میں نے صبح کھول کر دیکھا۔ اس میں لکھا تھا۔
”تم مجھے اچھی لگی ہو۔ اس لیے تمہارا نمبر حاصل کیا ہے۔“

میرا دل ایک لمحے کور کا تھا۔ میرے پاس دو سال سے موبائل تھا اور مجھے آج تک ایسا کوئی ایس ایم ایس نہیں آیا تھا۔ میرے دل نے بے ساختہ گواہی دی کہ یہ صبح مظفر چودھری کی طرف سے تھا۔ میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ مجھے لگا کہ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ میں عام طور سے رات کو دروازہ اندر سے بند نہیں کرتی تھی کیونکہ ماں جی رات کو چکر لگاتی تھیں اور مجھے دیکھتی تھیں مگر اس وقت میں نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر میں نے صبح ڈیلیٹ کر دیا اور پھر اس نمبر کو بلاک کر دیا۔ میں نے بلاک سروس لی ہوئی تھی۔ موبائل رکھ کر میں نے پھر رسالہ اٹھا لیا مگر میرا دل اب مطالعے میں نہیں تھا۔ رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اگر یہ صبح مظفر چودھری کی طرف سے تھا تو اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پوری طرح میرے پیچھے پڑ چکا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی چیز کے پیچھے پڑ جائیں تو اسے حاصل کر کے ہی دم لیتے ہیں۔ وہ اس کی قوت بھی رکھتا تھا۔ میں اتنی ٹینشن میں تھی کہ ایس ایم ایس کی ہلکی سی ٹون بجی تو میں اچھل پڑی تھی۔ میں نے ایس ایم ایس کھول کر دیکھا۔ اس بار یہ دوسرے نمبر سے آیا تھا۔ مگر کیا اسی نے کیا تھا۔

”تم کتنے نمبرز بلاک کر رہی۔ یقین کر دو میری جان تم بلاک کر کر کے تھک جاؤ گی مگر میرے پاس نمبرز ختم نہیں ہوں گے۔“

اس بار اس کے طرز خطاب نے میری جان نکال دی تھی۔ وحید میرا منگیتر تھا مگر اس نے آج تک مجھے یوں مخاطب نہیں کیا تھا۔ ان الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ پر اپنا قبضہ حق سمجھ رہا ہے۔ پانی سر سے اونچا پور ہا تھا اور میں اب باہر اور ماں جی کو بتانے کا سوچ رہی تھی۔ مگر میں یہ صبح کیسے دکھائی؟ شرم سے مر جاتی۔ اب میں پچھتائی کہ پہلا صبح کیوں ڈیلیٹ کیا۔ بے شک نمبر بلاک کر دیتی مگر صبح رہتی تو باپا اور ماں جی کو دکھا سکتی تھی۔ پھر یہ بھی واضح نہیں تھا کہ صبح نیچے والا کون ہے۔ اگر میں مظفر چودھری کا نام لیتی تو باپا مجھ سے پوچھتے کہ مجھے کیسے پتا چلا؟ اور جب میں سکینہ کا بتاتی تو

پھر یہ سوال سامنے آتا کہ میں نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ بلا وجہ باپا کے ذہن میں شک آ جاتے۔ میرے حوالے سے ان کے ذہن میں شک آئے اس سے زیادہ بہتر میں یہ سمجھتی کہ مجھے موت آ جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ریت میں گردن چھپانے سے کام نہیں چلے گا مجھے اس مسئلے کا سامنا کرنا ہوگا۔ میں نے ہمت کر کے صبح کیا۔
”کون ہو تم اور تمہاری جرات کیسے ہوئی یہ صبح کرنے کی؟“

ایک منٹ سے بھی پہلے اس کا جواب آیا۔ ”جانی میں تمہارا سب سے بڑا عاشق ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے دن رات کا چین حرام ہو گیا ہے اب تو تم پاس آؤ گی تو سکون ملے گا۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق تمہیں پتا چل گیا ہے ناں کہ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“
مجھے سخت سردی کے موسم میں بھی پسینا آ گیا تھا۔ میں نے لکھا۔ ”تم سخت واہیات آدمی ہو اور تمہاری ماں بہن نہیں ہیں جو تم کسی غیر لڑکی کو اس طرح کے صبح کر رہے ہو۔ اب مجھے کوئی صبح مت کرنا میں جواب نہیں دوں گی اور میں اپنے ماں باپ کو بتا رہی ہوں۔“

”بتا دو گڑیا میں کسی سے ڈرنے والا شخص نہیں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد بھی اس کے صبح آتے رہے لیکن میں نے انہیں کھولا نہیں۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مزید بکواس کرے گا۔ میں نے موبائل آف کر کے رکھ دیا اور فیصلہ کیا کہ صبح ماں جی کو دکھاؤں گی وہ خود باپا کو دکھا دیں گی۔ یہ سوچ کر میں کسی قدر مطمئن ہو گئی تھی کہ میرے سر پر میرے بڑے میرے محافظ تھے اور وہ مجھے محفوظ رکھتے۔ اطمینان کے باوجود رات دیر سے نیند آئی۔ میرے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ دیر سے سوئی تو صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی۔ آنکھ بھی دروازہ نبھنے سے کھلی۔ باہر ماں جی تھیں۔ پہلے انہوں نے دروازہ بند کرنے کا پوچھا کہ کیوں بند تھا اور پھر میرا چہرہ دیکھا اور فکر مند ہو گئیں۔

”تو ٹھیک ہے نا؟“
”سر میں درد ہے ماں جی۔“
”انہوں نے میرا ماتھا چھوا۔“ بخار بھی ہے۔ چل تو ہاشتا کر کے میں تجھے دوا دیتی ہوں۔“
”بابا کہاں ہیں؟“
”وہ آج جلدی ملے گئے۔ اسکول سے انہیں کسی میٹنگ میں جانا ہے کہ رات سے آج دیر سے آئیں گے۔“

مثبت سوچ

آپ کی شخصیت کو، آپ کی صحت کو، آپ کی تخلیقی صلاحیت اور آپ کی جرأت پر تعمیری اثرات مرتب کرتی ہے۔ آپ کی سوچ جتنی زیادہ مثبت ہوگی آپ کی زندگی اتنی ہی زیادہ خوشگوار ہوگی۔ منفی سوچ کا اثر بالکل الٹ ہوتا ہے۔ یہ آپ کو کمزور کر دیتی ہے اور آپ میں اعتماد کی کمی واقع کر دیتی ہے۔ جب آپ منفی سوچتے ہیں یا منفی گفتگو کرتے ہیں تو آپ اپنی طاقت کو ختم کر رہے ہوتے ہیں جب آپ ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں یا دفاعی انداز اپناتے ہیں تو اس طرح آپ ٹھن، دباؤ اور ناخوشگوار کا شکار ہوتے ہیں جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے۔ آپ جسمانی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ منفی سوچ آپ کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے مثبت سوچ آپ کی ذہنی صحت کو بہتر بناتی ہے اور آپ کی کارکردگی کو عروج پر لے جاتی ہے۔

مرسلہ: احسان سحر۔ میانوالی

کہا۔ ”ایک دن ذرا دیر سے رونی ملے گی تو مر نہیں جائے گا تیرا پتر۔“

ماں جی عصر سے ذرا پہلے چلی گئی تھیں۔ میں نشست گاہ میں بیٹھی ہوئی لی وی دیکھ رہی تھی۔ عصر کے بعد وقت تیزی سے گزرا تھا۔ ماں جی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ لی وی بند کر کے اٹھ رہی تھی کہ سفینہ بی بی اندر آئی اور اس نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کو بی بی صاحبہ بلاری ہیں۔“

وہ اسی کو بی بی صاحبہ کہتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”ای آگئی ہیں؟“

”نہیں جی وہ آپ کو ملک صاحب کے ہاں بلاری ہیں۔“ سفینہ بی بی نے جواب دیا۔ میں حیران ہوئی۔

”ملک صاحب کے ہاں لیکن کیوں؟“

”مجھے نہیں پتا بی بی جی پر انہوں نے کہا ہے کہ آپ کو بھیج کر میں چھٹی کروں۔“

سفینہ بی بی کچھ بے چین سی تھی میں سمجھی کہ وہ چھٹی کے نام پر تپ ہو رہی ہے۔ میں نے چادر لی اور باہر آئی تو سفینہ بی بی تھی میں موجود تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”بی بی آپ پلیس میں دوایہ چاول اندر رکھ کر آئی ہوں۔“

ای نے چاول ابل کر خشک ہونے کے لیے دھوپ

میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی۔ سورج نکل آیا تھا مگر بادلوں کی وجہ سے ہلکی سی دھوپ تھی۔ مجھے سردی لگی تو میں اندر چلی آئی۔ ماں جی نے جبراً دودھ کا بڑا والا گلاس پلایا اور پھر دوا دی تھی۔ میں دوا لے کر لیٹ گئی۔ میں نے ماں جی کو بتانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا کہ جب بابا آئیں گے تب ماں جی کو بتاؤں گی اور پھر وہ بابا سے بات کریں۔ رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی اس لیے سو گئی اور دوپہر تک سوتی رہی۔ ابھی تو طبیعت بہتر تھی۔ باہر آئی تو پتا چلا کہ ماں جی ہمارے ایک پڑوسی ملک اصغر علی کے گھر گئیں ہیں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ ملک اصغر علی ہمارے دور کے پڑوسی تھے، ان کی حویلی کئی مکانات چھوڑ کر تھی۔ بابا سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ ملک صاحب کے والد بہت بوڑھے اور حامی عرصے سے بیمار تھے۔ سفینہ بی بی نے بتایا کہ آج صبح اسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا تھا اور عصر کے وقت تدفین تھی۔ پچھ دیر میں ماں جی آگئیں۔ انہوں نے کہا۔

”تیرے بابا کو اطلاع کر دی ہے عمر وہ دور ہیں انہیں آنے میں دیر لگے گی۔“

”تب آپ چلی جائیے گا۔“

”تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تجھے چھوڑ کر کیسے جاؤں۔“

میں ہنسی۔ ”میں بچی تھوڑی ہوں جو آپ کے بغیر رہ

نہیں سکوں گی۔“

”سفینہ۔“ ماں جی نے سفینہ بی بی سے کہا۔ ”تو رک جانا جب تک میں نہیں آتی۔“

”ٹھیک ہے بی بی لی بی بی۔“ وہ بے دلی سے بولی۔ اسے شام کے وقت جانے کی جلدی ہوتی تھی کیونکہ ریمان چار بجے گھر آ جاتا تھا۔ سفینہ اسے گھر جا کر کھانا دیتی۔ ویسے سارا دن بہت پھر تیلی اور چاق و چوبند رہتی تھی۔ چنانچہ شام کا وقت قریب آتا سفینہ بی بی سست ہو جاتی اور اسے چھٹی کا کام زیادہ ہو گیا ہے کسی تکلیف یا بیماری کے بہانے سے چھٹی جاتی تھی۔ ماں جی سمجھتی تھیں اس لیے اگر کام نہیں ہو تو

اسے جلد جانے کی اجازت بھی دے دیتی تھیں۔ اس وقت بھی سفینہ بی بی کو فکر لگ گئی تھی کہ وہ کسی طرح جلد گھر چلی جائے۔ اس نے دبے لفظوں میں ماں جی سے کہا۔ ”بی بی

ذرا جلدی آئیے گا وہ ریمان.....“

”پتا ہے، پتا ہے۔“ ماں جی نے تیز لہجے میں

میں رکھوائے تھے۔ میں گیٹ کی طرف بڑھی۔ صباحت نے مجھے آتے دکھ کر گیٹ کھول دیا۔ میں باہر نکلی اور ملک صاحب کی حویلی کی طرف جانے لگی۔ پہلے میں نے سوچا کہ سفینہ بی بی کا انتظار کروں لیکن یہ سوچ کر کہ نہیں دیر نہ ہو میں خود ہی جانے لگی۔ ان کی حویلی کے راستے میں مشترک باغ آتا تھا۔ میں اسی سے گزرنے لگی۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے تاریکی وقت سے پہلے چھا رہی تھی اور درختوں کے نیچے تو اندھیرا سا تھا۔ اس وقت باغ میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے ڈر لگا مگر ہمت کر کے آگے بڑھتی رہی۔ جب تک میں باغ میں داخل ہوئی سفینہ بی بی حویلی سے نہیں نکلی تھی۔

میں باغ کے وسط تک پہنچی تھی کہ اچانک کوئی تاریکی سے نکل کر چھپنا اور اس سے پہلے کہ میرے منہ سے آواز نکلتی سائے نے میرا منہ ڈبایا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑا تھا جس سے تیز بو اٹھ رہی تھی میں نے تڑپ کر اس کا ہاتھ منہ سے ہٹانا چاہا مگر وہ دوسرے ہاتھ سے مجھے جکڑ چکا تھا۔ وہ متوسط قامت تھا لیکن مضبوط مرد تھا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ کپڑے سے اٹھتی تیز بو میرے دماغ پر چڑھ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے۔ پھر میں چکرا کر گرنے لگی۔ مگر گرتی کہاں سے کیونکہ مجھے تو اس شخص نے جکڑ رکھا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ میں بے حس ہو گئی ہوں تو اس نے مجھے آرام سے نیچے لٹایا اور ہلکی سی سیٹی بجائی۔ میں نے کیونکہ کپڑا منہ پر لٹکنے کے بعد سانس روک لی تھی اس لیے بو مجھ پر اتنی اثر انداز نہیں ہوئی تھی کہ میں بے ہوش ہو جاتی۔ ایک دو ہلکی پھلکی سانس لی تھیں جن سے بو میرے دماغ پر چڑھ گئی اور اس کے اثر سے میں نیم غشی کی کیفیت میں تھی۔ مگر بے ہوش نہیں ہوئی تھی اور آس پاس کی آوازیں سن رہی تھی۔ البتہ جسم یا زبان ہلانے کی سکت بھی نہیں تھی۔ میرا جسم میرے اختیار میں نہیں تھا۔ اسے میں کوئی آیا اور اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

”اسے لے کر نہیں گئے۔ میرا پتہ کہاں ہے؟“

میں دنگ رہ گئی تھی کیونکہ آواز سفینہ بی بی کی تھی۔ مجھے جکڑنے والے نے بھی آہستہ سے کہا۔ ”فکر نہ کرو گھر پہنچ جائے گا۔ تم دونوں ماں بیٹے اپنی زبان بند رکھنا۔ اگر کسی نے زبان کھولی تو ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے گی۔“ اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ اسی اثنا میں وہاں کوئی اور بھی آگیا اور ان دونوں نے مل کر مجھے اٹھایا اور کہیں لے جانے لگے۔ میں

قطعاً بے بس تھی۔ آج تک مجھے کسی غیر مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر اب میں یوں بے بس تھی کہ وہ جیسے چاہے مجھے پکڑ اور چھو رہے تھے۔ مگر ان کے انداز میں سفینہ بی بی نہیں تھا اور نہ ہی وہ بات کر رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ مجھے خاموشی سے کہیں لے جائیں۔ میرا سر اب پہلے سے زیادہ چکرار رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اندازہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ یہ یقیناً مظفر چودھری کا پلان تھا۔ اس نے کسی طرح سفینہ بی بی کو ساتھ ملایا تھا۔ شاید اس نے ریحان کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور پھر سفینہ بی بی کی مدد حاصل کی۔ اس کی مدد سے مجھے حویلی سے باہر آنے پر مجبور کیا۔ ملک صاحب کی حویلی تک جانے کا راستہ باغ سے گزرتا تھا اس لیے یہ لوگ وہاں میرے منظر تھے اور جب میں گزرنے لگی تو مجھے قابو کر لیا۔ چکر بڑھ رہے تھے اور آخری احساس یہ تھا کہ مجھے کسی کاری ڈکی میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک کھردری بان کی چارپائی پر بندھی پڑی تھی۔ نہ صرف میرے ہاتھ پاؤں سختی سے بندھے ہوئے تھے بلکہ میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اوپر سے مجھے پر بھاری کبل پڑا ہوا تھا جس سے نہایت ناگوار ہوا تھا۔ مگر نیچے چادر بھی نہیں تھی اور کھلی بان سے رخ ہوا آ کر میرے جسم کو سرد کر رہی تھی۔ مگر مجھے سردی سے زیادہ اپنی عزت آبرو کی پروا بھی میں نے اپنا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ کسی نے اب تک میرے ساتھ نہیں چھانڈ نہیں کی ہے۔ میرا لباس بھی ٹھیک تھا۔ البتہ دو بچا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آواز نکالنے کی کوشش کی مگر بس ناک سے معمولی سی آواز نکلی۔ اپنی بے بسی اور اس سے زیادہ آنے والے وقت کے خوف نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ پھر میں نے کوشش کر کے سر سے کبل سر کا یا۔ جس کی بدبو سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔

اندرتار کی تھی اس لیے جب سر نکالا تو معمولی سے سواٹ کے پہلے بلب کی روشنی نے بھی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ بلب میں میرے سر پر روشن تھا۔ چند لمبے کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کھول کر دیکھا تو خود کو ایک بچی دھڑی میں بند پایا۔ بچی دیواروں پر لکڑی کی بلیاں لگی تھیں اور ان پر مٹی لپ کر چھوٹے بچے کی عورت تھی۔ کوٹھری زیادہ

بڑی نہیں تھی۔ مشکل سے دس فٹ لمبی اور سات فٹ چوڑی تھی۔ اس میں ایک سنگل چارپائی تھی جس پر میں پڑی تھی اور مخالف سمت میں ایک اور سنگل چارپائی تھی۔ درمیان میں کوٹھری کا دو پٹ والا دروازہ تھا جو بند تھا۔ پتا نہیں میں کہاں تھی اور میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ مجھے اتنا یقین تھا کہ مجھے اغوا کرانے والا مظفر چودھری تھا۔ میں اسی کے کسی ٹھکانے پر تھی۔ میں کاٹنے لگی تھی مگر سردی سے نہیں خوف سے۔ پھر مجھے ماں جی اور بابا کا خیال آیا ان پر میری کم شدگی سے کیا گزر رہی ہوگی۔

یہاں وقت بتانے والی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ ہی باہر سے کوئی آواز آرہی تھی۔ ایسا سا نا تھا جس میں دور کہیں بھی نظر بول رہے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ میری کم شدگی کے بعد یقیناً ماں جی نے سفینہ بی بی سے پوچھ کچھ کی ہو گی کہ میں کہاں گئی کیونکہ ماں جی مجھے اس پر چھوڑ کر گئی تھیں۔ مجھے اُمید ہوئی کہ شاید بابا اور ماں جی اس سے سختی سے پوچھیں تو وہ اگلے دے کہ اس نے مجھے کن لوگوں کے حوالے کیا ہے۔ مگر جب مجھے اغوا کرنے والے کی دھمکی یاد آئی جو اس نے سفینہ بی بی کو دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اسے اور اس کے بیٹے کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دیں گے۔ اس کے بعد سفینہ بی بی کے لیے زبان کھولنا بہت مشکل تھا۔ مظفر چودھری اپنی دھمکی پر عمل کرنے والا شخص تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میرے اندر اُمید کا جو چراغ جل اٹھا تھا۔ وہ بجھنے لگا۔

میں بے بس تھی میرے ساتھ کچھ بھی ہو جاتا کسی کو پتا نہیں چلتا۔ اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد شاید مظفر چودھری مجھے قتل کر کے خاموشی سے کہیں دفنا دیتا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی خوب صورتی سے نفرت محسوس ہوئی تھی نہ میں اتنی خوب صورت ہوئی اور نہ مظفر چودھری کی غلیظ نظریں مجھ پر پڑتیں اور وہ مجھے غلام کرنے کا سوچتا اور اس پر عمل کرتا۔ کاش کہ میں عام سی شکل و صورت والی لڑکی ہوتی۔ کم سے کم اس آفت سے تو بچتی۔ اس وقت گرفتار تھی۔ مگر یہ سب میری تقدیر میں تھا۔ شاید میں خوب صورت نہ ہوتی تب بھی میرے ساتھ یہی ہوتا۔ میرا ذہن میرے قابو میں نہیں تھا اور بے ربط سوچیں میرے دماغ میں چکرار ہی تھیں۔ کبھی میں سوچتی کہ کاش ایسا ہوتا تو آج میں یہاں نہ ہوتی اور کبھی مجھے اپنے گھر والوں کا خیال آتا۔ کبھی اپنے انجام کی فکر لگ جاتی۔

مگر رفتہ رفتہ میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے

لگی۔ میں نے خود سے کہا کہ اگر مجھے یہاں سے نجات حاصل کرنی ہے تو مجھے اس کے لیے خود کوشش کرنا ہو گی۔ سب سے پہلے مجھے خود کو آزاد کرانا تھا۔ میں نے ہاتھوں پر زور آزمائی کی۔ مجھے سوتی رسی سے باندھا گیا تھا اور اس کی بندش بہت سخت تو نہیں تھی مگر جہاں جہاں گرہ لگی تھی وہاں سے یہ ذرا بھی نرم نہیں ہو رہی تھی۔ میں کوشش کرتی رہی اور جلد محسوس کر لیا کہ اس طریقے سے میں خود کو آزاد نہیں کر سکیں گی۔ میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھی اور خود پر سے کبل ہٹا دیا۔ میرے جسم پر ویلوٹ کے شلوار قمیص کے علاوہ سوٹر تھا۔ حویلی سے نکلے ہوئے دو پٹا اور گرم چادر بھی تھی اور یہ دونوں چیزیں غائب تھیں۔ کبل ہٹا تو میں ایک لمبے کولرز اٹھی تھی سردی بہت شدت کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہوئی تھی جس سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔

باہر بادل ہلکے سے گرہے تو بارش کی تصدیق بھی ہو گئی۔ میرے پاؤں اس طرح بندھے تھے کہ دونوں پیروں میں رسی سے الگ گرہ لگا کر ان کو آپس میں ملا دیا گیا تھا اور یوں میرے پاؤں کسی قدر آزاد تھے۔ میں کوشش کر کے چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ مجھے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے میں رسی کاٹ سکوں۔ مگر یہاں سوائے چارپائیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں پیروں کو معمولی سی حرکت دیتی بخ بستہ زمین پر دوسری چارپائی کی سمت بڑھی۔ میرے پیروں سے چپل بھی غائب تھی۔ زمین جیسے برف کی ہو رہی تھی۔ کسی طرح میں دوسری چارپائی تک پہنچی اور اس پر پڑا کبل بندھے ہاتھوں سے سرکانے لگی۔ خوش قسمتی سے میرے ہاتھ سامنے کی طرف بندھے تھے ورنہ میں یہ معمولی سا کام بھی نہ کر پاتی۔ کبل ہٹایا تو مجھے اس کے نیچے ایک پاؤچ سا نظر آیا۔ میں نے بے تابی سے اسے اٹھایا اور کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ اصل میں ریگز بن اور چپکنے والی پٹی سے بنی پاؤچ تھی جس میں اوزار رکھے جاتے ہیں۔ میں نے اس کو کھولا تو اندر سے چھوٹے چھوٹے اوزار گرے۔ ان میں ایک نیل کٹر نما آلہ تھا۔ اس میں متعدد چیزیں تھیں۔ میں نے یہ مشکل ان میں موجود چھوٹا سا چاقو کھولا۔ اس چکر میں میرا ایک ناخن بھی ٹوٹ گیا۔ مگر مجھے ایک اُمید نظر آئی کہ میں خود کو تو آزاد کر سکتی تھی۔ چاقو زیادہ تیز نہیں تھا اور اس کا پھل بھی چھوٹا تھا اس لیے میں نے بہت مشکل سے انگلیاں موڑ کر اسے کھینک پہنچایا اور رسی کاٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ چاقو کی

دھار تیز نہیں تھی اور یہ جھوٹا بھی تھا۔ میں دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی اور کئی بار چاقو میری کلائی میں بھی لگا۔ زخم آئے اور مجھے تکلیف ہوئی تھی۔ میرے آنسو نکل رہے تھے مگر میں نے کوشش جاری رکھی۔

نہ جانے کب تک میں رسی پر چاقو رگڑتی رہی اچانک رسی ڈھیلی ہوئی اس کے بل کا بڑا حصہ کٹ گیا تھا۔ اس لیے وہ ڈھیلی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کام آسان تھا۔ ایک منٹ میں میرے ہاتھ آزاد ہو گئے تھے اور میں کلائیاں مسل رہی تھی جن پر نشان بڑھ گئے تھے۔ پھر میں نے اپنے پاؤں آزاد کیے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے کھولنے کی کوشش کی تو وہ باہر سے بند نکلا۔ میں نے زور لگانے سے گریز کیا کیونکہ دونوں پٹ ٹل رہے تھے اور آوازیں نکال رہے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کسی نے سن لیا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں ہاتھ پیروں سے آزاد ہو گئی ہوں۔ دروازہ باہر سے زنجیر لگا کر بند کیا گیا تھا۔ یہ پرانا طریقہ تھا جواب گاؤں دیہات میں بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ پٹ پٹتے تو زنجیر کھنکھتی تھی۔ میں پیچھے ہٹ گئی اور چارپائی پر آ گئی کیونکہ زمین بہت سرد تھی اور میرے پاؤں بچ ہو گئے تھے۔ میں سمٹ کر بیٹھ گئی اور خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔ آزادی کی کوئی اُمید نظر نہیں آرہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں؟

اچانک میری نظر اس چاقو پر گئی جس سے میں نے رسی کاٹی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ تیز دھار نہیں تھا لیکن اگر میں اسے اپنی کلائیوں پر آزمانی تو یہ میری کلائی کی نیس کاٹ سکتا تھا۔ مگر جب میں نے سوچا کہ میں اپنے ہاتھ خود کاٹوں گی تو میں لرز اٹھی تھی۔ میں اس معاملے میں بہت کم ہمت تھی۔ مجھے تو انجکشن کی سوزی سے خوف آتا تھا۔ ہلکی سی چوٹ لگ جاتی تو میں رو دیتی تھی۔ بہت مجھے جان کے مقابلے میں زیادہ پیاری تھی۔ مگر میں خودکشی نہیں کر سکتی تھی۔ ہمارے مذہب میں خودکشی حرام ہے لیکن اصل بات یہ تھی کہ مجھ میں خودکشی کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا کہ میں خودکشی نہیں کر سکتی تھی مگر ان لوگوں کو دھمکی تو دے سکتی تھی کہ اگر وہ نے میرے پاس آنے کی کوشش کی تو میں اپنی شرگ کاٹ لوں گی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ مظفر چودھری جیسے لوگوں پر اس دھمکی کا کیا اثر ہوگا؟

میں ایک بار پھر منتشر ان خیال ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں؟ کیسے خود کو اور اپنی عزت کو بچاؤں؟ ابھی میں سوچ رہی تھی کہ کوٹھری کے باہر سے

زنجیر کھنکھنے کی آواز آئی اور میری حالت خراب ہو گئی۔ میں نے چاقو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے گلے کے پاس کر لیا مگر میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ جان کو تو نہیں مگر اس طرح میں خود کو چاقو مار لوں گی۔ آنے والا اجنبی ثابت ہوا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور پھر میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر مسکرایا۔ ”مرنا چاہتی ہے؟“ اس نے کہا اور دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ”چل اپنا گلا کاٹ کر دکھا۔“

میرے ہاتھوں کی لرزش بڑھ گئی تھی مگر میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”مجھے جانے دو ورنہ میں مر جاؤں گی مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔“

”یہی تو کہہ رہا ہوں چل شاباش اپنا گلا کاٹ لے۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔ اچانک چاقو میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں اپنے آپ میں سمٹ کر رونے لگی تھی۔ میرے منہ سے التجائیں نکل رہی تھیں۔ ”خدا کے لیے مجھے جانے دو، تمہیں اللہ، اس کے پیارے رسول ﷺ کا واسطہ مجھے جانے دو، میں شریف لڑکی ہوں۔ میرے ماں باپ مر جائیں گے۔“

”چپ کر۔“ اس نے اچانک اٹھ کر میری چوٹی پکڑ کر کھینچی تو میں بے اختیار اٹھتی چلی آئی۔ ”نخرے مت کر..... اگر تو نے کوئی حماقت نہیں کی تو صبح تک تجھے گھر چھوڑ دیں گے۔“

اس نے اتنی بے دردی سے بال کھینچے تھے کہ میرے سر میں شدید درد ہو گیا تھا۔ میں چلا اٹھی تھی مگر وہ اس کی پردا کیے بغیر مجھے کھینچتا ہوا کوٹھری سے باہر لایا۔ میں خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کوٹھری کے باہر جھوٹا سا کچا صحن تھا اور اس کے پار ایک جھوٹا سا کنبج تھا جس پر کچھ میل کی چھت تھی۔ احاطہ زیادہ بڑا نہیں لگ رہا تھا۔ کم سے کم اس جگہ یہ مشکل سے چالیس فٹ چوڑا تھا۔ کنبج کے آگے کیا تھا میں اس سے بے خبر تھی۔ وہ کھینچ کر مجھے کنبج کے برآمدے تک لایا اور پھر واحد دروازہ کھولتے ہوئے اندر دھکا دیا۔ میں لڑکھاتی ہوئی اندر قالین پر جا گری تھی۔ یہ سجا ہوا بیڈروم تھا اور شاندار۔ کے بیڈ پر نیم دراز شخص ہاتھ میں شراب کا گلاس لیے ہوئے تھا۔ اس نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ مظفر چودھری نہیں بلکہ کینے کے چچا کا لڑکا فضل تھا۔

میرے کان کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ میں دوسری طرف مری تھی اور مجھ پر نہ جانے کیا کیا چیزیں گر رہی تھیں۔ ان میں ٹھوس چیزیں بھی تھیں اور پانی بھی تھا جس نے مجھے شرابور کر دیا تھا۔ میں نے منہ فرش کی طرف کر لیا تھا اور خود میں سٹ گئی تھی۔

جب چیزوں کی بارش رکی تو میں نے حرکت کی اور خود پر آنے والی چیزیں ہٹانے لگی۔ یہ لمبہ تھا ہٹاتے ہوئے کوئی چیز میرے ہاتھ میں آئی اور میں نے محسوس کیا کہ انسان کا ہاتھ تھا مگر وہ اتنی آسانی سے کیسے میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ یہاں لائٹ تھی مگر دھماکا ہوتے ہی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ البتہ جا بے جا لگی آگ سے یہاں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بلند کیا تب دیکھا کہ وہ کہنی سے نیچے سے کٹا ہوا انسانی ہاتھ تھا جس سے نسیں اور گوشت جھانک رہا تھا۔ یہ یقیناً فضل کا ہاتھ تھا میں نے چیخ مار کر اسے دور پھینکا۔ کمرے کی حالت بگڑ گئی تھی بلکہ اب گمراہاں رہا تھا کیونکہ اس کی چھت اور دو طرف کی دیواروں کا بڑا حصہ غائب ہو گیا تھا اور اس طرف سے باہر کی تاریکی، بارش اور رہ رہ کر چپکنے والی بجلی دکھائی دے رہی تھی۔ میں بہ مشکل اٹھی اور لمبے سے ہوتی ہوئی باہر آئی۔

یہ کانچ کے سامنے والا حصہ تھا۔ احاطے میں ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس کے پارگیٹ تھا۔ کانچ میں برابر دو کمرے تھے۔ میں سامنے والے کمرے میں آئی تھی کہ پھر وہی سنسناتی ہوئی آواز آئی۔ مجھے یاد آیا کہ دھماکے والی چیز جب کانچ کی چھت توڑ کر اندر آئی تو اس سے پہلے ایسی ہی سنسناتی آواز آئی تھی۔ یہ یاد آتے ہی میں بے ساختہ گاڑی کی طرف بھاگی۔ اسی لمحے عقب سے کسی نے چلا کر کہا۔ ”وہ بھاگ رہی ہے پکڑو اسے۔“

میں گاڑی تک آئی تھی کہ عقب میں ہونے والے دھماکے کی لہر نے مجھے اچھال کر کچے میں پھینکا۔ پانی اور کچھڑ میں گرنے کی وجہ سے مجھے معمولی سی چوٹ آئی اور گاڑی نے مجھے برسنے والے لمبے سے بچا لیا تھا۔ یہ دھماکا کم شدت کا لگا تھا کیونکہ میں کھلی جگہ تھی۔ اس کے باوجود دھچکا اتنی شدت کا تھا کہ مجھے سنبھل کر انٹنے میں وقت لگا اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو کانچ مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ بس بچا جا رہے والی دیواریں رہ گئی تھیں اور اس کے لمبے سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ بہت تیز بارش ان شعلوں کو بجھاتی جا رہی تھی، شعلوں کی روشنی میں مجھے کوئی فرد نظر نہیں آیا۔ شاید

میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا اس کی شیوہ بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے پر مگر وہ پن اور ایسے تاثرات تھے جیسے کسی بھیڑیے نے کوئی بھیڑ دیکھ لی ہو۔ میں بے اختیار خود میں سٹ گئی۔ مجھے لانے والا اندر آیا اور اس نے فضل سے کہا۔ ”یاد رکھنا تیرے بعد ہماری باری ہے۔ صبح سے پہلے یہ قصہ ختم کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس اپنا کام شروع کرے۔“

”فکر مت کر ابھی تو پوری رات پڑی ہوئی ہے۔“ فضل نے کہا۔ ”اب تو جا اور چوس رہنا کوئی آئے تو مجھے خبردار کرنا۔“

مجھے لانے والا سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی فضل اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ ایک طرف آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور کمر گرم تھا۔ آتش دان دیکھ کر مجھے خیال آیا اور میں اچانک اٹھ کر اس کی طرف بھاگی۔ مگر مجھے آتش دان تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا اس سے پہلے فضل نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بستر پر پھینک دیا اور ایک گندنی گالی دے کر بولا۔ ”تو کیا سمجھتی ہے بہت ہوشیار ہے تو..... دیکھ کیسے میرے قابو میں آئی ہے۔“

”میں تیری کزن کی سہیلی ہوں۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”اس کا خیال کر لے۔“

”اس کا خیال بھی کروں گا۔“ وہ بھیا تک انداز میں مسکرایا۔ اسی لمحے باہر بادل گرے اور اس بار آواز بہت تیز تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ کچھ لمبے کی چھت پر بوندیں گرنے کی آواز بہت تیز تھی۔ فضل اپنی جیکٹ اتار رہا تھا۔ ”اچھا ہے بارش اور بجلی کے شور میں تیرا شور دب جائے گا۔ ویسے یہاں کوئی پکار سننے والا نہیں ہے۔“

”ہے۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”وہ تو ہے جو ہر جگہ ہوتا ہے اور سب کی سنتا ہے۔“

”تو بس اسی کو پکار، مگر میرا سزا جراب مت کرنا۔“ اس نے قیص بھی اتار دی اور بستر کی طرف بولھا تھا کہ عجیب سی سنسناتی آواز آئی۔ فضل ٹھٹک گیا تھا۔ آواز جیسے آسمان کی طرف سے آئی تھی۔ پھر اچانک کوئی چیز چھت توڑ لی ہوئی فضل کے عقب میں مری گئی تھی۔ میں سرکتے ہوئے بینڈ کے کنارے تک پہنچ گئی تھی۔ اسی لمحے جب خوفناک دھماکا ہوا اور فضل کے عقب میں بہت بڑا شعلہ نمودار ہوا تو میں جیسے خود بہ خود ہی بینڈ کے دوسری طرف مری گئی تھی۔ دھماکا ایسا تھا کہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے

میرے بارے میں خبردار کرنے والا بھی مارا گیا تھا۔ آواز کانچ کی طرف سے آئی تھی اور اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں کچھ دیر خالی ذہن کے ساتھ کھڑی کانچ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اوپر سے برستے نچستہ پانی نے مجھے چونکا دیا اور میں گیٹ کی طرف بڑھی۔

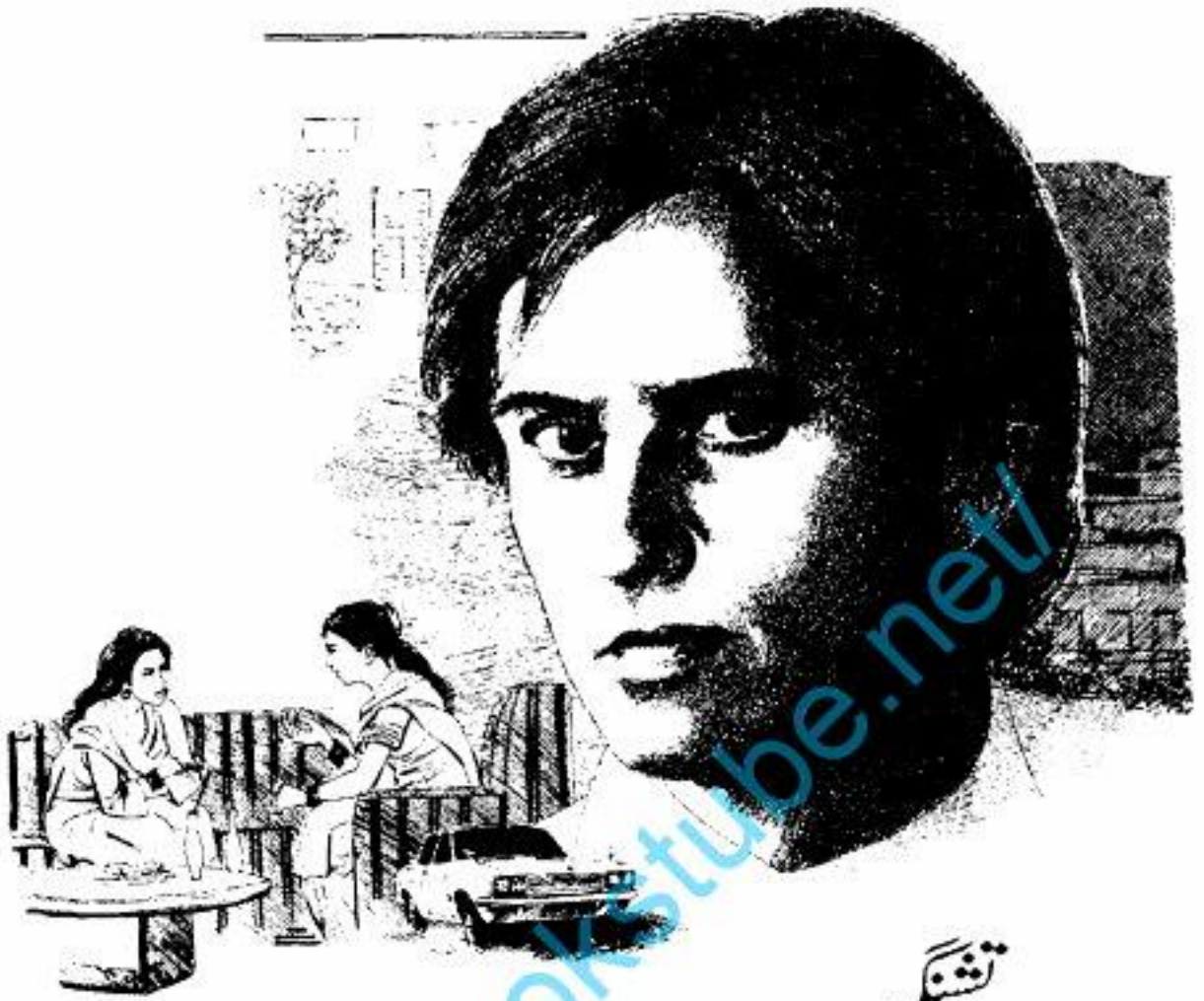
بڑا گیٹ بند تھا اور اس پر اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا میں اس سے باہر آئی تو میں نے خود کو کھیتوں کے درمیان ایک ویرانے میں پایا۔ ایک طرف جھاڑیاں اور چھوٹے درخت تھے اور اس طرف روشنی بھی ہو رہی تھی۔ روشنی لمبی قطار کی صورت میں درختوں سے جھانک رہی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھی تھی کہ میری جھٹکی حس نے خبردار کیا کہ اس طرف جانا ٹھیک نہیں ہے۔ عقب میں تاریکی تھی۔ لیکن میں اسی طرف جانے لگی۔ کچھ دیر پہلے تک مجھے عزت خطرے میں نظر آرہی تھی پھر اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ وہ شخص جو فرعون بنا ہوا تھا لمبے سے بھی پہلے گزروں میں بدل گیا اور اس کے ساتھی جو جسے کی بات کر رہے تھے ان کے جسے میں بھی موت آئی۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ ہوا کیا تھا؟ اوپر سے سنسنائی آواز کے ساتھ آنے والی چیز کیا تھی جس نے لمحوں میں اس جگہ کو تباہ کر دیا تھا۔

اللہ نے میری جان اور عزت دونوں کی حفاظت کی تھی۔ مگر اب میں سوچ رہی تھی کہ میں کس طرف جاؤں جو محفوظ رہ سکوں اور مدد حاصل کروں۔ میں رکی نہیں تھی بلکہ سونے کے دوران بھی بڑھتی رہی تھی۔ روشنی نہیں تھی مگر جب بجلی چمکتی تو چند لمحوں کے لیے ماحول روشن ہو جاتا تھا۔ یہاں کھیت تھے اور ان کے درمیان میں پگ ڈنڈیاں تھیں۔ کھیتوں میں گندم کے پودے زمین سے سر نکال چکے تھے۔ میں کھیتوں کے درمیان سے گزرتی رہی تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو مجھے دور چند کچے گھروندے دکھائی دیے اور میں اس طرف بڑھنے لگی۔ امید کے ساتھ خوف بھی تھا کہ کہیں یہاں مجھے مدد کی بجائے فضل جیسے کسی شیطان سے واسطہ پڑ جائے۔ مگر امید کے سہارے بڑھتی رہی۔ جب قریب آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ دیکھی بھالی ہے اور یہاں بابا کے ایک واقف کار زمیندار کے مزارع رہتے تھے آس پاس کی زمین بھی اسی زمیندار کی تھی۔ مشکل رخ بستہ بارش میں بیٹھنے سے میری حالت خراب ہو گئی تھی اور میں پہ مشکل ایک مکان تک پہنچی اور اس کی زنجیر پکڑ کر بجانے لگی۔ میں پوری قوت سے بجا رہی تھی کہ اندر آواز پہنچے اور بالآخر اندر سے کسی

عورت کی آواز آئی۔ ”کون ہے اس وقت؟“ ”دروازہ کھولو۔“ میں چلائی۔ میری آواز نے کام کیا اور عورت نے دروازہ کھول دیا۔ اسے دیکھتے ہی میں لہرائی اور بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔ پھر مجھے ہوش آیا تو میں حویلی میں تھی ماں، بی بی اد۔ بابا میرے پاس تھے۔ ان کو دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ مجھے پیار کر رہے تھے اور تسلی دے رہے تھے۔ پھر ماں جی نے بتایا کہ میں جس گھر تک پہنچی تھی اس کا ایک آدمی بابا کے پاس آیا تھا کیونکہ عورت نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس وقت میں صاف ستھری تھی ماں جی نے مجھے صاف کر کے میرے کپڑے بدل دیے تھے۔ مگر جب اس گھر تک پہنچی تو میں کچھز اور خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ میں گھر سے غائب ہوئی تو ماں جی اور بابا پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسی وقت پولیس میں رپورٹ کی اور سب سے پہلے نصیرہ بی بی پکڑی گئی۔ پولیس کو دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے بتایا کہ مجھے مظفر چودھری نے اغوا کر لیا ہے۔

مگر جب پولیس نے اس کے ڈیرے پر چھاپہ مارا تو مظفر چودھری اور اس کے آدمیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ سے ایک پولیس والا مارا گیا تو پولیس نے مزید نفری منگوا لی اور انتقامی جذبے سے مظفر چودھری کے ڈیرے پر چڑھائی کر دی۔ فائرنگ کے تباہی میں مظفر چودھری اپنے چھ ساتھیوں سمیت مارا گیا اور پولیس نے وہاں موجود مزید ایک درجن افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ مگر میں وہاں سے نہیں لی تھی۔

میں نے بتایا کہ مجھے فضل نے اغوا کر لیا تھا اور جہاں مجھے رکھا وہ جگہ نر اسرار طور پر تباہ ہو گئی۔ بابا کی وجہ سے میں کھل کر نہیں بتا سکی تھی کہ وہاں کیا ہونے والا تھا اور اللہ نے میری عزت محفوظ رکھی تھی۔ پولیس آئی اور مجھ سے بیان لیا۔ میں نے اس جگہ کے بارے میں بتایا تو پتا چلا کہ گزشتہ رات سرحد پار سے بھارتی فوج نے گولہ باری کی تھی جس میں وہ جگہ تباہ ہوئی جہاں میں قید تھی۔ وہ اصل میں مارٹر گولے تھے جو سنسنائی آواز کے ساتھ کانچ پر گرے تھے۔ میں سن کر حیران رہ گئی تھی کہ اللہ کیسے اپنے مجبور بندوں کی مدد کرتا ہے۔ بات زیادہ پھیلی نہیں تھی اور بابا نے صرف پولیس کو بتایا تھا۔ مگر آنے والے دنوں میں یہ بات پھیل گئی۔ مگر کسی نے میری بات کو سنی پر شبہ نہیں کیا تھا۔



تشنگی

محفوظہ غرار رسول
السلام علیکم

ہم مصنوعی زندگی جینے کے عادی بنتے جا رہے ہیں۔ ہمیں یہ تک احساس نہیں کہ مصنوعیت خوش حال زندگی کی موت ہے۔ یہ بظاہر پرسکون نظر آنے والی مصنوعی زندگی تباہی کے عمیق غار کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اگر میری بات غلط لگے تو مرینہ اسد کے حالات دیکھ لیں اس کے مقابلے میں آسیہ کیسی اُسودہ زندگی گزار رہی ہے۔ پیچ در پیچ والی یہ زوہد یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

صدف آصف
(کراچی)

نوٹے، وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے سے بالکل نہیں ہچکچاتے، سامنے والے کو نیچا دکھانے میں بھی ایک عجیب سی لذت محسوس ہوتی ہے۔
مرینہ اسد کا بھی اس وقت کچھ ایسا ہی حال تھا، وہ جو

روٹیوں کا اظہار چہرے کے تاثرات سے بخوبی ہوتا ہے، دل محبت، خلوص سے بھرا ہو یا رشک و حسد کے جذبے سے پُر ہو کچھ لوگ چاہتے ہوئے بھی چھپا نہیں پاتے یا انہیں دوسروں کی پروا ہی نہیں ہوتی، ان کی بلا سے کسی کا دل ٹوٹے تو

شروع ہوئی تو رکسنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آسیہ چپ چاپ بیٹھی اس کی لن ترانیاں سننے پر مجبور تھیں، کیوں کہ گھر آئے مہمان کی عزت کرنا اس کے مزاج اور روایت کا حصہ تھا۔
”اوہ آس، تمہارا دم نہیں گھٹتا، تم اتنی قدیم تو نہیں ہو جتنا تم نے آثار قدیمہ جمع کر رکھا ہے“ مرینہ نے کاغذ سے اچکا کر منہ بناتے ہوئے لفاظی کی انتہا کر دی۔

”کیوں بھی؟ فرنیچر میں بھلا کیا برائی ہے؟ میں نے ہمیشہ اس کی حفاظت کی ہے۔ جب ہی پرانا ہونے کے باوجود چمک دکھ ماند نہیں پڑی۔“ آسیہ نے سنہری بارڈر والے نازک سے گلاس میں ٹھنڈا پانی مرینہ کو پیش کرتے ہوئے دیے لفظوں میں صفائی دی۔ اسے مرینہ کا بے باک تبصرہ بالکل پسند نہیں آیا تھا مگر اس نے برداشت کا دامن تھامے رکھا۔
”آسیہ تم لوگ کس زمانے میں جی رہے ہو؟ میں تمہارے سامان کی برائی نہیں کر رہی بلکہ یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اب اس قسم کا فرنیچر آؤٹ آف فیشن ہو چکا ہے، ویسے بھی تمہاری شادی کو کئی سال گزر چکے ہیں ڈیزیز یہاں تو فیشن ڈوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔“ مرینہ نے اپنی نازک سی ناک ناگواری سے سکھرتے ہوئے ایک دم پٹری بدلی۔ اس کی باتوں نے آسیہ کو گہری سوچ میں مبتلا کر دیا۔ کیوں کہ وہ خود بھی کئی مہینوں سے گھر کی تزئین و آرائش کے لیے فراز کے پیچھے پڑی ہوئی تھی مگر وہ مسلسل نالے جا رہا تھا۔

”اچھا ایک بات بتاؤ؟ ایک مہینہ چیزیں دیکھ کر تم لوگوں کا دل بیزار نہیں ہوتا، نہ بابا نہ مجھے تو ایسی یکسانیت سے شدید کوفت ہوتی ہے۔ میں تو اسی لیے کچھ مہینے گزرتے نہیں ہیں کہ اسد کے پیچھے لگ کر پورے گھر کا رنگ و روغن تبدیل کر داتی ہوں۔ سارے کمروں کو دوبارہ سے جدید انداز میں ڈیکوریٹ کر داتی ہوں، گاڑی کا پراٹا ماڈل تبدیل کر کے نئی خریدتی ہوں، جب کہیں جا کر سکون ملتا ہے“ مرینہ اپنی نیوی بلیو قیمتی ساڑی کا پلوٹیک کرتے ہوئے اترائی دوایسی ہی تھی جب تک اپنی غلط بات کو بھی دلائل سے منوانہ کی جھٹ جاتی رکھتی۔ آسیہ کو اس کا تسخرانہ لہجہ ایک دم برا لگا۔

”اتنے سالوں سے ایک ہی ماڈل کے شوہر کے ساتھ کیسے گزارا کر رہی ہو؟ انہیں تبدیل کرنے کا نہیں سوچتیں۔“ آسیہ نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر مرینہ کی شیخیوں پر جل کر سوچا۔

”اب یہ کارپٹ دیکھو، کتنا پرانا ڈیزائن ہے۔“ مرینہ اس کے جذبات کی پروا کیے بغیر بولے جا رہی تھی۔ آسیہ نے

اس کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے کالے بالوں پر سنہرا رنگ کر دیا تھا۔ جسم تھوڑا بھر گیا تھا مگر اس کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شیشے کی میز پر اس کی نخر و ملی انگلیاں مسلسل تھرک رہی تھیں۔

”مرینہ بالکل ویسے کی ویسی ہے۔ منہ کھولتے ہوئے بالکل نہیں سوچتی، جب ہی تو پونی ورسی میں بھی سب اس سے چرتے تھے۔ جہاں بائی، پورا گروپ اس سے پیچھا چھڑانے کے چکر میں تھر تھر ہو جاتا۔“ آسیہ نے اپنی پونی ورسی کی یادوں کو تازہ کیا۔

”تبدیلی میری جان، تبدیلی ہر انسان کو اچھی لگتی ہے۔ مجھے دیکھو، کتنی اپ ٹو ڈیٹ ہوں اور ایک تم ابھی تک پرانے زمانے میں جی رہی ہو۔“ مرینہ نے ایک ادا سے کہا۔ آسیہ نے لبوں تک آتے ہوئے قہقہے کو روکا۔ مرینہ کا حد سے بڑھا ہوا مصنوعی انداز۔ اس کی خوبصورتی پر داغ بنا جا رہا تھا۔ اس کی شخصیت کا بھدا پن نمایاں ہو رہا تھا۔

”تم بھی کیا ایک ہی چیز کو لے کر بیٹھ گئیں۔ چھوڑو ان باتوں کو میں تمہیں گرم گرم چائے پلاتی ہوں۔“ آسیہ نے پرانے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ جس کی چولیس اب مل گئی تھیں۔ چ..... چ کی آواز نکلی۔ کثرت استعمال کی وجہ سے اس کے اسپرنگ اب بیٹھے والے کو جیسے لگے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے میوزک الگ بجتا تھا۔ مرینہ نے فوراً ہی اسے تسخرانہ ہنسی سے نوازا۔

آسیہ کا دل ایک دم چھوٹا ہونے لگا۔ اس کے اندر ایک یہی خامی تھی۔ وہ سامنے والے کی برتری سے بہت جلد مغلوب ہو جاتی۔ فراز کی بے تحاشہ محبت کے باوجود اس میں اب تک اعتماد کا فقدان تھا، اسی لیے وہ مرینہ کی فضول باتوں کا منہ توڑ جواب دینے کی جگہ اس سے متاثر ہونے لگی۔ چائے کا بہانہ بنا کر وہاں سے تیزی سے اٹھ گئی۔

مرینہ نے کمرے سے جاتی ہوئی آسیہ کے حسین چہرے کی طرف دیکھا، سبک نقوش پر اترتی اداسی، اور بھگی پڑی رنگت دل کو ٹھنڈک کا احساس دلانے لگی۔ آسیہ فراز کی محبت اور رفاقت پا کر حسین ترین ہو گئی تھی۔

مرینہ کی نفسیات میں ایسی کجی تھی کہ وہ دوسروں کو دکھ دے کا لطف اٹھاتی۔ اس کے اندر بے چینیوں کا ایک جہاں آباد تھا۔ وہ اپنی ناکام زندگی کی ذمے داری ہمیشہ دوسروں پر ڈالتی آئی تھی۔ آسیہ کے لیے تو اس کا دل پہلے ہی غبار سے لالاب بھرا ہوا تھا۔

”اب کیا کروں..... مل کیسے ادا کروں؟“ آسیہ نے مزید ابرگر اور کولڈ ڈرنک کی ٹرے تھامنے کے بعد اپنے کالے بیگ میں ہاتھ ڈال کر پیسے ٹولے تو یاد آیا کہ ممانے بونچورٹی جانے کے لیے پانچ سو کا ایک کڑکنا نوٹ دیا تھا، وہ تو ٹیمبل پر ہی بھول آئی۔ اب اتنے سے پیسوں کے لیے سب کے سامنے بے عزتی کا خوف جو طاری ہوا تو اس کا حسین چہرہ دھندلانے لگا۔

اس کا آج یونیورسٹی میں پہلا دن تھا، وہ اتنی ہڑبونگ میں گھر سے نکلی کہ ناشتا بھی نہیں کرسکی۔ ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈنے میں الگ برا حال ہوا۔ بھوک عروج تک جا پہنچی تو اس نے کینے میرا کا رخ کیا۔ اب ایک نئی پریشانی لاحق ہو گئی۔ وہ سوچ میں گم تھی کہ آرڈر سرور کرنے والے لڑکے عارف نے اسے ٹوکا۔ وہ اسٹوڈنٹ کی ایسی شرارتوں سے بیزار ہو چکا تھا، جو اکثر مل دیے بغیر بھاگنے کے چکر میں رہتے اور بعد میں اسے مالک سے خوب ڈانٹ پڑتی۔

”جلدی کریں جی، رش بڑھ رہا ہے۔ آپ راستہ روکے کھڑی ہیں“ عارف ایک دم تیز لہجے میں بولا تو آسیہ کی ہمت مزید جواب دے گئی۔

”پلیز..... ایک منٹ“ اس نے ٹرے وہیں کاؤنٹر پر رکھی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پین ہونٹوں میں دبایا اور سائیڈ میں ہو کر بڑی جانفشانی سے بیگ کی دوبارہ سے تلاشی لینے لگی، کچھ سکے ہاتھ لگے تو تھوڑا سکون محسوس ہوا۔

فراز جو چائے کی طلب میں یہاں آکر بیٹھا تھا، بہت دیر سے اس معصوم چہرے والی لڑکی کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی بوکھا ہٹ بتا رہی تھی کہ وہ پریولس کی ہے۔ فاعل تک پہنچتے پہنچتے فراز ایسے کئی نظاروں کا عادی ہو چکا تھا۔ یونیورسٹی میں آنے والے نئے اسٹوڈنٹ کی بوکھا ہٹ کوئی نئی بات نہیں تھی مگر اس لڑکی میں کچھ تو الگ بات تھی جو فراز کی نگاہیں نہ جاتے ہوئے بھی بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”ابھی بھی پیسے پورے نہیں ہوئے۔“ آسیہ نے اپنی جھانکی ہتھیلی پر سکون کو جمع کر کے گنا اور خود سے بولی۔ فراز پوری بات سمجھ گیا، تو وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب سے گزرا۔ اپنی پریشانی میں آسیہ کو ہوش ہی کہاں تھا۔ وہ کم پیسے لے کر ڈرتے ڈرتے کانٹری طرف بڑھی۔

”مس.....! آپ لڑے یہاں چھوڑ گئیں۔ ابھی۔ ادھر ادھر ہو جاتی تو آپ شور مچاتیں کہ ہم نے سامان

وہ ایک دم مڑی تو سائیڈ ٹیمبل پر فراز کی مسکراتی ہوئی تصویر سنہری فریم میں دکھائی دی۔ مرینہ ایک تک دیکھے گئی۔ وہ اسی مسکراہٹ پر تو فدا ہوئی تھی، دل ناشاد ایک بار پھر تشنہ

”آس تمہاری وجہ سے میری زندگی کی بہار مجھ سے روٹھ گئی، میرے جذباتوں پر تا عمر خزاؤں نے ڈیرہ جمالیا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

آسیہ لوازمات سے بھری ٹرائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں لوٹی تو مرینہ کو کھویا کھویا سا پایا۔

”مرینہ یار۔ چلو بغیر تکلف کے شروع ہو جاؤ۔“ آسیہ اس کے دل میں چلنے والے برسوں پرانے ناسور سے نا آشنا مسکراہٹ سجائے چائے پیش کرتے ہوئے چہکی تو مرینہ کے خیالات کی مالا بکھر گئی۔

”مجھے لگتا ہے کہ تم شادی کے بعد بہت بورنگ ہو گئی ہو، کچی گھر والی بن گئی ہو..... یار باہر نکلو، دیکھو دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔“ مرینہ نے، اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے مزیدار کباب اور پکچن رول ہری چٹنی میں ڈبو کر کھاتے ہوئے آسیہ کو اس پایا۔

کافی وقت گزارنے کے بعد مرینہ چلی گئی مگر آسیہ اس کے جانے کے بعد بھی ایک ہی جگہ بیٹھی رہی۔ اس کی باتوں کو سچ جانتی خواہشوں کے جال میں پھنستی چلی گئی۔

”نیا فرنیچر، پردے اور اتنے بڑے گھر کا رنگ و روغن، کوئی چھوٹی موٹی خواہش تو تھی نہیں کہ فراز پہ بھر میں پوری کر دیتے۔“ آسیہ کے دماغ نے سمجھایا بھی۔ پھر بھی اس دل کا کیا کرتی؟ جس پر ایک ہی سودا سامایا ہوا تھا۔

”ایک دفعہ گھر کی حالت درست کر والوں پھر اس مرینہ کو ضرور انوائٹ کروں گی جو یونیورسٹی میں تو میرے آگے پیچھے پھرتی تھی، مگر آج کیسی باتیں بتا رہی تھی۔ اس کا غرور تو حد سے تجاوز کر گیا ہے۔“ آسیہ کا معصوم دل اس طرح سے گھائل ہوا تھا، اسے یہ بھی فکر نہیں تھی کہ فراز گھر لوٹے والا ہے۔ دونوں بچیاں اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ امی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ وہ گھر کے سارے کام دام بھول کرنے سے تانے بانے بننے میں مگن ہو گئی۔ آج سے پہلے وہ فراز کی محبت میں کم، اپنی زندگی میں مست ملتک بنی جیسے جا رہی تھی۔ مرینہ کی لکھے دار باتوں نے اس کا دماغ گھما کر رکھ دیا۔ وہ جسے سب کچھ سمجھتی تھی دنیا کی نگاہوں میں تو وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے فراز سے پہلی ملاقات یاد آگئی۔

اور بولے سے قد بر ایسی پھمن کہ دیکھنے والا ایک لمحہ کو ٹھکے جائے۔ فراز نے مکمل جائزہ لے کر اس کا عکس اپنے دل میں اتار لیا۔

”آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔“ آسیہ کی سریلی آواز اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو فراز بے چین ہونے لگا۔ کچھ اور نہ سوچا تو اسے فوراً اپنے گروپ میں شمولیت کی دعوت دی۔ آسیہ کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو اس نے بلا جھجک ہائی بھری۔

☆☆☆

”آسیہ یہ پکڑو..... کافی کا کپ..... اس کے بعد شاعری کے مقابلے کی تیاری شروع کریں گے۔“ رمیض نے فراز کے اشارے پر آسیہ کو کافی کا کپ تھمایا۔ جو وہ اپنے پیٹے کے لیے لایا تھا۔ وہ سب یونیورسٹی میں ہونے والے ایک ادبی مقابلے کے انعقاد میں کوشاں تھے۔ آسیہ صبح سے مصروف تھی چہرے سے ٹکان ظاہر ہو رہی تھی۔

”تم..... نہیں پتی رہے“ آسیہ نے تشکرانہ انداز میں ایک سپ لیتے ہوئے پوچھا تو وہ فراز کو غصے سے دیکھنے لگا۔

”آس..... تم پتی لو..... اس کا موڈ نہیں ہوگا۔“ فراز نے شوخی دکھائی تو رمیض نے اسے گھورا۔ پوری یونیورسٹی میں وہ واحد بندہ تھا جسے اپنے دوست کے دل کی خبر تھی۔

آسیہ کو یہاں، جلد ہی ایسے قلعہ دوستوں کا ساتھ میسر آ گیا۔ وہ بڑی شوخ اور چٹیل لڑکی تھی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اس کا نام سر فہرست رہتا۔ وہ پورے گروپ کی کرتا دھرتائی ہوتی تھی۔ سب اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے اسے بہت اہمیت دیتے تھے، سوائے مرینہ کے جو فراز کی وجہ سے اس گروپ میں شامل ہوئی تھی مگر پیسے پر گھمنڈ اور بد مزاجی کی وجہ سے اس کی دوسرے ساتھیوں سے کم ہی بنتی تھی۔

آسیہ کے آتے ہی مرینہ کی اہمیت مزید کم ہو گئی۔ وہ اس کی مقبولیت سے جلتی تھی، مگر مجبور تھی، اگر معاملہ فراز کا نہ ہوتا تو ان لوگوں کو منہ بھی نہ لگاتی مگر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ساری باتیں برداشت کر رہی تھی۔ وہ شروع سے ہی فراز کی سحر انگیز مسکراہٹ اور نشیلی آنکھوں پر مرعشی تھی، اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کی دولت اور اثر و رسوخ سے متاثر ہو کر متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا فراز اس سے خوشی خوشی شادی کر لے گا۔ وہ بات نہیں جانتی تھی ان تئوں میں تیل نہیں۔

وہ فراز کا چمکاؤ آسیہ کی جانب ہوتا دیکھ کر کڑھنے لگی تھی، آسیہ مرینہ کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی

نہیں دیا۔“ عارف اسے دیکھتے ہی شروع ہو گیا۔

”وہ..... دراصل..... میرے پاس مل۔ میں۔ اگر کل.....“ آسیہ نے انک کر اپنا مدعا پیش کرنا چاہا مگر شرمندگی سے بولا نہیں گیا۔

”ہاں..... مل ادا ہو چکا ہے۔ بس اب یہ لے جائیں۔ برگر مشنڈ اور ڈرنک گرم ہو گئی ہے۔“ لڑکے نے سر پر ہاتھ مار کر کہا اور ٹرے زبردستی اسے تھما دی۔

”کیا؟ میرا مطلب ہے..... کس نے مل ادا کیا؟“ حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

”مس..... آپ کیوں بکری کے وقت ہمارا نام خراب کر رہی ہیں، وہ جو سامنے کالی شرٹ میں فراز بھائی بیٹھے ہیں..... اس نے مل دیا ہے۔“ عارف نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا، اس کی زبان سے تیز اس کے ہاتھ چل رہے تھے فراز سب کا ہر دل عزیز تھا اسی لیے کافی لوگ اسے پہچانتے تھے۔ عارف مڑ کر جلدی سے دوسرے اسٹوڈنٹ کے آؤر کی تکمیل کرنے لگا۔ وہ کم صم کھڑی رہ گئی، پھر اخلاقی تقاضے نبھانے کے لیے اس میز کی طرف بڑھی جہاں فراز تنہا بیٹھا بٹکلیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”تھینک یو..... میں پیسے گھر بھول آئی تھی..... کل ہی لوٹا دوں گی۔“ آسیہ نے فراز کے قریب پہنچ کر جھکتے ہوئے کہا۔

”شکر یہ کی کوئی بات نہیں ہے..... اب ہم ایک جگہ پڑھتے ہیں..... بھی آپ بھی مجھے چائے پلا دیجیے گا، حساب برابر۔“ فراز نے اسے اپنی میز پر بیٹھنے کی آفر کی اور ہلکے پھلکے انداز میں اس کی شرمندگی دور کرنا چاہی۔

”وہ تو میں ضرور پلاؤں گی مگر پہلے آپ کو مل کے پیسے لینے پڑیں گے“ آسیہ وہیں بیٹھ کر چیٹ پوجا کرتے ہوئے قدرے ریلکس انداز میں سر ہلا کر یونیورسٹی کی طرف دیکھنے لگی۔

”چلیں، اگر آپ پیسوں کی واپسی کے لیے اتنی ہی بھند ہو رہی ہیں تو کبھی کسی اور کو مشکل میں دیکھیں پوچھا موٹی سے اس کی مدد کر دیجیے گا..... بس میرا قرضہ اتر جائے گا“ فراز کے چہرے کی سحر انگیز مسکراہٹ اور سوچ کا مثبت انداز آسیہ کے دل میں گھر کر گیا۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی اس سے کافی متاثر ہو گئی۔

فراز کو بھی آسیہ بہت اچھی لگی، سنہری رنگت، کالی لٹ اس کی صندل جیسے پرلہر رہی تھی، شہابی نخل سے لب، آنکھوں میں ایسی چمک جیسے فانوس جل اٹھے ہوں، بے انتہا پرکشش

مرینہ نے ایک دو پار آئیہ سے بدتمیزی کرنے کی کوشش
مگر فراز کا اتنا براری انکشن سامنے آیا کہ اس نے مجبوراً اس
با طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا، بھولی بھالی سی آس نے خوشی
رشی اسے دل سے دوست مان لیا۔

فراز بظاہر اس سے اخلاق سے ملتا..... مگر اس کے دل
مرینہ کے لیے کوئی خاص جگہ نہ تھی۔ آئیہ سے ملنے کے بعد
فراز کے دل میں کسی اور کے لیے جگہ بچی ہی نہیں..... وہ
ری کی پوری سامگنی۔

☆☆☆

ابھی ان لوگوں کا تعلیمی سال اختتام پر ہی ہوا تھا کہ
ایک دن فراز نے سب کو فون کر کے یونیورسٹی میں ملنے کے
لیے کہا اور دھماکا کر ڈالا، کم از کم مرینہ کے لیے تو یہ دھماکا ہی
ثابت ہوا جس نے اس کی ہستی کے پرچے اڑا ڈالے۔

”دوستوں..... قدر دانوں..... مہربانوں..... اس
اتوار کو میرے غریب خانے پر جمع ہو جانا“ فراز کی خوشی
جھپائے نہیں چھپ رہی تھی، آئیہ بھی ایک ہفتے سے یونیورسٹی
نہیں آ رہی تھی، سب حیران و پریشان اس کے گرد جمع ہو گئے
سوائے رمیض کے جو فراز کا یار غار تھا، وہ دور کھڑا دوست کی
خوشیوں کے لیے دعا گو تھا۔

”یہ کیا نیا ڈراما ہے؟ تیرا ولیمہ ہے جو سب کو اپنے گھر بلا
رہا ہے۔“ ناصر نے سپاری کا پورا پیکٹ منہ میں ڈالتے ہوئے
اسے چیخا، مرینہ کا دل دھڑکا۔ وہ بغور فراز کو دیکھنے
لگی..... آئیہ بھی ابھی ابھی آکر ان لوگوں کے پاس کھڑی
ہوئی تھی، اس کے چہرے کی شرمیلیں مسکراہٹ اور گالوں پر
اندلی شرم و حیا کی لالی کوئی نئی داستان رقم کرنے جا رہی تھی۔
”بھائی..... اتوار کو میرا نکاح ہے..... ویسے کی دعوت
ایک سال بعد کھلاؤں گا۔“ فراز ایک دم شوخ ہو گیا۔ وہ
مرینہ کی حالت سے بے پروا، سرشار ساد و شہب سے مبارک
بادیں وصول لے لگا۔

”کیا..... کب..... اچانک..... کس سے؟“
نے اس پر گھونسوں کی بارش کرتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ
کر دی۔ وہ ہنستا ہوا وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

”اس راز سے تو آس ہی پردہ اٹھائے گی۔“ فراز نے
معنی خیز نظروں سے آئیہ کو دیکھا جو چھوٹی موٹی ہوئی جا رہی
تھی۔ مرینہ دل پر ہاتھ رکھ رکھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کا ہنسی
مذاق دیکھ رہی تھی۔

”کیوں تیرا منہ ٹوٹ جائے گا..... جلدی بتا“ شاہد نے

اسے ایک گھونسا رسید کیا اور بولا۔

”میرے پیاروں..... راج دلا روں..... مابدولت۔
اپنے اور آئیہ کے نکاح میں شرکت کا دعوت نامہ دینے خاص
طور پر یونیورسٹی آئے ہیں۔“ وہ چپکا تو سب دوستوں نے خوشی
سے نعرہ لگایا۔

”اوئے..... اوئے..... جھپی رستم۔ تسی مگریت
ہو..... کمال کرو یا یار۔ ہماری ناک کے نیچے سب چلتا رہا اور
ہمیں خبر ہی نہیں۔“ ناصرہ چیخ کر اس سے لپٹ گئی..... اب
پورے گروپ کی توہوں کا رخ آئیہ کی طرف ہو گیا جس کے
لبوں پر بڑی دلنشین مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”ویسے تو میری دوست بنتی ہو اس کے باوجود مجھ سے
اتنی بڑی بات چھپائی۔“ مرینہ نے کمر پر ہاتھ رکھا اور آئیہ کے
مقابل کھڑے ہو کر غصے سے چنگھاڑی، پورا گروپ ایک دم
سنجیدہ ہو گیا۔ مرینہ کے انداز نے خوشی کے ماحول کو بدل کر
رکھ دیا۔

”یار..... اس میں بتانے والی کیا بات تھی؟ مجھے
دوران تعلیم ان فضولیات میں پڑنا نہیں تھا، اب رازی کی فیملی
اچانک ہمارے گھر آئی اور دو دن میں یہ رشتہ طے
پا گیا۔“ آئیہ اس کی نیت جانے بغیر ہاتھ پکڑ کر صفائی دینے
لگی۔

”پلیز..... کول ڈاؤن۔“ فراز کا چہرہ غصے سے سرخ
ہو رہا تھا۔ وہ مرینہ کو کچھ سناٹا چاہ رہا تھا مگر رمیض نے اس کا
ہاتھ دبا کر سرگوشی کی۔

”اچھا..... سوری..... یار..... چھوڑو..... ان باتوں کو تم
نکاح والے دن صبح سے میرے گھر آ جانا۔“ آئیہ اس کا ہاتھ
تھام کر پیار سے بولی مگر مرینہ نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا،
اپنا بیک اٹھایا، اور سر جھکائے بغیر کسی سے ملے من کیٹ پار
کر گئی، یونیورسٹی سے جاتے ہوئے۔ وہ صرف رازی کی اچھی
یادیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اسی لیے مڑ کر آئیہ کی
جانب دیکھا بھی نہیں جو اس کے رویے پر سن سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

”آس..... ہانیہ..... ارے سب
کہاں ہو؟“ فراز جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ ایک اجنبی سا
احساس دلی چٹھا گا، اس کی بے قرار نگاہیں بیوی اور بیٹیوں کو
تلاش کرنے لگی۔

”پاپا..... پاپا کلپٹ دیں“ وہ دونوں جو تھوڑی
دیر پہلے ہی ماموں کے ساتھ کوئی تھیں ماں کا موڈ آف دیکھ

کر اپنے کمرے میں جا کر کھلونوں سے کھیلنے لگیں۔ باپ کی ہکار پر یوں آکر لپٹ گئیں، جیسے سالوں کی چھتری ہوئی ہوں۔ فوراً فرمائش کر دی۔

”یہ لو اپنا بھتا..... جانتا تھا اس کے بغیر گھر میں انٹری تھوڑی ملے گی۔“ فراز نے ہنستے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دونوں کو چاکلیٹ پکڑائیں۔ ان دونوں نے ایک ساتھ باپ کا منہ چوما تو فراز۔ زسرساری سے آنکھیں موند لیں، دن بھر کی تکان ہوا ہو گئی۔

”ارے۔ چلو خدا خالہ آئی بیٹھیں ہیں..... جلدی سے ڈرائنگ روم میں جا کر سیپارہ پڑھو۔“ آسیہ نے پھسکی سی مسکراہٹ سے شوہر کا استقبال کیا۔ اور بیٹیوں کو اس کا رُف پہنا کرتا کید کی، وہ دونوں سیپارہ سینے سے لگا کر سر ہلاتی ہوئی اندر کی طرف بھاگیں۔

”اوہو کیا بات ہے..... شوہر کے آتے ہی سب کو بھگا دیا۔“ فراز نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر بیوی کو دیوار سے چپکا دیا۔

”اف..... آپ کا کیسے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہو گیا ہے؟ فضول باتوں میں ماہر ہو گئے ہیں۔ جلدی سے فریش ہو جائیں۔ میں نے سینڈویچ بنائے ہیں۔“ آسیہ نے بے دلی سے اپنا آب چھڑایا اور باہر نکل گئی۔ فراز کو اس کی بے اعتنائی ایک دم بری لگی مگر سر تھک کر نظر انداز کرتا ہوا داش روم کی طرف بڑھ گیا۔

”سنیں، آپ کو مرینہ یاد ہے..... وہ جو، ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی“ آسیہ نے فراز کو تولیہ پکڑاتے ہوئے پوچھا، وہ ہاتھ منہ پونچھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔

”مرینہ..... وہ بھی سنسنی خیز تھی۔ جس کی کسی سے نہیں بنتی تھی۔ مجھے یاد آیا وہ بھی ایک عجیب و غریب شخصیت تھی۔ شوائف کرتی رہتی تھی۔“ فراز نے فون پر زور ڈالا اور کچھ سوچ کر کہا۔

”جی ٹھیک پہچانا۔ آج وہ اتنے سالوں بعد ہمارے گھر آئی تھی۔“ آسیہ نے پلیٹ میں کچپ نکال کر اسے چنڈوچ کے ساتھ پیش کیا۔

”ارے..... وہ محترمہ یہاں کیسے۔ خیریت۔ تو تھی؟“ فراز نے حیرت سے پوچھا۔

”پتا نہیں..... بتا رہی تھی کہ اس نے ناصرہ سے سارے پرانے دوستوں کے ایڈریس حاصل کیے ہیں۔ اب سب سے مل کر پرانی یادوں کو تازہ کر رہی ہے۔ اصل میں وہ دو

سال سے بیویشن کا کوئی خصوصی کورس کرنے دینی گئی تھی، چند دنوں قبل پاکستان لوٹی تو پرانے لوگوں سے دو میل ملاپ شروع کیا ہے۔“ دھانی سوٹ میں لمبے بالور جوڑا بنائے آسیہ بہت پیاری لگ رہی تھی، فراز کو مرینہ بارے میں جاننے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو بیوی حسن کی چمک میں کھونے کا طلب گار رہ رہا تھا۔

”تو پھر..... ٹھیک ہے نارازی، ہم اس بار۔ ڈرائنگ روم کے صوفے اور فرنیچر تبدیل کر سکتے ہیں نا۔“ ا کی داستان حزرہ کب ختم ہوئی، فراز کو خبر نہیں، نیند سے اس آنکھیں پونچھ رہی تھیں فرنیچر کی تبدیلی کا سن کر چونک۔ اٹھ بیٹھا۔

”کیا مطلب؟..... یہ مرینہ کا ذکر ہوتے ہوتے بار۔ گھر کی سجاوٹ تک کہاں جا پہنچی؟“ فراز نے سنجیدگی سے پوچھا۔ آج کل کے حالات میں غم جاناں سے اہم غم روزگار ہوا تھا۔

”مرینہ آئی تھی، کچھ نہ کچھ تو برا ضرور ہوتا تھا۔“ فراز دل اندیشوں میں گھر گیا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر سوچ لکیریں پھیل گئیں۔

”بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ اب گھر کو نئے انداز میں سجایا سنوارا جائے، بھلا اس میں کیا غلط بات ہے؟“ آسیہ۔ گھبرا کر صفائی پیش کی، وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہی سمجھ گئے کہ رازی کو اس کی بات سے اتفاق نہیں ہے۔

”میرا خیال ہے کہ فی الحال یہ بات قابل عمل نہیں ہے۔“ سمجھیں پتا ہے کہ بڑی مشکلوں کے بعد تو ہمارا بزنس جما ہے۔ میں ابھی کسی قسم کی فضول خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“ فراز نے نہ جانتے ہوئے بھی بیوی کے چہرے پر چھائے اشتیاق کو نظر انداز کیا۔ دو نوک الفاظ میں بات ختم کر دی، وہ اس معاملے میں اس کو جھوٹے خواب دکھانا نہیں چاہتا تھا۔

”یہ بات تو میں کئی سالوں سے سن رہی ہوں کہ حالات صحیح نہیں، حالات صحیح نہیں..... اب ایسا بھی کیا کہ انسان دل مار کر بیٹھ جائے۔ مجھے نہیں پتا، اب..... گھر میں کچھ نہ کچھ تو نئی تبدیلی ہونا چاہیے۔ کمروں کی حالت دیکھو..... گھر نیا رنگ و روغن مانگ رہا ہے۔ اس بار تو میں پردے بھی تبدیل کروں گی۔“ وہ دھوکھو کر ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔“ آسیہ نے منہ بھلا کر جوابی لہجہ میں کہا۔

”سمجھیں کیا لگتا ہے۔ مجھے اپنے گھر کو اچھی حالت

ایکٹراز جیل سے

فرار معما بن گیا

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر سان فرانسسکو کے ساحل سے ڈیڑھ میل دور ایکٹراز (Alcatraz) جزیرے پر قائم جیل سے اب تک 36 قیدی فرار ہونے کی کوشش کر چکے ہیں۔ ان میں دو قیدی ایسے بھی تھے جنہوں نے فرار ہونے کے لیے دوبارہ قسمت آزمائی لیکن دونوں مرتبہ ناکام رہے۔ فرار کی کوشش کرنے والے دیگر قیدیوں میں 23 قیدی فرار کے دوران پکڑ لیے گئے اور چھ محافظ کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ تاہم تین قیدی، فرینک مورس، کلیرنس اینگلین اور جون اینگلین گیارہ جون 1962ء کو اس جزیرے سے ایسے فرار ہوئے کہ ان کا آج تک پتا نہ چل سکا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ آج بھی ان کے نام ایف بی آئی کی مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ تینوں مفروضہ قیدی فرار کے دوران سمندر میں ڈوب گئے۔ تاہم تلاش کی متعدد کوششوں کے بعد بھی ان کی لاشوں کا پتا نہ چل سکا۔ اس واقعے نے اتنی شہرت حاصل کی کہ 1979ء میں اس پر ہالی ووڈ میں اسکیپ فرام ایکٹراز کے نام سے ایک فلم بنائی گئی جس میں فرینک مورس کا کردار ادا کار کلیٹ ایسٹ وڈ نے ادا کیا۔

مرسلہ: احسان سحر۔ میانوالی

لگا۔ آسیہ کو کمرے میں رازی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ چونک کر مڑی۔

”اچھا..... مرینہ میں تم سے کل بات کروں گی۔“ اس نے جلدی سے فون بند کیا اور نگاہ اٹھا کر فرار کو دیکھا۔ وہ جوتے پہننے میں مصروف تھا۔ چہرے کی شیوہ بڑھی ہوئی۔ لال آنکھوں کے ساتھ بہت تھکا تھکا لگ رہا تھا، ایک لمحے کو تو دل چاہا کہ جاری ناراضی بھلا کر اسے فکروں سے آزاد کر دے مگر وہ چپ چاپ بیٹھ رہی۔

”مرینہ، کتنی ہے، اب تو یہ رازی کی محبت کا امتحان ہے، اسے میرا کتنا خیال ہے؟“ وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں دیکھنے کی خواہش نہیں..... مگر یہ کوئی دوسرے کا تو کھیل نہیں۔ ایک بار ہاتھ تو لگا کر دیکھو پھر پتا چلے گا کتنے پیسے کھڑے دم رچ ہو جاتے ہیں مگر تم سمجھتی ہی نہیں ہو۔“ فرار غصے سے بولا۔ آسیہ رونے بیٹھ گئی، مرد کو قابو میں رکھنے کے لیے آنسو عورت کا سب سے قدیم اور موثر ہتھیار ہے۔ یہ تدبیر اس وقت بھی کارآمد ثابت ہوئی۔ وہ ایک دم موم ہونے لگا۔

”آس..... میری جان، پلیز چپ ہو جاؤ۔ اچھا میری ایک بات تو سنو..... مجھے ایک بڑا آرڈر ملنے کی امید ہے اگر اس میں منافع ہو گیا تو یقین کرو یہ بندہ خطا کار فرمائش ضرور پوری کرے گا۔ پلیز جہاں اتنا صبر کر لیا وہاں تمہوڑا انتظار اور کرلو۔“ فرار نے پیار سے اس کے رشتہ میں بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے منانے کی کوشش کی۔

”رازی، میں جانتی ہوں آپ مجھے ایسے ہی بہلا رہے ہیں۔ شادی سے پہلے تو آسمان سے تارے توڑ لانے کی باتیں کرتے تھے۔ اب ایک چھوٹی سی گھر جانے کی خواہش پوری نہیں کر پار ہے ہیں..... اچھا خیر مجھے اپنے اور بچیوں کے گرم کپڑے خریدنے ہیں، اس لیے اضافی رقم چاہیے، اتنا تو کر سکتے ہیں نا“ آسیہ پر مرینہ کی باتوں کا ایسا طعنے چڑھا کہ اسے رازی کی محبت کی شفافیت پر شبہ ہونے لگا، اس کے طنز یہ انداز پر فرار کو صدمہ پہنچا۔

اف..... یہ مجھ سے اتنی بدگمان ہو گئی ہے، اسے لگتا ہے کہ میں کچھ نہیں کر سکتوں گا۔ فرار کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کی اپنی آس ہے، جو بن کہے ہر بات سمجھ جاتی تھی۔ بیوی کی بے رحمی پر اس کے دل میں درد سا اٹھا، وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

”بس یار، فرار کا مزاج ایک دم مختلف ہے، وہ اسد بھائی کی طرح نہیں سوچتے، میری ناراضی ہے ان پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا ہے۔“ آج بڑے دنوں بعد رازی کی جلدی گھر واپسی ہوئی تو وہ دشمن جاں فون پر مصروف دکھائی دی، وہ اسے ہر حال میں منانا چاہتا تھا تا کہ ان کے گھر پر چھایا جمود ٹوٹ جائے، بچیاں بھی ماں کی بد مزاجی سے پریشان تھیں۔ آس کی روٹھی سی شکل اس پر الگ بھاری پڑ رہی تھی، کام پر بھی توجہ کم ہو رہی تھی مگر وہ کیا کرتا آس صرف بیوی ہی تو نہیں تھی، وہ تو اس کی زندگی تھی بھلا زندگی روٹھ جائے تو کیسے جیا جائے؟ وہ ٹائیہ ہانیہ کے لیے آکس کریم اور آس کے لیے گجرے تھامے کمرے میں داخل ہوا تو وہ فون پر کسی سے دکھڑے رونے میں مصروف تھی۔ فرار اس کی باتیں سننے

”اوہ تو بات اتنی سیدھی نہیں، جتنا میں سمجھ رہا تھا، یہ میاں بیوی کی معمول کی لڑائی نہیں، بلکہ اس کے پس منظر میں تو مرینہ کا ہاتھ شامل ہے، فراز میاں اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا، یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔“ اس نے آسیہ کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تو بالوں میں اٹھیاں پھیرتے ہوئے سوچنے لگا۔

☆☆☆

”مما..... تھک گئے..... اب گھر چلیں.....“ آسیہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ موسم سرما کے کپڑوں کی خریداری کرنے اس بڑے سے شاپنگ پلازا میں آئی ہوئی تھی جو اس کے گھر سے دور واقع تھا۔ کم بجٹ میں اچھے سویٹرز لینے کا معرکہ دو گھنٹے میں جا کر سر کیا تو بچیوں کا بوریت اور تھکن سے برا حال ہو گیا۔ پچھلی رات کو ہی فراز نے اسے ماہانہ خرچے کے علاوہ کچھ اضافی پیسے دیئے تھے، وہ ہانیہ اور ثانیہ کے لیے گرم جری، اپنے لیے ایک گرم سوٹ اور فراز کے لیے بلیک رنگ کی ہائی ٹیک خرید کر فارغ ہوئی تو بیٹیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

”اچھا..... بات تو سنو پاس ہی ماما کی ایک فرینڈ رہتی ہیں، تھوڑی دیر ان کے یہاں چل کر بیٹھتے ہیں، پھر واپس جائیں گے۔“ آسیہ نے بچیوں کو جوس اور چھس کا پیکٹ دلاتے ہوئے کہا تو دونوں نے سر ہلا کر ہائی بھری۔ آسیہ بہت دنوں بعد گھر سے باہر نکلی تھی اسی لیے خوب انجوائے کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے مرینہ کے گھریوں بغیر اطلاع دیے جانے پر پہلے تو اچکچاہٹ محسوس ہوئی۔

”کیا ہوا؟ یوں چلے جانے پر کوئی قیامت تھوڑی آجائے گی؟“ اس نے اپنے سوچا پھر سر جھٹک کر بے فکری سے چل دی مرینہ نے جو ایڈریس دیا تھا۔ وہ پچھلی گلی میں سڑک کے کنارے واقع بڑے بڑے گھر والے میں سے ایک کا تھا، بچیاں جوس پیتے ہوئے خوش خوشی ساتھ چلیں پڑیں۔

☆☆☆

”ارے..... اچانک..... فون کر کے آتی تو اچھا ہوتا۔“ مرینہ کی بے رخی پر آسیہ کا دل خراب ہو گیا، وہ جتنا جوش و خروش سے آئی تھی سب بھاپ بن کر رہ گیا۔ مرینہ انہیں ٹھاٹھا کر تیزی سے اندر واپس چلی گئی۔

آسیہ نے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کا اچھی طرح سے جائزہ لیا جو مرینہ کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا، بے انتہا میٹکے ڈیکوریشن پیسز، جہازی سائز صوفے، کرسٹل کے لیپ شینڈ

دیواروں پر آویزاں شان و شوکت میں اضافہ کر رہے تھے۔ ”واقعی مرینہ کی اتراہٹ جائز ہے، ڈیکوریشن تو اسے کہتے ہیں۔“ آسیہ نے حسرت سے ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس کا احساس کتری کا شکار ایک دم عود آیا۔ ایک دم اندر سے شور کی آواز آئی۔ کوئی مرد گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ مرینہ کے من من کی آوازیں بھی آسیہ کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

”یہ اسد بھائی اس طرح مرینہ سے بات کرنے ہیں۔“ آسیہ کی نگاہوں سے بہت سارے پردے ہٹتے چلے گئے، اسد کا بیوی کے لیے متعفن لہجہ، اس کے اندر پھریں کی دوڑ گئی۔ فراز نے اتنے سالوں میں بھی اس سے اس لب لہجے میں بات نہیں کی۔ مادی خوشی ہی سب کچھ نہیں ہوتی اصل چیز دل کا سکون ہوتی ہے۔ چند لمحوں میں ہی اس کا فلسفہ حیات بدل کر رہ گیا۔

☆☆☆

”شیراز بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟ کب ہوا یہ حادثہ..... رازی کیسے ہیں؟“ آسیہ کی توجان ہی نکل گئی، جب اس کے جینے نے اسے فراز کی گاڑی کے ایکسیڈنٹ کی خبر دی۔ وہ اسے اپنے ساتھ اسپتال لے جانے آئے تھے۔

”افوہ تم چلو تو راستے میں ساری بات بتاتا ہوں۔“ شیراز خود بھائی کی وجہ سے پریشان تھا، اوپر سے آسیہ کا رونا، اسی لیے مجبوراً تھوڑا سخت لہجہ اختیار کیا اور اسے جلدی چلنے کے لیے کہا۔

”دو منٹ..... رکے گا میں آتی ہوں۔“ اس نے تیزی سے چادر اوڑھی، دروازے کو لاک کیا، بچیوں کو پڑوس میں عذرا خالہ کے گھر چھوڑا اور جینے کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شیراز نے گاڑی دوڑائی۔ راستہ صاف تھا، وہ لوگ پندرہ منٹ میں ہی اسپتال پہنچ گئے۔

دونوں بے قراری سے ایمر جنسی کی طرف بڑھے، ڈاکٹر فراز کے سر میں ٹانگے لگانے اور زخم صاف کر کے نئی کرنے میں مصروف تھا، زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے فراز کی رنگت پہلی پڑ گئی تھی، آسیہ کا کھجور منہ کو آگیا، آنسو گالوں پر بہنے لگے تو فراز نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دینا چاہی تو منہ سے ”سی“ کی آواز نکل گئی، شیراز بھی بھائی کے کپڑے خون میں لت پت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

”اسے اب باہر جائیں، مریض ڈسٹرب ہو رہا ہے۔“ ڈاکٹر نے فراز کو ٹانگے میں دیکھا تو انہیں باہر انتظار کرنے کا

کہا۔ وہ لوگ باہر نکل آئے تو فراز کا اسٹنٹ انور ایک شیخ پر بیٹھایا، وہ بی اے اسپتال لے کر آیا تھا۔

”ہتا نہیں..... سر آج کل کن الجھنوں میں ہیں، مگر یہ نوشی بھی شروع کر دی ہے، آفس کا مسئلہ الگ چل رہا ہے، شاید اسی لیے گاڑی چلاتے ہوئے چوک گئے، وہ تو مجھے ہوئے ڈرائیور ہیں مگر پتا نہیں کیسے گاڑی ان سے بے قابو ہو گئی اور فٹ پاتھ سے جا ٹکرائی۔ وہ تو شکر ہے کہ میں گھر جانے کے لیے بایک پر ان کے پیچھے ہی دفتر سے نکلا تھا، لوگوں کا جھوم دیکھا تو رک گیا۔ پتا چلا سر کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ بے ہوش پڑے تھے۔ میں نے لوگوں کے ساتھ مل کر انہیں فوراً ہی اٹھایا اور اسپتال لے آیا۔“ انور شیراز کے برابر میں بیٹھا حادثے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ ساری باتیں سنتے ہی آسیہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز اٹھا۔

”اچھا دفتر میں کس قسم کے مسائل چل رہے ہیں؟ یہ جھوٹا کچھ بتاتا بھی تو نہیں ہے۔“ شیراز کے لہجے میں بھائی کے لیے فکر مندی تھی۔ وہ انور سے تفصیلات جاننے لگے۔ آسیہ کے کان دوبارہ ادھر لگ گئے۔ اسے یاد آیا کہ فراز نے دو دن پہلے اسے کچھ بتانے کی کوشش تو کی تھی مگر وہ منہ پھلائے اس کی بات سننے بغیر اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی، اب دل کو ملال اور بچھتاوے نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

”اصل میں فراز صاحب کو پہلی بار امریکا سے چادلوں کا ایک بڑا آرڈر ملا تھا، انہوں نے سارا جمع جتنا لگا کر مال تو باہر بھجوا دیا مگر وہاں سے وقت پر پیسوں کی ادائیگی نہیں ہو پائی۔ اسٹاف کو تنخواہ دینے کا وقت بھی سر پر آ گیا، پھر دوسرے بلوں وغیرہ کا بھی مسئلہ تھا۔ وہ بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ مسلسل اپنے بائیر کو یاد دہانی کے فون اور ای میل کر رہے تھے مگر ابھی تک وہاں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں آیا ہے۔“ نواز نے تفصیل سے شیراز کو سارے حالات بتائے۔

”اچھا، تو فراز کو یہ پریشانی لگی ہوئی تھی، شاید اسی لیے اس نے غائب دماغی میں گاڑی فٹ پاتھ سے ٹکرائی ہوگی۔“ شیراز نے انور سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، کیوں کہ وہ اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا، کافی دیر ہو گئی تھی، اس کے گھر سے بھی فون آنے لگے تھے، کراچی کے حالات کی وجہ سے ہر شخص سہا سہا سا رہنے لگا ہے۔

”میرا نہیں خیال کہ حادثے کی صرف یہ ہی وجہ رہی ہوگی۔“ انور نے شیراز کے استفسار پر نئی میں سر ہلایا۔ آسیہ اپنی جگہ چوری بن گئی۔

”کیا مطلب، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شیراز نے حیرت سے انور کو گھورا۔

”مجھے فراز صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے، تین سال گزر گئے ہیں۔ ان کی رگ رگ سے واقف ہوں، وہ ایک کھرے کاروباری آدمی ہیں، ایسے مسئلے مسائل تو بزنس کا حصہ ہیں، وقتی پریشانی الگ بات ہے مگر وہ ان سے نمٹنا بھی خوب جانتے ہیں، لیکن آج کل ان کی طبیعت کا چڑچڑاہٹا رہا ہے۔ کہ بات کچھ اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ذاتی پریشانی ہو، اب ہر بات کوئی اپنے دفتر کے ساتھیوں سے شیئر تو نہیں کرتا نا۔“ انور نے گہری نظروں سے ان دونوں کو دیکھا، آسیہ کو سلام کیا اور شیراز سے مصافحہ کیا۔

”ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟“ شیراز نے اس سے ہاتھ ملایا، اور خود کھائی کی۔ ان کی سوئی اسی بات پر اٹک گئی۔

”اب یہ بات تو فراز صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔“ انور نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے، شیراز بھی اس کا شکریہ ادا کرتے اس کے پیچھے چل دیے۔

”اف یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے، میں نے اپنی بے وقوفی میں ایک فضول سی بات کو اتنا کا مسئلہ بنا کر رازی کو اتنی ذہنی اذیت دی کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔“ انور کی باتوں نے آسیہ پر سوچوں کے نئے دروازے کھول دیے۔ دل پر آنسوؤں کی نمی گری تو مطلع صاف ہو گیا، اسی لیے اس نے اپنا حاسبہ شروع کر دیا، ہر طرف سے اپنے آپ کو ہی مجرم پایا۔

”اے لڑکی..... تم رازی کی پریشانی کے بارے میں کچھ جانتی ہو۔“ شیراز نے گاڑی چلاتے ہوئے سوچوں میں گم آسیہ سے پوچھا۔

”جی..... نہیں۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اسی میں عافیت تھی۔ شیراز اسے گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ فراز ابھی دواؤں کے زبر اثر سو رہا تھا، ویسے تو خطرے کی کوئی بات نہیں تھی، لیکن اسے ٹیسٹ کی رپورٹ آنے تک اسپتال میں رکنا تھا۔ رات ہو چلی تھی، آسیہ کی خواہش تو تھی کہ وہ شوہر کے ساتھ گھر کے مگر شیراز نے سختی سے منع کر دیا تھا، ایک تو وہ مردانہ وارڈ تھا، اس لیے انہوں نے خود رکنے کا فیصلہ کیا، پھر بچیوں کا بھی مسئلہ تھا اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے گھر آنا پڑا۔

☆☆☆

آسیہ نے بچیوں کو کھانا کھلایا اور سنانے کے لیے لٹا دیا، چھوٹی ہانیہ جو فراز سے بہت ملی ہوئی تھی اس کے بغیر

سوئے کو تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک پایا کو یاد کر کے روتی رہی، اسے گود میں لیے گھٹنا بھر ٹھلایا۔ وہ پھر کہیں جا کر سوئی۔

”فراز گھر پر نہیں ہیں تو لگ رہا تھا کہ جیسے دنیا کے سارے کام ہی ختم ہو گئے ہوں۔“ آسیہ سوچوں میں گم تھی۔ بچیاں سو گئیں، تو کمر میں اور سناٹا طاری ہو گیا۔ اس کی بھراہٹ کم ہی نہیں ہو رہی تھی، رازی کا زرد چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا تو رونا آ جاتا۔

اس نے وضو کیا اور عشاء کی نماز پڑھنے لگی، خضوع و خشوع سے اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں، بچیوں پر ایک نظر ڈالی، جھوٹی والی نے ٹانگ مار کر چادر دور پھینک دی تھی، دونوں کو حج سے چادر اوڑھائی، کمرے کی لائٹ بجھائی اور قرآن شریف لے کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ دیر تک تلاوت کرنے سے دل کو سکون حاصل ہوا۔ چائے کی طلب ہونے لگی تو وہ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر کچن سے باہر نکل آئی اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ فرنیچر، پردے، شوہن سب اپنی اپنی جگہ تھے مگر شوہر کے نہ ہونے سے گھر گھر نہیں لگ رہا تھا، ایک ہی دن میں ہنستا بستا آشیانہ جیسے محنڈر میں تبدیل ہو گیا تھا، اسے ان سب چیزوں کو دیکھ کر وحشت ہو رہی تھی، جن کی وجہ سے اس نے رازی کا دل دکھایا۔

مادی چیزوں کی چاہ میں ہی تو اس نے اپنے محبوب کو دینی اذیت پہنچائی، اسے احساس ہو رہا تھا کہ اصل حقیقت تو پیار، محبت، میاں بیوی کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی، بچوں کی قلقاریاں اور گھر کا سکون ہوتا ہے جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ چیزیں تو کالی ہوتی ہیں، پھر ان سے ایسا بھی کیا لگاؤ کہ رشتوں کو داؤ پر لگا دیا جائے۔ مٹی، گارے سے بنا ہوا مکان چھوٹا ہو یا بڑا اگر وہاں رہنے والوں کے درمیان محبت پائی جائے تو اسے گھر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اس نے چائے ختم کی اور کمرے میں چلی آئی۔

بستر پر لیٹتے ہی سوچیں ڈنک مارنے لگیں۔ فراز اپنے دنوں سے اپنے کاروباری پریشانیوں میں گمراہ ہوا تھا کہ وہ بھی اس کے لیے باعث آزار بن گئی، پچھتاوے کا ناگ اسے رات بھر دستار ہا، اذیت کے مارے آسیہ کی ساری رات آنکھوں میں کٹی۔

یہ اس کی زندگی کی طویل ترین رات تھی، ایسا لگتا تھا جیسے سویرا ہی نہیں ہوگا، وہ پہلی بار ایسی اندھیری تنہائی کا شکار

ہوئی تھی، اس کی زندگی کی ہر اندھیری رات میں فراز کی رفاقت اور محبت کی جانے لگی تھی، آج وہ اکیلی ہوئی تو احساس ہوا کہ گھر تو گھر والوں سے بنتا ہے، سامان سے نہیں۔ فجر کی اذان نے اسے جیسے زندگی کی نوید دی، صبح کے اجالے کے ساتھ ہی وہ رات کی گھاگھنٹی کیفیت سے باہر نکل آئی، اس کے اندر جیسے بجلی سی بھرنی ہو، جلدی سے بستر سے اتر کر واش روم میں کھس گئی۔

وہ نماز پڑھ کر جائے نماز طے ہی کر رہی تھی کہ شیراز بھائی کا فون آگیا، کہ فراز کی ٹیٹ کی رپورٹس رات کو ہی آگئی تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ سب کلیئر ہے۔ بس کچھ دنوں تک آرام کرنا پڑے گا تا کہ گھاؤ بھر جائیں۔ وہ تھوڑی دیر میں اسے ڈسچارج کرا کے گھر لارہے ہیں۔

آسیہ نے فوراً ہی شکرانے کے نفل ادا کیے، وہ کچن میں فراز کے لیے کھجوری اور چکن سوپ چڑھا رہی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ دوڑی کہ آواز سے بچیاں نہ اٹھ جائیں، وہ دونوں بھی رات کو دیر سے سوئی تھیں اسی لیے آسیہ نے انہیں آج اسکول نہیں بھیجا۔

اس نے چیک کیا تو مرینہ کا فون تھا، اس نے فوراً ہی لائن کاٹ دی، وہ اس وقت اپنی دوست نما دشمن سے بالکل بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی جس نے اس کی ہستی ہستی دنیا اجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

آسیہ نے خوشی خوشی فراز کی پسند کے کپڑے استری کیے اور نہبانے کھس گئی، اس کے گھر پہنچنے سے قبل وہ فریش ہونا چاہتی تھی۔ اسے دنوں کی بے رخی کا کچھ توازلہ کرنا تھا۔

☆☆☆

اسپتال سے واپسی کے بعد وہ چند دن بستر پر رہا، اس دوران میں جس طرح آسیہ نے گھر اور باہر کی ذمہ داریاں نبھائیں اس کے دل کے سارے کچے شکوے یوں دھل گئے جیسے بارش کے بعد سارا منظر دھل جاتا ہے۔ وہ آسیہ کی تیارواری، محبت فراموش نہیں کر پایا، جو اس نے ایکسپریٹس کے بعد نبھائی۔

وہ بستر پر منہ پھلائے پڑا رہتا، آفس کے معاملات کی ایک فکرور کرز کو تنخواہوں کی ادائیگی کرنی تھی، ایسے میں وہ نہ صرف اس کے غصے کو برداشت کرتی بلکہ شوہر کو جیسے ہتھیلی کا چھالنا بنا ڈالتی۔

شیراز بھائی بچوں کے ساتھ روزانہ چکر لگاتا۔ جتنا ہو سکتا، باہر کے کام ٹھٹھا جاتا۔ انور نے دفتر کے سارے معاملات

رقم بھیج دی ہے، بلکہ وقت پر ادائیگی نہ کرنے کا ہر جانہ بھی اگ سے ادا کیا ہے، اس لیے اچھی خاصی رقم میرے اکاؤنٹ میں آگئی ہے۔“ اس نے آسیہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے پیار سے کہا، جو سر کے نیچے کھنکھانے لگے، منہ اونچا کیے مکمل طور پر شوہر کی طرف متوجہ تھی۔

”اچھا..... مگر آپ نے پوچھا نہیں کہ اس نے پیسے دیر سے کیوں بھیجے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ..... ایک طویل کہانی ہے جو اس نے مجھے فون پر بتائی، مجھ سے بزنس کرنے سے قبل اس نے ایک اور بڑی پاکستانی پارٹی سے ڈیل کی تھی، انہوں نے سیکل والا مال تو بہت اچھا دیا، مائیکل مطمئن ہو گیا۔ مگر جب مال یہاں سے آگے سپلائی ہوا تو پتا چلا کہ چادلوں میں وزن بڑھانے کے لیے کنکر وغیرہ کی ملاوٹ کی گئی تھی، مائیکل کا کسٹمر تو ایسے گھٹیا مال پر ہتھ سے اکھڑ گیا۔“

مائیکل نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی سارے معاملہ تھا اس لیے اس نے وہاں اضافی رقم دے کر پہلے وہ چاول صاف کروائے، پھر انہیں آگے سپلائی کیا۔ وہاں کی لیبر پاکستان کے مقابلے میں بہت مہنگی ہے اسی لیے اسے ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگا جس سے اسے فائدے کی جگہ نقصان ہوا۔

”اس بار اس نے اپنے ایک پاکستانی ورکر ٹیم کے توسط سے جو کہ میرا بہت اچھا دوست بھی ہے، بڑی کمپنی کی جگہ مجھ جیسے چھوٹے سپلائر کو بزنس دیا، ٹیم کے بھروسے پر اس نے مجھے پہلی بار آرڈر دے دیا مگر پھر بھی وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا، بقول اس کے ایک پاکستانی سے چوٹ کھا کر بیٹھا تھا، اتنی جلدی اعتماد کیسے بحال ہوتا پھر اسے یہ بھی شبہ تھا کہ کیوں کہ میرا کاروبار بڑے پیمانے پر نہیں ہے، تو کہیں زیادہ منافع کی لالچ میں میں نے بھی ملاوٹ والا مال آگے نہ بھیج دیا ہو۔ اس لیے اس نے اپنی تسلی کے لیے پہلے مال چیک کیا پھر سپلائی آگے بڑھائی، ان معاملات کی وجہ سے وہ منہٹ روکے ہوئے تھا۔ جب اسے وہاں سے پوری ادائیگی ہو گئی تو اس نے میرے پیسے بھیج دیے۔ اسے اسی میلو کے ذریعے مہری ملاحظات کا اندازہ ہو رہا تھا اسی لیے بغیر کہے ہر جانہ بھی بھراں مڑے کی بات یہ ہوئی کہ ہمارا چاول وہاں اتنا پسند کیا جا رہا ہے کہ مائیکل کا ایک اور بڑا آرڈر بھی مل گیا۔“

”آخر چھوٹے بھائی کی لالچ میں لوگ نہ صرف اپنا دین و ایمان خراب کرتے ہیں بلکہ وطن سے بھی غداری کرتے ہیں، کیا فائدہ ہوا، اب اس رقم کو مائیکل تو نیا آرڈر نہیں دے گا

ایمانداری سے سنبھالے۔ اکثر وہ دفتر کا کام گھر ہی لے آتا تو وہ بھی بھائی کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا، مگر روزانہ کے کئی کام ایسے ہوتے جو آسیہ کو خود کرنے پڑتے، سب سے خوش آئند بات یہ ہوئی کہ اس دوران میں جب بھی مرینہ کا فون آیا، یا تو آسیہ نے مختصر سلام دعا کر کے بند کر دیا، یا پھر دوبارہ بات ہی نہیں کی۔ فراز کے ایکسیڈنٹ کا سن کر وہ محترمہ آنے کو نکل اٹھیں مگر آسیہ نے بڑے طریقے سے منع کر دیا، ویسے بھی رازی نے بیوی کو تنبیہ کر دی تھی کہ وہ مرینہ سے تعلقات کم سے کم رکھے گی۔ رازی کی بیماری کے دوران میں اسے خود بھی احساس ہوا کہ اس کے لیے دنیا میں اسے شوہر سے بڑھ کر کچھ نہیں، دوسروں کے درغلنائے میں آکر گھر کو تباہی کے دہانے تک لے جاتا کہاں کی غفلت تھی۔

☆☆☆

”آس..... او..... آس، ارے بیگم صبح سب کام کاج چھوڑو، آکر میری بات سنو۔“ فراز کی آواز میں خوشیاں کھنک رہی تھیں۔

”کیوں..... چیخ چیخ کر پورا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔“ آسیہ جو کچن میں بڑے انہماک سے رات کے کھانے کے لیے قیمہ بھوننے میں مگن تھی گفتگو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، ہاتھ پونچھ کر باہر جاتے ہوئے بولی۔

”میں..... تمہیں بتا نہیں سکتا کہ کتنا خوش ہوں“ فراز نے اسے گھما ڈالا۔ آسیہ کا سر گھومنے لگا، تو وہ چکراتے سر کو تھامے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”سو..... سوری میں تو بھول ہی گیا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے، ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتائی ہے۔“ رازی ایک دم اپنے جذباتی پن پر گھبرا اٹھا اسے چلا سے تھام کر زبردستی وہیں لٹا دیا۔ اپنی خوشی میں اس کے دل سے یہ بات تو نکل ہی گئی تھی کہ وہ آج کل دوبارہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی ہے۔

”کیا ہوا..... کیوں اتنے خوش ہیں؟“ سب کا توجہ پل کر اس کے حواس بحال ہوئے تو زری سے پوچھنے لگی۔ رازی کے چہرے کی شوشی لوٹ آئی۔

”تمہارے علم میں یہ بات تھی نا..... میں نے چادلوں کا جو آرڈر امریکا بھیجا تھا، اس کی ادائیگی رکی ہوئی تھی، وہ تو شیراز بھائی کی مالی مدد کی وجہ سے میں ورکرز کی رکی ہوئی تنخواہیں اور بلوں کی ادائیگی کے قابل ہوا، اب مائیکل جو میرا بائیر ہے اس کا جواب آ گیا ہے۔ اس نے نہ صرف پوری

تا..... اگر ایمانداری سے چلتے تو وہ ان کے ساتھ کاروبار کر رہا ہوتا۔“

”جسہیں پتا ہے نا جان..... جہاں وطن کی عزت کا معاملہ آجائے وہاں میرے لیے ہر بات ختم ہو جاتی ہے، میں سب سے پہلے پاکستان کی نیک نامی کے بارے میں ہی سوچوں گا، اسی لیے میں نے کم منافع رکھتے ہوئے مائیکل کو سب سے اچھی کوالٹی کے صاف ستھرے چاول بیچے تھے، اب ان لوگوں کو نہ صرف ہمارا کام پسند آیا بلکہ مجھے اس سے بھی بڑا آرڈر مل گیا ہے، میں نے سب سے پہلے تو شیراز بھائی کے پیسے دیئے ہیں۔“ وہ سرشاری سے مسکرایا۔

”یہ..... تو بہت اچھا ہوا، بے شک اللہ نیکی کی راہ انہاں نے والوں کو کبھی نے آسرا نہیں چھوڑا۔“ آسیہ نے آنکھ بند کر کے کہا اور خاموش ہو گئی۔

”کیا بات ہے..... تم اتنی خوش نظر نہیں آرہی ہو، جیسی میں توقع کر رہا تھا۔“ رازی نے اس کے چہرے کی پیماسی سی مسکراہٹ دیکھی تو پوچھ بیٹھا۔

”بس..... ویسے ہی صبح سے طبیعت گری گری سی ہے۔“ آسیہ نے اسے ٹالنا چاہا اور اس کا دل رکھنے کو اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ڈیئر۔ میں تمہاری ہر اداسی اچھی طرح واقف ہوں، اصل بات بتاؤ۔“ رازی نے اسے دوبارہ زبردستی لٹایا اور اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا، تو اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”صبح مرینہ کا فون آیا تھا، وہ آج کل بہت پریشان ہے۔ فون پر ہی رونے لگی۔“ آسیہ نے ہاتھ مسلتے ہوئے بتایا، رازی اس کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہو گیا تھا۔

”کیوں؟ خیریت تو ہے نا۔“ رازی کا لہجہ پُر تجسس تھا، وہ اندر سے ڈر گیا کہ اس عورت نے اب ان کی ہستی ہوئی زندگی میں کوئی نیا تماشا نہ کھڑا کر دیا ہو۔

”آج کل وہ لوگ بڑے بڑے حالات سے گزر رہے ہیں۔“ آسیہ نے ٹھہر ٹھہر کر بتانا شروع کیا۔ ”اصل میں

اختیارات کے ناجائز استعمال کی وجہ سے جن افسران کی تنزیہ ہوئی ہے ان میں اسد بھائی کا بھی نام آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ غضب بھی ہوا کہ اب ان کے اثاثوں کی بھی جانچ پڑتال شروع ہو گئی ہے کہ سرکاری تنخواہ دار ملازم کے پاس اتنی جائیداد کہاں سے آئی؟“ آسیہ نے افسرہ لہجہ میں بتایا، صبح فون پر مرینہ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کے بعد سے اس کا دل بہت

اداس تھا، وہ ایک نرم دل لڑکی تھی کسی کو یوں روتا دیکھنا اس کے لیے مشکل امر تھا۔

”مرینہ کے والد تو خود، سرکاری افسر تھے، میں نے سنا تھا کہ ان کا اپنے وقت میں بڑا اثر رسوخ تھا، انہوں نے اس سلسلے میں داماد کی مدد نہیں کی۔“ فراز بھی افسردہ ہو گیا، بہر حال وہ ان لوگوں کی پرانی رفیق کاری تھی۔

”ساری بات کرسی کی ہوتی ہے..... جب وہ ہی نہ رہے، تو تعلقات بھی دم توڑ جاتے ہیں۔ جب تک آدمی بڑے عہدے پر ہوتا ہے۔ لوگ جھک جھک کر سلامی دیتے ہیں، بعد میں کون کسی کو پوچھتا ہے، اب ان سے جو ہو سکتا ہے وہ کر رہے ہیں، مگر اس بار اوپر سے بہت سختی ہو رہی ہے ویسے مجھے میں ان کی شہرت بھی کچھ اچھی نہیں رہی، ایسا پیسا جیسے آتا ہے ویسے ہی چلا جاتا ہے، وہ تو خود اب بچوں کے محتاج ہیں۔“ آسیہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اللہ اس کی مشکل آسان کرے، خیر تم اپنی طبیعت مت خراب کرو۔ ایک اور خوش خبری سنو..... میں نے رنگ والے کو بلالیا ہے، سب سے پہلے گھر میں رنگ و روغن کا کام مکمل کروا لیتے ہیں، اس کے بعد نیا فرنیچر لے آئیں گے۔“ فراز نے بیوی کی خواہشات پوری کرنے کی ٹھانی۔

”نہیں..... اب مجھے اپنا گھر ایسے ہی پیارا لگ رہا ہے، کسی بھی طرح کی فضول خرچی کی کوئی ضرورت نہیں، میں سمجھ گئی ہوں کہ مکان کی رونق کینوں سے ہوتی ہے سامان سے نہیں۔“ آسیہ نے مسکرا کر شوہر کو دیکھا۔ اس کی حسین آنکھیں خوشی کے احساس سے جھلک کر نکلیں۔ رازی نے محبوبیت سے بیوی کو دیکھا اور سر ہلا کر اتفاق کیا۔

”پاپا..... پاپا..... میری چاکلیٹ آبی نے کھالی۔“ چھوٹی والی ہانیہ ہانپتی ہوئی آکر باپ سے ٹکرائی۔

”نہیں پاپا میں نے تو یہ والی چاکلیٹ کھائی تھی..... اس پر ہانیہ کا نام کہاں لکھا ہے؟“ چھوٹی ہانیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ شرارت اس کی آنکھوں سے فک رہی تھی۔

”یہ لو پاپا آپ دونوں کے لیے بہت ساری چاکلیٹس لائے ہیں، اب تو میری شہزادیاں خوش ہیں نا۔“ فراز ان دونوں کا جھڑانہ مٹانے میں لگ گیا۔ آسیہ پاس کھڑی مسکراتی رہی، کچھ دیر میں ان چاروں کی ہنسی کمرے میں گونجنے لگی، مکان کو جھڑانے میں اسے بہت سی آڑ مانٹوں سے گزرنا تو پڑا تھا مگر اب وہ جینے کا مگر پہچان گئی تھی۔



تمنا

جناب معراج رسول

سلام تہنیت

زیر نظر واقعہ تازہ تازہ ہے۔ دل کو چیر دینے والا۔ میرے آنسو اب تک
تہم نہ پائے ہیں۔ میرا خیال ہے قارئین بھی اسے پسند کریں گے۔

ڈاکٹر ممتاز عمر

(کراچی)

XX

ہمیشہ کی طرح شاہ زیب اسکول سے آیا۔ کھانا کھا کر
لیٹ گیا۔ شام ڈھلے آٹھ بجی تو خلی بڑھ چکی تھی۔ موسم سرما
کی وجہ سے سورج بھی جلدی غروب ہونے لگا تھا۔ اس نے
اٹھتے ہی ماں کو پکارا۔ ”ماما! آپ نے مجھے جلدی کیوں نہیں
اٹھایا؟ مجھے بہت سا کام کرنا تھا۔“

ماہد نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ”مجھے بتا دیتے تو
میں اٹھا دیتی۔ کھل کی گرمائی میں تم کچھ زیادہ ہی سو لیے میں
بھی تھکے ہوئے ہو۔“



© 2019

241

ماہنامہ سرگزشت

”ہاں ماما! تھکاوٹ تو ہے کیوں کہ دن بھر کل کے پروگرام کے لیے ریہرسل ہوتی رہی۔ بار بار چیزوں کو درست کرنے کی خاطر ہمیں اپنے ٹیبلو کو دہرائنا پڑا۔ پھر مجھے گھر کے لیے کام بھی دے دیا گیا ہے مگر نیند میں کچھ زیادہ ہی وقت ضائع ہو گیا۔“

”چائے پی کر کام بھی کر لیتا۔“ ماں بولی۔

اس نے ہاتھ منہ دھوے اور چائے پینے کے بعد اپنی ٹیبل پر جا بیٹھا۔

رات کے آٹھ بجے کا وقت ہوگا۔ گل فراز نے پکار کر کہا۔ ”کیپٹن صاحب! آجائیں کھانا کھالیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈانٹنگ ٹیبل پر آ بیٹھا مگر لا ابالی انداز میں کھانا کھایا۔ وہ انھنے دالا تھا کہ باپ نے پوچھا۔ ”بیٹا! کیا سارے کارڈ بنانے کی ذمہ داری تم پر آن پڑی ہے۔“

مسکراتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ ”نہیں آدھے کارڈ تائبش بننا رہا ہے۔ ہم دونوں کی خوشنظمی کے پیش نظر سر نے ہم دونوں کو کارڈ بنانے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔“

ناہید نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بیٹا ہماری خواہش کب پوری ہوگی؟ وہ دن کب آئے گا جب تم پاک فوج کی وردی زیب تن کیے گاندھوں پر فیتے سجائے ہمارے خوابوں کو تعبیر بخشو گے؟“

شاہ زیب بولا۔ ”ماما چند سال کی بات ہے! نٹر کے بعد سلیکشن ہوگا اور پھر آپ کو خوابوں کی تعبیر مل جائے گی۔ بس یہ دو تین سال اہم ہیں۔ میں کیپٹن بنوں گا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ دونوں نے تو میری پرورش کے دوران ہی مجھے کیپٹن کہہ کر ذہنی طور پر تیار کر دیا ہے کہ میرا مقصد حیات ملک و قوم کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔“

گل فراز بولا۔ ”بیٹا تمہارے دھوکے میں بھی خواہش تھی مگر جب میں سلیکشن کے لیے گیا تو بہت فداکاری کی وجہ سے تمہارے دادا کے خواب کو پورا نہ کر سکا۔ بس یوں سمجھو تمہارے سلیکشن سے جہاں ہماری خواہش پوری ہوئی وہیں ہمارے بزرگوں کی روحوں کو بھی تسکین پہنچے گی۔“

کھانے سے فارغ ہو کر شاہ زیب ایک بار پھر اپنی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ کارڈوں پر اشعار لکھتا۔ انہیں مختلف زاویوں سے دیکھتا اور کلر کے ذریعے انہیں مزید جاذبِ نظر بنانے میں مصروف ہو جاتا۔ اتنی سجاوٹ و خوب صورتی پیدا کرنے کے بعد بھی وہ بعض کارڈوں سے مطمئن نہ ہو پاتا۔

یوں خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ دوبارہ کارڈ بنانے لگتا۔ اس کام کو کرتے ہوئے اس کی محویت کا یہ عالم تھا کہ اسے وقت کا اندازہ ہی نہ رہا۔

”بیٹا! گھڑی دیکھو ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔“ ناہید نے پکار کر کہا۔

”بس ماما میں دو کارڈ اور مکمل کر لوں پھر سونے کے لیے آتا ہوں۔“

ماں اس کے قریب آ گھڑی ہوئی، کئی کارڈ اٹھا کر دیکھے اور ماشاء اللہ و سبحان اللہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ پوچھنے لگی۔ ”پروگرام کس طرح ترتیب دیا گیا ہے؟“

”پہلے ٹیبلو پیش کیے جائیں گے پھر نویں اور دسویں جماعت کے طلباء کے لیے ان کی شخصی خوبیوں کے مطابق اشعار پڑھ کر باری باری انہیں کارڈ دیں گے جس کے بعد دسویں جماعت کے طلباء بھی تمام اساتذہ کو اشعار کے ذریعے خراج تحسین پیش کریں گے۔ یوں پارٹی کے اختتام پر دعوت کا اہتمام ہے۔“

پشاور صدر کے ایک گھر میں تین نفوس پر مشتمل یہ چھوٹا سا خاندان تھا۔ گل فراز الیکٹرونک کے سامان کا تاجر تھا۔ بازار میں اس کی دکان تھی۔ ناہید اس کی چچا زاد تھی۔ دونوں تعلیم یافتہ و خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ شادی کے کئی سال تک ناہید کی گود سونی رہی۔ طبی اعتبار سے زوہین مکمل تندرست تھے۔ پھر دعاؤں اور منتوں کی نوبت آئی۔ اس پورے عرصے میں ناہید کا حسن خاصا ماند پڑ گیا۔ اس کی فکر مندی اور بے چینی اس کی صحت کو متاثر کر رہی تھی مگر پھر مشیبت ایزدی کے مطابق شادی کے ساتویں برس ان کے گلشن میں پھول کھلا جس کی آمد پر تمام خاندان میں خوشیاں منائی گئیں۔ منہائیاں بنیں، دعوتیں ہوئیں اور شاہ زیب کی آمد سے ناہید کے چہرے کی بشارت اور حسن و رعنائی بھی لوٹ آئی۔ اب اس کی توجہ کامرکز و محدود اس کا بیٹا تھا جس کی پرورش اور نگہداشت میں کسی قسم کی کمی کا تصور بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ ہاں بھی یہ احساس کچھ کے لگتا کہ شاہ زیب کے بعد کسی اور اولاد کی ولادت نہ ہوئی مگر وقت کے گزرنے سے یہ خلش بھی کم ہوتے ہوئے ختم ہو گئی۔ یوں ماں اور باپ کی شفقت و محبت تھا شاہ زیب کے حصے میں آئی۔ اس کی اٹھان پڑی خوبصورت تھی وہ صحت مند اور ڈبل ڈول کے اعتبار سے اپنے ہم عمروں میں نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ ساڑھے تین سال کی عمر میں اسے آرمی پبلک اسکول کی راہ دکھائی گئی جہاں کے ماحول میں اس نے خوب خوب نام کمایا۔ وہ نصابی دیگر

نصابی سرگرمیوں میں ممتاز شمار کیا جاتا۔ پرائمری کے امتحان میں وہ تمام اسکول میں اول آیا۔ اس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں ٹرائی سے نوازا گیا۔ آنکھوں جماعت تک بھی وہ اپنی کلاس میں اول آتا رہا۔ نویں جماعت کے نتائج میں بھی اس نے نوے فیصد نمبر حاصل کیے تھے۔ وہ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی انعامات حاصل کرتا ہوں وہ اپنے والدین کے لیے ہی نہیں اساتذہ کے لیے بھی باعث فخر تھا۔ ماں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ خود اس کے کپڑے استری کرتی، شوز پالش کرتی اور اس کی تمام خواہشات کو پورا کرتی۔ موسم سرما کی آمد کے ساتھ ہی وہ اس کے لیے سوئٹرز بننے شروع کر دیتی جسے دیکھ کر اکثر اس کا شوہر کہا کرتا۔ ”تم اتنی محنت سے سوئٹرز بنتی ہو حالانکہ بازار میں خوب صورت و دیدہ زیب سوئٹرز با آسانی مل جاتے ہیں۔“

”ان سوئٹرز میں ماں کی ممتا اور جذباتی وابستگی تو نہ ہوگی۔“ وہ بڑی محبت سے کہتی۔

16 دسمبر کی صبح گل فراز اور ناہید نے اٹھ کر نماز فجر ادا کی اور دونوں ہی جدا جدا مصروفیات میں لگ گئے۔ گل فراز نے پہلے قرآن کریم کا مطالعہ کیا اور بعد میں اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ناہید نے بھی قرآن کریم کے مطالعے کے بعد کچن کی راہ لی۔ وہ ناشتا بنانے میں مصروف تھی کہ اسے اندازہ ہوا شاہ زیب شاید نہیں اٹھا۔ وہ کمرے میں گئی اور شاہ زیب کو آواز دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور اسکول جانے کی تیاری کرنے لگا۔ محنت سے تیار کیے کارڈز سنبھالے، ناشتے کے لیے ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے گھڑی پر نظر پڑی تو اس نے ماں کو پکار کر کہا۔

”ماما! میں اسکول جا رہا ہوں۔“

”ناشتا بالکل تیار ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ناہید ٹرے لیے آگے بڑھی مگر اسی دوران وہ کچن کا ہارن بجا۔ شاہ زیب نے آگے بڑھ کر ماں کی پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

”ماما کیا کروں گاڑی آگئی۔ آپ نے میرے لیے ناشتا بنایا آپ یہ سمجھیں میں نے ناشتا کر لیا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر کی طرف چلا گیا۔

ناہید ٹرے ٹیبل پر رکھ کر محویت کے عالم میں اسے جانا ہوا دیکھتی رہی۔ اسی دوران گل فراز بھی آگیا۔ دونوں نے ایک ساتھ ناشتا کیا جس کے بعد گل فراز اپنی دکان کے لیے روانہ ہو گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی کہ گھریلو ملازمہ آگئی جس سے مخاطب ہو کر وہ بولی۔ ”پہلے

بچوں کو دودھ پلانے

والی ماؤں کا بلڈ پریشر

ماؤں کی جانب سے شیر خواروں کو دودھ پلانے کا فائدہ صرف بچوں کو ہی نہیں ہوتا بلکہ خود ماں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں۔ ایک نئے طبی جائزے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دودھ پلانے کے کئی سال بعد بھی ماؤں کے بلڈ پریشر بڑھنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی آف ویٹرن سڈی اسکول آف میڈیسن کے ریسرچرز نے دیکھا ہے کہ خواتین اپنے بچوں کو جتنے زیادہ عرصے تک اپنا دودھ پلاتی ہیں 64 سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے تک ان میں ہائی بلڈ پریشر کا امکان اتنا ہی کم ہوتا ہے تاہم 64 سال کی عمر کے بعد اس فائدے کا امکان گھٹنے لگتا ہے۔ ریسرچرز نے بریسٹ فیڈنگ اور ہائی بلڈ پریشر میں تعلق کو سمجھنے کے لیے 74 ہزار 785 آسٹریلیائی خواتین کے بارے میں تحقیق کی جو 45 سال یا اس سے زیادہ عمر کی تھیں۔

مرسلہ: زویا فراہ، جہلم

کچن میں برتن دھو لو پھر جھاڑو دے کر پونچھا لگا لو اور ہاں آج مشین لگا کر کپڑے بھی دھولو۔“ یہ کہہ کر وہ خود انھی اور دوپہر کے کھانے کی غرض سے کچن کی طرف چلی جہاں اس نے کھانے کی تیاری شروع کر دی۔ کچن اور ٹی لاؤنچ برابر برابر تھے۔ مارننگ شو آ رہے تھے۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ وائٹ کچن کڑا ہی بنانے کی عملی ترکیب بتائی جا رہی ہے جسے دیکھنے اور سمجھنے کی خاطر وہ کچن کی مصروفیات ترک کر کے ٹی وی لاؤنچ میں آ بیٹھی۔ وہ آج پہلی بار اس طرح کھانے کی ترکیب نہ دیکھ رہی تھی بلکہ وہ تو اکثر انواع و اقسام کے کھانوں کی ترکیب سمجھ کر سننے سے بھرے کرتی تھی جس سے اس کا شوہر اور بیٹا خوب خوب محظوظ ہوا کرتے تھے۔ دن گیارہ بجے کا وقت تھا اچانک بریکنگ نیوز آئی شروع ہوئی جس کے مطابق آری پبلک اسکول پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اساتذہ و طلباء پر غلہ بنا لیے گئے تھے۔ دھماکوں اور فائرنگ کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ یہ خبر بار بار بار بار وہ ترین خبر کے طور پر آتی رہی اور پھر پروگرام روک کر اس اندام ملک واقعے کی براہ راست کورینج شروع ہوئی۔ اس نے ریویو لٹا کر کئی چینل دیکھے ہر طرف یہی لرزہ خیز خبر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند طلباء کی موت کی خبر پچاس سے

زیادہ کی تعداد تک پھیل گئی۔ اس دوران جب یہ خبر نشر ہوئی کہ دہشت گردوں نے اسکول کے اس ہال پر بھی قبضہ کر رکھا ہے جہاں نویں دسویں کے طلباء کی پارٹی ہو رہی تھی تو اس کی بے چینی و اضطراب بہت بڑھ گیا۔ وہ مٹھیاں بھیج کر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کر رہی تھی۔ بظاہر ہی وہی اسکرین پر آرمی پبلک اسکول کے واقعات دکھائے جا رہے تھے مگر وہ لاشعوری طور پر تصور میں اسکول کے اس ہال میں جا پہنچی جہاں پارٹی ہو رہی تھی۔ دہشت گرد فائرنگ کرتے اور بچے ان سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دل خراش چیخوں سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تمام لیا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اپنا موبائل اٹھا کر اس نے گل فراز کا نمبر ڈائل کیا۔ نیٹ ورک بڑی تھا۔ بمشکل تمام رابطہ ہو پایا۔ دوسری طرف سے گل فراز بولا۔ ”میں اسکول کی طرف جا رہا ہوں تم میرا انتظار کرو۔“ وہی وی کے سامنے کھڑے کی حالت میں بیٹھی تھی۔ شہدا کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ملازمہ نے آکر کچھ پوچھا جس پر وہ بولی۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ یہ سن کر ملازمہ واپس چلی گئی۔ وہ کبھی اٹھتی کبھی بیٹھتی کبھی چیختی بدلتی پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملاتی، بڑی کوششوں کے بعد ایک بار پھر گل فراز سے رابطہ ہو پایا جس پر اس نے بتایا کہ وہ لیڈی ریڈنگ اسپتال میں ہے جہاں بے تحاشا رشتہ ہے۔ مزید کوئی معلومات ہوئیں تو بتائے گا۔ اس نے اپنی ماں اور بھائی کا نمبر ڈائل کیا کچھ دیر بعد وہ بھی آگئے۔ انہوں نے بتایا۔ ”تمام بازار بند ہیں، ٹریفک بے ہنگم، افراتفری کا عالم ہے۔“ پھر یہ کہہ کر ”میں بھی لیڈی ریڈنگ اسپتال جا رہا ہوں.... چلا گیا۔“

لیڈی ریڈنگ اسپتال کے باہر لوگوں کا اژدھام تھا۔ گل فراز کا برادر بستی زابد خان بھی اس نے جا ملے۔ سینکڑوں والدین تھے جو اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاں بے تحاشا تھا وہ دونوں بڑی مشکل سے ایمرجنسی میں پہنچے جہاں ہر زخمی بچے کے گرد اس کے عزیز واقارب کھڑے تھے۔ مختلف بچوں کو دیکھتے ہوئے ایک بچے حذیفہ کے پاس کھڑے ہو کر گل فراز نے اس کی طبیعت پوچھی۔ ”خف و غم زور آواز میں وہ بولا۔“ ”اٹکل ٹھیک ہوں۔“ جس کے بعد اس کا اگلا سوال یہ تھا۔ ”اور شاہ زیب.....“ جس پر حذیفہ نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلائے اور یہ کہتے ہوئے کہ ”شاید وہ تو.....“ آنکھیں بند کر کے

آنسو بہانے لگا۔

ان دونوں نے مل کر تمام زخمی بچوں کو دیکھا اور پھر مردہ خانے کی طرف مڑ گئے۔ جن بچوں کی شناخت ہوتی جا رہی تھی انہیں ان کے ورثا کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ آہ و فغاں کی صدا میں تھیں۔ نالہ و فریاد ایسی کہ آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ہر طرف کہرام مچا تھا۔ لوگ اپنے پیاروں کی لاشوں کے گرد کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ گل فراز بہت سے چہروں کو پہچانتا تھا۔ اکثر شاہ زیب کے ہم جماعتوں کے والدین تھے مگر یہ وقت کسی کو تسلی دینے اور صبر کی تلقین کا نہ تھا۔ وہ خود بے چین و مضطرب تھا اس لیے کسی اور کو کیا تسلی دیتا۔ آگے کی جانب اس اسٹریچر کے گرد وہ اور زابد ٹھہر گئے۔ یہ کوئی اور نہیں اس کا اپنا بچہ تھا۔ اس کے سامنے شاہ زیب ہونٹ اور آنکھیں کھولے اس طرح لیٹا تھا کہ جیسے ابھی کہے گا۔ ”باباجی! آپ آگئے مجھے گھر لے چلے۔ بھوک لگی ہے۔“ ماما نے ناشتا بنایا تھا میں اب جا کر کروں گا۔“ مگر یہ سب کچھ ایک خیال تھا جس کا تصور بھی روٹنے کھڑے کیے دیتا تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ زبان تنگ تھی پھر اچانک وہ شاہ زیب کے بازو پکڑ کر ہلانے لگا۔ ”کیپٹن صاحب! اٹھو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اسی پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ زابد نے اسے اٹھایا۔ طبی عملے نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی جس کے بعد اسے ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ زابد بھی بڑی مشکل سے اپنے اوسان قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ کسی کو تو اس وقت حوصلہ مندی کا ثبوت دینا تھا۔ کارروائی مکمل ہوئی۔ لاش ان کے ہالے کر دی گئی جسے اسٹریچر پر لٹا کر ایبویٹنس میں رکھ کر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہر طرف سے ایبویٹنس کے سائرن بجنے کی آوازیں تھیں اگلی نشست پر زابد اور پیچھے اسٹریچر پر شاہ زیب ابدی نیند سو رہا تھا۔ گل فراز دیوانہ وار اسے تنکے جا رہا تھا۔ آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ اسی حال میں گھر کے پاس پہنچے تو اہل محلہ بھی جمع تھے۔ لوگوں نے آگے بڑھ کر اسٹریچر نکالا کسی نے گل فراز کو سنبھالا۔ گھر کا دروازہ کھول کر جوں ہی اسٹریچر اندر کی طرف لے جایا گیا تاہم آہ و فریاد کرتے ہوئے آگے بڑھی اور اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر بے اختیار کہنے لگی۔ ”میرے کیپٹن صاحب! تم تو کہہ کر گئے تھے ماما آپ سنبھیں میں نے ناشتا کر لیا مگر بیٹا جتنا تو اب تک رکھا ہے آؤ کھا لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دیوانہ وار شاہ زیب کے پوسے لینے لگی اور اسی حالت میں ایک طرف گر کر بے ہوش ہو گئی۔

فرس نے آکر بتایا۔ ”سراسر مریض کی پھر وہی کر رہی ہو؟“
 کنڈیشن ہو گئی ہے۔“
 ”وہی جو پولیس کھڈی میں ہے سر۔“ اس نے بتایا۔
 ”اس پر پھر رونے کا دورہ پڑا ہے۔“
 ”اوکے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم چلو
 میں اس وقت کسی کی رپورٹ دیکھنے میں مصروف
 تھا۔ اس لیے بے وحیانی سے پوچھا۔“ کس مریض کی بات

پشیمان

محترم مدیر اعلیٰ
 میں اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں۔ جو واقعہ سناتے جا رہا ہوں یہ
 تب کا ہے جب میں پریکٹس کرتا تھا۔ یہ واقعہ خود میں انوکھا ہے
 اس لیے میں نے اسے بطور خاص سرگزشت کے لیے لکھا ہے۔ امید ہے
 قارئین کو بھی پسند آئے گا۔
 ڈاکٹر عبدالمجید
 (کراچی)



میں ابھی آتا ہوں۔“

نرس کے جانے کے بعد میں اس مریض کے بارے میں سوچنے لگا۔ رحیم نام تھا اس کا۔ عبدالرحیم۔ وہ قاتل تھا اس نے ایک دکان دار کا قتل کر دیا تھا۔

دکان دار ساٹھ ساٹھ سال کی عمر کا آدمی تھا۔ اس نے اندرون سندھ سے آکر کراچی میں دکان کھولی تھی۔ شاید یہ رحیم بھی اسی علاقے کا تھا۔ جس نے نہ جانے کس وجہ سے دکان دار کا خون کر دیا تھا۔

چونکہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اس لیے گرفتار بھی ہو گیا تھا۔ اس دکان دار سے جھگڑے کے دوران اس کو چوٹ لگی تھی جو بہت شدید تھی۔ پولیس اسے زخمی حالت میں اسپتال لے آئی تھی۔ جہاں اب اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔

میں چونکہ ایک پولیس سرجن ہوں اس لیے اس قسم کے واقعات روزانہ کا معمول تھے۔

میرا ایک شوق اور بھی ہے اور وہ ہے قیدیوں کے حالات معلوم کرنا۔ ان کی کہانیاں سننا اور خود ان کی کہانیاں لکھنا۔ اس طرح میں نے درجنوں کہانیاں لکھ لی ہیں۔ ایسی جگہوں سے زیادہ سچی کہانیاں اور کہاں ملتی ہوں گی۔

بہر حال میں نے فائل بند کی اور اس وارڈ کی طرف چل پڑا جہاں اس قیدی رحیم کو رکھا گیا تھا۔ اتنے عرصے میں میرا یہ تجربہ ہو گیا کہ کون حادثاتی طور پر مجرم بنا ہے اور کون ایسا ہے جس کی فطرت میں جرم شامل ہے۔

رحیم ایسا آدمی نہیں دکھائی دیتا تھا جو اپنی فطرت میں برا ہو۔ وہ ایک دھیمے لہجے اور نرم چہرے والا آدمی تھا۔ اس نے پولیس والوں کو یہ بتایا تھا کہ اس کا کسی بات پر دکان دار و سایا سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس نے و سایا کا قتل کر دیا۔

لیکن اس کی یہ کہانی مجھے ہنسنے نہیں ہو رہی تھی۔ بات کچھ اور معلوم ہوتی تھی۔

چونکہ میں ایک با اختیار ڈاکٹر تھا اس لیے میرے کہنے پر رحیم کو بیڑیاں اور ہتھکڑیاں وغیرہ نہیں لگائی گئی تھیں۔

میں اس کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آیا کرتا۔ اس لیے وہ میرا احترام بھی کرتا تھا۔

میں جب اس کے پاس پہنچا تو مجھے دیکھ کر اس نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ ”نہیں نہیں لیئے رہو۔“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم ابھی کمزور ہو۔“

میں عبدالرحیم ہوں۔“ وہ پھر لیٹ گیا۔

”تمہارے زخم بھرنے لگے ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”تم بہت جلد ٹھیک ہو کر چلے جاؤ گے۔“

”لیکن جاؤں گا کہاں ڈاکٹر صاحب۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک ہنسکی اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”یہاں سے نکل کر جیل ہی تو جانا ہے ناں۔ تو زخم ٹھیک ہوں یا نہ ہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے بہت دکھ بھرے لہجے میں یہ بات کی تھی۔

”عبدالرحیم تم مجھے ایک بات بتاؤ۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تم پر جو یہ الزام ہے اس کی کہانی کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔“

”نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں نے خود اس بندے کو مارا ہے۔ اس سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔“

”بس یہی بات میں نہیں مانتا۔“ میں نے کہا۔ ”اس آدمی کا قتل جھگڑے کی وجہ سے نہیں ہوا۔ بلکہ کوئی اور وجہ معلوم ہوتی ہے۔“

وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہی زخمی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کیا نجومی بھی ہیں؟“

”ارے نہیں بھائی بس یوں ہی میں نے اندازہ لگایا تھا۔“

کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب بات تو کچھ اور ہی ہے۔“

”اگر تم مناسب سمجھو تو بتا دو۔“

”ہاں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”کسی نہ کسی کو بتانا تو پڑے گا۔ ورنہ اندر ہی اندر مر جاؤں گا ڈاکٹر صاحب مر جاؤں گا۔“

”تو چلو بتانا شروع کرو۔“

اس نے اپنی آنکھیں بند کریں۔ جیسے اپنی کہانی سنانے کے لیے خود کو سمیٹ رہا ہو۔

☆.....☆

”میں عبدالرحیم ہوں۔ ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا۔ بڑی دکھ بھری زندگی گزاری ہے صاحب۔ بہت پریشانی کی۔“

”جو سب سے چھوٹی تھی۔ نیلما نامی لڑکی۔ میں اس کو پیار... سے رشتہ کہا کرتا۔ وہ بھی ہی رشتہ نہیں تھی۔ ملائم ملائم خوب صورت۔ مجھ سے بہت لاڈ کرتی تھی۔ اپنی ماں سے زیادہ میرا خیال رکھا

جست کی کمی کی علامات

وہ انسان جن کے زخم ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت لگتا ہو ان میں جست کی کمی ہوتی ہے۔ اس کی کو پہچاننا نہایت آسان ہے۔ ناختوں پر سفید دھبے جست کی کمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح شدید یا متعدی بیماری کے بعد مریض میں ذائقے کی پہچان ختم ہونے کی وجہ بھی جست کی کمی ہے۔ ایسے مریض کی بھوک میں کمی بھی واقع ہو جاتی ہے جس سے وزن کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جست کی کمی کو پورا کرنے کا سب سے بہترین طریقہ خوراک ہے۔ سب سے زیادہ جست اوسر اور میٹ (گوشت) میں ہوتا ہے جبکہ جست کی مناسب مقدار خشک پھلوں، مٹز، لوبیہ اور دالوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

مرسلہ: زو یا فرہاد، جہلم

تھی۔ لیکن ابھی یہ بھید سامنے نہیں آیا کہ اس نے دکاندار کا خون کیوں کیا۔

”پھر یہ ہوا ڈاکٹر صاحب کہ شروع شروع میں جیتا چلا گیا۔ یہ جو چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ پہلے دانا دکھاتی پھر جال میں پھنسا لیتی ہے اور انسان ساری زندگی اس میں پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ میرے پاس پیسے آنے لگے تھے۔ میری زندگی کچھ اور ہو گئی تھی لیکن میں نے گھر والوں کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ بلکہ ان پر اپنے پیسے ظاہر ہی نہیں کیے تھے۔ چھپا کر رکھتا تھا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اپنے قصبے میں زمین کا ایک ٹکڑا دیکھ رکھا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کو خریدنے کا ارادہ تھا۔ بس خواب تھے کہ کچھ دنوں کے بعد میں بھی چھوٹا موٹا زمیندار بن جاؤں گا لیکن قسمت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔“

”تم جوے میں ہار گئے ہو گے۔“ میں نے کہا۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”جی صاحب اور بہت بڑی رقم ہار گیا۔ ہوا یہ کہ میں پہلی دفعہ جب پچیس ہزار روپے ہارا تو میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں نے اپنے نوک ن ہار گیا تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے جتنے پیسے بھی جمع کیے وہ زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار روپے تھے۔ بتایا کہاں سے

کرتی۔ میں چاہے جتنی رات کو بھی کام سے واپس آؤں نیلما میرے انتظار میں ہی رہتی تھی۔“

”اور تم کرتے کیا تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے قصبے سے کچھ فاصلے پر کائن کی ایک فیکٹری ہے چونکہ ہمارے علاقے میں کپاس کی فصل زیادہ ہوا کرتی ہے اس لیے وہ فیکٹری ہمارے ہی علاقے میں بنائی گئی ہے۔ تو میں اس فیکٹری میں سپروائزر تھا صاحب۔ میری ڈیوٹی شفٹوں میں ہوا کرتی تھی کبھی دن کبھی رات کو۔ لیکن ڈیوٹی چاہے کسی بھی وقت کی ہو۔ نیلما میرا انتظار کرتی رہتی اور جب میں آتا تو مجھ سے لپٹ جایا کرتی۔“

”ہاں رحیم بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میری بھی دو بیٹیاں ہیں۔ جن کو میں پھولوں کی طرح رکھتا ہوں۔“

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ نہ جانے اسے کیا یاد آ گیا تھا۔

نہ جانے کون سا غم اسے بے چین کر دیتا تھا۔ کیسی کہانی تھی۔ میں نے اس کی زبانی جو کچھ کہا لکھا ہے وہ صرف ایک نشست کی بات نہیں تھی۔ بلکہ دو چار دنوں میں جا کر معلوم ہو سکا تھا۔

اس کے بعد اس نے تفصیل سے جو کہانی سنائی وہ بہت الم ناک تھی۔

اس نے بتایا۔ ”ڈاکٹر صاحب مجھ میں ایک بری عادت تھی۔ اس عادت نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ نہ جانے کیسے لت لگ گئی تھی۔ میں اپنے خدا کا بھی گناہ گار ہو گیا تھا اور اپنی نگاہوں سے بھی گر چکا تھا۔“

”اور وہ عادت کیا تھی رحیم؟“ میں نے پوچھا۔

”جوا کھیلنے کی عادت۔“ اس نے جھکتے ہوئے بتایا۔

یہ سن کر مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ عبدالرحیم ایسا تو نہیں لگتا تھا کہ وہ جوا کھیلنے کا عادی ہو۔ لیکن شاید جو شخص کسی کا قتل کر سکتا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہوگا۔

”بس صاحب ایک دوست کے بہکاوے پر یہ لٹ لگ گئی تھی مجھے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں فیکٹری سے جب بھی شام کو نکلتا جوے کے اوڑے پر پہنچ جاتا۔ اس اوڑے کو چلانے والا بشیرا نام کا ایک بدمعاش تھا۔ وہ بہت خطرناک آدمی تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔“

”ظاہر ہے ایسے آدمی کو چلانے والا ایسا ہی ہوگا۔“

میں تلخ ہو کر بولا۔ اس آدمی سے اب وحشت سی ہونے لگی

لاتا۔ میں بہت پریشان تھا کہ آڈے کا بد معاش میرے پاس آگیا۔

”کیا بات ہے عبدالرحیم۔ تو ایک طرف کیوں آکر بیٹھ گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اب کیا بتاؤں۔ میں پورے پچیس ہزار ہار گیا ہوں اور گھر میں بھی اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ادا کر سکوں۔ چار پانچ گھنٹوں کی مہلت دی ہے اس نے۔“

”ارے تو اس میں ایسی کون سی بات ہو گئی۔ اس کھیل میں اوپر نیچے تو ہوتا رہتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”چل پریشان مت ہو۔ پچیس ہزار مجھ سے لے لے۔“

”تم سے؟“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”تو کیا ہوا۔ تو پرانا بندہ ہے۔ پورا بھروسا ہے تجھ پر۔ جب کوئی لبا ہاتھ لگے تو واپس کر دیتا۔“

”اس وقت اس کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی ڈاکٹر صاحب۔ وہ وقت پر کام آ رہا تھا لیکن میں کیا جانتا تھا کہ میں جال میں پھنستا جا رہا ہوں۔ میں نے اس سے پچیس ہزار لے کر جوے کا ادھار چکنا کر دیا۔“

”اس کے بعد جیت کے آسرے پر تم نے پھر جو اٹھایا ہوگا۔“

”جی ڈاکٹر صاحب۔“ اس نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی۔ ”پھر کھیلنا رہا اور آہستہ آہستہ دولاکھ کا قرض ہو گیا۔ یہ قرض اس بد معاش کا تھا۔ میں جب بھی کسی سے پارتا اس وقت وہ مدد کرنے میرے پاس آ جاتا۔ لیکن جب رقم دو لاکھ ہو گئی تو اس نے آنکھیں دکھائی۔“

”بس بھائی! اب بہت ہو گیا۔“ اس نے کہا۔ ”اب میرے پیسوں کی واپسی کی بات کر۔ دولاکھ بہت ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ میں نہیں کر سکتا۔“

”بھولا بھائی بس تھوڑا سا موقع اور دے دو۔“ میں نے کہا۔ ”تم دیکھ لینا قسمت میرا ضرور ساتھ دے گی۔“

”تیرے ستارے گردش میں ہیں عبدالرحیم۔ قسمت اب کبھی تیرا ساتھ نہیں دینے والی۔ تو یہ کہانی رہنے دے اور میرے پیسوں کی بات کر۔“

”ڈاکٹر صاحب میں نے اس کم بخت کی بہت منت سماجت کی لیکن ایک ہفتے سے زیادہ مہلت دینے پر وہ تیار نہیں ہوا۔ اب میں کہاں سے دولاکھ لے کر آتا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس بد معاش کے پیسے واپس کیے تو وہ کچھ بھی

کر سکتا تھا۔ میرا گھر تھا، بیوی تھی۔ بچے تھے۔ پورے محلے میں بدنامی ہو جاتی کہ میں جو اٹھایا کرتا ہوں۔ خدایا میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا۔“

”کیا تم اپنے گھر والوں کو اعتماد میں نہیں لے سکتے تھے۔“

”نہیں صاحب، گھر والوں کو میں کیا بتاتا۔ وہ تو بے چارے ویسے ہی میرے سامنے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔ میں نے ان کو ایسا رکھا ہوا تھا۔“

اس شخص کی اس بات سے بے زاری اور نفرت کے جذبے مجھ میں کر دئیے گئے۔ وہ تو ایک بے رحم سا انسان تھا۔ بیوی بچوں پر ظلم کرنے والا۔ ان کو دبا کر رکھنے والا۔ یہ یاشیوں کے لیے جو اکھینے والا۔ پھر کسی کا خون کر دینے والا۔ ایسا شخص تو رحم کے قابل ہی نہیں ہو سکتا۔“

”ڈاکٹر صاحب، دسایا میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔“ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

”کون دسایا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی دکاندار جس کا میں نے خون کیا ہے۔“

اوپر تو اب جا کر پتا چلا کہ عبدالرحیم اس دکاندار کو پہلے سے جانتا تھا اور اس قتل کا محرک کچھ اور تھا۔ جیسا میں پہلے سمجھ گیا تھا کہ عام جھگڑے کی واردات نہیں تھی۔

”دسایا میری جان پہچان کا تھا صاحب۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم ہوش میں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ اس کی بیوی مرچکی تھی۔ ایک بیٹی تھی جس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اکیلا زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے مجھے پریشان دیکھ کر خود میرا حال پوچھا اور میں نے اسے بتا دیا کہ میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں۔“

”عبدالرحیم میں نے اس بندے کے بارے میں سن رکھا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ ایک خطرناک آدمی ہے۔ وہ تو تمہیں برباد کر دے گا۔“

”اس لیے تو پریشان ہو رہا ہوں۔“ میں پریشان ہو کر بولا۔ ”سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟ کون دے گا مجھے دولاکھ۔“

”میں دوں گا۔“ اس نے کہا۔

”تم؟“

”ہاں میں۔“ اس نے اپنی بات دہرائی۔ ”میں اس وقت تھکا ہونے کا کام نہیں آؤں گا تو کب آؤں گا۔ تم کل شام کو مجھ سے دولاکھ لے لینا اور منہ پر مارنا اس بد معاش کے۔“

”میں تو حیران رہ گیا تھا۔ اس دور میں کون کس کی مدد کرتا ہے اور وہ بھی پورے دولاکھ روپے۔ وہ تو مجھے اپنا احسان مند کیے دے رہا تھا صاحب۔ لیکن جب دوسری شام

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

ٹپ ٹریٹمنٹس

ٹی ٹی کی ٹپ ٹریٹمنٹس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کرنے کے لیے اس سے رنگ نکھار دیتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گھسے ہوئے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ دھبے، آنکھوں کے گرد ملتے پھرتے اور گردن کی جھریاں جاتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ مردوں کے لیے یہ گولیاں کہ اپنی اور کمریسں ملتے پھریں لیکن ٹپ ٹریٹمنٹس کھانا ان کے لیے بہت کمالات ہے۔

www.facebook.com/top treatments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو معجز اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سوماتروپین (نشوونما کا ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں ممکنہ اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

HELP LINE ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دوا خانہ پر دستیاب

042-35789145 & 60334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

نہ ملنے کی صورت میں یا مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے

II

میں اس سے ملا تو اس نے ایک ایسی بات کر دی کہ میں پکڑ میں
آکر رہ گیا صاحب۔“

”کیا کہا تھا اس نے۔“

”اس نے کہا تھا دیکھو عبد الرحیم۔ میں تمہیں دو لاکھ تو
دے رہا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”میں پیسے تمہیں واپس کر دوں گا وسایا۔“

”نہیں، میں پیسے تو مانگ بھی نہیں رہا۔ تم چاہے کبھی
واپس نہ کرو۔“

”تو پھر۔“

”تم اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔“ اس
نے کہا۔

میں تو بس سنائے میں رہ گیا تھا۔ کیا بات کر دی تھی
اس نے۔ وہ عمر میں مجھ سے بھی دو چار سال بڑا ہو گا اور

میری تیلما پر نظر رکھے ہوئے تھا۔
”وسایا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں ہو سکتا تو رہنے دو۔“ اب اس کا لہجہ بہت بدلا
ہوا تھا۔ ”کوئی کسی کی یوں ہی تو اتنی مدد نہیں کرتا ہے۔“

”لیکن یہ تو سوچو کہ میری بیٹی اور تم میں کتنا فرق ہے۔“
”تمہاری مرضی۔ مجھے جو کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا ہے۔“

اس وقت تو میں ناراض ہو کر واپس چلا آیا۔ پھر سوچتا
رہا کہ کیا کروں اور تو کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ ایک طرف وہ

بد معاش تھا اور دوسری طرف میری تیلما۔
”پھر ڈاکٹر صاحب میں نے وہی کیا جو ہمیشہ سے ہوتا
آیا ہے۔“

”یعنی تم نے اپنی معصوم بیٹی اس کے حوالے کر دی۔“
”جی ڈاکٹر صاحب۔“ اس کے منہ پر ہنسی چھائی۔

”وہ بہت رورہی تھی ڈاکٹر صاحب۔ میرا فیصلہ سننے کے
بعد میرا ہاتھ تھام کر روتی رہی تھی۔ بابا بابا کی دہائی تھی

لیکن اس کی قربانی دے کر میری جان بچ رہی تھی۔ ڈاکٹر
صاحب۔ اس لیے میں نے اسے قربان کر دیا۔“

”عبد الرحیم! میں تمہیں کیا سمجھا تھا اور تم کیا لکھے
ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تو تم سے نفرت ہونے لگی ہے۔“

”میں اسی قابل ہوں صاحب۔“ وہ پھر رونے لگا
تھا۔ ”اسی قابل ہوں۔“

”چلو آگے بتاؤ کیا تمہاری بیوی نے کچھ نہیں کہا؟“
”وہ بے چاری کیا بولتی صاحب۔ میں نے تو اس کو
دبا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ صرف روتی رہی۔ اس بے چاری پر تو

سکتہ ہو گیا تھا صاحب۔ تیلما کو میں نے زبردستی وسایا کے
ساتھ کر دیا۔ مولوی کو بلا کر اس کا نکاح کروا دیا اور واپس

کچھ دنوں کے بعد تیلما کو لے کر شہر آ گیا۔“
”اور تم نے اپنا قرض ادا کر دیا۔“

”ہاں صاحب! قرض ادا کر دیا اور کبھی اس طرف نہیں
گیا لیکن کیا فائدہ تھا اپنی بیٹی کی بھیجٹ تو دے ہی چکا تھا۔“

”اور تمہاری بیٹی کا کیا ہوا۔“
”پتا نہیں صاحب! بہت دنوں تک اس کے بارے

میں کچھ نہیں معلوم ہوا کہ دکھ کیسی ہے، وسایا اس کے ساتھ کیا
سلوک کر رہا ہے۔ کچھ نہیں معلوم۔ پھر ایک دن بیوی نے

بے حال ہو کر کہا کہ جاؤ خدا کے لیے شہر جا کر اس کی خیریت
تو معلوم کر لو۔“

”اوہ تو تم اس طرح شہر آ گئے۔“
”ہاں صاحب! مجھے پتا چل گیا تھا کہ وسایا نے یہاں

دکان کھول لی ہے میں اس کو تلاش کرتا ہوا یہاں آ گیا۔“
”لیکن تم نے اس کو قتل کیوں کیا؟“

”وہی بتا رہا ہوں صاحب، جمعے کا دن تھا۔ جمعے کی
نماز ہو رہی تھی۔ میں ایک مسجد میں چلا گیا۔ وہاں مولوی

صاحب خطبہ دے رہے تھے اور وہ واقعہ بتا رہے تھے کہ ایک
بار ایک آدمی ہمارے نبی پاکؐ کے پاس آیا اس نے بتایا کہ

اس نے اپنی ایک بیٹی کو زندہ دفن کر دیا تھا۔ اس وقت اس کی
وہ بیٹی رورہی تھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بابا بابا کہہ رہی تھی۔

یہی تو میری بیٹی بھی کر رہی تھی صاحب۔ میں بھی تو دیا ہی
باپ تھا۔ پھر جب مولوی صاحب نے بتایا کہ نبی پاکؐ یہ سن

کر رونے لگے۔ تو پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوا صاحب۔
میں نماز پڑھے بغیر مسجد سے باہر آ گیا اور سیدھا وسایا کے

پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میری بیٹی کو چھوڑ
دے۔ اس نے انکار کیا اور میں نے اس کا قتل کر دیا۔ یہ ہے

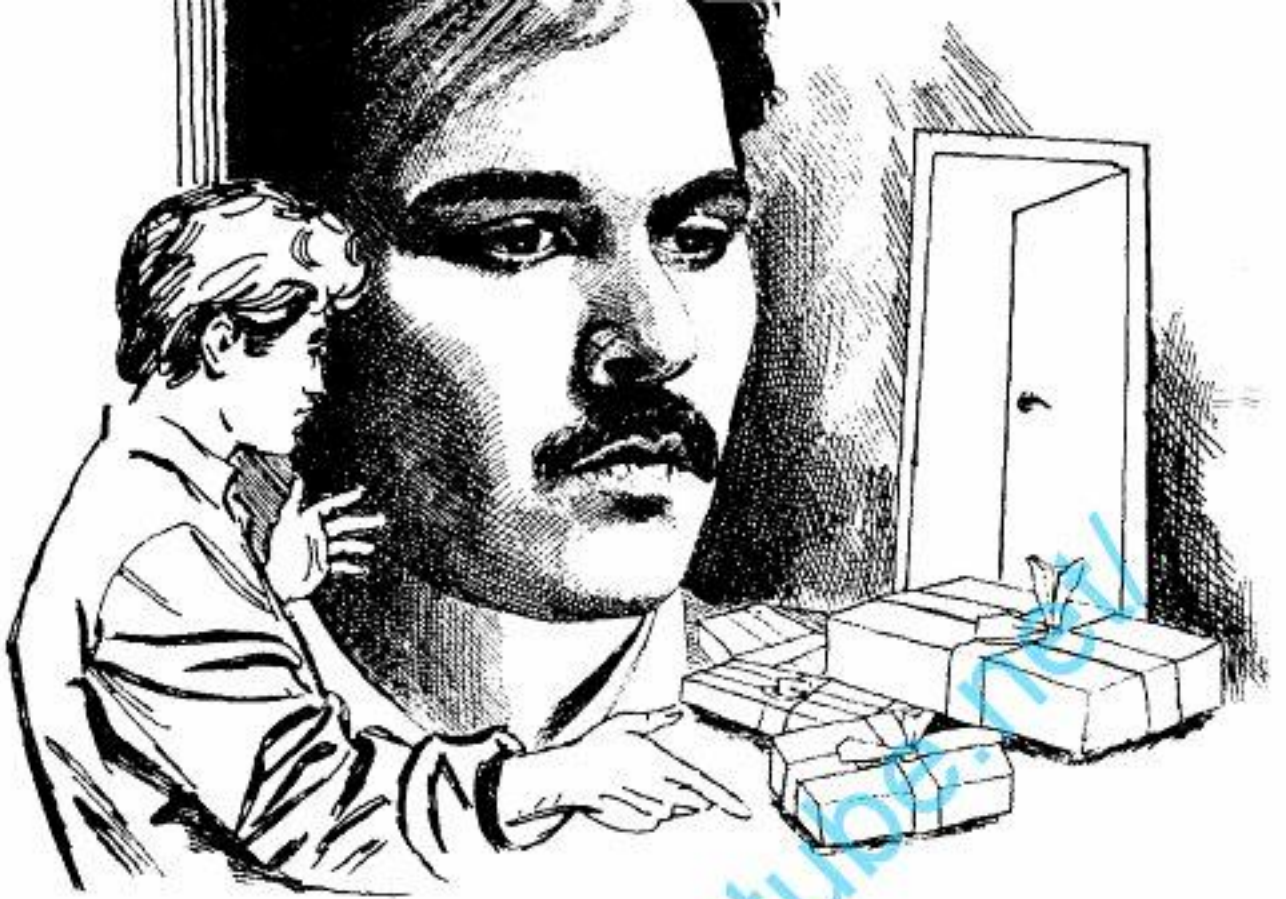
میری کہانی صاحب۔ خدا کے لیے اس کہانی کو لکھ دس اور
لوگوں کو یہ بتائیں کہ آج بھی جب کوئی اپنی بیٹی پر ظلم کرتا

ہے، چاہے کسی طرح ہو تو نبی پاکؐ کی آنکھوں میں آنسو
آجاتے ہیں۔ خدا کے لیے ان پاک آنکھوں میں آنسو نہ

آنے دیں۔ ورنہ دنیا اور آخرت دونوں برباد ہیں۔“
یہ بھی عبد الرحیم کی کہانی۔ جو پہلی بار بہت اچھا آدمی

معلوم ہوا پھر بہت بد آدمی بن گیا اور پتا چلا کہ وہ ایک بہت بڑا
انسان ہے۔





تحفے

مکرم و محترم مدیر
السلام علیکم

میں اپنی زندگی کا ایک اہم گوشہ بے نقاب کر رہا ہوں۔ اس گوشے کو میری بزدلی سمجھنے کی بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر میں تحفے لیتا رہتا تو کیا ہوتا؟ میری آپ بیتی پڑھنے والے اپنے آس پاس بھی نظر رکھیں کہ کہیں اس مرض کا کوئی مریض آپ کے آس پاس تو نہیں ہے۔

احسن سلیم
(اسلام آباد)

ایک معقول صورت انسان دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔

”معاف کیجیے جناب میں نے آپ کو زحمت دی۔“ اس نے بہت سی مہذب انداز میں کہا۔ ”میں آپ کے اوپر والے فلیٹ میں رہتا ہوں۔“

”اوہ تو آپ میرے پڑوسی ہوئے۔“

”جی ہاں۔“ وہ سر اویا۔ ”پڑوسی ہوں آپ کا، وجاہت

میں نہیں جانتا تھا کہ دروازے پر کون دستک دے رہا ہے۔

مجھے اس فلیٹ میں آئے ہوئے صرف چار پانچ ہی دن ہوئے تھے۔ کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ابھی تک کوئی کام والی بھی نہیں رکھی تھی اور جمعہ کے آنے کا وقت بھی نہیں تھا پھر یہ کون ہو سکتا تھا۔

بہر حال تیسری دستک پر میں نے دروازہ کھول دیا۔

کہتے ہیں مجھے۔“

”اور میں احسن سلیم ہوں۔“ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”یہ کیسے، یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔“ اس نے پلیٹ میری طرف بڑھا دی۔ ”اس میں ایک خاص قسم کا حلوا ہے اس قسم کا حلوا صرف میرے خاندان والے بنانا جانتے ہیں۔“

”ارے صاحب یہ کیا زحمت کی آپ نے۔“

”نہیں بھائی، اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ آپ میرے نئے پڑوسی ہیں یہ تو میرا فرض بنتا ہے نا۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔“

اس کے لہجے میں ایسی بے چارگی تھی کہ میں نے اس کا شکر یہ ادا کر کے اس سے وہ پلیٹ لے لی۔ ”آئیں اندر تو آئیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جناب! اس وقت نہیں۔“ اس نے معذرت کر لی۔

”اس وقت ذرا جلدی ہے۔ پلیٹ پھر بھی لے جاؤں گا۔“

وہ پلیٹ دے کر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ پتا نہیں کیسا آدمی تھا۔ بہر حال جو بھی ہو اس کا حلوا واقعی بہت لذیذ تھا۔

اس دور میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ورنہ یہاں کون کس کو پوچھتا ہے۔

وہ شخص مجھے حلوا دے کر گیا تھا۔ اب میرا فرض بنتا تھا کہ میں بھی بدلے میں کچھ نہ کچھ دوں۔ لیکن میں اسے کیا دے سکتا تھا۔

بہت سوچنے کے بعد یہی بات سمجھ میں آئی کہ اسے فلیٹ میں بلا کر اس کی خاطر تواضع کر دوں گا۔ اس طرح کچھ عزت رہ جائے گی۔

لیکن ہوا یہ کہ دو چار دنوں تک وہ دکھائی نہیں دیا اور ایک دن اچانک بلڈنگ کے گیٹ پر مجھے دیکھتے ہی میرے پاس آ گیا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا۔ اس نے بتانا شروع کر دیا۔ ”کیا بتاؤں جناب، دو چار دنوں کے لیے ایک ضروری کام سے کوئٹہ چلا گیا رات ہی کو واپس آیا ہوں۔“

”چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔“

”آپ کا تھنڈ میری جیب ہی میں پڑا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیسا تھنڈ؟“

”یہ لیں۔“ اس نے اپنی جیب سے ایک قیمتی سا قلم نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ میں آپ ہی کے لیے کوئٹہ سے لایا تھا۔“

”ارے! وہ کیوں..... کیوں اتنی زحمت کی۔“

”نہیں جناب اس میں زحمت کیسی آپ تو میرے پڑوسی ہیں اور ایک اچھا پڑوسی بھائیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ لیں رکھ

لیں پلیز۔“ اس نے اس انداز سے کہا کہ مجھے قلم رکھنا ہی پڑ گیا۔

اب میرے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ بے چارہ دوبار مجھے کچھ نہ کچھ دے گیا تھا۔ ایک بار اس نے حلوا دیا تھا اور دوسری بار ایک قیمتی قلم تجھے کے طور پر دیا تھا۔ حالانکہ اس سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں تھا کہ تجھے تھا نفد دے جائیں۔ لیکن جب وہ اتنا کچھ کر رہا تھا تو یہ میرا بھی فرض بنتا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ دوں۔

دفتر سے واپسی پر ایک شام میں نے اس کے لیے ایک پرفیوم خرید لیا۔ یہی طریقہ ہو سکتا تھا کہ میں اس کے تحفوں کے احسانات کا بدلہ دے سکتا۔

پرفیوم میں نے اس کے فلیٹ میں جا کر دیا تھا۔ وہ مجھے اپنے فلیٹ کے دروازے پر دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ ”ارے صاحب! میرے نصیب کہ آپ میرے پاس تشریف لے آئے..... آئیں اندر آ جائیں۔“

”پھر بھی سہی، اس وقت تو میں آپ کو یہ دینے آیا ہوں۔“ میں نے پرفیوم کی شیشی اس کی طرف بڑھا دی۔

”ارے یہ کیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جناب میں اپنے لیے پرفیوم لے رہا تھا۔ پھر آپ کا خیال آیا میں نے سوچا کہ آپ کے لیے بھی لے لوں۔“

”اوہو، کیوں زحمت کی آپ نے؟“

”دیکھیں انکار مت کیجیے گا۔“ میں نے کہا۔ ”کچھ میرا بھی تو حق ہے پلیز۔“

اس نے کئی بار میرا شکر یہ ادا کرتے ہوئے وہ پرفیوم لے لیا۔ پھر اس سے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور میں اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

کچھ دنوں تک پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے کسی کام میں مصروف ہو گیا ہو۔

دو چار دنوں کے بعد وہ پھر ٹپک پڑا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھا۔ ”ارے جناب ایک بار پھر اپنے کام کے سلسلے میں لاہور جانا پڑ گیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”چلیں، یہ تو اچھی بات ہے کہ آپ بڑی رہتے ہیں۔“

”ہاں صاحب! کام تو کام ہوتا ہے۔“ پھر اس نے وہ پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لیں جناب انارکلی بازار سے آپ کے لیے لیتا آیا ہوں۔“

”خدا کی پناہ، یہ ہے کیا؟“

”یہ سونے کے گلاسوں کا ایک سیٹ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیسے؟“

”یہ سونے کا بنا ہوا ہے۔“

”کیوں اتنی زحمت کی۔“

”نہیں جناب اس میں زحمت کیسی آپ تو میرے پڑوسی ہیں اور ایک اچھا پڑوسی بھائیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ لیں رکھ

”لیکن کیوں، آپ کیوں اتنی زحمت کیے جا رہے ہیں؟“
 ”پھر وہی زحمت کی بات کی آپ نے۔“ وہ نہ امان گیا
 تھا۔ ”اس میں کون سی زحمت ہوگی۔ میں اپنی محبت میں لے کر آیا
 ہوں۔ پلیز انکار مت کیجیے گا۔“
 اس بار بھی اس کا تحفہ قبول کرنا پڑا تھا۔

دو چار دنوں کے بعد وہ پھر آگیا۔ اس بار وہ میرے لیے
 دو عدد قمیص لے کر آیا تھا۔ ”یہ لیں جناب یہ انگلینڈ کی قمیص ہیں۔
 آپ کے لیے لایا ہوں۔“

”وجاہت صاحب! یہ آپ کیا کرنے لگے ہیں۔ اب
 مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

”پلیز دل نہ توڑیں۔“ اس نے کہا اس کی آواز رندھ مٹی
 تھی۔ ”میں تو بس محبت کا بھوکا ہوں۔ اگر قبول کر لیں گے تو
 عنایت ہوگی۔“

مجھے وہ قمیص قبول کرنی پڑ گئی تھیں۔ کچھ شرمندگی سی
 ہو رہی تھی۔ اس شخص نے اتنا بہت کچھ دے دیا تھا اور میں نے
 کیا دیا تھا، بس پر فیوم کی ایک شیشی۔

اس لیے میں نے اس کے لیے شیونگ کی ایک کٹ خرید
 لی۔ پورے دو ہزار کی، بہت ہی شاندار۔ جب میں نے اس
 کے حوالے کی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ ”ارے یہ آپ کیا
 کرتے ہیں۔ اتنا مہنگا تحفہ خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”وجاہت صاحب! آپ کے غلوں کے سامنے تو یہ کچھ
 بھی نہیں ہے۔ پلیز قبول کر لیں۔“ اس نے قبول کر لیا۔

تیسری شام کو وہ پھر میرے دروازے پر تھا۔ اس بار وہ
 ایک قمیص تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدی بھی تھا۔ جو ایک بڑا سا
 کارٹن اٹھائے کھڑا تھا۔

”سلیم صاحب! یہ آپ کی نذر ہے۔“ اس نے کارٹن کی
 طرف اشارہ کیا۔

”وجاہت صاحب کیا ہے اس میں۔“
 ”سلیم صاحب ایک ڈیک ہے۔ یہ وہی ڈیک ہے جو آپ کے
 ساتھ آرام سے میوزک سنتے رہے گا۔“

”ڈیک!“ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ ”یہ ڈیک
 آپ مجھے تحفے میں دے رہے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ اس نے انکساری سے گردن جھکا دی۔
 ”اچھا سیٹل رہا تھا میں نے سوچا آپ کے لیے لے لوں۔“

”لیکن یہ تو کمال ہے۔ میرا مطلب ہے اتنا مہنگا تحفہ
 اچھا نہیں لگتا۔“

”بھائی صاحب رہنے دیں۔ جب غلوں کا رشتہ ہو تو

مجھے اور سستے کی پروا نہیں کرتے۔ رکھ لیں پلیز۔“ اس نے پھر
 اتنے غلوں سے بات کی کہ ہے اس کا تحفہ رکھنا ہی پڑ گیا۔
 اب پھر میرے سامنے ایک سوال آکھڑا ہوا تھا۔ اس
 کے اس مجھے تحفے کے عوض کیا دیا جائے۔ اس کم بخت نے تو
 شرمندہ کرنے پر کوئی کسر نہ چھوڑی۔

بہت سوچ کر میں نے اپنے دفتر سے دس ہزار روپے
 ایڈوائس کے طور پر لیے اور 13 اچھ کا ایک کھرنی دی اس کے
 حوالے کر دیا۔

وجاہت اس فی وی سیٹ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔
 ”ارے اب یہ کیوں لیا آپ نے؟“ اس نے کہا۔ ”یہ تو بہت
 قیمتی ہے۔“

”وجاہت صاحب! آپ کے غلوں سے زیادہ قیمتی
 نہیں۔ میں انکساری سے بولا۔ ”بس اسے قبول کر لیں۔“
 ”اب تو لینا ہی پڑے گا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ نے تو
 مجھے خرید لیا ہے۔“

میں نے وہ سیٹ اس کے حوالے کر دیا۔ اب میں مطمئن
 تھا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور اب کچھ دنوں کے لیے
 سکون ہو جائے گا۔

لیکن کہاں کا سکون، صرف چار دنوں کے بعد وہ پھر
 میرے پاس آگیا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں تو کچھ نہیں تھا لیکن
 وہ بہت بڑبڑا دھواں دے رہا تھا۔

”چلیں میرے ساتھ چلیں۔“ اس نے کہا۔
 ”کہاں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بس ذرا نیچے ٹیک۔ بس پانچ منٹ کا کام ہے۔“
 ظاہر ہے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس کے
 ساتھ میڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ میڑھیوں کے پاس ہی ایک
 جگہ گلی ہوئی بایک کھڑی ہوئی تھی۔

”سلیم صاحب! یہ بایک آپ کی نذر ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”کیا!“ اس دفعہ میں واقعی بے ہوش ہونے والا
 تھا۔ ”یہ بایک..... یہ نئی بایک..... آپ نے میرے لیے
 خریدی ہے.....!!“

”جی ہاں، آپ ہی کے لیے۔“ اس نے بتایا۔ ”آج ہی
 سودوم سے نکلوا کر لایا ہوں۔“

”لیکن وجاہت صاحب! یہ تو انتہا ہوگی، اتنی قیمتی
 چیزیں میں کبھی قبول کر سکتا ہوں؟“

”پلیز انکار نہ کریں۔ یہ تو آپ کو لینا ہی ہوگی۔“ اس
 نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

اس کی انتہا کچھ ایسی تھی کہ میں انکار نہیں کر سکا۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل کی چابی قبول کر لی۔

لیکن اب ایک بہت بڑا خطرہ میرے سر پر منڈلانے لگا تھا۔ اب تک یہی ہوتا آیا تھا کہ اس نے مجھے کوئی تحفہ دیا میں نے بواب میں اس سے قیمتی تحفہ دے دیا۔ اس نے جواب الجواب کے طور پر اس سے زیادہ قیمتی تحفہ دے دیا اور نوبت یہاں تک آچکی تھی کہ اس نے ہائیک تحفے میں دے دی تھی۔ لہذا جواب میں مجھے کوئی گاڑی تحفے میں دینی تھی۔ فرض کریں اس نے میری گاڑی کے جواب میں کوئی پلاٹ تحفے میں دے دیا تو پھر میں کیا کرتا۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ اس محلے سے ہی بھاگ لوں۔ ویسے بھی وہ فلیٹ تو کرائے ہی پر تھا۔ میری جب مرضی ہو وہاں سے نکل سکتا تھا۔

پھر میں نے یہی کیا۔ میں نے مالک مکان سے اپنا ایڈوانس واپس لیا اور راتوں رات خاموشی سے نکل لیا۔ لوگ تو اپنے پڑوسیوں کی بد معاشیوں سے تنگ آ کر مکان چھوڑتے ہیں اور میرا یہ حال تھا کہ میں پڑوس کی مہربانی سے تنگ آ کر بھاگ نکلا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد میرے کچھ پرانے دوستوں نے مجھے فون کر کے بتلایا کہ انہوں نے پرانے دوستوں کو ایک جگہ جمع کر کے ایک کلب بنالیا ہے اور ہفتے کی رات اس کلب کی طرف سے ڈنر دیا جا رہا ہے۔

یہ بہت اچھی خبر تھی۔ اس قسم کی بور لائف میں اس قسم کی سرگرمیاں رنگ بھر دیتی ہیں۔ میں نے شرکت کی یقین دہانی کرا دی۔ ہفتے کی رات میں ہوٹل پہنچ کر اپنے پرانے دوستوں سے مل کر دل خوش ہو گیا تھا۔ ہم کتنے دنوں کے بعد مل رہے تھے۔

پرانے زمانے پوری شدت کے ساتھ یاد آنے لگے تھے۔ اس تحریک کا بانی اسلم حسین تھا۔ اس نے ایک آدمی سے تعارف کروایا۔ ”سلیم! یہ ہمارے دوستوں کے حلقے میں تو نہیں رہے ہیں لیکن ہم نے اعزازی طور پر ان کو اپنی محفل یاراں کا ممبر بنالیا ہے۔“

”چلو یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ میں خوش دلی سے بولا۔ ”اب ان کا مکمل تعارف میں کروادوں۔“

”یہ ڈاکٹر درانی ہیں۔“ اسلم نے بتایا۔ ”پاکستان کے صفِ اول کے سائیکاٹرسٹ۔“

”اوه یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”نفسیات سے میری بھی بہت گہری دلچسپی رہی ہے۔“ میں اور ڈاکٹر درانی باتیں کرنے لگے۔ اسلم حسین دوسرے دوستوں کے پاس چلا گیا تھا۔ میں نے یوں ہی باتوں باتوں میں اس بڑوسی کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس نے تجھے دے دے کر مجھے بے حال کر دیا تھا۔

ڈاکٹر درانی نے ہنسا شروع کر دیا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔“

”نفسیاتی مرض ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں! اس کو نفسیات کی اصطلاح میں ڈورو مانیا (Doro mania) کہتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”اس میں جتنا حضرات بعض اوقات اتنے حساس ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کا تحفہ قبول نہ کیا گیا تو شدید نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“

”خدا کا شکر ہے ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”کہ میں وہاں سے بھاگ آیا۔“

”ہاں! یہ بہت اچھا کیا آپ نے۔“ ڈاکٹر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک خوب صورت سالانٹر نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی کرتے ہیں۔“

”جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ یہ بری عادت چھچھا نہیں چھوڑتی۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”میں پچھلے دنوں سنگاپور میں تھا۔ وہاں سے میں نے یہ سالنٹر خریدا تھا۔“ ڈاکٹر نے سالنٹر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ یس، یہ میں آپ کو تحفے میں دے رہا ہوں۔“

”مجھے تحفے میں! مجھے شاک سا لگا تھا۔“ یہ آپ مجھے تحفے میں دے رہے ہیں؟“

”جی ہاں رکھ لیں نا پلیز۔“

میں نے ایک نظر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور اچانک باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ ڈاکٹر پکارتا ہی رہ گیا تھا لیکن میں کہاں رکنے والا تھا۔

ایک اور تحفہ ایک اور ڈورو مانیا کا مریض۔ ایک سے تو جان چھڑا کر بھاگا تھا اب یہ دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی۔

تو وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں پلٹ کر دوستوں کے کلب کی طرف نہیں گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ مجھے جب بھی کوئی شخص ملتا ہے تو میں پہلے اس سے یہی پوچھتا ہوں کہ بھائی خدا کے لیے یہ بتا دو کہ تم مجھے کوئی تحفہ دینے کا ارادہ تو نہیں کر رہے ہو یا کہہ دیتا ہے تو میں دوبارہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھتا۔

طعن

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم

یہ روداد ہمارے ہی علاقے کی ہے۔ اس پوری روداد میں ایک سبق ہے۔
ایک انوکھا پن ہے اور یہی انوکھا پن خود میں ایک خوب صورتی ہے۔
میرا خیال ہے یہ روداد قارئین سرگزشت کو بھی پسند آئے گی۔

محمد سلیم اختر
(راولپنڈی)



چوہدری محبت خان اور چودھرائی ریوراں بی بی نے
محبت کی شادی کی تھی۔ محبت خان عمر پور کا رہنے والا تھا اور
ریوراں علی پور کی۔ وہ علی پور کے ملک زمان کی بیٹی تھی۔ حسن
اور خوب صورتی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ محبت خان بھی
کچھ کم نہ تھا۔ وہ مردانہ حسن و جمال کا نادر نمونہ تھا۔ اس کا نام
ہی محبت خان نہ تھا، کردار بھی محبت بھرا تھا۔ وسیع و عریض
اراضی کا مالک تھا۔ بڑی سی حیثیت تھی، ڈھور ڈھور کر چاکر
تھے۔ زندگی رواں دواں تھی۔ گاؤں میں بھی اس کی بڑی

عزت تھی اور اس کی واحد وجہ اس کا اعلیٰ اخلاق تھا۔ غریب نوازی اس کی فطرت تھی۔ ان ہی اوصاف نے اسے مقبول بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کی زندگی میں ایک کی تھی۔ شادی کے سات سال گزرنے کے باوجود ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ چودھرائن اس دکھ کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرتی تھی۔ ڈاکٹر حکیم۔ ٹوٹا ٹوٹکے دوا اور دارو جو حیلہ اس کے بس میں تھا وہ کر چکی تھی لیکن اس کی گود اب بھی سوتی تھی اور اسی غم میں وہ اندر ہی اندر کھل رہی تھی۔ چودھری محبت نے بظاہر کبھی کبھ نہ کہا تھا لیکن اندر ہی اندر اسے بھی ارمان تھا کہ ان کے آئینہ میں بچوں کی قلمکاریاں گونجیں۔

گاؤں کے غریب اور مزار سے بھی جھولی اٹھا کر اس کے لیے دعائیں مانگتے تھے کیوں کہ چودھرائن بھی سخاوت اور فراخ دلی میں محبت خان سے کم نہ تھی۔ مگر نہ جانے اس کی بھابی صغرا کو اس سے کیا پیر تھا کہ اس نے کبھی زیوریاں کو اچھانہ جانا۔ زیوریاں کا بھائی ملک سلطان اپنے گاؤں عمر پور کا بڑا زمیندار تھا۔ اس کی شادی زیوریاں کی شادی کے چھ ماہ بعد ہوئی تھی اور اب وہ تین بچوں کے والدین تھے۔ صغرا اکثر زیوریاں کو بانجھ ہونے کے طعنے دیتی تھی مگر اس کے باوجود زیوریاں اس کی کوئی بات دل پر نہ لیتی اور اس کے طنز کو برداشت کر لیتی۔ وہ بھائی اور بھابی کا بے حد احترام کرتی تھی۔ ملک سلطان کو تو بہن کا بہت خیال رہتا تھا مگر صغرا کی وجہ سے وہ مجبور رہتا تھا۔

صغرا کے طعنے کبھی کبھی اس کو رلا دیتے۔ آٹھواں سال گزرا تو چودھرائن کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ایک روز وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ چودھری کا دل دھل گیا۔ اس نے اسے تسلی دی اور اگلے دن ہی اس نے عمرہ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چند ہی دنوں میں سفر کے مراحل طے ہو گئے۔

اللہ کے گھر پر نظریں پڑتے ہی دونوں کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے اور پھر دونوں پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ ایک سیلاب ان کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ انہوں نے رو رو کر اور گڑ گڑا کر اپنے رب سے جانے انجانے میں سرزد ہوئے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنی عرضی پیش کر دی۔ پھر وضو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جا کر بھی انہوں نے اپنی جھولیاں پھیلا دیں۔ آنسو ایک بار پھر ان کے دامن بھگونے لگے۔ ان کے یوں چھا چھوں پر سے آنسوؤں کی بارش نے رحمت الہی کے جذبہ رحم کو جوش دلا دیا۔ سفر سے واپس آنے

کے کچھ ہی ماہ بعد جب ڈاکٹر نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ چودھرائن کی گود بھرنے والی ہے تو اس حویلی میں اصلی گھر کے چراغ جلانے لگے۔ شیرینی عتی، مسجد میں ختم القرآن ہوا اور دعائیں مانگی گئیں۔

سارا گاؤں چودھری اور چودھرائن کی خوشیوں میں برابر کا شریک تھا۔ زیوریاں نے مصلے پر رو کر دعا مانگی کہ اسے بیٹا دینا۔ چودھری بھی رب کے آگے فریاد کرتا کہ اس کی دعا تھی کہ اسے بیٹی ملے۔

☆.....☆

مگر جب ولادت ہوئی تو محبت خان کی دعا کا پھل تھی۔ اس کا نام خوش بخت رکھا گیا۔ اس نے باپ بننے کی خوشی میں خوشیاں منانے کا اعلان کیا مگر چودھرائن تو بیٹے کی امید لگائے بیٹھی تھی لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ ہو سکتا ہے اگلی بار لڑکا ہو جائے مگر ڈاکٹر افشاں نے جس کے ہاتھوں خوش بخت کی پیدائش ہوئی تھی اس نے یہ کہہ کر اس کے ارمانوں پر اس ڈال دی کہ چودھرائن کے آئندہ ماں بننے کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔ خوش بخت اس کی پہلی اور آخری اولاد رہے گی۔ زیوریاں نے نہ جانے کس دل سے یہ خبر قبول کی مگر اس نے بیٹی کو کبھی بھی اپنے اس دکھ کا احساس نہ ہونے دیا۔

خوش بخت کی پیدائش کے چند دنوں بعد صغرا ایک اور بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس کا نام انہوں نے کاشان رکھا تھا۔ اس سے پہلے صغرا کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ زیوریاں کے بھائی سلطان نے بھی خوش بخت کی پیدائش پر بہت خوشی منائی تھی۔ بھانجی کی خوشی میں اس نے اپنے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کی کہ اس کی بہن کی گود بھی ہری ہو گئی ہے۔ اب کاشان کی پیدائش نے ان خوشیوں کو دو چند کر دیا تھا۔ لہذا سلطان نے صغرا سے پوچھے بغیر ہی خوش بخت اور کاشان کی نسبت بچپن میں ہی طے کر دی۔ محبت خان اور زیوریاں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ لہذا انہوں نے اس رشتے کو دل سے قبول کر لیا۔ صغرا نے بھی سلطان کے فیصلے کی تائید کر دی اور خوش بخت کو کاشان کے نام کی لکھی تھی پہنادی گئی۔

☆.....☆

خوش بخت اپنی ماں زیوریاں سے بھی بڑھ کر خوب صورت تھی۔ جب وہ عمر کی منزلیں طے کرتے ہوئے جوانی کی دہلیز پر پہنچی تو لوگ اسے دیکھ کر متحکک رہ جانے لگے۔ ایسا

لگتا تھا کہ کوئی حور رستہ بھول کر زمین پر آگئی ہو۔ گاؤں کی سب لڑکیوں کی رنگت سے اس کی رنگت صاف تھی۔ گالوں پر لالی نمایاں تھی۔ گاؤں میں اس سے بڑھ کر حسین اور کوئی لڑکی نہ تھی۔ کاشان بھی کم نہ تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ قصبے کے اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد وہ شہر چلا گیا اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ بھی کبھار اپنی پھوپھی سے ملنے آتا تھا۔ خوش بخت سے بھی گفتگو ہو جاتی تھی لوگ اس جوڑی کو لاکھوں میں ایک کہتے تھے۔ صغراں بھی خوش بخت کو پسند کرنے لگی تھی کیوں کہ وہ بہت ہی خوب صورت تھی، نازک بھی اور سلیقہ شعار بھی۔ محبت خان اور زیوراں کی تو وہ جان تھی۔ صغراں کے طعنے بھی اب ختم ہو گئے تھے اور زیوراں بھی بانجھ ہونے کا لیبیل اتار چکی تھی۔ کاشان ایف اے پاس کرنے کے بعد گاؤں واپس آ گیا تھا اور اس نے اپنی زمینوں کا حساب کتاب سنبھال لیا تھا۔ سلطان اور صغراں سوچ رہے تھے کہ اب خوش بخت کی ڈولی لے لی آئیں۔ خوش بخت کے ماں باپ کا بھی یہی خیال تھا کہ اب بیٹی کو رخصت کر دیا جائے۔

خوش بخت اور اس کی سہیلیوں کو بھی خبر ہوئی تھی کہ خوش بخت کو دلہن بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان ہی دنوں خوش بخت کی طبیعت خراب سی رہنے لگی۔ جسم میں مستقل درد رہنے لگا تھا۔ رنگت بھی پیلی ہو گئی تھی اور چہرہ بھی اترنے لگا تھا۔ اس کی ماں نے اپنے طور پر خوش بخت کی دیکھ بھال کی۔ نوے نوکوں کو آزمایا مگر اس کی حالت بہتر نہ ہوئی تو اس نے اس کے باپ کو بتایا تو وہ فوراً اسے شہر کے بڑے اسپتال لے گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے خوش بخت کا چیک اپ کیا اور پھر اسے شہر کے ایک مشہور سرجن کی طرف ریفر کر دیا۔ سرجن نے کافی دیر معائنہ اور مختلف قسم کے ہدایات کرنے کے بعد کچھ ٹیسٹ کرانے کو کہا جو ایک مشہور لیبارٹری سے کرائے گئے۔ رپورٹس اگلے روز ملنی تھیں لہذا محبت خان ایک عزیز کے ہاں ٹھہر گیا۔ خوش بخت بھی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ دانت بھی اس نے خاصی تکلیف میں گزاری تھی۔ اگلے دن محبت خان رپورٹس لے کر سرجن کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے ساری رپورٹس پڑھنے کے بعد کہا۔ ”محبت خان! آپ کی بیٹی میں جسمانی تبدیلیاں آرہی ہیں۔“

”حیرت ہے جسمانی تبدیلیاں اور اس عمر میں۔“ محبت خان حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میری بیٹی

تو اس وقت پچیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس عمر میں اب بھلا کیا تبدیلیاں آئیں گی اور پھر ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی بلکہ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“ محبت خان بولتے بولتے رک گیا اور ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی مانند کوندا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ خوش بخت گاؤں کے کسی لڑکے کے ساتھ..... اگر ایسا ہوا تو میں ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔ مگر نہیں میری بیٹی ایسی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو شرم و حیا کا پیکر ہے۔“

”آپ کی بیٹی لڑکا بن رہی ہے۔“ ڈاکٹر نے دھماکا کر دیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میری بیٹی لڑکا بن رہی ہے۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے اور بھلا بھی ایسا ہوا بھی ہے؟ آپ رپورٹ کو غور سے پڑھیں۔ لگتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”چودھری صاحب! ایسا ممکن ہے، اس سے پہلے کئی ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ آپ کی بیٹی کی بھی جنس تبدیل ہو چکی ہے۔ میں اسے اسپتال میں داخل کر رہا ہوں۔ ایک معمولی سے آپریشن کے بعد وہ عمل مرد بن جائے گی اور معمول کے مطابق زندگی بھی گزرے گی۔“

”نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا نہیں ہوتا چاہیے۔ آپ اس کو کوئی ایسی دوا دیں، کوئی ایسا ٹیکا لگائیں کہ وہ لڑکی ہی رہے، ورنہ لوگ کیا کہیں گے۔ ان کو حقیقت کیسے تسلیم کراؤں گا۔“ محبت خان افسردہ سا ہو کر بولا۔

”کمال کر رہے ہیں آپ! قدرت آپ کو پلا پلایا بیٹا دے رہی ہے اور آپ ہیں کہ ناشکری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب! اگر یہی بیٹا مجھے آج سے پچیس سال پہلے مل جاتا تو میں گاؤں میں شیرینی تقسیم کرتے نہ تھکتا۔ میں نے خوش بخت کی پیدائش پر بھی منجھائی تقسیم کی تھی اور صبر بھی کیا تھا کہ یہ اللہ کی دین تھی۔ چودھری محبت خان بول رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں مستقبل کے مناظر تیزی سے گزر رہے تھے کہ وہ گاؤں کیسے جائے گا۔ زیوراں کو کیسے بتائے گا۔ بتا دیا تو اس کا رد عمل کیا ہوگا؟ وہ عورت جو روز ازل سے اپنے دل میں بیٹے کی خواہش لیے ہوئے تھی۔ اب وہ اپنی اس خواہش کو اٹانے کے روپ میں پورا ہوتے کیسے برداشت کرے گی۔ کیا وہ اس خوشی میں دیوانی ہی نہ ہو جائے۔“

ڈاکٹر نے محبت خان کی ذہنی کیفیت کو جان لیا تھا۔ اس نے چودھری کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولا۔

”چودھری صاحب! خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس نے آپ کو بیٹی دی جسے آپ نے دل سے قبول کر کے سینے سے لگایا اور اب وہی آپ کو بیٹا دے رہا ہے تو آپ ناشکرے کیوں بن رہے ہیں۔“

”محبت خان گم صم سا بیٹھا ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کو کیسے کہتا کہ بات صرف ان کے سمجھنے اور قبول کرنے کی نہیں ہے۔ گاؤں اور علاقے کے لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ کیسی کیسی باتیں سننے کو ملیں گی زیور اس کیسے سمجھائے گی بیٹی کو دواغ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ سلطان، صغراں اور کاشان کو ہم کیا جواب دیں گے۔ ہم کیسے ان کا سامنا کریں گے۔ صغراں تو آسمان سر پر اٹھالے گی۔ اس کی طنزیہ باتیں ہمیں جیتے جی مار ڈالیں گی۔ کاشان پر کیا گزرے گی جو خوش بخت کا منگیتر ہے اس سے محبت کرتا ہے۔“

☆.....☆

صغراں اور سلطان دونوں ہی کاشان کے سر پر سہرا باندھنے کے لیے بے تاب تھے۔ صغراں اور اس کی بیٹی کھلی روزانہ ہی بازار کے چکر لگا رہی تھیں۔ وہ اس شادی کو منفرد اور یادگار بنانا چاہتی تھیں۔ خوش بخت اور سلمیٰ میں پیار محبت بھی بہت تھا اور اب تو خوش بخت سلمیٰ کی بھابی بن کر اس کے پاس ہی آرہی تھی۔ سلمیٰ کی خوشی تو دیدنی تھی کہ اس کی ہونے والی بھابی لاکھوں میں ایک تھی۔ صغراں نے زیور کا آرڈر بھی دے دیا تھا اور اب کپڑوں کی خریداری ہو رہی تھی۔ حویلی کے سب نوکر بھی خوش تھے کہ سلطان کی حویلی میں خوشیوں کی برأت اترنے والی تھی۔

زیور اس بھی مصروف تھی۔ وہ بڑا سا بکس کھولے خوش بخت کے جہیز کے جوڑے چھاننے میں مصروف تھی مگر اس کا دھیان خوش بخت کی طرف ہی تھا۔ اس نے بکس بند کیا اور دالان میں بچھے تخت پر آ بیٹھی اور غلا میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ سامنے کام کرنے والی عورتیں کالج صاف کرنے میں مصروف تھیں۔ دوپہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی۔ فضا اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”اے میرے رب! کوئی خبر کی خبر سنانا۔“ اس نے دوپٹا پھیلا کر دعا کی۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں اتنے میں ملازمہ رضیہ اس کے قریب آئی تو اس نے پوچھا۔ ”خوش بخت کی خبر.....؟“

چودھرائن اداس ہو کر بولی۔ ”رضیہ! پتا نہیں آج میرا دل کیوں ڈول رہا ہے۔ اللہ خیر کرے، عجیب عجیب سے

خیالات دل میں آرہے ہیں۔ نہ جانے میری خوش بخت کس حال میں ہے۔“

”بی بی جی! دل چھوٹا نہ کریں۔ سو ہنار ب خیر کرے گا۔“ رضیہ نے اسے تسلی دی اور اس نے آمین کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں ایک نوکرانی نے آنکر اطلاع دی کہ چودھری صاحب واپس آگئے مگر خوش بخت ان کے ساتھ نہیں ہے۔

زیور اس اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اٹھی اور چودھری کے کمرے میں پہنچی۔ وہ بڑی بے چینی سے کمرے میں ٹھل رہا تھا۔ بیوی پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آنکھوں میں بے بسی نمایاں تھی۔ چودھری کی یہ حالت دیکھ کر چودھرائن کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ دھم سے فرش پر ہی بیٹھ گئی۔ محبت خان بھی اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر یوں ہی خاموشی رہی۔ وہ کوئی مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اور چودھرائن اذیت کے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ بالآخر محبت خان نے ہمت کی اور اسے دھیرے دھیرے بتانے لگا۔ زیور اس منہ کھولے یوں سن رہی تھی جیسے محبت خان اسے الف لیلہ کی داستان سنا رہا ہو۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہے۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کے رخساروں سے ٹپک کر دوپٹے کو بھگور رہی تھیں۔ محبت خان نے بات ختم کی تو وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

”زیور اس! رب نے تیری سن لی ہے۔ تجھے بیٹے کی بہت چاہ تھی ناں۔ اب اللہ پلا پلایا بیٹا دے رہا ہے تو، تو رونے بیٹھ گئی۔“ چودھری نے کہا۔

”کون سی عورت ہے جسے بیٹے کی طلب نہیں، یہ بیٹا جو مجھے آج مل رہا ہے اگر اس وقت مل جاتا تو۔“ زیور اس تڑپ کر بولی۔

”تو..... تو ساری برادری میں منٹھائی بانٹتی۔ آج تو وہ حسرت پوری کر لے میں منٹھائی منگوا دیتا ہوں۔“ چودھری نے کہا۔

”اس وقت اور اب میں بہت فرق ہے۔ اُس وقت اس مجھے یہ بیٹا مل جاتا تو میں اکیس گاؤں میں منٹھائی بانٹتی۔ میں شریک برادری میں سر اٹھا کر چلتی اور نکلے نکلے لوگوں کے طعنے سنیتی۔“ یہ کہہ کر زیور اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے کی آوازیں سن کر حویلی کے سارے ملازم بھی وہاں آگئے۔

چودھری نے سب کے سوالیہ چہروں کی طرف دیکھا اور لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”تم سب چودھرائن کو مبارک دو۔ اللہ نے ہمیں اس عمر میں اولاد دینے سے نوازا ہے۔ اب ہماری بیٹی خوش بخت نہیں بلکہ بخت خان بن گئی ہے۔“

ملازم ستائے میں آگئے کہ چودھری کیسی انہونی بات کر رہا ہے۔

چودھری محبت کمرے سے نکلا اور عمر پور روانہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ سنگ رہا تھا کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا ہے۔ عمر پور جا کر اس نے سلطان کو یہ بات بتائی تو وہ حیران ضرور ہوا مگر اس نے سچائی کو تسلیم کر لیا۔ محبت خان کو مبارک باد بھی دی اور کہا کہ وہ اس کے ساتھ شہر جائے گا پھر وہ دونوں اکٹھے بخت خان کو لے کر آئیں گے۔

☆.....☆

منوں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی جس نے بھی سنا حیرت سے دانتوں تلے انگلی داب لی۔ کئی ایک نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ مولویوں نے اسے قیامت کی نشانی کہا۔ جوانوں نے اسے سائنسی دور کا کرشمہ قرار دیا مگر عورتوں نے تو اس کی توجیہات کو اور ہی رنگ دیا۔ کسی نے خوشی کا اظہار کیا کہ چلو چودھرائن کی خواہش پوری ہو گئی۔ کسی نے کہا چودھری نے اپنی جایداد بچانے کے لیے ڈھونگ رچایا ہے۔ کوئی بولی چودھری نے شہر میں دوسری شادی کر رکھی ہوگی اور یہ بیٹا اس سے ہوگا۔ مگر اس کا سب سے زیادہ دکھ صغرا کو تھا۔ کئی عورتیں تو اس کے ہاں باقاعدہ پرسہ دینے لگیں۔

☆.....☆

ادھر خوش بخت ان پنکاموں سے بے خبر خواب آور دعاؤں کے زیر اثر اٹھ رہی تھی۔ اسے اپنی بھلائی کا علم ہو چکا تھا۔ یقین نہ آنے کے باوجود اسے یقین کرنا بھی پڑا۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسا کون سا لمحہ تھا جب اس نے لڑکا ہوئے کی خواہش کی ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو قبولیت بخش دی۔ اسے خوش بخت سے بخت خان بننے کے لیے کئی تکلیف وہ مراحل سے گزرنا پڑا مگر اب وہ مکمل طور پر لڑکا بن چکی تھی۔ اسپتال کے کاغذات میں اس کا نیا نام بخت درج کیا گیا تھا۔ بالآخر اسپتال سے رخصت ہونے کا دن آ گیا۔ چودھری محبت اور سلطان ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹے تھے کہ ایک نرس بخت خان کو ساتھ لیے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل

ہوئی۔ بخت خان کو دیکھ کر دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اتنا گھبرو جوان، محبت خان کا اپنا بیٹا تھا۔ اس کی کئی ایک اڑا راضی کا اگلو تا وارث، اس کے بڑھاپے کا سہارا۔

قدرت کی عنایت کے رنگ بھی عجیب تھے۔ وہ بخت پر نظریں جمائے اس کی طرف بڑھا۔ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور پھر جوش سے گلے لگا یا اور بولا۔ ”اے اب شیروں کی طرح اکڑ کر چل پڑا اب تو لڑکی نہیں۔ جو شرمارہا ہے۔“

بخت خان مسکرانے لگا اور سلطان خان کے گلے جا لگا۔ پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑا۔ اس سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنے باپ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”چلیں ابا جان! اماں! راہ دیکھ رہی ہوگی۔“

”ہاں بیٹا! اس نے تیرا بڑا انتظار کیا ہے مگر تو نے بڑی دیر لگا دی۔“ بخت خان باپ کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا اور چپ چاپ باپ اور ماموں کے ساتھ چل پڑا۔

☆.....☆

حویلی میں شادی کا سماں تھا۔ گاؤں کی سب عورتیں بخت خان کو دیکھنے کے لیے جمع تھیں۔ جوں ہی وہ تانگے سے اتر کر حویلی میں داخل ہوا تو اس پر پھولوں کی چٹیاں برسنے لگیں۔ لڑکیاں بالیاں اسے دیکھنے کے شوق میں ایک دوسرے پر گر رہی پڑ رہی تھیں۔ بڑی بوڑھیاں آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ”ٹاک نقشہ بالکل ویسا ہی ہے۔“

”بھئی صورت تو بدلتے سے رہی۔“

”سچ سچ کا لڑکا لگتا ہے۔“

”لگتا ہی نہیں کہ یہ پہلے لڑکی تھا۔“ غرض جتنے مذاحتی باتیں ہو رہی تھیں۔

بخت خان! اپنی ماں کے قریب جا پہنچا اور آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ زیور اس نے سر سے پاؤں تک اسے غور سے دیکھا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر بولی۔ ”واہ مولیٰ! تیرے رنگ۔“ یہ کہہ کر وہ بخت خان کے ہاتھوں کو وارنگی سے جو منے لگی۔ اس کے آنسو زار و قطار بہہ بہہ کر اس کا دامن بھگونے لگے۔ گاؤں کی عورتیں آگے بڑھ کر چودھرائن کو مبارک باد دینے لگیں کہ سوئے رب نے اسے گھبرو جوان بیٹا دیا ہے جو ان دونوں کے بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔

☆.....☆

محبت خان کے معمولات اب بدل گئے۔ کھیتوں پر جانا اس نے کم کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ بخت خان اب کھیتوں

اور چاہے ادا کا سارا حساب کتاب سنبھال لے۔ اس نے ایک فشی بھی رکھ لیا جو بخت خان کی رہنمائی کرنے لگا۔ اسے شروع میں یہ کام مشکل لگا مگر وہ آہستہ آہستہ سیکھنے لگا۔ مگر اس کا شرمیلا پن نہ دور ہوا۔ اس کی چال اب بھی لڑکیوں والی تھی اور وہ نظریں جھکا کر ہی چلتا تھا۔ اس کی سہیلیاں اب اس سے باقاعدہ پردہ کرنے لگی تھیں۔

علی پور سے صرف کا شان ملنے آیا تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور سمجھدار تھا۔ جب کہ اس کی ماں اور بہن بھائی ان پڑھ تھے۔ کا شان نے بخت خان کو مبارک باد دی اور کہا کہ قدرت جو فیصلہ کرتی ہے اس میں بہتری ہی ہوتی ہے۔ اب تم میرے کزن ہی نہیں بلکہ دوست بھی ہو۔ آج سے ہماری دوستی ہوگی۔ کا شان نے ایسی باتیں کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی اور پھر اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دے کر چلا گیا۔ اگلے دن محبت خان نہ جانے کے باوجود بھی علی پور چلا گیا۔ اس کے ماموں سلطان اور کا شان نے اسے خوش آمدید کہا مگر اس کی ممانی صفراں اور اس کے دو بیٹوں نے اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی۔ سہلی، بخت خان سے ملنا چاہتی تھی مگر اس کی ماں نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ بخت خان کے سامنے نہ آئے۔ لہذا وہ کسی سہلی سے ملنے اس کے گھر چلی گئی۔ کا شان کے بھائیوں، عرفان اور عمران نے بخت خان سے سرسری سا ہاتھ ملایا اور کسی قسم کی گرجبوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔ صفراں نے بھی بادل خواستہ اسے خوش آمدید کہا اور کھانا لگا کر چلی گئی۔ پھر اس کے سامنے نہ آئی۔ بخت خان ان لوگوں کے طرز عمل سے حیران رہ گیا اور وہ یہ جان گیا کہ اس کے ماموں اور کا شان کے علاوہ کسی نے اس کے اس روپ کو قبول نہیں کیا۔ اس نے ان کی طنزیہ باتیں بھی سن لیں جو وہ آپس میں کر رہے تھے مگر ان کے برعکس کا شان کی دوستی نے اسے حوصلہ دیا اور اسے یقین سا آ گیا کہ زندگی کے اس نئے سفر میں وہ اس کا ساتھ دے گا۔ اسے دیکھا کہ سہلی اس سے ملنے نہیں آئی۔

بخت خان جب ندی پار کر کے اپنے گاؤں کی حدود میں داخل ہوا تو اس نے کنویں والا راستہ اختیار کیا کیوں کہ وہ شارٹ تھا۔ عصر کے بعد کا وقت تھا۔ کنویں پر گاؤں کی لڑکیوں اور عورتوں کی قطاریں لگی تھیں جو پانی بھرنے آئی تھیں۔ دو لڑکیاں کنویں سے ڈول نکال نکال کر سب کے گھڑے بھر رہی تھیں اور آپس میں ہنسی مذاق بھی کر رہی تھیں۔ دور سے انہیں بخت خان گاؤں کی طرف آتا نظر آیا

تو ان سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں سے ایک بولی۔ ”ارے اب تو وہ بالکل لڑکا لگتا ہے۔ سچ سچ کا مرد بن گیا ہے، واہ مولا تیرے رنگ۔“

”تیرا کیا خیال تھا۔ آدھا تیر۔ آدھا بیڑ والی بات ہو گئی۔“ ایک لڑکی ہنس کر بولی۔

”تھوڑی سی بیڑ والی بات تو اب بھی اس میں رہ گئی ہے۔“ ایک اور لڑکی بولی تو سب ہمدن گوش ہو گئیں۔ ”تم دیکھو تو سہی اس کی چال وہی لڑکیوں والی ہے۔ سر جھکائے زمین کے کنگر گنتا جا رہا ہے۔ کسی کی طرف دیکھتا تو ہے ہی نہیں۔“

”تو تمہارا مطلب ہے بخت خاص دیکھی نہیں بنا سکتی ہے۔“ ایک اور لڑکی اپنا گھڑا اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ہاں بنا سکتی ہی سمجھو۔ آج کے ناخالص اور دو نمبری دور کی پیداوار۔“ ایک شرارتی لڑکی نے لہک لگائی تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

ایسی باتیں اب روزانہ ہی کنویں پر ہونے لگی تھیں۔ بخت خان کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے بارے میں عجیب عجیب طنزیہ باتیں کرتے ہیں۔ کچھ اسے چودھری کے گناہوں کی سزا کہتے اور کچھ اللہ کی طرف سے آزمائش۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں مگر بخت خان خاموش تھا۔ وہ کربھی کیا سکتا تھا۔ کسی کا منہ بند تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ کو بھی یقین دلانے میں عرصہ لگا تھا کہ وہ اب خوش بخت نہیں، بخت خان ہے۔ تو پھر لوگ اسے اتنی جلدی کیسے قبول کر لیں گے۔ ان ہی سوچوں کی وجہ سے وہ ہر ایک سے کٹا کٹا رہنے لگا۔ کمرے میں تنہا پڑا رہتا۔ کیوں کہ اس کا کوئی دوست جو نہ تھا، بس ایک کا شان ہی تھا جو اس سے ملنے آ جاتا تھا اور اس کو اپنے ہمراہ باہر لے جاتا۔ اسے وہ کھیل کھیلنے۔ شکار کرنے اور گھوڑے پر بیٹھنے کے مشورے دیتا۔ وہ ہر بات اس کو اپنے برابر لا کر کرتا تھا جس سے خوش بخت میں حوصلہ پیدا ہوتا۔

علی پور کا سالانہ میلہ نزدیک آ گیا تھا۔ کا شان ابھی سے کہہ گیا تھا کہ وہ تیار رہے۔ وہ خود اسے لینے آئے گا اور میلے میں لے جائے گا۔ اسے ٹھیل تماشے دکھائے گا۔

میلے والے دن کا شان آ کر اسے ساتھ لے گیا۔ کبڈی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ گاؤں کے جوان لڑکے ایک ٹولی کی صورت میں بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ کا شان اور بخت خان بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں موجود سب لڑکوں نے بڑی حیرت

ادھر زیوراں اب بخت خان کے سر پر سہرا دیکھنے کے لیے بے تاب تھی۔ جب اس نے کاشان کی بہن سکنی کا نام لیا تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ صغراں نے تو آسمان سر پر اٹھالیا کہ میری بیٹی کا نام کیوں لیا۔ غضب خدا کا، زیوراں اپنے غذا بوں کا پھندا میرے گلے میں ڈالنے چلی ہے۔ وہ تو زیوراں کے درپے ہوئی کہ تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ میری بیٹی کا نام لیا۔ اس آدھے تیر اور آدھے بیڑ کے لیے کیا میری بی بی رہ گئی تھی۔“

زیوراں کی بکی ہو کر رہ گئی۔ جیسے اس سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو گیا ہو۔ ”صغراں! ہم نے جب میری بیٹی مانگی تھی تو اس وقت میں تو گز گز نہیں اچھلی تھی۔ میں نے تمہارے دس دس نام نہیں رکھے تھے۔ میں نے تو اسے دل سے پیٹا بیٹا تھا میں نے تمہارا نام رکھا تھا کہ تمہارے ایک ہی بار رشتہ مانتے پر ہاں کر دی تھی۔ ورنہ لوگ تو بیٹی دیتے وقت لڑکے والوں کو بیسیوں پھیرے لگواتے ہیں مگر میں نے.....“

”میرے بیٹے کا نام اب مت لو۔ وہ تو خالص گھبرو جوان ہے۔ تمہارے بیٹے کی طرح راتوں رات جنس بدل کر نہیں آیا۔“ صغراں طنز یہ لہجہ میں بولی۔

”مگر اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ یہ تو سوہنے رب کی دین ہے۔ جس کو جب چاہے اور جس رنگ میں دے۔“ ”ظاہر ہے تم نہیں کہو گی تو اور کون کہے گا۔“ صغراں کا لہجہ ابھی تک طنز یہ تھا۔ ”تمہیں بڑی آس تھی ناں بیٹے کی۔ وہ تو یوری ہوئی اور وہ بین اس وقت جب بیٹی کی رخصتی قریب تھی۔ جایداو بچے کا اچھا بہانہ ڈھونڈا ہے تم لوگوں نے۔“

”تو اس بات کا مروڑ اٹھ رہا ہے تمہارے پیٹ میں۔“ زیوراں کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ ”تو تم خوش بخت کے ذریعے ہماری جایداو پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ اسی لیے اب تمہیں بخت خان کا وجود دکھ رہا ہے۔“ یہ کہہ کر زیوراں غصے سے باہر نکل آئی۔ گھر آ کر چودھراں نے اپنے دل کی ساری بھڑاس چودھری محبت پر اتار دی۔ رورہ کر اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بخت خان کے دل میں تیر کی مانند کھچا چلا گیا۔ اس نے ماں اور باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ اب وہ اپنے کمرے میں دل کا بوجھ

سے اس نے جوڑے کو دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں اشارہ بازیاں کیں۔ کسی نے کوئی طنز یہ جملہ بھی کس دیا۔ ”کبڈی تو مردوں کا کھیل ہے۔ عورتوں کا کیا کام۔“

بخت خان مزید وہاں نہ ٹھہرا اور کاشان کو چھوڑ کر گھر لوٹ آیا۔ کاشان نے برا نہ منایا اور اگلے دن پھر اس سے ملنے آ گیا۔ دونوں کا اکثر وقت ساتھ گزرنے لگا تھا اور یہی وقت بخت خان کو اچھا لگتا تھا۔ مگر کاشان کی ماں کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ خوش بخت اسے پسند تھی اسی لیے وہ اسے اپنی بہو بنانا چاہتی تھی مگر اس کا یوں راتوں رات لڑکائیں جانا اس نے قبول نہ کیا تھا۔ وہ کاشان کو اس سے ملنے سے منع کرتی تھی مگر کاشان کہتا۔ ”ماں! تم تو خواہ مخواہ اس غریب کے پیچھے بڑ گئی ہو۔ اس میں اس کا بھلا قصور کیا ہے۔ کل تو آپ اس کے کن گاتی تھیں۔ بہو بنانے کا بھی فیصلہ کر لیا مگر آج.....“ کاشان ماں سے الجھ پڑا تو وہ بھی اسی انداز میں بولی۔

”پتر کاشان! کل اور آج میں بہت فرق ہے۔ تم اسے کوئی عذاب الہی سمجھو۔ جس کا سایہ میں تم پر نہیں پڑنے دوں گی۔ مجھے تو یہ قیامت کے آثار لگتے ہیں۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو۔ یہ سائنسی ترقی کا زمانہ ہے جس میں ہر بات ممکن ہے۔ یہ انہونی نہیں ہے۔ لڑکی سے لڑکا اور لڑکے سے لڑکی بن جانا عام سی بات ہے۔“ کاشان نرم لہجہ میں بولا مگر اس کی ماں کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”ہوش کی بات کر بیٹا! یہ انہونی نہیں تو کیا ہے۔ کبھی تم نے گندم کے پودے کے ساتھ بھنے اگتے دیکھے ہیں۔ کبھی آم کے درخت پر خر بوزے لگتے دیکھے ہیں۔ کبھی سنا ہے کہ مرغی نے انڈے نہیں چوزے دیے ہیں۔“

”مگر اس میں بخت خان کا کیا قصور ہے۔ اس میں اس کی مرضی کا دخل تو نہیں ہے۔ ایسا تو کسی کے ساتھ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کسی دن میرے ساتھ.....“

”اللہ نہ کرے بیٹا! ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ مجھے بخت خان سے ہمدردی ہے مگر زمانہ خراب ہے۔ سنا نہیں تم نے گاؤں کے لوگ کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ صغراں اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”اماں! آپ بھی تو ایسی باتیں کرتی ہیں۔“ کاشان یہ کہہ کر ناراض سا ہو گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے بخت خان سے دلی ہمدردی تھی۔ وہ اسے لڑکی ہونے کے خول سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔

آنکھوں کے راستے بہا کر ہلکا کر رہا تھا۔ ساری رات اس نے جاگ کر گزار دی۔

اس دن سے بخت خان خاموش خاموش سا رہنے لگا۔ اس نے کاشان سے بھی ملنا کم کر دیا۔ علی پور نہ جانے کی تو اس نے قسم کھائی تھی مگر کاشان خود اس سے ملنے کے لیے آتا رہا۔

کاشان نے بھی اپنی ماں اور پھوپھی کے درمیان ہونے والی گفتگوں لی تھی۔ اس لیے اس نے پھوپھی سے اور بخت سے ان کے گھر آکر معافی مانگی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ تو خود بھی چاہتا تھا کہ بخت اور سلمیٰ کی شادی ہو جانی چاہیے مگر اس کی ماں تو ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ ایک روز کاشان زبردستی بخت خان کو ندی کے کنارے لے گیا اور اس کی ہمت بڑھا کر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔

”کاشان! میں سوچتا کہ مجھے پیدا کرنے میں رب کی کون سی مصلحت تھی؟ کاشان کو بخت خان سے ایسی تلخ اور براہ راست بات کی توقع ہرگز نہ تھی مگر بخت خان اداس اور دھیمے لہجے میں بولتا رہا۔ ”میری ماں اس دنیا کی سب سے بد قسمت عورت ہے۔ پہلے اس کو اولاد کی تنہائی اور بیٹے کی آس تھی مگر اسے بیٹی ملی تو وہ اپنا دکھ چھپا گئی کہ بیٹا بھی مل جائے گا مگر وقت اور قدرت نے اسے یہ نعمت نہ دی۔ یہ نعمت اب ملی بھی تو کس روپ میں۔ نہ میں اس کا دکھ بانٹنے والی بیٹی ہوں اور نہ ہی اسے خوشیاں دینے والا بیٹا۔“

”کاش میں سلمیٰ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے سکتا۔“ کاشان معذرت بھرے لہجے میں بولا۔ تو بخت خان کی آنکھوں میں سلمیٰ کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ پہلے ان دونوں میں کتنی محبت اور دوستی تھی۔ لیکن اب وہ بخت خان کو شوہر کے روپ میں قبول کر لے گی مگر اس کا جواب تو کسی کے پاس بھی نہ تھا۔

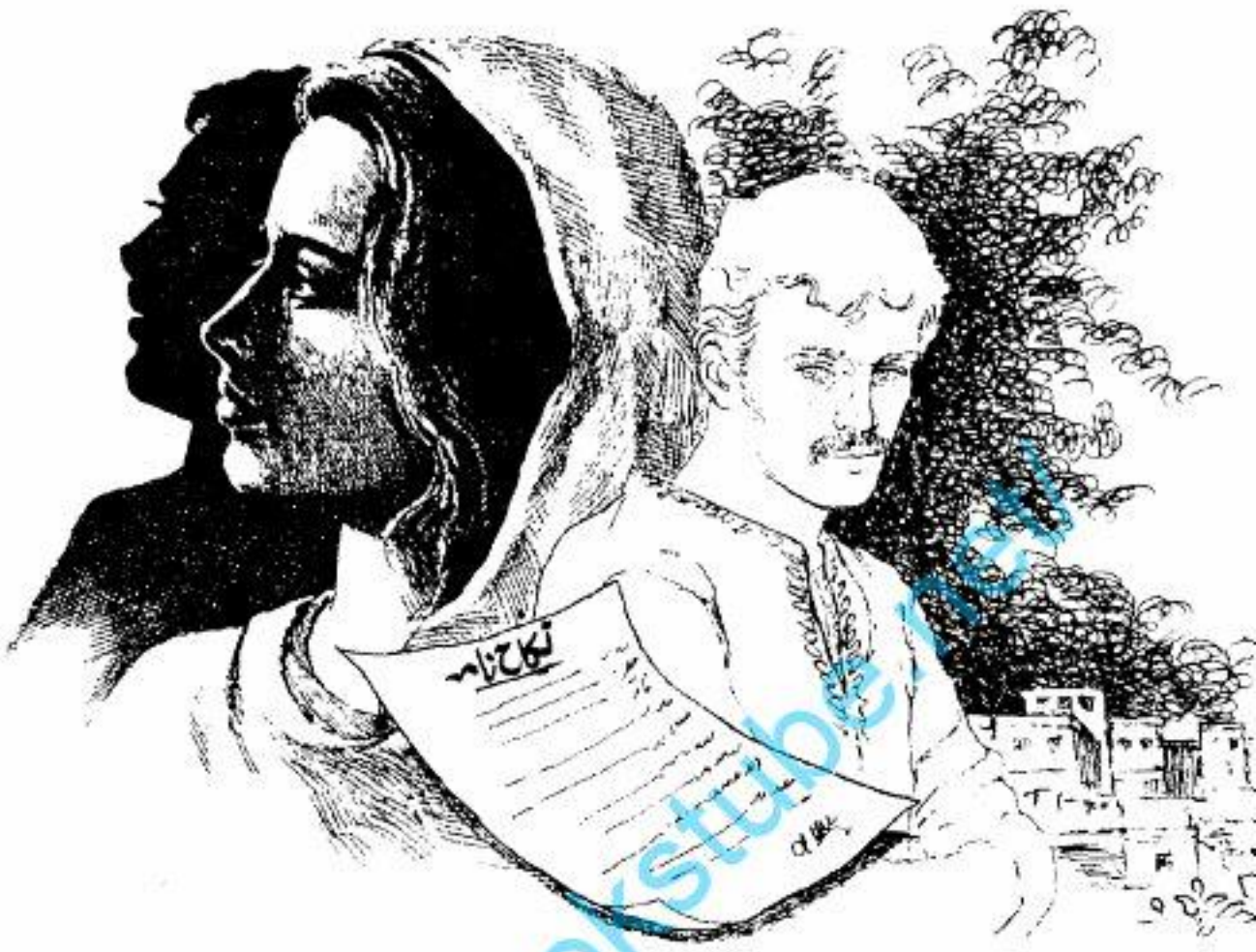
☆.....☆

چودھرائن ابھی تک آگ میں جل رہی تھی اس نے صفراں کو نیچا دکھانے کے لیے دن رات ایک کر دیا اس نے ہر اس گھر کے چکر لگائے جہاں بھی جوان لڑکی موجود تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی نہ صاف انکار کیا اور نہ ہی ہاں کی بس گول مول سا جواب دے کر ٹال دیا۔ بخت خان تو ماں کو منع ہی کرتا رہا کہ اب وہ کہیں نہ جائیں مگر اس کی ماں بہو لانے کے لیے سرگرداں ہی رہی۔ بخت خان کوشش کے باوجود بھی سلمیٰ کی ماں کے طنزیہ الفاظ نہیں بھلا سکا تھا اور اس

کے کانوں میں ہر وقت یہی الفاظ گونج رہے تھے۔ ”ہوں آدھا تیر آدھا تیر۔“

”کیا واقعی یہ سچ ہے۔ ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ اب مکمل مردانہ زندگی گزاروں گا۔ پھر یہ طنزیہ اور تحقارت بھرے جملے یہ سکتے فقرے اور دل میں آگ لگانے والی باتیں کیوں اچھالی جاتی ہیں۔ کیا میں واقعی اپنے ماں باپ کے کسی گناہ کی سزا ہوں۔“ بس اس دن سے بخت خان کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزرنے لگا۔ اس نے زمینوں پر جانا اور کاشان سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چودھری محبت نے اس بات کو محسوس کیا اور اس کی سرزنش بھی کی مگر اس کی خوش دلی شاید ہمیشہ کے لیے کھو گئی تھی۔ اس روز بھی چودھری محبت نے اس سے ذرا غصہ بھرے انداز میں بات کی تھی کہ وہ ہر وقت کمرے میں کیوں بند رہنے لگا ہے۔ باہر نکلو زمینوں پر جاؤ۔ گھومو پھرو اور جاندار زندگی بسر کرو۔ اتنا سنتے ہی بخت خان باہر نکل گیا۔ اس کا رخ زمینوں کی طرف ہی تھا۔ مگر بخت خان لوٹ کر گھر نہ آیا۔ دوپہر ڈھلی تو اس کی ماں کھانے کے لیے اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ نہ آیا تو اس نے ملازموں کو ڈیرے پر بھیجا مگر بخت خان وہاں بھی نہ تھا۔ شام بھی ڈھلنے لگی تھی۔ چودھرائن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر رات آئی اور گزر گئی۔ چودھری محبت نے سارا گاؤں اور علی پور بھی چھان مارا مگر بخت خان کا نشان نہ ملا۔ حویلی اور گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔

اگلے دن گاؤں کے چرواہے نے بتایا کہ گاؤں سے باہر کافی دور جا کر جہاں ندی کافی گہری ہو جاتی ہے وہاں پر پانی میں کسی کی لاش تیر رہی ہے۔ یہ سن کر چودھری اور گاؤں کے لوگ اس طرف دوڑ پڑے۔ وہ لاش بخت خان ہی کی تھی۔ اس نے گہرائی والی جگہ کود کر خودکشی کر لی تھی اس کی لاش بڑی مشکل سے باہر نکالی گئی۔ اس کی ادھ مکھی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں گویا بتانے والے سے پوچھ رہا ہو کہ اس کے بنانے میں اس کی کیا مصلحت تھی؟ چودھرائن کے بین کیجہ چیر رہے تھے۔ کاشان سر ہانے کھڑا رو رہا تھا اور صفرائی اس کی لاش کو دیکھ کر زار و قطار آنسو بہا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”چودھری محبت! تیرا بخت خان تو بڑا شہید و جوان تھا سچا اور انمول۔“ اور کاشان اپنے آنسو چیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کاش میری ماں یہ بات بخت خان کی زندگی میں کہہ دیتی۔



ڈیڑھ سیانا

جناب معراج رسول
السلام علیکم

میں اس بار ایک منفرد نوعیت کی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ اس لیے بھی منفرد ہے کہ اس کا مرکزی کردار بھی میں خود ہوں۔ جیسا کہ یہ میری اپنی سرگزشت ہے۔ میں نے جو قدم اٹھایا اس کی وجہ سے کچھ لوگ مجھے غلط کہیں گے ان سے استدعا ہے کہ وہ میرے پورے حالات کو مدنظر رکھیں۔ سنار کی سو اور لوہار کی ایک۔ میں نے یہی کیا ہے۔

شاہنواز
(ٹورنٹو کیفیڈا)

کو قتل کر دیا۔ کونسا دنیا تو یہ جانتی تھی کہ حق نواز نہ صرف میرا بڑا بھائی ہے بلکہ اس کی مقام پر تھا تو اس کی واحد وجہ نواز ہی تھا۔ یہ باتیں بھی اس نے پھیلانی تھیں۔ مجھے دنیا کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس دنیا نے مجھے دیایا کیا تھا جو میں اس کی

آج میرا بڑی شدت سے کسی کو قتل کرنے کو دل چاہ رہا تھا اور یہ ”کسی“ کوئی اور نہیں بلکہ میرا بڑا بھائی ہے۔ اگر میں اس ارادے پر عمل کر لیتا تو زمانہ مجھے برا درکش اور شاید شیطان کے القابات سے نواز تا جس نے اپنے بڑے بھائی

گھر میں نہیں آؤں گا۔“

اسے اس تقریر کا صرف دسواں یا بیسواں حصہ سمجھیں۔ جسے سن کر اماں اور ابا کے ہاتھوں سے طوطے اڑ گئے تھے۔ پہلا بیٹا ہونے کے ناطے وہ اس سے پاگلوں کی طرح پیار کرتے تھے۔ جب کہ مجھے اس پیار کا دسواں حصہ بھی نہیں ملا تھا۔ اماں دھاڑیں مار کر رونے لگیں اور ابا نے بلبل کر اماں پر چڑھائی کر دی اور انہیں بے نقط سنائیں کہ انہیں نواز کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا میں مر گیا ہوں جو تم میرے بیٹے کو اتارن پہنار ہی ہو۔

”آپ کا نیا سوٹ ہی تو ہے ایک دوبار پہنا اور پھر چھوڑ دیا۔“ اماں نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سوچا کہ پھر سے سلائی کر کے نواز کے سائز کا کروں۔“

ابا کا غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب انہوں نے وہ سوٹ اٹھا کر چولہے میں جھوک دیا۔ میں دس سال کا تھا اور اس وقت تک جی مشہور ہو گیا تھا (اس شہرت میں بنیادی کردار بھائی صاحب کا تھا)۔ مگر میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میں جو بچپن سے اترن پر گزارہ کرتا آ رہا ہوں۔ کیا اماں ابا نے بھی اس طرح میرے لیے سوچا؟ مگر ذہن پر خاصا زور دینے کے بعد بھی ایسا کوئی واقعہ ذہن میں نہیں آیا کہ اماں ابا نے مجھے اترن پہنانے سے انکار کیا ہو۔ حد یہ کہ جب بچہ اسکول جاتا ہے تب تو اسے پہلی بار نیا بستہ، یونیفارم، جوتے اور کتا ہیں ملتی ہیں۔ مگر مجھے تو یہ بھی نواز کی برسوں پہلے چھوڑی ہوئی ملی تھیں۔ مجھے صرف کاپیاں اور مینسل وغیرہ نئی ملی تھیں۔ ممکن ہے اگر نواز نے اپنی چچی سنبھال کر رکھی ہوتیں تو یہ بھی مجھے پرانی ہی ملتی۔ اس اُمید پر کہ نواز کے اس داویلے اور اماں ابا کے اس پردہ عمل کے بعد پالیسی بدل جائے گی۔ چند دن بعد میں نے ہمت کر کے اماں سے کہہ دیا۔

”میں یہ شلوار قمیص نہیں پہنوں گا۔“

اس وقت اماں سلائی مشین پر حق نواز کا ایک دس سال پرانا سوٹ کانٹ چھانٹ کر میرے مطابق کر رہی تھیں۔ وہ آٹھ سال کی عمر میں اس سے زیادہ جسامت رکھتا تھا۔ پچھری دس سال کی عمر میں نہیں تھی۔ اماں نے حیرت سے زیادہ آلود نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیوں نہیں پہنے گا، اچھا تھا سوٹ تو ہے۔“

اماں جسے اچھا خاصا کہہ رہی تھیں اس کا کپڑا بھی ٹھس

پر وا کرتا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں دبو اور بزدل ہوں۔ اپنے بڑے بھائی تو کیا ایک چھٹکی مارنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔ اس لیے جس وقت میرے اندر نواز کوئل کرنے کی خواہش ابھری اسی وقت میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ میں قیامت تک اس خواہش پر عمل نہیں کر سکوں گا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہوں گا۔ میرا خیال ہے بات اس طرح آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی جب تک میں آغاز سے نہیں بتاؤں۔

میرا آغاز نواز کا اختتام تھا۔ یعنی مجھے اس کے بچے کچے پر گزارہ کرنا پڑا تھا۔ مجھے پہلا کپڑا جو نصیب ہوا وہ اس کی اترن تھی۔ اس وقت غریب سے غریب بچہ بھی نیا کپڑا پہن ہی لیتا ہے مجھے زیادہ تر نواز کے اتارے ہوئے اس کے بچپن کے کپڑے ہی پہننے کو ملے تھے۔ پھر اس کے موزے، ٹوپے، سویٹر، کبل، بستر اور جوتے پہننے کو ملے۔ حد یہ کہ مجھے ماں باپ سے پیار بھی وہ ملا جو نواز سے بچ جاتا تھا۔

وہ مجھ سے خاصا بڑا ہے یعنی پورے آٹھ برس اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا اور میرا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ اسے بڑے بھائی ہونے کے ناطے مجھ سے شفقت اور محبت سے پیش آنا چاہیے تھا۔ بڑے بھائی کی طرح ایثار اور قربانی سے کام لینا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس اس کی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے کچھ نہ ملے یا ملے تو بہت معمولی سا اور نہ ہونے کے برابر۔ یہ کام وہ اتنی ہوشیاری سے کرتا تھا کہ میں تو کیا میرے ماں باپ بھی اس کی چال بازی نہ سمجھ پاتے تھے۔

جب میرے لیے نئے کپڑوں یا چیزوں کی بات ہوتی تو نواز نہایت ہوشیاری سے اپنے پرانے کپڑے اور چیزیں پیش کر دیتا تھا اور اس طرح مصومیت سے غیر محسوس انداز میں مہنگائی کو اجاگر کرتا کہ ماں باپ دونوں اس کی باتوں میں آ جاتے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ نئی اور بھی چیز استعمال کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں دس برس کا اور نواز آٹھارہ برس کا تھا تو اماں نے ابا کا ایک پرانا جوڑا جو اتنا ہی پرانا تھا اسے نواز کے لیے سلائی کر کے اسے دیا تو اس نے بچہ مار کر دیا اور اتنا شور کیا کہ گھر سر پر اٹھالیا کہ اسے پرانا جوڑا دیا جا رہا تھا۔ اس نے نہایت جذباتی انداز میں ایک لمبی تقریر کی جس کا لب لباب کچھ یوں تھا۔ ”اب میری یہ اوقات رہ گئی ہے کہ میں دوسروں کی اترن پہنوں۔ نہیں پال سکتے تو بتا دیں میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ اللہ نے ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، محنت مزدوری کر لوں گا۔ بھوکا مر جاؤں گا مگر اب اس

گیا تھا۔ اماں کو بہت احتیاط سے سلائی کرنا پڑ رہی تھی۔ میں نے مزید ہمت کر کے کہا۔ ”میں اتن نہیں پہنوں گا۔“

”ہاں ہاں، تو کسی نواب کی اولاد ہے۔“ اماں نے طنزیہ لہجے میں ایک طویل لچکر شروع کیا جس میں اپنی مالی مشکلات اور مہنگائی کا رونا رونے سے لے کر ان احسانات کی طویل فہرست کا ذکر بھی تھا جو وہ ماں باپ کی حیثیت سے اپنا پیٹ کاٹ کر ہمارے لیے کر رہے تھے۔ میں اتنا گنگ ہوا کہ یہ احتجاج بھی نہ کر سکا کہ وہ جن احسانات کا ذکر کر رہی ہیں وہ صرف نواز کے ساتھ ہوئے ہیں۔ بہر حال اس لچکر سے میرے اندر جو خوش فہمی آگئی تھی وہ فوراً رفع ہو گئی اور مجھے پتا چل گیا کہ میرے لیے پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ میں اب بھی وہی شاہ نواز تھا جسے دوسرے نہیں بلکہ نمبر دو بیٹے کی حیثیت حاصل تھی اور اس حیثیت میں ساری عمر کوئی فرق نہیں آئے گا۔ جب تک اماں ابازندہ رہے میں دو نمبر ہی رہا۔

ابا کی علاقے کی مارکیٹ میں کریمانے کی دکان تھی۔ اگرچہ متوسط علاقہ تھا مگر جنرل اسٹور کا کام اچھا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ہماری مالی حالت (جس کی خرابی کا رونا صرف میرے لیے رویا جاتا تھا) آس پاس کے پڑوسیوں سے خاصی بہتر تھی۔ ابا میٹرک پاس تھے اور اماں نے صرف پانچویں تک اسکول دیکھا تھا۔ مگر ان کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد بہت سارا پڑھے۔ اس لیے انہوں نے صرف چار سال کی عمر میں نواز کو نزدیکی سرکاری اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس وقت بھی اسکولوں کا رواج بہت کم تھا۔ نواز کو پڑھنے کا شوق نہیں تھا مگر اس نے بھانپ لیا تھا کہ اماں ابا کی کمزوری تعلیم ہے اس لیے وہ یوں پوچھنے لگا جیسے اسے بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ حالانکہ روزانہ اسکول جانا اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ براہ راست انکار نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے دوسری ترکیب نکالی اور اسے دن اسکول جانے کے وقت اسے جسمانی عوارض لاحق ہو جاتے تھے۔ وہ جانے سے انکار نہیں کرتا تھا مگر تیار ہوتے ہوئے یوں کراہتا اور اداکاری کرتا کہ بالآخر اماں کو ترس آ جاتا اور وہ اسے خود اسکول جانے سے منع کر دیتیں۔

ہو شیار نواز فوراً نہیں مانتا تھا بلکہ اپنی تکلیف کو مسلسل بیان کرتے ہوئے اسکول جانے پر اصرار کرتا اور پھر اماں کی استیوں مانتا جیسے صرف اماں کے کہنے پر اسکول نہیں جا رہا ہے ورنہ اس وقت اسے ملک الموت بھی اسکول جانے سے

نہیں روک سکتا تھا۔ پانچویں تک یہ بہانے چلتے رہے اور مزے کی بات تھی کہ تمام عوارض اور تکالیف صرف اسکول کے وقت تک ہوتی تھیں جیسے ہی وقت گزرتا نواز بھلا چڑکا ہو جاتا اور دوپہر ختم ہوتے ہی کھیلنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ بڑی کلاسوں میں آنے کے بعد اس نے حکمت عملی بدل دی۔ اب وہ تیار ہو کر باہر نکلتا اور اپنے جیسے آوارہ لڑکوں کے ساتھ کسی میدان کا رخ کرتا جہاں وہ کرکٹ کھیلنے تھے۔ اماں گھر میں رہنے والی عورت تھیں اور ابا کو دکان سے فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ نواز پر نظر رکھتے۔ اس لیے وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے آہ ادا تھا۔

پڑھائی میں رہ جانے والی کمی وہ دوسرے طریقے سے پوری کرتا تھا۔ شام کے وقت وہ کچھ دیر ابا کے ساتھ دکان پر بیٹھتا تھا اور جب ابا نماز پڑھنے جاتے تو چیزوں میں ہیرا پھیری کرتا تھا۔ یہ چیزیں بعد میں اپنے اساتذہ کے گھر پہنچتا اور اس کا فائدہ اسے امتحان کے دنوں میں ہوتا۔ اس کے اتنے اچھے نمبر آتے کہ اماں ابا نہال ہو جاتے اور مٹھائیاں بانٹتے نہیں تھکتے تھے۔ ان کو کبھی پتا نہیں چلا کہ ان کا برخوردار پاس کیسے ہوتا ہے؟ جب میری اسکول جانے کی عمر ہوئی تو اماں ابا نے اس لیے دیر سے داخل کرایا کہ یہ قول ان کے میں بھی تھا۔ حالانکہ میں غمی نہیں تھا۔ بچپن سے توجہ نہ پا کر میں چپ رہنے لگا تھا اور بلا ضرورت بات نہیں کرتا تھا۔ اماں ابا نے میرے بہ مشکل ہی کچھ لاڈ اٹھائے ہوں گے۔ میرے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس چپ کا نقصان یہ ہوا کہ حق نواز نے اماں ابا کے کان میں مسلسل ڈالنا شروع کر دیا کہ میں غمی ہوں اور کوئی عقل والا کام نہیں کر سکتا اس لیے کوئی مجھ سے توقع بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ تو مجھے اسکول میں بھی داخل نہیں کر رہے تھے۔ مگر میری خالہ کو پتا چلا تو انہوں نے اماں کو لتھاڑا۔ ”تو شاہ نواز کو اسکول کیوں نہیں بھیج رہی۔“

”آپا اسے عقل ہی کہاں ہے؟“

”عقل تم دونوں میاں بیوی کو نہیں ہے اچھا بھلا بچہ تو ہے جسے آج کل کے بچوں کی طرح بدتمیز اور چلبلا نہیں ہے تو تم مجھسی جو عقل نہیں ہے اسے فوراً اسکول میں داخل کراؤ۔“

اماں خالہ سے ڈرتی تھیں اس لیے انہوں نے ابا سے بات کی اور ابا نے مجھے اسکول میں داخل کرانے کو کہہ دیا۔ سرکاری اسکول گھر سے دور تھا اس لیے طے ہوا کہ نزدیکی پرائیویٹ اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ مگر جب نواز کو پتا

یہ تو میں ہی جانتا تھا۔ ورنہ جب وہ گھر سے جاتا تب میں سکون کا سانس لیتا تھا ورنہ تو مجھے ہوم ورک یا ٹیسٹ کی تیاری کرتے ہوئے بھی اس کے کاموں کے لیے دوڑنا پڑتا تھا۔ تعلیم کے معاملے میں، میں نواز سے بہتر ہی تھا کیونکہ میں روز اسکول جانے والا اور روز کا کام روز کرنے والا طالب علم تھا۔ غبی مشہور ہونے کے باوجود مجھے اپنا سبق یاد کرنے میں کبھی دشواری پیش نہیں آئی اور میں ہر ٹیسٹ اور امتحان میں با آسانی پاس ہو جاتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے بہت اچھے نمبرز نہیں ملتے تھے کہ میں کلاس میں کوئی پوزیشن لیتا کیونکہ پوزیشن صرف ٹیچرز کے منظور نظر لڑکے لیتے تھے۔ میں خاموش اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا اس لیے ٹیچرز کی نظروں میں نہیں آتا تھا۔ پھر نواز نے اسکول میں بھی میرے بارے میں یہی مشہور کر دیا تھا کہ میں غبی ہوں۔ اس لیے دوسرے لڑکے مجھے چھیڑتے اور میرا مذاق اڑاتے تھے مگر کسی نے مجھے سنجیدہ نہیں لیا۔ پوری اسکول لائف میں میرے چند ایک ہی دوست بنے تھے۔ ان سے بھی دوستی بہت گہری نہیں تھی۔ اسکول کے بعد محلے میں بھی یہی حال تھا۔ بس چند ایک لڑکے تھے جن کے ساتھ میں کھیلتا تھا۔

جب نواز میٹرک میں آیا اور اسے بورڈ کے امتحانات سے واسطہ پڑا تو اسے پتا چلا کہ اب اس کی راشن پلائی کی پالیسی کام نہیں آئے گی۔ پڑھنے کی اسے عادت نہیں تھی اس لیے اس نے قباول حکمت عملی اپنائی۔ اس نے امتحانات میں پیسے کھلا کر قفل کی اور یوں میٹرک کر لیا۔ اس کے نمبرز زیادہ اچھے نہیں آئے تھے اس لیے اسے عام سے کالج میں داخلہ ملا جہاں پڑھائی کے نام پر صرف چند ایک کلاسز ہی ہوتی تھیں اور زیادہ تر کلاسوں پر تالا پڑا رہتا تھا۔ یوں اسے نہ پڑھنے کا اصلی بہانہ مل گیا اور تین سال تک انٹر میں جھک مارنے کے بعد اس نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت میں نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ جب ابائے اس سے کہا کہ اگر وہ پڑھ نہیں رہا ہے تو اسٹور پر اس کا ہاتھ بنائے تو اس نے چالاکی سے انکار کر دیا اور ابائے کہا کہ وہ ٹیکنیکل کالج میں داخلہ لینا چاہتا ہے۔ ابائے اگرچہ راضی نہیں تھے مگر اس کی بات سے کہاں انکار کر سکتے تھے۔

میں نے اپنے بچنے کے ساتھ ابائے سے کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ صبح دس سے دوپہر گیارہ بجے تک دکان میں کھڑے رہنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ لڑکے ملازم تھے مگر کیش کا وٹرنان پر

چلا تو وہ جل بھن کر رہ گیا تھا۔ اس نے فوراً مخالفت کی اور نہایت چالاکی سے اماں ابا کو قائل کیا کہ اتنا پیسا ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے اور پرائیویٹ اسکول والوں کے منہ بھی کھلے رہتے ہیں۔ کتابوں اور یونیفارم سمیت ہر شے مہنگی ہوتی ہے اس لیے مجھے سرکاری اسکول میں داخل کرایا جائے جہاں سے وہ پڑھ رہا تھا اور جہاں تک دوری کی بات تھی تو وہ مجھے ساتھ اسکول لانا لے جاتا۔ اس کے پرانے یونیفارم اور کتابیں میرے کام آئیں۔ اماں ابا تو پہلے ہی اس کے کہنے میں آتے تھے فوراً مان گئے۔ اس وقت نواز نویں کلاس میں تھا۔ ایک دو سال بعد میں خود بھی آنے جانے کے قابل ہو جاتا۔

یوں میرا داخلہ سرکاری اسکول میں ہوا اور مجھے نوازی چھوڑی چیزوں اور اترنوں پر گزارہ کرنا پڑا تھا۔ نواز کو مجھ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ سیری پیدائش کے بعد اس نے ایک بار بھی مجھے گود میں نہیں لیا تھا۔ باہر لے جانے اور کھلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اماں ابا بھی میرے ساتھ اس کے روپے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ جب اس نے مجھے ساتھ اسکول لانے اور لے جانے کا ذمہ لیا تو وہ یوں اس کے ممنون ہو گئے جیسے وہ کوئی غیر ہو۔ ان کا بیٹا اور میرا بڑا بھائی نہ ہو۔ حالانکہ اس کے ساتھ آنا جانا یوں ہوتا تھا کہ گلی سے نکلتے ہی وہ مجھ سے بے نیاز ہو جاتا اور منہ اٹھائے تیز قدموں سے چلتا۔ اسے قطعی پروا نہیں ہوتی تھی کہ میں اس کے پیچھے آ رہا ہوں یا نہیں۔ کہیں رک گیا ہوں یا گر گیا ہوں یا کسی گاڑی کے نیچے آ گیا ہوں۔ میں بھاری بھر کم بیک اٹھائے اس کے پیچھے بھاگتا تھا اور اس ریس میں میرا حشر نشر ہو جاتا۔

چند ایک بار کے بعد میں نے راستہ یاد کر لیا اور اب میں خود آرام سے جاتا اور آرام سے گھر واپس آتا تھا۔ واپسی میں وہ چالاکی سے کام لیتا اور تیز قدمی سے آنے کے بعد گلی کے کونے پر میرا انتظار کرتا اور پھر یوں میرے ساتھ گھر تک آتا جیسے اس نے سارے راستے میرا بہت ہی خیال رکھا ہو۔ پہلے وہ مجھے نظر انداز کرتا تھا اب اس نے مجھے اپنا خادم سمجھ لیا اور جب تک گھر میں ہوتا مجھ پر حکم چلاتا رہتا تھا۔ میں بھاگ بھاگ کر اس کے کام کرتا اور اگر ذرا سا بھی انکار کرتا تو وہ فوراً اماں یا ابائے سے شکایت کرتا اور اس کے بعد میری شامت آ جاتی کہ میں بڑے بھائی کا حکم نہیں مان رہا جو میرے لیے اتنا کرتا ہے۔ حالانکہ وہ میرے لیے کیا کرتا تھا

اسے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے یا کسی ہوٹل پر بیٹھے مپ شپ کرتے دیکھا تھا۔ وہ گھر سے جھوٹ بول کر اور اماں سے پیسے اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ اماں اسے کبھی انکار نہیں کرتی تھیں اگر اپنے پاس نہیں ہوتے تو پاس پڑوس سے ادھار کر کے دے دیتی تھیں۔ جب نواز دو تین بار دکان پر بیٹھا تو اس نے خوب چونا لگایا۔ ابا جانتے تھے شاید اس لیے بھی انہوں نے اسے دکان پر بیٹھنے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

اس کے برعکس میں نے گلے سے کبھی ایک روپيا نہیں نکالا۔ دکان میں کھانے پینے کی بیشمار چیزیں ہوتی تھیں اور میں نے کبھی ایک سپاری بھی نکال کر نہیں کھائی۔ اس وقت مجھے دو روپے جب خرچ ملتا تھا جب کہ نواز کو بیس روپے۔ اسے وہ بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔ میں دو روپے میں گزارا کرتا تھا اور ابا کو بھی خیال نہیں آیا کہ وہ مجھے کچھ زیادہ دے دیں۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ میں گلے سے مار کر اپنا حساب کر لیتا ہوں گا۔ یہ کام ایسا ہے کہ اس میں سو ڈیڑھ سو روپے کا پتا نہیں چلتا ہے اور ابا حساب کرتے تھے۔ جو کماتے گھر لے آتے۔ مزید سامان ڈلو کر جو بچتا وہ گھر میں خرچ کے لیے دے دیتے اور یہاں سے جو بچتا وہ بینک میں ڈال دیتے۔ سال کے سال میرا جیب خرچ ایک روپے کے حساب سے بڑھتا رہا اور جب میں نویں کلاس میں آیا تو مجھے صرف چھ روپے مل رہے تھے۔ میٹرزک میں اماں ابا نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری اور مجھے دس روپے ملنے لگے۔

نواز کے ڈپلو سے کام بھی وہی حشر ہوا تھا جو انٹر کا ہوا تھا یعنی وہ کبھی مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ چار سال اور لاکھ روپے سے اوپر ضائع کر کے اس نے اعلان کیا کہ وہ پڑھے گا نہیں بلکہ کاروبار کرے گا۔ اس وقت تک ابا اس سے کچھ فرٹ ہو چکے تھے مگر نواز اب بھی اپنی بات منوا سکتا تھا۔ اس نے ڈیکوریشن شاپ کا کہا تو ابا نے اسے ڈیکوریشن شاپ کھلوا دی۔ اس میں اچھا خاصا خرچا آیا۔ کوئی لاکھ روپے کا تو سامان ہی پڑا تھا۔ پھر نواز کو دکان بھی اچھی جگہ دلوائی تھی۔ اس میں بھی خاصا خرچ آیا تھا۔ آج سے کوئی سولہ سال پہلے یہ خاصی بڑی رقم ہوتی تھی خاص طور سے متوسط طبقے کے لیے۔ ابا نے برسوں میں جا کر یہ رقم جمع کی تھی جو نواز نے صرف ایک سال میں برہادر کر دی۔ جی ہاں اس نے ایک سال بعد دکان بند کر دی تھی کیونکہ خسارہ کتبہ ہو گیا تھا کہ دکان چلانا ممکن نہیں رہا تھا۔

نواز نے کچھ اس انداز میں کاروبار چلایا تھا کہ وہ بارہ

چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ اس لیے ابا کی خواہش تھی کہ اب نواز دکان پر آئے۔ دوسری طرف نواز کا یہ حال تھا کہ اسے بن محنت کے رقم مل رہی تھی تو اسے کیا ضرورت تھی دکان پر جا کر محنت کرنے کی۔ کالج سے جان چھوٹی تو اس نے ٹیکنیکل کالج کا بہانہ کر لیا اور ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ الیکٹریکل میں تین سال کا ڈپلوہ تھا۔ جب وہ ڈپلوہ کا بہانہ کر رہا تھا تو ابا نے اس سے کہا تھا۔ ”اب مجھ سے اتنی دیر دکان پر نہیں رہا جاتا ہے۔“

اس نے فوراً اپنی بلا میرے سر ڈال دی۔ ”ابا ایسا کرو کہ شاہ نواز کو ساتھ رکھ لو۔“

”وہ تو ابھی پڑھ رہا ہے۔“ ابا کو زندگی میں شاید پہلی بار میرا خیال آیا۔

”کیا کرے گا پڑھ کر۔“ نواز نے بے پروائی سے کہا۔ ”اسے دکان پر لگا دو اچھا ہے کام سیکھ جائے گا۔ بعد میں اس کے کام آئے گا۔“

ابا کو نواز کی یہ بات لگی اور مجھے شام کے وقت دکان پر آنے کا حکم مل گیا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ میں زیادہ تر گھر میں ہوتا اور نواز کے کام کرتا تھا تو ابا کی دکان پر کام کرنے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ بلکہ مجھے تو بچپن سے دکان پر جانا اچھا لگتا تھا۔ یوں میں نے شام کو دکان پر جانا شروع کر دیا اور چند مہینے بعد ابا نے میری طرف سے مطمئن ہو کر شام کو گھر جانا شروع کر دیا۔ میں نہ صرف دکان میں کام کرتا تھا بلکہ کیش کاؤنٹر بھی دیکھتا تھا۔ جب کہ میری عمر بارہ سال بھی نہیں تھی۔ میں نے یہ سارا کام اتنی خوش اسلوبی سے کیا کہ ابا حیران رہ گئے تھے کیونکہ انہیں مجھ سے توقع نہیں تھی کہ میں یہ کام اتنی جلدی سیکھ جاؤں گا۔ پہلے ابا نے مجھے سامان دینے پر لگایا۔ میں نے ایک مہینے میں یہ کام سیکھ لیا۔ اس کے بعد کیش کاؤنٹر مجھے دیا گیا۔ ابا سر پر موجود رہے۔ جب ابا کو اطمینان ہو گیا کہ میں دکان بجالا سکتا ہوں تو اب وہ تین گھنٹے کے لیے گھر چلے جاتے تھے۔ میں اسکول سے ایک بجے تک آتا اور شام چار سے سات بجے تک میں دکان دیکھتا تھا۔ دوپہر میں آرام کرتا تھا اور دکان سے آنے کے بعد اپنا ہوم ورک کرتا۔ دوسری طرف نواز کا یہ حال تھا کہ صبح دیر سے اٹھتا اور کالج کا بہانہ کر کے گھر سے نکل جاتا۔ دیر سے جانے کے لیے یہ جواز پیش کرتا کہ کلاسز دیر سے ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ ہفتے میں دو تین دن ہی کالج جاتا تھا۔ میں نے خود دکان پر آتے جاتے

ایک بچے دکان کھولتا تھا اور اس کے فوراً بعد وہاں اس کے آوارہ دوستوں کا ہجوم جمع ہو جاتا۔ جن کے لیے دکان کے خرچ پر چائے اور ٹیچ میں بریانی آرہی ہوتی تھی۔ سامان کرائے پر جاتا تو اس کی واپسی کی پروا نہیں ہوتی تھی کوئی چیز گم جاتی تو اس کی تلاش کی زحمت نہیں کی جاتی تھی۔ چیزیں ٹوٹ پھوٹ جاتیں تو ان کی مرمت نہیں کرائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ دکان ڈیکوریشن کی بجائے کباڑ کی بنی چلی گئی۔ آمدنی اتنی کم ہوئی کہ کرایہ اور بل ادا کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ چائے اور بریانی بند ہوئی تو نواز کے آوارہ دوست بھی غائب ہو گئے۔ اس وقت اس نے کوشش کی کہ اپنا کام پھر سے بنائے اس نے ابا سے رقم مانگی مگر ابا پہلے ہی سب اسے دے چکے تھے اور اب خالی ہاتھ تھے۔ پھر بھی انہوں نے کہیں سے دس ہزار کر کے اسے دے دیے اور یہ بھی دکان کے ساتھ ڈوب گئے۔ ایک سال سے بھی پہلے دکان بند ہو گئی اور وہ گھر آن بیٹھا تھا۔

دوسری طرف میں نے دکان میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ میٹرک کیا اور بہت اچھے نمبروں سے کیا اب میرا ارادہ آگے بڑھنے کا تھا مگر اس موقع پر نواز نے ہمیشہ کی طرح ٹانگ اڑائی اور اماں ابا سے کہا۔ ”یہ آگے بڑھ کر کیا کرے گا اسے دکان پر لگائے رکھو۔ اب ابا کی آرام کرنے کی عمر ہے۔ یہ جوان ہو گیا ہے پوری دکان سنبھال سکتا ہے۔ کام بھی سیکھ ہی گیا ہے اتنے سالوں میں۔“

میرا خیال تھا کہ اس وقت تو اماں ابا اسے آئینہ دکھائیں گے کہ اس نے کالج میں دوبار پڑھ کر کیا کیا تھا؟ جہاں تک دکان کی بات تھی تو اسے ابا کے بڑھاپے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ سب سے بڑھ کر اسے ابا نے دکان کھلوا کر دی تو اس نے کیا تیر مارا تھا؟ انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کی بجائے ابا نے کہا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ شاہ نواز دکان اچھی طرح چلا رہا ہے۔“

مزعے کی بات تھی کہ یہ ساری گفتگو میرے سامنے ہو رہی تھی۔ اماں ابا اور نواز میرے بارے میں کوئی بات کرتے ہوئے اس کا قطعی خیال نہیں کرتے تھے کہ میں سامنے موجود ہوں۔ ان کے خیال میں ان کے تجربے میرے دل پر اثر نہیں کرتے تھے یا انہیں ہر طرح کی بات کہنے کا حق حاصل تھا۔ میرے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے سب کی رائے لی جاتی تھی سوائے میرے۔ جیسا کہ اس وقت ہو رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”میں آگے

بڑھنا چاہتا ہوں۔“
”تم بڑھنا چاہتے ہو۔“ نواز نے تسخرانہ انداز میں کہا۔ ”کیا کر لو گے پڑھ کے تھرڈ ڈیڑن میں بی اے کر لو گے اور بہت تیر مارا تو نہیں ٹھکرک لگ جاؤ گے۔ کیا ملے گا دو ڈھائی ہزار روپے۔ اس سے زیادہ تو ابا دکان کے ملازموں کو دے رہا ہے۔“

نواز ٹھیک کہہ رہا تھا اس سے زیادہ دکان کا ایک ملازم لے رہا تھا مگر میں جو نام نہاد مالک تھا اور ایک ایک پیسے کا حساب رکھتا تھا مجھے آج تک ابا نے سو روپے بھی ساتھ نہیں دیئے تھے۔ مجھے بس ضرورت بھرل جاتا تھا اور میری ضرورت بھی محدود ہوتی تھی۔ آج بھی مجھے نواز کی اترن ملتی تھی۔ وہ جو کپڑے، جوتے اور چیزیں چھوڑ دیتا تھا وہ میرے نام ہو جاتی تھیں۔ خاص میرے لیے کوئی چیز کم ہی آتی تھی۔ میں نے نواز کی مخالفت پر رحم طلب نظروں سے اماں ابا کی طرف دیکھا۔ مگر اماں نے نواز کی تائید کی۔ ”ٹھیک تو کہہ رہا ہے کیا کرے گا پڑھ کر۔“

نواز نے روپیٹ کر میٹرک میں سی گریڈ لیا تھا اور وہ بھی نقل کر کے میں نے اپنی محنت سے پڑھا تھا اور اے گریڈ لیا تھا۔ میری سیونٹی نو پر سینج آئی تھی۔ اماں ابا میرے رزلٹ سے بے خبر نہیں تھے۔ مجھے بہت اعلیٰ درجے کے کالجوں میں تو نہیں مگر کسی اچھے کالج میں داخلہ مل سکتا تھا۔ دکان پر کام کرنے کی وجہ سے مجھے از خود حساب کتاب سے رغبت ہو گئی تھی اور میں آگے کامرس پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے یہی چیز ابا کے سامنے رکھ دی۔ ”اگر میں نے آگے پڑھا تو دکان کے کام آئے گا۔“

”تو اب کون سی مشکل ہے۔“ نواز نے پھر ٹانگ اڑائی۔ ”ٹھیک سے تو حساب اب بھی کر لیتا ہے۔ اس کے لیے آگے پڑھنا ضروری نہیں ہے۔“
”پڑھنا تو اچھی بات ہے آدمی کے کام آتا ہے۔“ میں نے ہتھی لہجے میں کہا۔ ”میں اسی طرح دکان پر بھی کام کرتا رہوں گا۔“

اماں ابا کا دل ذرا نرم ہوا تو نواز نے پھر وار کیا۔ ”اچھا اگر پڑھنا ہے تو پرائیویٹ پڑھ لے۔ کالج جانے کا تو ابا کو زیادہ کام کرنا پڑے گا۔“
”میں میں بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔
”نواز ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ابا نے فیصلہ کر دیا انہیں۔

خیال اچھا لگا کہ میں صبح سے شام تک دکان سنبھال سکتا تھا۔ ”اب مجھ سے اتنا کام نہیں ہوتا ہے۔“

اس وقت نواز ڈیکوریشن کی دکان ڈبورا تھا اور اس کے پاس جینوپن بھانہ تھا کہ وہ ابا کی دکان پر نہیں بیٹھ سکتا ہے۔ یوں میں کالج جانے کی بجائے پرائیویٹ پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ اب میں صبح دکان جاتا اور اب صرف دوپہر اور رات کے وقت دو بار دوڑھائی کھٹنے کے لیے آجاتے تھے جب رش بڑھ جاتا تھا۔ اب سیل کے ساتھ دکان کے لیے سامان کی خریداری بھی میں کرنے لگا تھا۔ ابا سیلز مین سے سامان لیتے تھے میں نے یہ کیا کہ کوشش کر کے سٹری بیوٹر سے رابطہ کر لیا اور ہمارے علاقے میں جس جس کی گاڑیاں آتی تھیں میں ان سے براہ راست سامان لینے لگا۔ اس میں زیادہ بچت ہوتی تھی۔ بہت سی چیزیں جو غیر ملکوں سے آتی تھیں ان کو میں خود مارکیٹ سے اٹھانے لگا۔ میری کوششوں سے دکان کے نفع میں اضافہ ہوا تھا مگر اس کا فائدہ بھی نواز کو ہوا تھا۔ اب نہ صرف اس کی دکان کے بل بلکہ اس کی جیب بھی بھر رہے تھے۔ آئے دن وہ ابا سے رقم لینے آ جاتا اور کچھ نہ کچھ لے لے کر ہی جاتا تھا۔

چند مہینے میں وہ دکان لٹا کر گھر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ صرف کھارہا تھا۔ پہلے اماں ابا سے لیتا تھا تو اب جب اسے رقم کی ضرورت ہوتی براہ راست دکان آکر گلے سے رقم نکال لیتا تھا۔ مگر بہت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اس وقت آتا جب ابا نہیں ہوتے تھے۔ بعد میں جب میں ابا کو حساب دیتا اور بتاتا کہ نواز رقم لے گیا ہے تو ابا کا سوڈ خراب ہو جاتا تھا۔ مگر وہ نواز کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ ایک دو بار جب میں نے ابا کو بتایا کہ آج نواز اپنی رقم لے گیا ہے تو ابا کا تاثر کچھ ایسا تھا جیسے انہیں میری بات پر یقین نہیں آیا ہے۔ میں دل میں کڑھ کر رہ گیا تھا۔ ابا کے سامنے پیرا کر دار بھی تھا اور نواز کا بھی۔ ماں باپ سے زیادہ کون اپنی اولاد کو جانتا ہے۔ اس کے باوجود ابا میرے ساتھ ایسا رویہ رکھ رہے تھے۔ دل برداشتہ ہو کر میں نے سوچا کہ دکان چھوڑ دوں۔ مگر میری ازلی فطرت آڑے آئی جو مجھے کوئی آزادانہ قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میں نے انٹر کامرس میں پرائیویٹ داخلہ لیا تھا۔ پہلے تو میں اپنے طور پر پڑھتا رہا پھر امتحان سے تین مہینے پہلے میں نے کچلے کے ایک لڑکے جاوید سے ٹیوشن کی بات کی۔ وہ بہت اچھا طالب علم تھا اور اس نے دو سال پہلے ہی انٹر

کا امتحان پاس کیا تھا۔ مگر وہ فیس اچھی خاصی مانگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے سب کے سامنے بات کی تو نواز لازمی ناگاہک اڑائے گا اس لیے میں نے چپکے سے ابا سے بات کی کہ میں ٹیوشن پڑھتا چاہتا ہوں تو ابا نے آگے سے جواب دیا۔

”تو جو کما تا ہے اس سے فیس دے دے۔“

میں حیران ہوا۔ ”میں کہاں کما تا ہوں ابا؟“

”دکان میں بیٹھتا ہے وہاں سے جو لیتا ہے۔“

مجھے ایک بار پھر شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ”ابا خدا گواہ ہے میں نے دکان کے گلے سے آج تک تمہیں بتائے بغیر ایک روپيا بھی نہیں نکالا ہے۔“

مگر ابا کو میری قسم کا بھی یقین نہیں آیا تھا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ تو کچھ لیتا ہی نہیں ہے۔“

میں نے ابا کو اس بات کا ٹکڑی جواب دیا اور اگلے دن مارکیٹ میں حاجی صاحب کی اجناس کی ہول سیل کی دکان پر ملازمت کے لیے پہنچ گیا۔ مجھے علم تھا کہ انہیں حساب کتاب کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے جانتے تھے۔

جب میں نے ملازمت کا کہا تو وہ حیران ہوئے۔ ”شاہنواز پتا تمہیں ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری تو اپنی دکان ہے۔“

میں نے بھانہ کیا۔ ”حاجی صاحب میں یہاں کام کر کے حساب کتاب سیکھنا چاہتا ہوں۔ ابا سے اجازت لے کر آیا ہوں۔“

حاجی صاحب کو میری بات کا یقین آیا یا نہیں آیا مگر انہوں نے مجھے ملازمت دے دی۔ میں نے جاتے ہوئے ابا سے کہہ دیا تھا کہ آج وہ دکان دیکھ لیں مجھے کچھ کام ہے۔ ابا سمجھے کہ مجھے دکان کے حوالے سے کام ہے۔ مگر جب شام کو میں نے انہیں بتایا کہ میں نے ملازمت کر لی ہے تو انہیں یقین نہیں آیا۔ ”تو نے ملازمت کر لی ہے مجھے بتائے بغیر، مجھ سے پوچھے بغیر۔“

”ابا جب تمہیں مجھ پر یقین ہی نہیں ہے تو دکان میں کام کرنے کا فائدہ۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”اب تم دیکھ لیتا میں کتنی رقم نکالتا تھا۔ دکان کا حساب خود تمہیں بتا دے گا۔“

”مارکیٹ میں میری بے عزتی ہوگی۔“ ابا کو غصہ آ گیا۔

میں ڈر گیا مگر ہمت کر کے کہا۔ ”ابا تم نے مجبور کیا ہے۔ تمہارے خیال میں میں گلے میں ہاتھ مارتا ہوں اور اپنی ٹیوشن کی فیس خود دے سکتا ہوں مگر ایسا نہیں ہے اور مجھے فیس دینی ہے اس کے لیے رقم چاہیے۔ اس لیے میں نے نوکری کر لی۔“

ابا کو اب بھی دکان کی فکر تھی۔ ”دکان کون دیکھے گا؟“ ”نواز ہے نا۔“ میں نے یاد دلایا۔ ”وہ گھر بیٹھا ہے۔“ ابا نے اب نواز کو دکان لے جانا شروع کر دیا اور وہ بلبلا اٹھا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے چار مہینے حاجی صاحب کی دکان پر کام کیا۔ ٹیوشن پڑھ کر میں نے پیپرز دیئے اور پھر حاجی صاحب کی ملازمت چھوڑ دی۔ کیونکہ ابا کو اب میری ضرورت تھی۔ نواز چند دن تو ٹھیک سے جاتا رہا پھر اس نے نئے شروع کر دیئے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دکان کا بول کر گیا اور وہاں پہنچا نہیں۔ دکان ملازموں پر چلتی رہی اور جب ابا گیا تو پتا چلا کہ نواز وہاں پہنچا ہی نہیں ہے۔ یا اگر جاتا تو کچھ دیر بعد کسی بہانے سے غائب ہو جاتا۔ آخر میں تو یہ ہوا کہ ابا خود جانے لگا تھا اور پہلے کی طرح صبح سے شام تک دکان دیکھتا تھا۔ ایک تو عمر کا تقاضہ اور پھر ابا کو عادت بھی نہیں رہی تھی۔ جب میں دکان دیکھتا تو ابا دو بار میں کل چار پانچ گھنٹے آتا تھا اور اب ابا کو پھر سے بارہ سے چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ میں دیکھتا تو مجھے رحم آتا مگر ابا نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں کہا کہ میں واپس آ جاؤں اور میں خود سے آ جاتا تو مجھے پھر فیس کا مسئلہ ہو جاتا۔ اس لیے دل پر جبر کر کے میں حاجی صاحب کے پاس کام کرتا رہا۔ پیپرز کے دنوں میں کام چھوڑ دیا اور جس دن آخری پیپر دے کر آیا۔ سیدھا دکان پہنچ گیا۔ ابا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”آج باپ کا خیال آ گیا۔“

”جی ابا۔“ میں نے صرف اتنا ہی کہا اور پھر سے اسی تنخواہ پر کام شروع کر دیا جس پر آج تک کر رہا تھا۔ ابا کو پھر بھی خیال نہیں آیا تھا۔ ہاں اتنا ہوا کہ جب سیکنڈلایز کے پیپرز کا وقت آیا تو ابا نے خود سے مجھے ٹیوشن کا کہہ دیا اور دکان کے وقت میں بھی کمی کر دی تھی۔ نواز ان دنوں ایک ڈبو کلب میں کام کر رہا تھا۔ اسے خود بھی ڈبو کا شوق تھا۔ مگر وہاں سے جو ملتا تھا اس کا ایک روپيا بھی وہ گھر میں نہیں دیتا تھا بلکہ الٹا اب تک ابا ماں سے پیسے لے جاتا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ ابا پر غصہ آتا تھا جواب تک اس کے ہاتھوں

بے وقوف بن رہے تھے۔ اسے ایک لفظ نہیں کہتے تھے بلکہ اس کی غلطیوں اور مکاریوں کی پردہ پوشی کرتے تھے۔ دیکھا جائے تو اسے خراب کرنے میں ان دنوں کا ہاتھ تھا۔ نواز کی محبت میں وہ اسے ڈبو رہے تھے۔

انہی دنوں اس نے نیا شوشہ چھوڑا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ مگر یہ پہلا موقع تھا کہ ابا اس کی بات ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ”تو کوئی ٹھیک سے کام کرے تو تیری شادی بھی کریں۔“ ”ابا کرتور ہا ہوں۔“

”اس سے تجھے کیا ملتا ہے۔ دو ہزار روپے اس میں تو تیرا اپنا خرچ پورا نہیں ہوتا ہے، بیوی کا کہاں سے پورا کرے گا؟“

”عورت اپنے نصیب کا خود لاتی ہے۔“ نواز نے ڈھٹائی سے کہا۔

ابا کے برعکس اماں نے سنا تو نہال ہو گئی اور ابا کے سر ہو گئی کہ نواز کی شادی کر دی جائے۔ دوطرف سے دباؤ پڑا تو ابا مان گئے اور اماں نے لڑکی تلاش کرنی شروع کر دی۔ نواز جہاں دوسرے معاملات میں خوش نصیب تھا۔ وہیں قدرت نے اسے خوش روئی سے بھی نوازا تھا۔ سرخ و سفید رنگت اور مناسب جسامت کے ساتھ خوب رو نقوش تھے۔ اسے خود لڑکیوں سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی ورنہ اس میں دل چسپی لینے والیوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں میری رنگت دلی ہوئی تھی اور مناسب نقوش تھے۔ پھر وہ خود کو کچا سنوار کر بھی رکھتا تھا۔ مہینے میں دو بار کسی اچھے سیلون میں جاتا تھا جہاں میئر کٹ سے لے کر مردانہ فیشنل اور دوسرے کام بھی ہوتے تھے۔ میں نے سادہ کریوٹ میئر اسٹائل رکھا ہوا تھا اور فیشنل جیسی چیز کا تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جب شیو کا آغاز ہوا تو میں ہلکی شیور کھنے لگا تھا۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنی سرگرمیاں محلے اور علاقے سے باہر رکھی تھیں۔ محلے میں اس نے اپنا تاثر ایک شریف لڑکے کا سا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی جب اماں نے کوشش شروع کی تو اس کے لیے کئی اچھے رشتے آ گئے۔ میں نے بتایا کہ محلے میں ہمارا کھانا کھاتا پیتا شمار ہوتا تھا۔ ہمارا کارز کا بڑا امکان تھا اور ابا نے خود اٹھوڑا کر کے اوپر والی منزل بنوالی تھی اور اسے کرائے پر دے دیا تھا۔ ابا کا ارادہ تھا کہ نواز کی شادی کے بعد اسے اوپر والا حصہ دے دیں گے۔ اگرچہ اماں اسے

ساتھ رکھنے کے حق میں تھیں۔ نیچے تین بیڑے روڑے تھے جو ہمارے لیے کافی تھے مگر ابا کا کہنا تھا کہ شادی کے بعد بیٹوں کو الگ کر دینا چاہیے اس سے پہلے کہ وہ خود الگ ہو جائیں۔ اماں کو گھر سجانے کا شوق تھا اس لیے ہمارے ہاں اچھا فرنیچر اور دوسرا سامان بہترین قسم کا تھا۔ کھانا پینا بھی اچھا تھا اس لیے جب اماں نے رشتوں کی تلاش شروع کی تو محلے میں ہی کئی گھر رشتہ دینے کو تیار ہو گئے۔

ان دنوں میرے بی کا کام پارٹ دن کے پیپر ز ہونے والے تھے۔ میں نے اس بار بھی ٹیوشن کے لیے جاوید سے بات کی تھی۔ ایک تو وہ بہت اچھا پڑھاتا تھا دوسرے وہ یوں تیاری کراتا کہ جو چیز امتحان میں آتی ہوتی تھی وہ مجھے اچھی طرح سکھا پڑھا دیتا۔ میں پڑھنے کے لیے اسی کے گھر جاتا تھا۔ جاوید کی ایک بہن سیما تھی۔ وہ جاوید سے ایک سال بڑی تھی۔ جاوید میرا ہم عمر تھا اس لیے وہ مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔ مگر شکل صورت اور اپنے چہرے جسم کی وجہ سے اٹھارہ سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ گوری چنی اور خوش شکل لڑکی تھی۔ خاص طور سے اس کی ہلکی براؤن آنکھیں دیکھنے والی تھیں۔ صورت اور تاثرات سے تیز مزاج لگتی تھی۔ مگر مجھے اس کی یہ بات بھی اچھی لگتی تھی۔ گھر میں وہ کئی بار میرے سامنے آئی اور ہر بار اسے دیکھنا مجھے اچھا لگا تھا۔ مگر میں نے یہ بات ظاہر ہونے نہیں دی کہ اسے دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھی وہ میرے اور جاوید کے لیے چائے بنا لاتی تھی۔ جب گھر میں نواز کی شادی کی بات چل رہی تھی تب مجھے خیال آیا کہ اس کے بعد میری باری ہوگی اور اگر اماں نے مجھ سے پوچھا تو میں سیما کا نام لوں گا۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں تھا کہ مجھ سے پوچھا جاتا لیکن اماں نے کیونکہ نواز سے پوچھا تھا اس لیے مجھے اُمید تھی کہ مجھ سے ہی پوچھا جائے گا۔ سیما مجھ سے ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی مگر یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔

مگر چند دن بعد جب اماں نے سرور لہجے میں ابا کو بتایا کہ انہوں نے نواز کے لیے ہما باجی کی بیٹی سیما کو چن لیا ہے تو مجھ پر ہلکی سی گری تھی۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اماں نواز کے لیے سیما کا انتخاب بھی کر سکتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سیما کا گھرانا بہت پڑھا لکھا تھا۔ اس کے والد جنید انکل سول انجینئر تھے اور انہوں نے اپنے سارے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ سیما بی اے کر رہی تھی اور جاوید نے بی بی اے میں داخلہ لیا تھا۔ ان کا ایک بڑا

بھائی انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ نواز اور سیما کا کوئی جوڑ ہو سکتا ہے۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا۔ مگر اماں کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی یقین دہانی حاصل کر چکی ہیں۔ دو دن بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ جب اماں ابا بات ڈالنے گئے اور واپسی میں خوش خوش آئے تھے کیونکہ سیما کے ماں باپ نے انہیں تقریباً ہاں کر دی تھی۔

میں دنگ تھا کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ نواز کچھ نہیں کرتا تھا۔ میٹرک پاس تھا اور وہ بھی نقل کر کے۔ ڈبو کی دکان پر معمولی سی جاب کر رہا تھا۔ ٹھیک ہے ہمارا گھر اچھا تھا اور ابا کا اپنا جنرل اسٹور تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صرف یہی چیزیں دیکھ کر لڑکی دے دی جائے۔ لیکن سیما کے ماں باپ نے یہی کیا تھا۔ پھر یہ جان کر مجھے مزید صدمہ ہوا کہ سیما بھی خوش تھی۔ شاید اس لیے کہ نواز خوب صورت تھا۔ کوئی بھی لڑکی اسے ناپسند نہیں کر سکتی تھی۔ شاید سیما نے اس میں بس یہی دیکھا تھا۔ اس کی خوشی کا اندازہ مجھے یوں بھی ہوا کہ جب میں جاوید سے پڑھنے گیا تو وہ خاص اہتمام سے تیار ہوئی اور اس نے میرے لیے بھی اہتمام کیا تھا۔ کیونکہ اب میں اس کا ہونے والا دیور تھا۔ ایک موقع پر جاوید اٹھ کر کہیں گیا تو وہ جلدی سے آئی اور مجھ سے نواز کے بارے میں پوچھنے لگی کہ اسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے۔ سچی بات ہے میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا کہ نواز کو کیا پسند ہے۔ اس لیے میں نے چندا لے سیدھے جواب دے کر جان چھڑائی۔ میرا دل اتنا خراب ہوا تھا کہ میں نے ٹیوشن بھی چھوڑ دی۔ اگرچہ کچھ تیاری باقی تھی مگر میرا دل نہیں چاہا کہ اب میں سیما کے گھر جاؤں۔

اماں ابا اور ان کے ساتھ سیما کے گھر والوں کو بھی اس شادی پر جلدی تھی۔ اس لیے جھٹ رشتہ اور بٹ شادی ٹھہر گئی اور چند مہینے بعد سیما رخصت ہو کر ہمارے گھر آ گئی۔ ابا نے اپنے کپے کے مطابق پہلے ہی مکان کا اوپری حصہ نواز کے لیے خالی کر لیا تھا اور اسے ری نیو بھی کیا گیا تھا۔ سیما کے گھر والے بھی کھاتے پیتے تھے اس لیے انہوں نے ڈھیروں چیزیں لے لیا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز تھی اس لیے سیما کو نیچے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ ادا والا لگ رہیں۔ شادی کے دوسرے دن اس نے نیچے آنا چھوڑ دیا تھا اور اگر آتی بھی تو بس ہوا کے جھوکے کی طرح۔ یعنی نہیں جلتے ہوئے یا کہیں سے

آتے ہوئے۔ اماں ابا اس کی روش پر حیران تھے اور انہوں نے ایک دو بار نواز سے کہا بھی تو اس نے آگے سے ترش جواب دیا۔

”کیا اپنے لیے شادی کر کے لائے ہو جو تمہارے گھٹنوں سے لگی بیٹھی رہے؟“

”جب تو نہیں ہوتا تب تو نیچے آ سکتی ہے۔“

”کیا تم نے اوپر نوکر لگا کر دیئے ہیں۔“ نواز نے

مزید بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ ”بے چاری اپنے گھر میں پانی

بھی نہیں پیتی تھی اور یہاں اسے سارا کام کرنا پڑتا ہے۔“

ابا نے اماں سے کہا۔ ”اب سمجھ میں آیا کہ اسے الگ

کیوں کیا تھا؟“

مگر ابا نے اسے الگ کہاں کیا تھا۔ اب اس کے

ساتھ اس کی بیوی کا بوجھ بھی ابا پر آ گیا تھا۔ گھر کا سارا راشن

اور سامان اسٹور سے جاتا تھا۔ جب انہیں ضرورت ہوتی

نواز آتا اور یوں اٹھا کر لے جاتا جیسے سامان ہمیں فری میں

ملا ہو۔ ابا اسے ایک لفظ نہیں کہتے تھے اور دوسری طرف

میرے ساتھ وہی رویہ تھا۔ مجھے مینے میں ڈھائی تین ہزار مل

جاتے تھے۔ جب کہ ملازمین اب پانچ ہزار لے رہے

تھے۔ دس بارہ ہزار نواز لے جاتا تھا۔ صبح سے رات تک

دکان پر میں ہوتا اور وہ آکر جھانکتا بھی نہیں تھا۔ اس کا اور ابا

کا رویہ دیکھ کر میں سوائے جلنے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا

تھا۔ البتہ میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی میرا بی کام مکمل ہوگا

میں نوکری کی تلاش شروع کر دوں گا۔ مارکیٹ میں کوئی

مسئلہ نہیں تھا۔ حاجی صاحب ہی مجھے رکھ لیتے۔ مگر اب

میں کوئی باقاعدہ نوکری کرنا چاہتا تھا۔ مگر جیسا میں نے سوچا

تھا ویسا ہو نہیں سکا تھا۔

میں فائل کی تیاری کر رہا تھا کہ ابا کی طبیعت خراب

ہوئی۔ بخار ہوا اور انہوں نے شروع میں توجہ نہیں دی۔ نتیجہ

یہ نکلا کہ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو انہیں اسپتال لے

گئے وہاں پتا چلا کہ ڈینگی بخار ہے اور بڑ چکا ہے۔ ابا دو دن

اسپتال میں پھر دنیا سے گزر گئے۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ

ہم سب ششدر رہ گئے تھے۔ ہم سے مراد میں اور اماں

ہیں۔ نواز کا موقع پرست ذہن اس موقع پر بھی کام کر رہا

تھا۔ اس نے خاموشی سے مکان کی فائل ابا کی الماری سے

نکال لی۔ صرف مکان کی فائل ہی نہیں بلکہ ابا کی چیک بک

اور الماری میں موجود نقدی بھی پار کر لی جب کہ ابا کی میت

گھر میں پڑی تھی۔ پھر اس نے دکان کا گلہ صاف کر لیا کہ

ابا کی آخری رسومات ادا کرنی ہیں۔ ابا میرے لیے کیسے ہی

سہی، تھے تو باپ اس لیے میرا دکھ کم نہیں ہوا تھا۔ سوم والے

دن مجھے خیال آیا کہ آج میرا پہلا پیپر تھا۔ میرا دل نہیں چاہا

کہ میں پیپر دوں اور شاید میں دے بھی نہیں سکتا تھا اس لیے

میں نے اس سال پیپر زندہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اماں بالکل کم صم

ہو گئی تھیں۔ میں ان کی دل جوئی کرتا رہتا۔ ان کا غم ہلکا

کرنے کی کوشش کرتا۔ میں نے سوم کے بعد دکان کھولی تب

مجھے پتا چلا کہ وہاں سے خاصا سامان بھی کم ہے۔ اجناس کے

علاوہ بھی خاصی چیزیں غائب تھیں۔ میں نے نواز سے پوچھا

کیونکہ چابیاں اسی کے پاس تھیں تو اس نے ڈھٹائی سے

کہا۔ ”کیا ابا کا سوم نہیں کرنا تھا۔“

”تو اپنے پاس سے خرچ کرتے دکان سے کیوں

لیا۔“

”اپنے پاس ہے ہی کیا جو خرچ کرتا۔“ اس نے کہا۔

”ابا کے سوم میں صابن اور ڈرجنٹ کا کیا کام؟“

میں نے پوچھا مگر مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اس

کی بجائے نواز مجھ پر غرانے لگا تھا۔ ہمارے پاس بھی کچھ

نہیں تھا میں نے اماں سے نقدی کا پوچھا تو اماں نے بس اتنا

کہا۔

”دو دن پہلے تیرے ابا نے الماری میں پچیس ہزار

روپے رکھے تھے۔“

مگر الماری سے ایک روپہ بھی نہیں نکلا تھا۔ میں سمجھ

گیا کہ یہ نواز کا کام ہے۔ اسے کہنا بیکار تھا وہ الٹا مجھ پر الزام

لگا دیتا۔ دکان میں بھی کشش نہیں تھا اور کچھ پارٹیوں کو رقم دینا

تھی۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ ابا اس مقصد کے لیے چیک

سائن کر کے رکھتے تھے۔ میں نے اماں سے چیک بک کا

پوچھا۔ تب پتا چلا کہ الماری میں چیک بک بھی نہیں تھی۔

مجبوراً مجھے نواز سے پوچھنا پڑا اور وہ پھر ڈھٹائی سے مکر

گیا۔ ”مجھے کیا معلوم..... ہو سکتا ہے میت میں آنے والے

کسی فرد نے ہاتھ دکھا دیا ہو۔“

الماری کی تلاشی کے دوران میں مجھے مکان کی فائل

کی گم شدگی کا بھی پتا چل گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن گھر

میں آنے والے کو مکان کی فائل سے تو دل چسپی نہیں ہو سکتی

تھی۔“

جواب دیا۔ ”ابا نے میرے پاس رکھوائی تھی۔“

”کچھ پارٹیوں کو ادا دینی کرنی ہے، اب بینک جانا ہو

غالباً نواز بھی یہی چاہتا تھا۔ مگر اس نے واضح کر دیا کہ اسے ہر مہینے پچیس ہزار چاہئیں۔ ورنہ وہ دکان بچ دے گا۔ پچیس ہزار خاصی بڑی رقم تھی کیونکہ دکان مہینے میں پچاس ہزار سے زیادہ نہیں کماتی تھی۔ دکان کرائے کی تھی اور مالک ہر سال باقاعدہ کرایہ بڑھاتا تھا۔ بجلی کے ریٹ بھی خاصے بڑھ گئے تھے۔ سب کٹ کٹا کر مشکل سے مہینے کا پچیس ہزار بچتا تھا۔ میں نے نواز سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں آمدنی میں سے نصف دوں گا مگر اب تم دکان سے کچھ نہیں لو گے۔“

اس وقت تو نواز خاموش رہا مگر اب وہ یہ کرتا تھا کہ جب میں اسے پچیس ہزار دے دیتا تو وہ آنے بہانوں سے دکان سے سامان لے جاتا۔ ادائیگی کا کہتا مگر اس نے بھی ایک روپیہ بھی نہیں دیا اور جب مہینے کی رقم لینے کا وقت آتا تو آنکھیں ماتھے پر رکھ کر آ جاتا۔ میں بد مزگی کی وجہ سے خاموش رہتا تھا۔ وہ اس چیز کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ میں صبح سے رات تک دکان پر ہوتا تھا۔ اماں بے چاری گھر پر اکیلی ہوتی مگر سیما یا نواز کو تو فتن نہیں ہوتی تھی کہ کچھ دیر ان کے پاس آ کر بیٹھ جائیں۔ ابا کا صدمہ، اکیلا پن اور پھر دل کی بیماری اماں کو اندر ہی اندر کھا گیا تھا۔ اچانک انہیں ہارٹ ایک ہوا اور وہ نیچے اکیلی تھیں۔ جب میں رات کے وقت گھر آیا تو اماں دنیا سے گزر چکی تھی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا۔ اماں کا مردہ جسم اسپتال بھی لے گیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا ہاں یہ معلوم ہوا کہ اگر اماں کو بروقت طبی امداد مل جاتی تو وہ بچ سکتی تھیں مگر ان کا وقت آ گیا تھا میں کسی کو کیا کہتا۔ بس رو دھو کر رہ گیا۔

اماں کے بعد کچھ عرصے تو نواز اور سیما مجھ پر مہربان رہے۔ میں بھی خوش فہمی کا شکار ہو گیا کہ انہیں میرا خیال آ گیا ہے۔ مگر یہ دھوکا تھا اور ان کا مقصد مکان کا ٹیلا پورشن خالی کرانا تھا۔ پہلے انہوں نے اصرار کر کے مجھے اوپر منتقل کر دیا کہ نیچے میں اکیلا رہتا ہوں۔ حالانکہ میں صبح نو بجے جاتا اور دس بجے گیارہ بجے واپس آتا تھا۔ تینوں وقت کا کھانا میں باہر کھا جاتا تھا اور رات کو جب بستر پر لیٹتا تو منٹ میں سو جاتا تھا مجھے تو چھائی محسوس کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ البتہ نواز اور سیما نے میری تنہائی محسوس کر لی تھی۔ جیسے نیچے تین بینڈ رومز تھے اسی طرح اوپر بھی تین بینڈ رومز تھے۔ جب میں اوپر آ گیا تو نواز نے اسے اس میں منسوبے پر عمل شروع کیا۔ اس نے نیچے کمر کرانے کے بہانے سارا پرانا سامان فروخت کر

دینک والے مجھے جانتے تھے کیونکہ اکثر میں رقم جمع کرانے بھی جاتا تھا۔ میں منیجر سے ملا اور اسے ابا کے انتقال کا بتا کر ان کے اکاؤنٹ کے بارے میں پوچھا۔ منیجر نے اکاؤنٹ سے ابا کے اکاؤنٹ کا معلوم کر لیا تو اس نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ اکاؤنٹ میں موجود تقریباً پونے دو لاکھ روپے دو چیکوں کی مدد سے ایک دن کے وقفے سے نکلوا لیے گئے ہیں۔ میں دنگ رہ گیا۔ میں نے منیجر کو بتایا کہ ابا کی چیک بک میت والے گھر سے غائب ہو گئی تھی۔ منیجر نے دونوں چیک منگوا لیے۔ ان پر سو فیصد ابا کے سائن تھے۔ یہ ان ہی چیکوں میں سے تھے جو ابا سائن کر کے رکھتے تھے کہ کوئی ناگہانی ہو جائے تو ہم رقم نکلوا سکیں۔ مگر یہ کام کوئی اور کر گیا تھا اور مجھے اس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ نواز ہی تھا۔ ابھی ابا کے انتقال کو دس دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس نے اپنی پرانی بانیگ بچ کر نئی زیرو میٹر بانیگ لے لی تھی۔ دونوں میاں بیوی بن ٹھن کر شام کو نکل جاتے تھے۔ ان کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی سوگ ہوا ہے۔ میں نے اماں کو بتایا مگر وہ حسب معمول چپ رہیں۔ وہ پہلے ہی نواز کو کچھ نہیں کہتی تھیں۔ میں ابا کے بعد ان صدموں سے دوچار تھا مگر پھر بھی دکان سنبھالنے میں لگ گیا۔ کیونکہ دکان چلانی تھی اور پیٹ بھی بھرنا تھا۔ ایک مہینے بعد میں نے نواز سے کہا۔ ”تم دکان پر کیوں نہیں آتے؟“

”یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”پہلے ابا تھے۔ اب صرف میں ہوں دکان چلانا اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔“

شاید اس نے بھی محسوس کر لیا کہ میں اکیلے دکان نہیں چلا سکوں گا دوسرے اسے میں ابا کی طرح رقم نہیں دوں گا۔ بلکہ دکان کی آمدنی آدمی آدمی ہوگی۔ یہ سوچ کر وہاں گیا اور مجھے پہلے مہینے ہی پتا چل گیا کہ اس کے آنے سے دکان چل نہیں سکتی تھی صرف لٹ سکتی تھی۔ سامان تو جاتا ہی تھا اب اس نے گلے پر بھی یوں ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا جیسے ڈاکو بینک لوٹتے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب مجھے بس اتنی رقم ملی کہ میں اماں کے ہاتھ پر گھر چلانے جتنی رقم رکھ سکا تھا۔ میں نے دوسرے مہینے ہاتھ جوڑ کر نواز سے کہا۔ ”میں دکان چلاؤں گا تم آرام کیا کرو۔ اگر دکان اسی طرح چلی تو ایک مہینے بعد ہم دونوں ہی گھر بیٹھے ہوں گے۔“

دیا اور کچھ سامان اوپر لے آیا۔ پھر اس نے خاموشی سے بیچے کا پورشن کرائے پر دے دیا۔ تب مجھے بتا چلا کہ میری تنہائی دور کرنے کے پیچھے اصل مقصد کیا تھا؟

جیسے ہی ان کا مقصد پورا ہوا۔ ان کا رویہ بدل گیا۔ اب خیال کی جگہ بددلی آگئی۔ مجھے دیکھتے ہی سیرا کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں۔ کھانا پانی اس نے پہلے بھی نہیں پوچھا تھا۔ مجھے اپنے لیے چائے بھی خود بنانی پڑتی تھی۔ مگر اب میں چائے بھی بناتا تو وہ برا مناتی تھی۔ اس کی وجہ سے میں نے بچن میں جانا چھوڑ دیا۔ رات کو آتا اور اپنے کمرے میں کھس کر سو جاتا اور وہاں سے پھر صبح لکھتا اور سیدھا سڑکیاں اتر کر باہر چلا جاتا تھا۔ صرف جمعے کے دن دوپہر تک گھر میں رہتا تھا کیونکہ مارکیٹ اور میری دکان بھی جمعے کے بعد کھلتی تھی۔ مگر جمعے کے دن بھی میں کمرے میں رہتا تھا۔ نواز اور سیرا کا رویہ دیکھتے ہوئے میں نے بلاوجہ کمرے سے لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اس لیے مجھے بتائیں چلا کہ میرے خلاف کیا کچھڑی پک رہی ہے۔ ایک دن نواز اچانک دکان پر آیا اور اس نے مجھ سے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا بندوبست کر لو۔“

میں چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

جب نواز نے مکان کا نچلا حصہ کرائے پر دیا تو اس نے نہ تو مجھ سے پوچھا اور نہ ہی مجھے کرائے میں سے کچھ دیا۔ وہ سب اس کی جیب میں جاتا تھا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ ہم بنوارہ کر لیں۔“

”وہ کیسے؟“

”میں مکان لے لیتا ہوں اور تم دکان لے لو۔“

مکان کی مالیت اس وقت بھی کوئی تیس لاکھ روپے تھی جب کہ دکان بے شک مہینے کے ساٹھ ستر ہزار دے رہی تھی مگر اس کی مالیت گزول سمیت دس لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اس سے یہ بات کی تو وہ بولا۔ ”مکان تو ابابا نے پہلے ہی مجھے دینے کی بات کی تھی اس لیے وہ میرا ہے۔ شکر کرو کہ میں دکان میں اپنا حصہ نہیں مانگ رہا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں سوچ کر بتاؤں گا اور تم نے بندوبست کی بات کیوں کی؟“

”دیکھو تم جوان آدمی ہو۔ سیرا کو تمہارے ساتھ رہنے ہوئے ابھن ہوتی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اب تم اپنی رہائش کا خود بندوبست کر لو۔“

نئی بات ہے کہ مجھے خود ان لوگوں کے ساتھ رہنے ہوئے ابھن ہوتی تھی۔ مگر سیرا کی بات سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ ”میں نے کبھی غیر ضروری اس کے سامنے آنے کی بھی کوشش نہیں کی پھر اسے کیا مسئلہ ہے۔ میں اپنے کمرے تک محدود رہتا ہوں۔“

”میں یہ سب نہیں جانتا۔“ نواز نے رکھائی سے کہا۔ ”بس تم جلد از جلد اپنا کہیں اور بندوبست کر لو۔“

میں نے بیٹھ کر سکون سے سوچا تو مجھے مناسب لگا کہ میں دکان لے لوں اور مکان نواز کے حوالے کر دوں۔ مکان لے کر میں کیا کرتا جب کہ دکان مجھے ساٹھ ستر ہزار مہینے کے دے رہی تھی میں چند سال میں اپنا گھر بنالیتا اور مجھے روزگار کے چکر میں بھٹکنا بھی نہیں پڑتا۔ اس لیے میں نے نواز سے کہا۔ ”مجھے منظور ہے لیکن ساری کارروائی پکی ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ تم بعد میں دکان پر بھی دعویٰ لے کر آ جاؤ۔“

نواز کو اُمید نہیں تھی کہ میں اتنی آسانی سے مان جاؤں گا وہ بھی سمجھتا تھا کہ مکان دکان سے تین گنا زیادہ مالیت کا ہے اس لیے اس کی خوشی دیکھنے والی تھی اور وہ فوراً مان گیا۔ ہمارا مکان لیز تھا اور اسی طرح ابانے جنرل اسٹور کے کاغذات بھی بنوائے تھے اور اس کی قانونی حیثیت تھی۔ نواز نے نہایت پھرتی دکھائی۔ اسے خوف تھا کہ کہیں میں انکار نہ کر دوں اس صورت میں اسے مکان میں سے بھی مجھے نصف حصہ دینا ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر دکان کا بنوارہ ہوا تو میں ہی اسے لوں گا کیونکہ میں ہی اسے چلا سکتا ہوں۔ نواز میں اتنی اہلیت اور ہمت نہیں تھی کہ جنرل اسٹور چلا سکتا۔ مکان بک جاتا تو اسے اس قیمت میں اتنا بڑا مکان اور کہاں ملتا اور سب سے بڑھ کر اس کا بنوارہ کیسے ہوتا۔ اس نے دودن میں ایک وکیل سے کاغذات بنوائے اور ابتدائی کارروائی شروع کی۔ میں نے بھی ایک وکیل سے بات کی اور اس کی مدد سے کاغذات چیک کیے۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے مکان سے اور نواز نے دکان اور اس کے کاروبار سے دست برداری کے کاغذات پر سائن کر دیئے۔

کارروائی ایک مہینے میں مکمل ہوئی تھی۔ مگر اصل بنوارہ اس سے پہلے ہی ہو گیا۔ یعنی میں گھر سے نکل گیا تھا اور دکان کے نفع سے نواز کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ میں نے مارکیٹ کے پاس ہی ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور وہاں رہنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ نواز نے غفلت میں یہ فیصلہ کر لیا تھا مگر اب وہ پچھتا رہا تھا کیونکہ اسے کمانا نہیں صرف لٹانا آتا

تھا۔ اسے بیوی بھی ایسی ملی تھی۔ صرف مکان کے کرائے سے ان میاں بیوی کی عیاشی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ زندگی کے بارے میں ان کے رویے کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سیما دو بار اُمید سے ہوئی تھی مگر انہوں نے بات ختم کرادی تاکہ بچے کے جنم سے بچ کر زندگی کو پوری طرح انجوائے کر سکیں۔ اگرچہ انہوں نے مجھ سے چھپانے کی پوری کوشش کی تھی مگر ایک گھر میں رہتے ہوئے اس قسم کی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ مجھے افسوس ہوا تھا مگر میں نواز سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ ایک مہینے میں نواز اور سیما کے دماغ ٹھکانے آ گئے تھے۔ کہاں تو وہ مکان کے کرائے کے ساتھ مجھ سے بھی تیس تیس ہزار لے رہے تھے اور کہاں اب ان کے پاس صرف کرائے کے بارہ ہزار آ رہے تھے۔ اس میں گزارہ کہاں ہو سکتا تھا۔ مکان کے لالچ میں انہوں نے اپنے پاؤں پر کھانڈی ماری تھی اور مجھے بلاوجہ کی غلامی سے آزاد کر دیا تھا۔ جب سے بنوارہ ہوا تھا نہ تو میں نواز کے پاس گیا تھا اور نہ ہی وہ میرے پاس آیا تھا اس لیے جب اسے دکان پر دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اسے ضرورت پہنچ لائی ہے ورنہ مجھ سے دل چسپی یا محبت اسے بھی نہیں تھی۔ اتفاق سے اس وقت گاؤں میں بھی نہیں تھا اور ملازموں کو میں نے سامان ترتیب سے رکھنے پر لگایا ہوا تھا۔ نواز نے کہا۔ ”تم سے بات کرنی ہے۔“

”وہ مجھے کچھ رقم ادھار چاہیے۔“

”جو تم واپس نہیں کرو گے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”شاہنواز یقین کرو.....“

”خدا کے لیے تم بچپن سے مجھے یہ سمجھتے اور بتاتے آئے ہو اب تو میری جان چھوڑ دو۔“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو اس کے تیور بدل گئے۔

”اتنی آسانی سے نہیں، ٹھیک ہے دکان اب تمہاری ہے لیکن گیارہ سال سے تم دکان چلا رہے ہو۔ اس کا حساب دو۔“

”میں صرف ایک سال سے دکان چلا رہا ہوں۔ کہو تو اس کا حساب دوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے تمہیں ہی دینا پڑ جائے۔“

اس نے دوبارہ تیور بدلے اور عاجزی سے بولا۔

”ہاں نامہ سرگزشت“

”شاہنواز اس وقت میں بہت مشکل میں ہوں سیما کی طبیعت خراب ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاسکوں۔“

سیما نے اگرچہ کبھی میری طرف توجہ نہیں دی۔ جب میں اسے پسند کرتا تھا تب بھی وہ مجھ سے بے نیاز رہی۔ پھر اس سے رشتے کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اب وہ میرے بھائی کی بیوی تھی اس لیے میں نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر نواز نے اس کی طبیعت خرابی کا بتایا تو میرے اندر بے اختیار خیال آیا اور میرا دل چاہا کہ نواز کو کچھ رقم دے دوں۔ مگر ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے۔ اس خیال کے باوجود میں خود کو روک نہیں سکا تھا اور میں نے اسے دو ہزار دیئے۔ اس نے کہا۔ ”یہ تو کم ہے.....“

”تمہیں یہی مل رہا ہے اس پر خدا کا شکر کرو اور دوبارہ میرے پاس کچھ مانگنے مت آنا۔ وراثت میں تمہیں مجھ سے تین گنا زیادہ ملا ہے۔“

”اس مکان کو لے کر کھاؤں کیا؟“ اس نے تلخی سے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے تم جلد ایسا ہی کرو گے۔“

نواز چلا گیا مگر اس کے چالاک ذہن نے محسوس کر لیا کہ وہ سیما کا نام لے کر مجھ سے رقم کھینچ سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ ہر دوسرے ہفتے چکر لگاتا اور کسی نہ کسی بہانے مجھ سے رقم لے جاتا۔ بہانے میں سیما لازمی شامل ہوتی تھی۔ پھر مجھ میں مردت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے میں اسے رقم دے دیتا تھا۔ ورنہ اب مجھے اس کی صورت دیکھتے ہی بیزاری ہوتی تھی۔ نواز نے کہیں جاب کر لی تھی۔ اس کے باوجود اس کے خرچے پورے نہیں ہوتے تھے۔ اس کا اثر گھر پر پڑا اور اب اس کے اور سیما کے درمیان آئے دن جھگڑے ہوتے تھے اس کا پتا مجھے یوں چلا کہ ایک دن جاوید میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ ”شاہنواز یا تم سے بات کرنی ہے۔“

میں اس کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا میں ملازموں سے دکان دیکھنے کا کہہ کر اسے نزدیکی ہوٹل لے آیا۔ ”ہاں کہو۔“

”یارو! بھائی نے باجی کو بہت جگ کیا ہوا ہے۔“

”تو میں اس مسئلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا اب نواز اور اس کی بیوی سے نام نہاد

تعلق رہ گیا ہے۔“

”پھر بھی تم نواز بھائی کے بھائی ہو انہیں سمجھاؤ کہ معاملے کو اس حد تک خراب نہ کریں۔ سیما باجی دودن سے گھر میں ہیں کیونکہ ان کے گھر تو فاقے ہو رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے لیکن تمہاری باجی نے مجھے اس گھر سے بے دخل کرایا کیونکہ میرے رہنے سے اسے الجھن ہوتی تھی۔ دوسرے نواز بھجنے والا آدمی نہیں ہے۔ اگر اس نے دنیا میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ سیما ہے اب اسے ہی اس سے شکایت ہوگئی ہے تو نواز کو پھر کون سمجھا سکتا ہے؟“

جاوید بھی یہ بات سمجھتا تھا۔ وہ مجبوراً میرے پاس آیا تھا اور اس نے بالآخر اصل بات اگل دی۔ ”مجھے سیما باجی نے بھیجا ہے وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟“

”تم اس کے دیور بھی ہو اگر وہ تم سے ملنا چاہتی ہے تو یہ کوئی غلط بات تو نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں رات دکان بند کرنے کے بعد ہی آسکوں گا۔“ میں نے کہا۔ ان دنوں لی کام فائل کے پھر پیپر ز ہو رہے تھے اور میں نے امتحانی فارم بھی جمع کرایا تھا مگر میں پیپر ز نہیں دے رہا تھا کیونکہ میری تیاری ہی نہیں ہوئی تھی۔ صبح سے رات تک میں دکان میں لگا رہتا تھا تو پیپر کی تیاری کہاں سے کرتا؟ میں عام طور سے رات گیارہ بجے تک دکان بند کرتا تھا مگر اس رات میں نے دس بجے ہی دکان بند کر دی تھی۔ ویسے بھی دس بجے کے بعد فروخت بہت کم ہو جاتی تھی۔ میں سیما کے ماں باپ کے گھر پہنچا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ جاوید نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا مگر جب سیما آئی تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے ماں باپ بھی نہیں آئے تھے۔ سیما نے اٹھ کر دروازہ بند کیا تو میں کسی قدر حیران ہوا تھا۔

”تم نے دروازہ کیوں بند کیا ہے؟“

”میں چاہتی ہوں یہاں ہونے والی گفتگو ہمارے درمیان رہے۔“ اس نے کہا اور دوپٹا جو پہلے اچھی طرح لپکا ہوا تھا اب شانوں پر ڈال لیا۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ وہ باقاعدہ تیار ہوئی تھی اور اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ شادی کے دو سال بعد بھی وہ تقریباً پہلے جیسی ہی تھی۔ پھر نواز نے اسے بھی عیش و آرام سے رکھا تھا۔ بچہ نہیں تھا۔ وہ دیکھنے میں لڑکی جیسی لگ رہی تھی۔ وہ بڑے صوفے پر میرے پاس ہی آ بیٹھی۔ سچی بات ہے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی

اگرچہ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تم گھر کیوں چھوڑ کر آئی ہو؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”اسی پر تو بات کرنے کے لیے تمہیں بلایا ہے۔“

”تمہارا اور نواز کا جھگڑا ہوا ہے؟“

”بات اس سے بھی بڑھ گئی ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ پھر اس نے رو ہانے لہجہ میں کہا۔ ”نواز نے مجھے طلاق دے دی ہے۔“

میں دنگ رہ گیا تھا پھر میں نے بہ مشکل کہا۔ ”طلاق دے دی ہے مگر کیوں؟“

”بس وہ پاگل ہو گیا تھا۔“ اب سیما آنسو بہانے لگی۔ ”اس کے منہ سے نکل گیا اور پھر وہ پچھتا یا۔“

”حالانکہ وہ پچھتانے والا شخص نہیں ہے۔“

”نہیں وہ بہت رویا تھا خودکشی کرنے جا رہا تھا میں نے بڑی مشکل سے روکا۔ اب میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اس لیے یہاں آگئی لیکن میں نے گھر والوں کو طلاق کا نہیں بتایا ہے بس یہی کہا ہے کہ میں نواز سے جھگڑا کر کے آئی ہوں۔“

مجھے اس کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا کہ نواز جیسا شخص جذباتی ہو کر اپنی زندگی ختم کرنے کی کر سکتا ہے۔ مگر سیما کے آنسو اور سکیاں میرا دل پکھلا رہی تھیں۔ میں نے التجائی۔ ”پلیز رومت۔“

”نواز نے تو خودکشی نہیں کی لیکن میں ضرور کر لوں گی۔ میں یوں ذلت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔“ وہ جذباتی ہو کر بولی۔ ”دنیا والوں کو تو کیا اگر میرے گھر والوں کو بھی پتا چل جائے تو میں ایک لمحے کو اس دنیا میں نہ رہوں۔“

”تم ایسی کوئی حماقت نہیں کرو گی۔“ میں نے دہل کر کہا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ طلاق یافتہ کہلانے سے بہتر ہے میں اس دنیا میں نہ رہوں۔ میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ تم اس مسئلے کا کوئی حل نکالو۔“

”میں نکالوں۔“ میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”تمہیں تو میرے ساتھ ایک گھر میں رہتے ہوئے الجھن ہوتی۔۔۔۔۔“

”خدا کے لیے میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔ ہم نے تمہارے ساتھ جو کیا خدا نے شاید اسی کی سزا دی

276

ماہنامہ سرگزشت

2015ء

کیا آپ لبوب مقوی اعصاب کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دبئی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

ہے۔“ اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔“ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

”پلیز ایسا مت کرو۔“ میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”تم میری بھابی ہو۔ اس لحاظ سے میرے لیے محترم ہو۔ تم فکر مت کرو میں کسی مفتی یا عالم سے پوچھتا ہوں کہ اس مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے۔“

”میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔“ اس نے کہا۔ میں سیما کے گھر سے نکلا اور نواز کے پاس آیا۔ وہ گھر میں تھا اور صورت و چلیے سے اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم میری بربادی کا تماشا دیکھنے آئے ہو؟“

”اگر میں تمہاری جیسی فطرت رکھتا تو ایسا ہی کرتا لیکن میں تمہاری فطرت سے محروم ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی سیما کے پاس سے آ رہا ہوں اس نے کہا ہے اس مسئلے کا کوئی حل نکالوں۔“

نواز نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے میں آرام سے بیٹھا ہوں۔ ان چند دنوں میں کتنے ہی عالموں اور مفتیوں سے پوچھ چکا ہوں سب کا ایک ہی جواب ہے۔“

”کیا جواب ہے؟“

”یہی کہ واحد حل حلالہ ہے۔“

”یعنی سیما عدت پوری کرنے کے بعد کسی شخص سے شادی کرے اور اس کے ساتھ رہے پھر وہ اسے طلاق دے تو سیما دوبارہ تم سے شادی کر سکتی ہے۔“

”بالکل لیکن ایسا شخص کہاں سے ملے گا جو خاموشی سے سیما سے شادی کر لے اور ملے گا بھی تو یہ شادی چھپی نہیں رہے گی۔ کم سے کم سیما کے گھر والے فوراً جان جائیں گے۔“

”یہ تو ہے۔“

”لیکن ایک صورت ہو سکتی ہے۔“ نواز نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کس صورت کی بات کر رہا ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں اس آزمائش سے نہیں گزر سکتا۔“

”شاہنواز اللہ کے لیے میرا گھر اجڑنے سے بچا لے۔“ نواز نے بھی میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”تو میرا بھائی ہے اس گھر میں آکر رہے گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ سب خاموشی سے ہو جائے گا۔“

”اگر میں تمہاری مدد پر راضی ہو جاؤں تب بھی حلالہ

اس طرح نہیں ہوتا ہے جہاں تک میں نے جانا ہے ہمارے ہاں حلالہ کے نام پر جو ہوتا ہے وہ دین سے مذاق کے مترادف ہے کہ لوگ اللہ کے بتائے ایک راستے کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ میں کسی غلط کام میں شامل نہیں ہو سکتا۔“

”تب میرے پاس خودکشی کے سوا کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا ہے۔“ نواز نے مایوسی سے کہا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ نواز خودکشی نہیں کر سکتا ہے مگر مجھے سیما کی فکر تھی۔ وہ عورت تھی اور اس صورت حال میں وہی سب سے زیادہ متاثر تھی۔ اس لیے میں نے نواز سے کہا۔

”جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے میں معلوم کرتا ہوں۔“

”لیکن میں نے جہاں جہاں سے معلوم کیا یہی بات سامنے آئی کہ حلالہ کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے اور حلالہ بھی شرعی طریقے سے ہونا چاہیے۔ اس طرح نہیں جیسا کہ آج کل رواج پا گیا ہے۔ یعنی عدت کے بعد مطلقہ کی شادی ہوئی اور شوہر سے ایک بار قربت کے بعد اسے پھر طلاق دے دی اور وہ دوبارہ عدت گزار کر اپنے پہلے شوہر کے نکاح میں آگئی۔ میں نے صورت حال نواز کے سامنے رکھ دی۔“ اس نے پوچھا۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”اگر میں اس طرح طلاق دوں گا تو نہ میرا ضمیر مطمئن ہوگا اور نہ ہی یہ ٹھیک ہوگا۔ اس کا گناہ ہم تینوں کے سر جائے گا۔“

”تم کیا کہتے ہو؟“

”اگر میں سیما سے شادی کرتا ہوں تب بھی میں فوری طلاق نہیں دوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ مجھ کو بولا۔ ”تم سیما پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔“

”لاحول ولا.....“ میں نے کہا۔ ”ایسا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں آیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کوئی بار میرے سر نہ رہ جائے۔ دوسرے میں تمہارے پاس نہیں آیا ہوں تم میرے پاس آئے ہو۔ اگر تمہیں منظور نہیں ہے تو تم آزاد ہو اپنی مرضی کا بندہ تلاش کر لو۔“

مگر اپنی مرضی کا بندہ انہیں تا قیامت نہیں مل سکتا تھا۔ اس لیے مجبوراً انہیں مجھ پر ہی راضی ہونا پڑا۔ طے یہ پایا کہ مکان کے سب سے اوپری حصے میں ایک الگ کمر تعمیر کیا جائے گا اور وہ بہ ظاہر میرے لیے ہوگا مگر درحقیقت اس

میں نواز رہے گا اور میں سیما کے ساتھ نیچے رہوں گا۔ مگر جب تک وہ عدت میں ہوگی ہم دونوں ہی اوپر رہیں گے۔ طلاق کو ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ مزید ایک مہینے بعد نواز نے اوپر کمر اور واش روم بنوا لیا اور ظاہر ہے یہاں میں نے ہی خرچ کیا تھا بلکہ اب میں پہلے کی طرح گھر کا سارا خرچ بھی اٹھا رہا تھا۔ سیما واپس آگئی تھی مگر اب وہ سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ دنیا والوں کو بس یہ معلوم تھا کہ بالآخر بھائی کے خون نے جوش مارا اور وہ بنوارے کے باوجود مجھے دوبارہ گھر میں لے آیا۔ سب نوازی کی تعریف کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کیونکہ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ نواز کتنا اچھا تھا۔

سیما نیچے رہتی تھی۔ میں اور نواز صبح دکان پر چلے جاتے اور پھر شام کو آتے تو خاموشی سے اوپری کمرے میں چلے جاتے۔ سیما پورے فلور پر اکیلی رہتی تھی۔ ہاں کوئی باہر سے آجاتا تو نواز شوہر کی طرح نیچے چلا جاتا۔ یہ ڈراما کامیابی سے چلتا رہا۔ حتیٰ کہ سیما کی عدت ختم ہوگئی۔ نواز نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ نکاح گھر میں نہیں ہوگا۔ ان دنوں میں نے گاڑی لے لی تھی۔ ہم گاڑی میں ایک دور دراز کے نکاح خواں کے پاس پہنچے اور میں نے سیما کو طلاق یافتہ ظاہر کیا۔ نواز کا کپے کاغذ پر طلاق نامہ موجود تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اور سیما با آسانی میری بیوی بن گئی۔ ہم جس طرح گئے تھے اسی طرح واپس آگئے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب میں اور سیما میاں بیوی تھے اور نواز سیما کا جینہ بن گیا تھا جیسے پہلے میں اس کا دیور تھا۔

پہلی شب ہم دونوں ہی شرمندہ سے اور ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے مگر اس کے بعد حالات نارمل ہوتے چلے گئے۔ بلکہ چند دن بعد مجھے لگا کہ سیما نے مجھے شوہر کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ وہ اچھے انداز میں پیش آتی۔ خدمت گزاری بھی کرتی تھی۔ جب میں جوش قدی کرتا تو اس نے کبھی انکار نہیں کیا۔ نواز اب مستقل اوپر رہتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ دکان جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور ہمہ وقت کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ اس کی شیو بڑھ گئی تھی اور حلیے سے بے پردگی کی وجہ سے وہ جوگی لگنے لگا تھا۔ میرے دل میں پہلی بار خواہش جاگنی کہ کاش وہ یہاں سے چلا جائے۔ بس میں اور سیما ہوں۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے اندر خوف بڑھ رہا تھا کہ مجھے بالآخر سیما کو طلاق دینا پڑے گی

ہوگی۔ ہم یہ مکان بیچ کر یہاں سے چلے جائیں گے مگر تم دکان بیچ کر نہیں جاسکتے تمہیں یہیں رہنا ہے۔ اب سوچ لو کہ طلاق دو گے یا نہیں۔“

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے نواز ساری عمر میرے ساتھ غلط سلوک کرتا آیا تھا وہی سلوک سیمانے کیا تھا۔ وہ بھی مجھے استعمال کرتا تھا اور سیمانے بھی استعمال کیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”میں طلاق نہیں دوں گا۔“

”تب اس گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔“ نواز نے حکم دیا۔ ”مجھے اس کی پروا بھی نہیں ہے کہ تم ساری دنیا کو بتا دو گے۔ میں سیمانے کو بھی اس کے گھر بھیج دوں گا۔ لیکن اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا کہ تم میری ہی چھت کے نیچے میری بیوی کے شوہر بن کر رہو۔“

”یہ میری بیوی ہے۔“

”جلد تم یہ بات نہیں کہہ سکو گے۔“

جب میں نواز کے پاس آیا تب بھی میں نے احتیاطاً وہ کمر انہیں چھوڑا تھا جہاں میں کرائے پر رہ رہا تھا اور یہ احتیاط میرے کام آئی۔ نواز کسی صورت میں رکنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا اور جب وہ مرنے مارنے پر اتر آیا تو مجبوراً مجھے وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔ میں نے اپنا سامان لیا تھا اس وقت ان کو خیال نہیں آیا کہ سیمانے کا طلاق نامہ اور مجھ سے نکاح نامہ میرے ہی پاس تھا۔ اگلے دن نواز صبح سویرے مکان پر آیا اور اس نے مجھ سے ان دو چیزوں کا مطالبہ کیا۔ میں نے جواب دیا۔ ”انہیں بھول جاؤ اب عدالت میں ملاقات ہوگی۔ سیمانے کہنا جلد کیس کر دے تاکہ میں اسے دنیا کے سامنے ذلیل کر سکوں۔“

نواز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے قتل کر دے حالانکہ یہ کام مجھے کرنا چاہیے تھا۔ نواز کے جانے کے بعد مجھے شدت سے خیال آیا کہ مجھے نواز کو قتل کر دینا چاہیے مگر ساتھ ہی میں جانتا تھا کہ میں ایسا کر نہیں سکتا تھا اور اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اصل میں تو سیمانے میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ نواز کے قتل کا ارادہ تھا۔ سیمانے کا ارادہ جاننے کے باوجود میرا غصہ کم نہیں ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کو کوئی ایسی سزا دوں جو ان کے لیے سوہان روح بن جائے مگر فی الحال ایسی کوئی سزا ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ جہاں تک طلاق نہ دینے کا تعلق تھا تو وہ خلع لے سکتی تھی اور یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ پھر نواز

اور اب میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے ایک مہینے بعد نواز نے مطالبہ کیا۔ ”اب سیمانے کو طلاق دے دو۔“

”تم یہ مطالبہ نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا۔ ”میں سیمانے کو کیوں طلاق دوں وہ میری بیوی ہے۔“

”دھوکے باز۔“ نواز نے واپس پھیرے۔

”میں نے کوئی دھوکا نہیں کیا میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں اپنی مرضی سے طلاق دوں گا اور ابھی میری مرضی نہیں ہے اس لیے میں طلاق نہیں دوں گا۔“

”تم سیمانے پر قبضہ جمار ہے ہو۔“

”وہ کوئی دکان یا مکان نہیں ہے جس پر میں قبضہ جما رہا ہوں وہ جیتی جاگتی عورت ہے اور اس نے مجھے بہ طور شوہر قبول کیا ہے۔“

”وہ اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔“

”یہ بات وہی کہے تو میں کچھ سوچوں گا، تمہارے کہنے پر تو ہرگز طلاق نہیں دوں گا۔“

نواز نچلے فلور پر ہی تھا۔ اس نے سیمانے کو آواز دی تو وہ آگئی اور نواز نے اس سے پوچھا۔ ”تم شاہ نواز سے طلاق چاہتی ہو؟“

”ہاں میں اس سے طلاق چاہتی ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں حیران رہ گیا۔

”لیکن تم نے مجھ سے تو بھی نہیں کہا۔“

”تو اب کہہ دیا ہے۔“ وہ بولی۔

”لیکن میرا طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”تب میں خلع لے لوں گی۔“

”اس کے لیے تمہیں عدالت جانا ہوگا اور عدالت تمہیں تو سب کھل جائے گا۔“

”کھل جائے اب میں میرے گھر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ سیمانے یوں کہا کہ میں ششدر رہ گیا اور نواز مسکرا رہا تھا۔

”اگر تم میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتی ہو تو اب مجھ سے کیا اداکاری کرتی آئی تھیں؟“

”تم جو چاہے سمجھو۔“ سیمانے بے باکی سے کہا۔ ”اب تم میرے شوہر نہیں اور تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔“

مجھے غصہ آنے لگا۔ ”تم مجھے نہیں روک سکتی ہو۔“

”دیکھو مسئلہ غصے سے حل نہیں ہوگا۔“ نواز نے کہا۔ ”اگر بات کھلی تو صرف ہماری نہیں تمہاری بدنامی بھی

ماہنامہ سرگزشت

سے شادی کر لیتی اور جہاں تک دنیا کی بات ہے تو اس کی پروا انہیں پہلے بھی نہیں تھی۔ صرف سیمائے گھر والوں کا کچھ مسئلہ تھا تو وہ بھی کبھی حل ہو ہی جاتا۔

ان چند مہینوں میں، میں نے اپنی خاصی رقم سیمائے لٹائی تھی اسے ایک سے بڑھ ایک لباس اور چیزیں دی تھیں۔ مہنگائی کے اس دور میں جب لوگ گولڈنچ رہے ہیں میں نے اسے سیٹ بنا کر دیا۔ گھر کا بہت سا سامان لے کر دیا اور وہ سب میرا خسارہ بن گیا تھا۔ اس میں سے اب مجھے کچھ واپس نہیں ملتا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ جب سیمائے زندگی میں آئی تو مجھے لگا کہ میری بھی کوئی زندگی ہے۔ میں نے بھرپور کوشش کی سیمائے خوش رکھوں۔ میں اس کی ہر بات مانتا تھا۔ وہ جتنا مانگتی اس سے زیادہ دیتا تھا۔ وہ بھی یوں بنی رہی جیسے مجھ سے خوش ہو مگر جب نواز نے طلاق کے لیے کہا تو وہ اس کی ہموار بن گئی۔ گویا وہ شروع سے نواز کے ساتھ رہنا چاہتی تھی تب اس نے مجھے کیوں دھوکے میں رکھا۔ میرے اندر خوش فہمی پیدا کی اور میں اسے اپنا سمجھنے لگا تھا۔

اب میں ان دونوں کو سزا دینا چاہتا تھا۔ کئی دن تک میں اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ پھر ایک دن مجھے اچانک خیال آیا۔ میں نے اس پر غور کیا تو میں اچھل پڑا تھا۔ پھر میں نے کچھ عالموں سے اس بارے میں مشورہ کیا اور انہوں نے بھی میرے خیال کی تصدیق کی۔ میں نے اگلے دن ہی خاموشی سے مارکیٹ میں دکان سیل کرنے کی بات پھیلادی۔ یعنی ان لوگوں تک پہنچا دی جو مارکیٹ میں بیٹھے تھے اور یہی کام کر رہے تھے۔ دو تین آفرز آئیں مگر وہ میرے خیال کی نہیں تھیں اس لیے میں صبر سے انتظار کرتا رہا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ بس میں چاہتا تھا کہ دکان کی فروخت کی شہرت نہ ہو۔ اگر نواز اور سیمائے علم میں آ جاتا تب بھی کوئی فرق تو نہیں پڑتا مگر جیسا میں چاہتا تھا پھر شاید ویسا نہ ہوگا۔

اس دوران میں سیمائے کی طرف سے مجھ پر حملے کا کیس کر دیا گیا اور میں اسے بھی دیکھنے لگا۔ میں نے اچھا دیکھ لیا تھا جو چکر باز یوں کا ماہر تھا اور وہ کیس کو طول دینے لگا۔ دو مہینے بعد مجھے مطلوبہ آفر مل گئی اور میں نے دکان فروخت کرنے کی کارروائی شروع کر دی۔ میری پوری کوشش تھی کہ نواز کو اس کا علم نہ ہو اس لیے میں نے جس سے سودا کیا اس سے بھی بات خفیہ رکھنے کو کہا۔ مارکیٹ میں میری جان پہچان زیادہ تھی لیکن نواز کے جاننے والے بھی کم نہیں تھے

اور مجھے اصل خطرہ ان کی طرف سے تھا۔ ایک مہینے بعد کارروائی مکمل ہو گئی اور رقم مجھے مل گئی۔ مجھے رقم ملی اور میں اس کے اگلے دن روانہ ہو گیا۔ میں نے شہر ہی چھوڑ دیا اور شہر چھوڑنے سے پہلے نواز کو ایک خط کوریئر سے بھیجا جسے میں نے کمپیوٹر پر ٹائپ کروا کے اس کا پرنٹ نکالا تھا۔ اس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

”نواز میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ سمجھ لو کہ تم شدہ ہو رہا ہوں اور اب سیمائے سے خلع لے لی۔ سات سال سے پہلے وہ عدالت سے بھی خلع نہیں لے سکتی اس لیے تم لوگ سات سال تک تو انتظار کرو۔ یاد رکھنا اگر تم دونوں نے ساتھ رہنے کی خوشی کی یا کوئی چکر بازی کی تو میں تم سے بے خبر نہیں ہوں دونوں حدود کے تحت جیل جاؤ گے اور سزا پاؤ گے۔ ہاں خاموشی سے گناہ کی زندگی بسر کرنا چاہو تو تمہاری مرضی ہے۔“

فقط تمہارا بھائی۔

نوٹ: لازمی نہیں ہے میں سات سال بعد آؤں تو طلاق یا خلع دے دوں میں اپنی جھلک عدالت میں دکھا کر پھر غائب ہو سکتا ہوں اور سیمائے پر مزید سات سال کا انتظار لازمی ہو جائے گا۔“

میں نے خط کی دو کاپیاں کرا کے انہیں نواز اور سیمائے کے ماں باپ کے گھر بھیجا۔ تاکہ وہ ان سے بات چھپانہ سکیں۔ میرا واپس آنے اور ان کی نگرانی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر دھمکی دینے میں کیا حرج تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ ملا بیٹھا آکر میں نے چند مہینے حالات دیکھے لوگوں کے انداز اور رسم و رواج جانے۔ مقامی زبان سیکھی۔ پھر ایک عام مارکیٹ میں ایک جنرل اسٹور پر سیلز مین کی جاب کی۔ ایک سال بعد میں نے جمع پونجی سے اپنی دکان کھول لی اور دو سال بعد میں نے اپنا مکان لے لیا تھا۔ پھر ایک مقامی مسلمان لڑکی سے شادی کی اور اللہ نے مجھے اچھی بیوی کے ساتھ اولاد بھی دی۔ آج اس بات کو سات سال پورے ہونے کو آئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ نواز اور سیمائے پھر کیا کیا۔ ممکن ہے نواز نے دوسری شادی کر لی ہو مگر سیمائے نہیں کر سکتی تھی۔ جس وقت میں یہ سچ بیانی لکھ رہا ہوں سیمائے کے لیے طلاق نامہ میرے سامنے پڑا ہے اور میں بعد میں فیصلہ کروں گا کہ اس پر سائن کر کے اسے بھیجوں یا نہ بھیجوں۔



برے پھنسے

محترم ایڈیٹر سرگزشت کراچی
السلام علیکم

یہ واقعہ ایک عام بلکہ روز مرہ میں شامل ہے۔ اسے پاکستانی پولیس کا معمول سمجھ لیں کیوں کہ یہ مجھ پر ہی نہیں ہر ایک پر گزرتی ہے۔ انہی حالات سے پچاسوں لوگ گزرے ہوں گے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں کہ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔

نعمان بدر
(ملتان)



ہو سکتا ہے کہ آپ میری اس کہانی کو مذاق سمجھیں یا جھوٹ سمجھیں لیکن ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بتائیں کہ کیا ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر یہ کہانی جھوٹ نہیں ہے۔ یہ ایک سو فی صد سچی کہانی ہے۔

میں اپنے فلیٹ میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ بچے اس لیے نہیں تھے کہ بیوی نہیں تھی اور بیوی اس لیے نہیں تھا کہ شادی نہیں ہوئی تھی۔

میں اس رات ایک بہت رومانٹک سا خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی جیسی دستک پولیس والے ہی دیا کرتے ہیں۔ بوکھلا کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے باہر اندھیرا تھا۔ اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کون لوگ آ گئے ہیں۔ پھر ان میں سے کسی نے میرے چہرے پر کسی طاقتور رتارچ کی روشنی ڈالی۔ میری تو آنکھیں ہی چندھیا کر رہ گئی تھیں۔ ”کیا بات ہے، کون ہو تم لوگ؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”اوئے تیرا نام نعمان بدر ہے نا؟“ کسی نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ”ہاں! میں نعمان بدر ہی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بات کیا ہے؟“ ”بات تو تھانے چل کر بتائیں گے۔ اوئے اس ڈالو مو بائل میں۔“

اس وقت پتا چلا کہ آنے والے پولیس کے لوگ تھے۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے فلیٹ کے نیچے اتار کر لے آئے۔ ارد گرد کے فلیٹوں کی کھڑکیاں روشن ہونے لگی تھیں۔

لوگ کھڑکیوں سے جھانک کر طرح طرح کے تبصرے کیے جا رہے تھے۔

”تو بہ ہے۔ دیکھنے میں کتنا شریف آدمی لگتا تھا۔“
”ارے میں تو اس کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی اونچی چیز ہے۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں بھائیو۔“ میں نے یہ آواز پہچان لی۔ یہ ان مولوی صاحب کی آواز تھی جو کنڈا ڈال کر اپنے گھر کو روٹن رکھتے تھے۔

میں اس وقت بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ میری ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ سوال کیا کہ مجھے کیوں لے جا رہے ہیں۔ میں نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کے جواب میں ایسی کراہتوں کی گالیاں سننے کو طبیعت ہی صاف ہو گئی۔

پھر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خاموش ہی رہوں۔ شاید تھانے جا کر صورت حال واضح ہو جائے۔ مجھے اٹھانے والوں نے اتنی بے دردی سے اٹھا کر موہاٹل میں پھینک دیا جیسے آٹے کی بوری پھینکتے ہیں۔

ان لوگوں نے مجھے سیٹ پر بھی بیٹھنے کو نہیں کہا۔ میں سیٹوں کے درمیان پڑا رہا۔ جب کہ دونوں سیٹوں پر پولیس کے جوان بیٹھ گئے تھے۔

موہاٹل ابھی چلی ہی تھی کہ ایک پولیس والے نے میری گردن پر ہاتھ جما دیا۔ میں ہلکا کر رہ گیا تھا۔

”ارے بھائی کیوں مار رہے ہو مجھے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔“

”اوائے چپ کر شریف دلچسپ ہے تو موہاٹل میں بیٹھنے والوں کی پہلی سلامتی ہے۔“

میں ہنسا کر رہ گیا۔ ایسی ذلت تو میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھائی ہوگی۔

بہر حال کچھ دیر کے سفر کے بعد موہاٹل تھانے کے کپڑے میں داخل ہو گئی۔

”اوائے اتر۔“ ایک نے کہا۔ ”تیرا سفر ختم ہوا۔“
”بھائی صاحب آپ لوگ کسی غلط فہمی میں مجھے اٹھا کر لائے ہیں۔“ میں نے کہا۔

ایس ایچ او ایک خون خوار صورت پولیس والا تھا۔
”سرجی یہ نعمان بدر ہے۔“ مجھے ساتھ لانے والوں

میں سے ایک نے بتایا۔ ”بڑی مشکلوں سے ہاتھ آیا ہے۔“
قلیٹ کی دیوار پھلانگ کر بھاگ رہا تھا۔“

”ارے خدا کا خوف کرو تم لوگ۔“ میں ہلکا کر بولا۔
”تم لوگ مجھے سوتے میں پکڑ کر لائے ہو اور کہہ رہے ہو میں دیوار پھلانگ کر بھاگ رہا تھا۔“

”خاموش۔“ ایس ایچ او نے مجھے جھڑک دیا۔ ”ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ اب بتاؤ اتنے دنوں سے کہاں چھپے ہوئے تھے۔“

”جناب! میں کیوں چھپنے لگا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو سب کے سامنے ہوں۔“

”سرجی یہ بہت ہی ڈھٹ قسم کا مجرم ہے۔“ ایک پولیس والا غصے سے بولا۔ ”اس کو ڈرائنگ روم بھیج دیں سر جی خود ٹھیک ہو جائے گا۔“

”دیکھو بھائیو، تم لوگ چاہے مجھے کسی بھی روم میں بھیج دو لیکن پہلے بتاؤ دو کہ میں نے کیا جرم کیا ہے۔“
”تم نے بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا۔

”بینک میں ڈاکا؟“ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ”ایس ایچ او صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا میں آپ کو بینک میں ڈاکا مارنے والا لگ رہا ہوں۔“
”تمہارا نام نعمان بدر ہے نا؟“

”جی ہاں! وہ تو ہے اس سے میں نے کب انکار کیا ہے۔“

”اور تم پیراڈائز اپارٹمنٹ میں رہتے ہو؟“
”جی ہاں، میں وہیں رہتا ہوں۔“

”تو بس۔ پتا چل گیا نا کہ تم ہی نے بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔“

”ارے صاحب اس سے کیسے پتا چلا؟ کچھ تو خدا کا خوف کریں۔“

ایک ہاتھ میری گدی پر پڑا۔ ”اوائے ہمارے صاحب کو خدا کا خوف کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔“

”کچھ میں اس طرح پتا چلا، ہمارے تجربوں نے ہمیں خبر دی ہے کہ بینک میں ڈاکا ڈالنے کا کام نعمان بدر نے کیا ہے اور وہ پیراڈائز اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ تو ان دونوں نشانیوں پر پورا اترتا ہے ابھی لے کر آئے تو نے ہی ڈاکا ڈالا ہے۔“

ہے۔“ پولیس والے نے بتایا۔
 ”کون! وہ اپنے مستقیم صاحب۔“
 ”جی صاحب۔ وہی وہ ان کا سگا بہنوئی ہے۔“
 ”اوہ پھر تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ مستقیم صاحب کا
 دماغ تو آج کل ویسے ہی خراب رہتا ہے۔“
 ”سرجی ایک مشورہ دیتا ہوں جب تک معاملہ ٹھنڈا نہ
 ہو جائے اس بندے کو لاک اپ میں رکھیں۔ کچھ دنوں بعد
 چھوڑ دیں گے۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“ ایس ایچ او نے گردن ہلائی۔
 ”واہ! یہ کیا مذاق ہے۔“ میں بھڑک اٹھا۔ ”تم لوگ
 یوں ہی کسی کو لاک اپ میں کیسے رکھ لو گے۔ کوئی مذاق ہے۔
 بھائی اس نعمان بدر کو پکڑو جس نے یہ جرم کیا ہے۔ اگر وہ کسی
 مستقیم کا بہنوئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔“
 ”بات یہ ہے بھائی کہ ہم ابھی اس بندے پر ہاتھ
 نہیں ڈال سکتے۔ اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ بعد میں
 اس کو گڑ دیں گے۔“
 ”اور اس وقت تک میری جو رگڑ ہوتی رہے گی اس کا
 کون ذمے دار ہوگا؟“

”ہم مجبور ہیں تم کو دس پندرہ دنوں کے لیے لاک
 اپ میں رکھنا ضروری ہے ورنہ ہماری نوکریاں ختم ہو جائیں
 گی۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ پھر ایک پولیس والے کو حکم دیا۔
 ”بھائی اسے لاک اپ میں ڈال دو۔“
 پولیس والے نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس وقت ایک
 دوسرا پولیس والا بول پڑا۔ ”سرجی! آپ کو یاد نہیں رہا جس
 بندے نعمان بدر کی بات ہو رہی ہے وہ پہلے بھی تو اس چکر

”ایس ایچ او صاحب! آپ یقین کریں میں ایک
 شریف اور بے گناہ انسان ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ ایسی کوئی
 حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایک بہت بڑی فرم میں
 ایک اچھے عہدے پر ہوں۔ معاشرے میں میری عزت
 ہے۔ مجھ جیسا آدمی کسی بینک میں ڈاکا کیسے ڈال سکتا ہے۔“
 اسی وقت ایک پولیس والا بول پڑا۔ ”سرجی یہ وہ بندہ
 نہیں ہے۔“
 ”کیا مطلب۔“

”ہاں سرجی! میں اس نعمان بدر کو جانتا ہوں۔ وہ کوئی
 اور ہے یہ بے چارہ تو خواہ مخواہ مارا گیا ہے۔“
 ”تو یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔“ ایس ایچ او
 غرایا۔
 ”سرجی میں تو تھانے میں بیٹھا تھا۔ جو لوگ مجھے تھے
 وہی اٹھا کر لائے ہیں اس بے چارے کو۔ میں نے تو ابھی
 اس کی شکل دیکھی ہے۔“
 خدا بھلا کرے اس پولیس والے کا اس کے لیے دل
 سے دعا نکل رہی تھی۔

”سوری جناب۔“ ایس ایچ او نے میری طرف
 دیکھا۔ ”میرے بندے کسی اور کے دھوکے میں آپ کو پکڑ
 کے لے آئے ہیں۔“
 ”آپ نے تو سوری کر دیا۔ لیکن اتنی دیر میں میری جو
 بے عزت ہوئی ہے۔ جتنی ٹھکانی ہوئی ہے اس کا کیا ہوگا۔“
 ”اب اس کا تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“ ایس ایچ او نے کہا۔
 ”سرجی میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ یہ آدمی کسی بینک
 میں ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔“ یہ وہ پولیس والا بول رہا تھا جس
 نے مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے موبائل میں پھینکا تھا۔
 ”لیکن سرجی ایک بات اور بھی ہے۔“
 پولیس والے نے کہا۔
 ”اب کون سی بات ہے۔“

”وہ جو اصل نعمان بدر ہے۔ وہ رہتا تو اسی بلڈنگ
 میں ہے۔ لیکن اس کا فلیٹ نمبر کچھ اور ہے۔ یہ بات مجھے
 پہلے سے معلوم تھی۔“
 ”معلوم تھی تو اس شریف آدمی کے گھر کیوں چلے گئے
 تھے؟“

”سرجی۔ وہ نعمان بدر، مستقیم صاحب کا بہنوئی

شمارہ فوری 2015ء کی منتخب سچ بیانییاں
 ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: سفاک محسن..... تنویر حسن
 ☆ دوم: سوکن..... ثنا
 ☆ سوم: خاندہ بدوش..... انور ذکی

پہلے نمبر پر ہاتھ رکھ کر منتخب ہو جائیں گے
 سچ کی بات ہے

میں پکڑا جا چکا ہے۔“

”کس چکر میں؟“

”اس نے اپنے آپ کو مستقیم صاحب کا بہنوئی شو کیا تھا صاحب جی۔“ پولیس والے نے بتایا۔ ”وہ بندہ تو بہت بڑا فراڈی ہے۔ مستقیم صاحب کے نام کو بدنام کرتا پھر رہا ہے۔“

”اب تو میں جاسکتا ہوں نا؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”کیوں نہیں جناب۔ آپ بالکل جاسکتے ہیں۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن آپ ہماری بھی مجبوریاں دیکھیں۔“ ”ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں آپ لوگوں کی مجبوریاں۔“ ”آپ یقین کریں۔ جب آپ جیسا کوئی شریف آدمی ہمارے تھانے میں آتا ہے تو ہمیں خود شرمندگی ہوتی ہے۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”اب آپ چائے پیے بغیر نہیں جاسکتے۔“

”سرجی۔“ ایک دوسرا پولیس والا بول پڑا۔ ”آپ تو بالکل بھولے ہیں سرجی۔ آپ کو تو کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی۔“

”کیوں اب کیا ہو گیا؟“ ”آپ کو یاد نہیں ہے سرجی۔ اس بندے نعمان بدر کی مستقیم صاحب سے ناراضگی چل رہی تھی۔ اس لیے صاحب نے اسے اپنا بہنوئی ما۔ نئے سے انکار کر دیا تھا گھریلو جھگڑا تھا سرجی۔“

”اوہو، یہ تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔“

”تو پھر کیا کیا جائے سرجی؟“

”کرنا کیا ہے۔ اس بندے کو لاک اپ میں ڈال دو۔ بہت شریف بنا پھر رہا ہے۔ ہم صاحب سے تو جھگڑا نہیں لے سکتے نا۔“

”ہاں سرجی۔“

”تو پھر ڈالو اسے لاک اپ میں۔“ ”دس دس دنوں کے بعد دیکھا جائے گا۔“

”آخر یہ کیا مذاق ہے۔“ میں غصے سے دھاڑنے لگا تھا۔ ”تم لوگوں نے یہ کیا لگا رکھا ہے۔ جب تمہیں معلوم بھی ہے کہ میں ایک بے گناہ انسان ہوں تو پھر یہ تماشا کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ۔“

”یہ مجبوری ہے ہماری۔“ ایس ایچ او نے کہا۔

”اچھی مجبوری ہے۔“ میں بھنائے جا رہا تھا۔

”تمہاری مجبوری تو میرے لیے موت ہو رہی ہے۔“

”سرجی ہم خواہ مخواہ اس شریف بندے کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔“ ایک پولیس والے نے مداخلت کی۔ ”آپ یاد کریں سرجی مستقیم صاحب تو اس بندے سے خود اتنے پریشان ہیں کہ دوبار سے بند کرنا چکے ہیں۔“

”یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ یعنی وہ بندہ ہے اسی قابل۔“

”وہی تو میں بتا رہا ہوں سرجی۔ ہم خواہ مخواہ ایک شریف بندے کی بدعائیں لے رہے ہیں۔“

”جائیں بھائی آپ چلے جائیں۔“ ایس ایچ او نے میری طرف دیکھا۔ ”اور ہمیں معاف کر دیں کہ ہم نے آپ کو پریشان کیا ہے۔“

”خدا حافظ۔“ میں جلدی سے دروازے کی طرف لپکا اور اسی وقت ایک پولیس والے نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”دومنٹ تو رک جاؤ بادشاہو۔“

”اب کیا ہو گیا؟“ ایس ایچ او نے غصے سے پوچھا۔ ”سرجی کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ مستقیم صاحب ہر وقت اپنے بہنوئی سے ناراض ہی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اگر انہیں پتا چل گیا کہ ہم نے ان کے بہنوئی کو پکڑ لیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ ناراض ہو جائیں انسان کے دماغ کو بدلتے ہوئے کہاں دیر لگتی ہے۔“

”یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔“ ایس ایچ او نے کہا۔ ”چلو ڈال دو اس کو لاک اپ میں۔“

”اور اس بار میں نے وہ حرکت کی جو مجھے پہلے کر لینی چاہیے تھی۔ میں لاک اپ میں ڈال دیا اسے جانے دو کے چکر سے نکل کر ایک کنارے ہو گیا۔“

”یعنی میں اب چھ مہینے سے جیل میں ہوں کیوں کہ میں نے ایک پولیس والے کا سر بھاڑ دیا تھا۔ جی ہاں میں نے میز پر بھی ہوئی ایش ٹرے اٹھا کر ایس ایچ او کے سر پر دے مارا تھا۔“

”اس کے نتیجے میں مستقیم صاحب سے بھی جان چھوٹ گئی تھی اور مجھے باقاعدہ گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ جہاں سے مجھے چھ مہینے کی سزا سنائی گئی۔“

”اور اب میں جیل میں رہ کر یہ کہانی لکھ رہا ہوں۔“

”ہو سکتا ہے کہ آپ کو میری یہ کہانی غلط معلوم ہو۔ کیوں کہ یہ ہے ہی غلط لیکن آپ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ایمان سے بتائیں کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا؟“





اسرار

جناب معراج رسول
السلام علیکم

اس بار میں ایک انوکھی مخلوق کی درندگی کا قصہ لے کر حاضر
ہوا ہوں۔ آپ یقین کریں یہ مبالغہ نہیں اس مخلوق کی حشر سامانی
کسی داستان جھمپیر اور جنگ شاہی کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ ان
نفس اخبارات میں بھی یہ خبر شہ سرخیوں کے ساتھ آئی تھی۔
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
(جیکب آباد)

طوفانی بارشوں کا سلسلہ تھم چکا تھا۔ بستی والوں نے
سکھ کا سانس لیا تھا کیوں کہ اگر یہ سلسلہ مزید ایک روز جاری
رہتا تو بستی کی مشرقی سمت بچے والے دریا میں زبردست
طفیانی آجاتی اور پورا علاقہ زیرِ آب آجاتا۔ یہاں آس
پاس دو تین بستیاں تھیں۔ ایک تو دریا کے دوسرے کنارے
پر آباد تھی جو پچھروں کی بستی کہلاتی تھی۔
گزشتہ دنوں ہونے والی طوفانی بارشوں کے باعث
اس دریا کی جنوب مشرقی سمت سے نکلنے والی ایک شاخ

(کینال) پر آٹھ ستونوں والا جو ریلوے پل بنا ہوا تھا اس کے چار ستون بہہ گئے تھے پل ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں ہنگامی بنیادوں پر مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ یہ کینال دریائے سندھ سے پھوٹی تھی اور جنگ شاعی اور تھمپیر کے درمیان سے گزرتی تھی۔

اور سیر کمال احمد اپنے پارہ ورکروں کی ٹیم کے ساتھ وہاں خیمہ زن تھا۔ ٹوٹے ہوئے پل کے قریب چار خیمے نصب کیے گئے تھے۔ یہ ٹیکنیکل عملہ تھا جن کے ذمے آہنی برتن اور پٹریوں کی مرمت کا کام تھا جب کہ اینٹوں اور سینٹ کے ستونوں کا کام تقریباً چالیس مزدوروں اور پانچ راج مسٹریوں کے سپرد تھا۔

یوں ان دونوں ٹیموں کو ”اے“ اور ”بی“ سیکشن میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ”اے“ ٹیم اور سیر کمال احمد کی تھی۔ ”بی“ سیکشن کی ٹیم نے بھی الگ تھلک مقام پر اپنی جھونپڑیاں ڈال لی تھیں اور یوں بنجر ویران علاقے میں باقاعدہ ایک کالونی بن گئی تھی۔

کام ہنگامی بنیادوں پر جاری تھا کیوں کہ ایک بڑے شہر کا رابطہ دیگر شہروں سے بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ پہلے متبادل راستہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

اور سیر کمال احمد ایک پینتیس سالہ شخص تھا۔ وہ خود دن رات کام کی نگرانی کرتا تھا۔ بارشوں کا سلسلہ ابھی پوری طرح ختم تو نہیں ہوا تھا تاہم اس میں خاصی حد تک کمی ضرور واقع ہو گئی تھی۔

اور سیر سارے عوامل پر سوچ بچار کرنے کا عادی تھا۔ وہ مزدور پارٹی کے ٹھیکیدار راجا شفیق کو بھی کام کے سلسلے میں مفید مشورے دیا کرتا تھا۔

ایک روز صبح چھ بجے حسب معمول دونوں ٹیموں نے بیداری کے بعد کام سنبھالا تو ایک لرزہ خیز ڈاؤن کے انکشاف ہوا۔ تین افراد کی لاشیں کینال کے قریب تھوڑے فاصلے پر پڑی تھیں۔ ان تینوں بد نصیبوں میں سے دو مرد تھے اور تیسرا اے ٹیم کا ورکر تھا۔

کام روک دیا گیا۔ پورے عملے میں خوف اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اور سیر کمال احمد اور ٹھیکیدار راجا شفیق جائے مقام پر پہنچے۔ تینوں لاشوں کو الگ الگ تین چار پارٹیوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ لاشوں کی حالت بہت بری تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی

خونخوار درندے نے انہیں چیر پھاڑ ڈالا ہو۔ اکثریت کا خیال تھا کہ یہ کام جنگلی کتوں اور خونخوار بھیڑیوں کا ہے۔ اس علاقے میں ٹھمپیر تھانے کی حد لگتی تھی۔ چنانچہ فوری طور پر چند افراد کو ایک جیب میں روانہ کر دیا گیا۔ پولیس پارٹی آئی تو اس نے لوگوں کے بیان قلمبند کیے۔ لاشوں کا جائزہ لیا اور وہی ہوا یعنی اس حادثے کو جنگلی کتوں اور بھیڑیوں کا شاخسانہ قرار دے کر ضابطے کی کارروائی نمٹا دی گئی۔ لاشیں شہر بھجوا دی گئیں کیوں کہ ان کے ورثا وہیں رہتے تھے۔

یہ اسی رات کا ذکر ہے۔ صبح کے واقعے کی وجہ سے عملے نے دو گھنٹے پہلے کام روک دیا تھا۔ وجہ معقول تھی۔ اس لیے اور سیر کمال احمد اپنے خیمے میں آ گیا۔ یہاں پیرو میکس کا ایک لیپ روٹن تھا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ اس کا ملازم بختیار علی کھانا لے آیا مگر کمال کو بھوک نہ تھی۔ اسے ان بد نصیب مزدوروں کی عبرت ناک موت کا رنج تھا۔ بختیار بھی آرزوہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک بچی عمر کا آدمی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ”صاحب“ نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تو اس کا بھی کھانے کو جی نہیں کیا تھا۔

”یار مجھے ایک کپ چائے بنا دو۔“ کمال نے کہا۔ ”ابھی لایا صاحب!“ وہ یہ کہہ کر خیمے سے باہر چلا گیا۔ وہیں گیس کا اسٹور کھا تھا۔ بھگی پھٹکی چائے، کافی یا دودھ وہیں گرم کیا جاتا تھا۔ اس کے ملازم بختیار کو گئے ابھی ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ کسی کے ٹھٹھکارنے کی آواز ابھری۔

”کون؟“ کمال احمد نے پوچھا۔

”میں ہوں جناب! ٹھیکیدار شفیق۔“ باہر سے آواز آئی۔

”آ جاؤ..... آ جاؤ.....“ کمال احمد نے فوراً کہا۔ ٹھٹھکار نے قدم اور سانوئی رنگت کا درمیانی عمروالا شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص کے اوپر واسٹ پہن رکھی تھی۔

”آؤ بیٹھو مگر پہلے ذرا بختیار علی سے کہہ دو کہ ایک کپ چائے کا پانی اور.....“

”وہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔“ راجا شفیق نے مسکرا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور پھر اس کے سامنے دھری ایک چھوٹی سی فولڈنگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ دونوں صاحبان نے ہونے کی وجہ سے بے تکلف دوست بن چکے تھے۔

”کیا بات ہے اب تک سوئے نہیں آپ؟“ اس نے کمال احمد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
 ”ہاں یار! آج والے واقعے کی وجہ سے دل بڑا خراب ہے، نیند ہی نہیں آ رہی۔“ کمال احمد نے افسردہ لہجہ میں کہا۔

”دکھ تو واقعی مجھے بھی بہت ہوا کمال صاحب! بے چارے محنت مزدوری کرنے والے ان تین بد قسمت آدمیوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوا مگر کمال صاحب میرے حلق سے ایک بات نہیں اتری ہے اب تک.....؟“ راجا شفیق نے چوٹکانے والے انداز میں کہا۔

”اگر ان تینوں مزدوروں کو کتوں اور بھینڑیوں نے چیر پھاڑ ڈالا تھا تو کم از کم چیخنے چلانے کا شور تو آنا چاہئے تھا؟“

”یار شفیق! ہم سب لوگ سارے دن کے تھکے بارے سوئے ہیں۔ بستر پر پڑتے ہی بے سدھ ہو جاتے ہیں پھر صبح تڑکے ہی آنکھ کھلتی ہے۔ بھلا شور کی آواز کون سنتا۔“ کمال احمد نے پھسکی مسکراہٹ سے کہا۔

”پھر بھی کمال صاحب! تمہیں چالیس افراد پر مشتمل عملے کے لوگوں میں کسی ایک کو بھی خبر نہ ہو سکی۔“ راجا شفیق کے لہجہ میں حیرت پنہاں تھی۔

بخارا علی چائے کی ٹرے اٹھائے آگیا۔ دونوں کو چائے کا ایک ایک کپ تھمانے کے بعد خود بھی ایک قریب دھرے اسٹول پر ٹنگ کر بیٹھ گیا۔ ایک گم اس کے ہاتھ میں تھا۔

”میرے ذہن میں تو کوئی اور بات ہے۔“ کمال احمد نے چائے کی چمکی لے کر بے سوچ لہجہ میں کہا۔

”کیسی بات؟“ راجا شفیق کے کندھے سے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”جس مقام پر وہ تینوں مزدوروں کی لاشیں پائی گئی تھیں وہاں آس پاس زمین پر کسی جانور کے قدموں کے نشانات نہیں ملے تھے ماسوائے انسانوں کے پیروں کے۔“ کمال احمد نے کہا۔

راجا شفیق بولا۔ ”ہو سکتا ہے بارش کی وجہ سے نشانات معدوم ہو گئے ہوں۔ برسات بھی تو دیکھو ناں۔ جیسے جعرات کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ بالکل معمولی ہلکی ہلکی اور کبھی ایک دم تیز.....“

”ہوں یہ بات تو ہے مگر راجا! پھر بھی جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا ہے کہ اتنی بڑی واردات یوں چپ چاپ ہو گئی۔“ کمال احمد اس بار اچھے ہوئے لہجہ میں بولا۔ راجا شفیق خاموش رہا۔

تینوں اب خاموشی سے چائے پینے لگے۔ باہرات کا تاریک سناٹا کھیل چکا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار کے ساتھ تیز ہوا کے جھونکے بھی چل رہے تھے۔

”مرمتی کالونی“ سے ذرا دور ایک بستی کی آبادی میں جس کے ایک طرف کھجوروں کا بڑا سا باغ تھا۔ وہاں ایک کچی اور سرخ اینٹوں کا مکان بنا ہوا تھا۔ مکان باغ کے مالک رحمت اللہ کا تھا۔ بستی کی معتبر شخصیت بھی یہی تھی۔

آج سے کئی سال پہلے جب رحمت اللہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا اس کے دادا نے یہاں ایک کھجور کا درخت لگایا تھا اور آج اس کی دوسری نسل تقریباً چالیس درختوں پر مشتمل ایک باغ کی شکل میں اس کا پھل کھا رہی تھی۔ رحمت اللہ کی بیوی امیر زادی ایک خوش اطوار خوش جمال خاتون تھی۔ شادی کے سات آٹھ سالوں بعد بڑی منتوں اور مرادوں سے ایک بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ وہ اب دس بارہ سال کا ہو چکا تھا۔ رحمت اللہ اب اس چھوٹے سے گوشہ میں زمیندار کہلاتا تھا..... باعزت زمیندار۔

یہ تینوں الگ الگ چار پائیوں پر کھلے صحن کے ایک کونے میں بڑے سے چھپر نما سائبان تلے گہری نیند سو رہے تھے۔ درمیان میں ان کے بیٹے شاہ رخ کی چھوٹی چار پائی تھی۔ اس بڑے مکان کی کل کائنات یہ تین افراد ہی تھے۔

باہر ہو کا عالم تھا۔ تاریک رات اسے بھرپور جو بن پر تھی۔ ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ ٹھنڈی ہوائ بھی چل رہی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اچانک باہر کسی گیدڑ کے زور سے رونے کی آواز ابھری۔ یہ آواز گیدڑ شاید دروازے کے قریب پہنچ کر اپنی منحوس آواز میں رویا تھا۔ مگر رحمت اللہ اور شاہ رخ کی آنکھ نہیں کھلی تھی البتہ امیر زادی ضرور جاگ گئی تھی۔ باہر گیدڑ دوبارہ چلایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ امیر زادی نے اس آواز پر گیدڑ کو کونسا دیا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لی مگر اس کی چھٹی ایسی تھی کہ ایک بار آنکھ کھل جانے کے بعد دوبارہ نہیں آئی۔ یا پھر بہت دیر سے آتی۔ بہر طور..... وہ کافی دیر تک کروٹیں پٹتی رہی پھر اچانک ہی وہ ایک آواز پر

چونک پڑی۔

آواز بڑی عجیب سی تھی۔ صحن کا دروازہ قریب ہی تھا اور یہ عجیب اور نامعلوم سی آواز دروازے کے باہر سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ معاً ہولے سے دروازے کے دونوں پٹ آواز کے ساتھ ہلے۔ امیر زادی دروازے کو کھٹکے لگی۔ چھپر نما سائبان کے ایک بدنما بانس سے جھولتی ہوئی لائین کی دھیمی برقان زدہ روشنی میں اس نے بدستور اپنی نظریں جمائے رکھی تھیں۔ آواز دوبارہ نہیں ابھری۔ امیر زادی بھی کہ دروازہ ہوا سے ہی ہلا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ جیسے ہی دوبارہ لینے کی کوشش کرنے لگی تو اچانک دروازے کے باہر سے ایک خراٹے دار حیوانی آواز ابھری۔

اب تو امیر زادی کا ہاتھ ٹھکا۔ وہ ایک بہادر عورت تھی تاہم پھر بھی یہی سمجھی کہ باہر کوئی آوارہ جانور یا جنگلی سور ہوگا کیوں کہ مجوروں کا باغ قریب ہی تھا۔ یہ سوچ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔

دفعتاً باہر ہولے ہولے خرخرانے کی آوازیں بتدریج ابھرنے لگیں۔ آس پاس کا علاقہ جنگل تھا۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ کوئی آوارہ جانور ہے لیکن اب متواتر خرخرانے کی آواز کے ساتھ ہولے ہولے دروازے کے کھٹکنے پر امیر زادی چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پہلے باورچی خانے میں جا کر مسالا پیسنے والا ڈنڈا اٹھایا اور دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھی۔

”اسے اب بھگاتا ہی پڑے گا۔“ وہ ڈنڈا تھامے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دانت پیس کر بڑبڑائی۔

قریب پہنچ کر اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ڈنڈا پکڑا اور بائیں ہاتھ سے دروازے کی کھڑکی کھول دی پھر فوراً دروازے کا ایک پٹ وا کر دیا۔ اسے تاریکی میں ایک انسانی ہولادور جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس انسانی ہولے کو دیکھ کر چونگی بھی مچتی اور حیران بھی ہوئی تھی۔ وہ ہولادور بھی غائب ہو گیا تھا۔ امیر زادی کو حیرت اس بات پر بھی کہ وہ کسی جانور کی توقع کر رہی تھی پھر یہ انسانی ہولادور کہاں سے آگیا؟ آخر کون تھا یہ؟ پھر اس نے سر جھٹک کر دروازہ بند کر دیا۔ کھڑکی چڑھائی اور مسالے کا ڈنڈا واپس باورچی خانے میں رکھنے کے بعد وہ اپنی چار پائی پر آکر لیٹ گئی۔ باہر اب گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش بھی رک گئی تھی۔

اگلے روز سب بیدار ہوئے۔ امیر زادی ناشتا وغیرہ

بنانے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد رحمت اللہ اور اس کا بیٹا شاہ رخ غسل وغیرہ کر کے چار پائی پر بیٹھ گئے تب تک امیر زادی نے چار پائی پر ناشتا لگا دیا اور خود بھی شوہر اور بیٹے کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔

”بابا! آج میں بھی آپ کے ساتھ باہر جاؤں گا۔“ شاہ رخ نے اپنے باپ سے کہا۔ رحمت اللہ نے شفقت بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ اس کی کوئی بات رد نہیں کرتا تھا۔ آخر کو اکلوتا اور لاڈلا تھا لہذا پیار سے بولا۔ ”ماں بیٹا چلنا میرے ساتھ۔“

”تم اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا ہاتھ پکڑ کر، نوکروں کے حوالے نہ کرو دینا میرے چاند کو۔“ امیر زادی نے اپنے بیٹے کی پیشانی چوم کر شوہر کو تنبیہ کی۔

”میں بھلا اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے دور کیوں کروں گا تو فکر نہ کر۔“ رحمت اللہ نے بیوی سے کہا۔ امیر زادی نے اچانک اس سے پوچھا۔ ”شاہ رخ کے پو! یہ آج بڑوں مجھے بتا رہی تھی کہ مرثی کا لونی کے تین مزدوروں کو جنگلی کتوں نے چیر پھاڑ ڈالا ہے؟“

بیوی کی بات سن کر رحمت اللہ بولا۔ ”ہاں، بستی کے لوگ وہاں گئے تھے۔ پولیس بھی آئی تھی لیکن حیرت ہے ہمیں یہاں رہتے ہوئے برسوں بیت چکے ہیں۔ پہلے تو کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔“

”اب جنگلی جانوروں کا کیا بھروسہ، بھوک کی وجہ سے کب خونخواری پر اتر آئیں۔ تم شام ہونے سے پہلے لوٹ آیا کرو۔“ امیر زادی نے کہا۔ اس کے لہجے سے تشویش مترشح تھی۔

رحمت اللہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اری نیک بخت! مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے پاس ڈبل بیرل بندوق ہے اور پھر یہ جانور بے چارے مجھے کیا کہیں گے۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ امیر زادی نے اپنے بیٹے شاہ رخ کی بلائیں لیں پھر اسے دعائیں دیتے ہوئے چہرے پر پھونک ماری، اس کے بعد رحمت اللہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا باہر کچھ لوگوں پر نظر پڑی جن میں چند افراد زمین پر جھٹک جھٹک کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ ہلکے چونک گئے۔ امیر زادی نے فوراً سر پر چادر رکھ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

”کیا بات ہے بھائیو! کیا چور آیا تھا؟ کسی کا کھورا

اس پورے علاقے میں یہ دوسری لرزہ خیز واردات تھی۔ بہتی میں یہ افواہیں تیزی سے گردش کرنے لگیں کہ یہاں کوئی خونی بلائیں آئی ہے۔ جو دن میں تو کہیں چھپی رہتی ہے مگر رات ہوتے ہی شکار کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔

کھوجیوں کے مطابق یہ درندہ عجیب و غریب تھا جس کے بھاری بھرکم پنجوں کے نشانات چار کی بجائے دو تھے۔ وہ ریچھ ہی کی طرح کا کوئی خونخوار جانور ہے جو دو پیروں پر انسانوں کی طرح کھڑا ہوتا ہے۔

ادھر اور سیر کمال احمد اور ٹھیکیدار راجا شفیق کو تلے اوپر ہونے والی ان دو وارداتوں نے خاصا پریشان کر ڈالا تھا۔ کیوں کہ مزدوروں اور ورکروں میں کام کے معاملے میں وہ پہلے جیسی تیزی اور تندہی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ کام بھی متاثر ہو رہا تھا۔ صورت حال کو دیکھ کر کمال احمد اور راجا شفیق سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

”سرجی! اس طرح تو ہمارے کام کو مہینے لگ جائیں گے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔“ راجا شفیق نے تشکر لہجے میں کہا۔

راجا شفیق کی بات سن کر اور سیر کمال احمد نے بھی کمرے فکر کے ساتھ کہا۔ ”تم صحیح کہتے ہو۔ میرا خیال ہے اب اس کی رپورٹ حکام بالا تک پہنچانا ہوگی۔“

”جی جناب! نہ صرف یہ بلکہ مدد کی بھی درخواست لکھ دیں اور صاف صاف واضح کر دیں کہ اگر اس کا فوری طور پر سدباب نہ کیا گیا تو کام کا بہت حرج ہوگا۔“

یہ دونوں حسب معمول رات کو سر جوڑے بیٹھے تھے۔ باہر بختیار اسٹو پر چائے کا پانی چڑھائے ہوئے تھا۔ ہر سو تاریکی اور سنائے کا راج تھا۔

اچانک انہیں باہر بختیار کی لرزہ خیز جھنجھٹائی دی۔ کمال احمد اور راجا شفیق خیمے سے باہر آ گئے۔

کمال احمد کے ہاتھ میں نارنج تھی جب کہ راجا شفیق نے پیٹر میکس اٹھا لیا تھا۔ ان کی جو سامنے نظر پڑی تو ہری علاج لرز اٹھے۔

چائے کا اسٹو الٹا ہوا تھا اور قریب ہی خون میں لت پت ان کا لٹنم بختیار بری طرح تڑپ رہا تھا۔ کمال احمد فوراً اس کی طرف لپکا جب کہ راجا شفیق متوشش نظروں سے تارکی میں آس پاس گھومنے لگا مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔

تلاش کر رہے ہو؟“ رحمت اللہ نے وہیں کھڑے کھڑے با آواز بلند ان سے پوچھا۔ لوگ کافی تعداد میں تھے اور ان کے چہروں پر خوف اور پریشانی کے تاثرات مترشح تھے۔ وہ اب قریب آ گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے رحمت اللہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ”سائیں! آپ کے گھر میں تو خیریت ہے نا؟“

”اللہ کا کرم ہے۔ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا؟“ رحمت اللہ نے پوچھا۔

”خیریت کہاں..... سائیں!“ ایک دوسرا دیہاتی بولا۔

”کل رات ایک عجیب و غریب اور خونخوار جانور نے خدا بخش کے گھر کا دروازہ توڑ کر اس کے سارے خاندان کو پھاڑ ڈالا ہے۔ پورے چار افراد تھے۔ ماں، باپ اور بہو بیٹا۔“

”کیا.....! یہ..... تو بڑی ہی افسوس ناک اور بری خبر سنائی تم نے؟“ رحمت اللہ نے پریشان ہو کر کہا۔ دروازے کے عقب میں کھڑی امیر زادی بھی یہ سن کر دھک سے رہ گئی تھی۔

”سائیں! اس سے بھی بری خبر ہمارے پاس ہے۔“ ایک تیسرے شخص نے کہا۔ یہ ان دونوں افراد میں سے ایک تھا جو جھکے جھکے زمین پر کسی کے قدموں کے نشانات دیکھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ یہ کھوجی تھے۔

”وہ کوئی دو پیروں والا جانور ہے۔ یہ دیکھو سائیں کتنے واضح نشانات ہیں اس کے قدموں کے۔“ انہوں نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔ ”لگتا ہے وہ یہاں تک پہنچ کر واپس لوٹ گیا تھا۔“

اب رحمت اللہ کے ساتھ امیر زادی کا بھی ہاتھ تھا اسے فوراً رات والا وہ پراسرار انسانی بولا یاد آ گیا تھا۔ امیر زادی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر متوشش رہی ہے سوچا کہ اس نے رات میں جس پراسرار ہیولے کو دیکھا تھا ہمیں وہ ہی تو نہیں جن کی یہ لوگ باتیں کر رہے تھے مگر وہ تو بالکل انسان جیسا دکھائی پڑتا تھا۔ وہ دہل گئی۔ اس نے فوراً امیر ہاتھ بڑھا کر اپنے بیٹے شاہ رخ کو اندر کھینچ کر اپنے ساتھ چٹا لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رحمت اللہ نے اپنی بیوی کو دروازہ بند کرنے کا کہا اور پھر خود ابھی آنے کا کہہ کر ان لوگوں کے ساتھ چٹا بنا۔

”بب.....بختیار.....کبک.....کیا ہوا؟ کس نے تمہاری یہ حالت.....!“ فرط غم سے وہ اپنا جملہ پورا نہ کر پایا۔ بختیار کا پیٹ اور سینہ بری طرح چاک تھا گردن بھی آدمی ادھیڑ دی گئی تھی۔ چہرہ خون آلود ہو رہا تھا۔ وہ اپنے لب واکر کے کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔

”و.....و.....وہ.....جج.....جانور.....نہن.....نہیں.....“ وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اس کی روح تقس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ کمال احمد کو اپنے ملازم کی وردناک موت پر بہت دکھ تھا۔ وہ یوں تو مضبوط دل کروے کا آدمی تھا مگر مرتے وقت اپنے ملازم بختیار کے ان الفاظ نے اسے بھی ایک عجیب قسم کے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ بختیار نے مرتے وقت اس خوبی عفریت کے بارے میں بتانے کی جس طرح کوشش کی تھی اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ کوئی درندہ یا جانور نہیں تھا۔

”تو پھر کون تھا وہ.....؟“ کمال احمد سوچنے لگا۔ ادھر راجا شفیق ذرا کمزور دل واقع ہوا تھا۔ اس نے کمال احمد سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ اندر آجائیں کمال صاحب! کہیں وہ خونخوار جانور قریب ہی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو، ہمارے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں ہے۔“

”شفیق! ہم اس کی لاش کو بے گور و کفن کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟“ کمال احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک اور لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ یہ ذرا قریب بنے مزدوروں کے خیموں کی سمت سے آئی تھی۔

راجا شفیق اپنا دل تمام کر جیسے اندر دوڑ گیا جب کہ کمال احمد اپنی ٹارچ سنبھالے فوراً آواز کی سمت بڑھا۔ مزدوروں میں بھکڑ مچ گئی تھی۔ کمال احمد آواز کے مخرج والے مقام تک پہنچا تو اچانک اسے ٹھوکر لگی۔ وہ منہ کے بل گر پڑا۔

ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی وہ سمجھ گئی تھی مگر کمال احمد نے اٹھنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی اسے اپنے بالکل قریب ایک خیمے کے باہر کسی انسان کی مکھی مکھی چیخوں کے ساتھ خونخوار غراہٹوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے دھبے نما ہولے نظر آ رہے تھے۔

تب اچانک ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح انسانی خرخراہٹ ابھری اور ساتھ ہی دھب کی آواز سے کوئی گرا۔ اس وقت کمال احمد کو ایک بھاری بھر کم دھبانا کوئی شے اپنی طرف بڑھتی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی زور زور سے خرخراہٹ کی آوازیں ابھریں۔ خطرہ محسوس کر کے کمال احمد نے اٹلے قدموں بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی اور اندھیرے میں اندھا دھند اپنے خیمے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اسے تھوڑی دور تک کسی کو اپنے تعاقب میں آتی ہوئی بھد بھد کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ معدوم ہو گئیں۔ کمال احمد نے اپنے خیمے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔

☆.....☆

ایسے پے در پے ہونے والی پراسرار خونی واقعات کا تبادلہ بہت سی سے لے کر مرتی کالونی تک ہونے لگا تھا۔ گویا خوف و ہراس دونوں طرف تھا۔

بہت سی میں ایک باقاعدہ کچھری قائم کر دی گئی۔ رحمت اللہ نے بہت سی کے چند لوگوں کے ساتھ اپنے ڈیرے پر ایک نشست لگائی۔ سب لوگ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رائے دینے لگے۔

اکثریت کی رائے یہی تھی کہ یہ خونی حرکت کسی خونخوار جانور کی ہے تاہم ان لوگوں میں ایک شخص ویسا تھا جس کی رائے پر اور کوئی تو متفق نہ ہوا تھا مگر رحمت اللہ کو اس کی بات دل کو لگی تھی۔ اس شخص کا نام خوشی محمد تھا۔ اس نے سب سے آخر میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا۔

”تم سب لوگ ایک اہم بات کو فراموش کر رہے ہو۔“ اس کی بات سن کر سارے لوگ اس کا چہرہ ہنسنے لگے۔ خوشی محمد ایک بچی عمر کا صحت مند شخص تھا۔ بولا۔ ”تم لوگ وزیر خان کو کیوں بھول رہے ہو۔“

”وزیر خان.....؟“ اس کی بات سن کر کئی لوگ زیر لب بڑبڑائے۔

”ہاں! وزیر خان! کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ وہ ایک پناہ شکاری ہے؟“ خوشی محمد گویا انہیں یاد دلاتے ہوئے بولا۔ ”تو ایک نے جیسے اپنے تئیں اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے لقمہ دیا۔“

”سمجھنا خوب، اب ہم سمجھے تمہارا مطلب..... چونکہ وہ ایک شکاری ہے اس لیے ہمیں اس خون خوار جانور کو ہلاک کرنے کے لیے اس کی مدد لینا چاہیے۔“

”تم لوگ اب بھی میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔“

خوشی محمد نے اسرار بھرے لہجے میں کہا تو اس بار تقریباً سب ہی چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

خوشی محمد ہولے سے کھٹکھٹا کر بولا۔ ”وزیر خان کے ڈیرے میں بھانت بھانت کے جانور ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے ڈیرے کا کوئی جانور کسی وجہ سے باگل ہو کر درندگی پر اتر آیا ہے اور اپنی درندگی کی پیاس بجھا کر واپس وہیں لوٹ جاتا ہے۔“

اس کی بات سن کر پہلے پہل تو سب کو جیسے یلخت سانپ سونگھ گیا۔ اس کے بعد سارے ہی لوگوں نے نفی میں سر ہلا دیے اور یہ خدشہ ذکر کر دیا۔

مگر رحمت اللہ وہ واحد شخص تھا جسے خوشی محمد کی بات سے خاصی حد تک اتفاق تو تھا لیکن چونکہ اکثریتی رائے نے خوشی محمد کے اس خیال کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس لیے وہ بھی خاموش ہی رہا۔ پھر متفقہ رائے کے مطابق یہ طے پایا کہ دس بارہ افراد رات میں باری باری پہرہ دیں گے جن کے پاس اپنے ذاتی ہتھیار ہیں۔ وہ ہتھیار اٹھا سکتے ہیں ورنہ ڈنڈے، سونے اور لالٹیاں تو سب کے پاس موجود ہی ہونی چاہئیں۔ نیز یہ لوگ پورے ٹولے کے ساتھ پوری بستی کا ساری رات گشت لگاتے رہیں گے اور اس خون خوار جانور کو گھیر کر ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس کے بعد نشست برخاست ہوئی اور لوگ اٹھ کر جانے لگے تو رحمت اللہ نے خوشی محمد کو وہیں روک لیا پھر جب سب لوگ چلے گئے تو رحمت اللہ نے اسے مخاطب کیا۔ ”بھائی خوشی محمد، میں نے وزیر خان کا نام تو سنا ہے اور یہ بھی کہ وہ ایک شکاری ہے لیکن کیا تم مجھے اس کے بارے میں ذرا تفصیل بتا سکتے ہو؟“

”ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں۔“ وہ جھٹ بولا۔ پھر بتانے لگا۔

”وزیر خان ایک قریبی بستی میں رہتا ہے جو پانی جھیل کے قریب واقع ہے۔ مجھے ایک بار اس کے ڈیرے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح سمجوروں کا بیوپاری ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ میاں بیوی تنہا ہی رہتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی بھی چل رہی ہے۔ صولت خان نامی ایک زمیندار ہے اور وہ بھی وہیں رہتا ہے۔“

رحمت اللہ نے ایک ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ”خیر ہمیں بھلا ان دونوں کی دشمنیوں سے کیا لینا دینا۔ تم یہ بتاؤ

کہ اس نے اپنے جنگل ڈیرے پر کس قسم کے جانور پال رکھے ہیں؟“

”زیادہ تر تو میں نے چھوٹے موٹے جانور ہی دیکھے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”ان میں صرف بارہ سنگھا، آئی ٹیکس اور جنکارہ کے علاوہ دیگر چھوٹے موٹے چرند پرند ہیں مگر بڑے بڑے بھیرے جن کے نیچے چار پوے لگے ہوئے ہیں اور دروازہ سلاخ دار ہے میں چند بڑے جانور بھی ہیں مگر انہیں الگ تھلک رکھا گیا ہے جنہیں باقاعدگی کے ساتھ خود وزیر خان خوراک کھلاتا اور انہیں کبھی کبھی باہر بھی نکالتا ہے۔“ اتنا بتا کر وہ رکا اور پھر دائیں بائیں دیکھ کر رحمت اللہ کی طرف جھکتے ہوئے اسرار بھری سرگوشی میں بولا۔ ”میں نے تو یہاں تک بھی سنا ہے کہ اس کے پاس ایک ایسا اونٹ بھی ہے جو گوشت خور ہے۔ یہی نہیں بعضوں کے مطابق وزیر خان نے ایک ”مم“ بھی پال رکھی ہے جسے اس نے گھمیر کے بنجر ویرانوں سے پکڑا تھا، لوگ کہتے ہیں یہ وہ کوہ گیر کے گنجان پہاڑی سلسلوں گورکھل سے شکار کیا۔ اللہ جانے سائیں! جج کیا ہے؟“

”ان خطرناک درندوں کے بارے میں تمہیں کبھی کوئی ٹھوس شواہد ملے؟“ رحمت اللہ نے پوچھا۔

”اسے کچھ لوگوں نے غصے میں آکر یہ کہتے سنا تھا کہ میں ایک روز اپنے دشمن کو قتل کر کے اپنے اس اونٹ کے آگے ڈال دوں گا۔ پھر اس کی لاش کا بھی کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“

”دفع کرو۔ یہ سنی سنائی باتیں ہیں تم ایسا کرو کبھی میرے ساتھ وزیر خان کے جنگل ڈیرے تک چلنا۔ ذرا میں بھی وہاں کا جائزہ لوں گا۔“

اس کی بات پر خوشی محمد نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆.....☆

راجا شفیق ذرا سہا چار پائی پر بیٹھا تھا۔ کمال احمد کو ہانپتا کھیتا اندر داخل ہوتے دیکھ وہ فوراً چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کک..... کیا ہوا؟ خیریت تو ہے ناں؟“

”خیریت نہیں ہے! اس درندے نے ایک اور مزدور کا خون گرد کیا ہے۔“ کمال احمد نے ہانپتے ہوئے یہ مشکل کہا۔ ”اور.....“ وہ دھڑکے نے میرا بھی پیچھا کیا تھا مگر میں نکل بھاگا۔“

اس کی پوری بات سن کر راجا شفیق کا چہرہ فق ہو گیا اور

گنت زدہ لہجے میں اس سے بولا۔

”کک..... کہیں..... ایسا ت..... تو نہیں کہ..... وہ..... یہاں بھی آن دھمکے؟“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک راجا شفیق کی آنکھیں خوف و دہشت کے مارے پھیل گئیں۔ کمال احمد نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اپنے عقب میں دیکھا تو پیڑ و میکس کی روشنی میں خیمے کی دیوار پر ایک بددیت بیوے کا سایا ابھرا اور ساتھ ہی غراہٹ ابھری۔

راجا شفیق نے مارے خوف کے ایک زور دار چیخ ماری اور بدحواس ہو کر خیمے سے باہر دوڑ گیا۔ خیموں میں شور مچ چکا تھا مگر کسی کو باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اگلے روز ہی مزدور باہر نکلے۔ ان کے خیموں سے کچھ دور راجا شفیق کی لاش کھلے آسمان تلے پڑی تھی۔

☆.....☆

ریلوے پل کی مرمت کا کام اب مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ مزدوروں اور ورکروں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی تھی۔ بلکہ کچھ تو اب واپس شہر اپنے گھروں کی طرف لوٹنے کے لیے پرتولنے لگے تھے کیونکہ سب ہی کو اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس انتہائی مخدوش صورت حال نے اور سیر کمال احمد کو بری طرح پریشانی سے دوچار کر دیا تھا۔ اپنے ملازم، بختیار اور ٹھیکیدار راجا شفیق کے عبرت ناک انجام پر اسے بے حد دکھ تھا۔ اس جگر خراش واقعے کے بعد مزدوروں نے شور مچانا شروع کر دیا اور وہ سب کمال احمد کے خلاف نعرے لگانے لگے کہ اس نے پہلے واقعے کے بعد حکام بالا سے مدد لینے پر جان بوجھ کر تامل سے کام کیوں لیا تھا۔

اپنے انجینئر کو مشغول مزدوروں کے پھرے مجمع سے بچانے کی خاطر کئی ورکر بھی زخمی ہو گئے۔ مشغول مزدوروں نے جیب کو بھی آگ لگا دی اور یوں ریلوے پل کی تعمیر کا پورا عملہ تھرتھرا ہوا جس کو جدھر راستہ ملا۔ منہ اٹھائے دوڑ پڑا۔ اس شور شرابے پر بستی کے لوگوں نے بڑی مشکلوں سے مشغول مزدوروں کے ہجوم پر قابو پایا۔

☆.....☆

متعلقہ محکمے کے دو آدمیوں کے ساتھ تین سپاہیوں اور ایک انسپکٹر پر مشتمل تفتیشی ٹیم بھی زیر مرمت ریلوے پل کی مرمتی کالونی آ پہنچی تھی۔ انہوں نے کمال احمد اور چند

مزدوروں کا تفصیلی بیان لیا۔ یہ لوگ پولیس کی ایک موبائل ڈائن گاڑی میں آئے تھے۔

متعلقہ محکمے کے دونوں افسروں کا نام زیر درانی اور شمشاد بیگ تھا جب کہ انسپکٹر غلام علی تھے۔

”حالات بہت خراب ہو گئے ہیں جناب! ٹھیکیدار راجا شفیق کی ہلاکت کے بعد تو مزدوروں اور ورکروں نے احتجاجاً کام بھی بند کر دیا ہے۔“ کمال احمد نے تفتیشی ٹیم کو یہاں کے مخدوش حالات سے آگاہ کرتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ”اگر اس صورت حال پر جلد قابو نہ پایا گیا تو مین لائن کا کام شدید متاثر ہو سکتا ہے۔“

افسر شمشاد بیگ نے پوچھا۔ ”کیا کسی نے اس خون خوار درندے کو دیکھا ہے؟“

”نہیں سر! بس ہلکی سی جھلک ہی دیکھی ہے۔ میں نے بھی اس کا ہیولا دیکھا تھا مجھے تو وہ دو ہیروں والا کوئی گوریلا ٹائپ جانور لگا تھا۔“

”حیرت کی بات ہے کیا وہ خون خوار جانور اتنا چالاک اور پھرتیلا ہے کہ خاموشی کے ساتھ یہ کارروائی کر کے فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے؟“ دوسرے افسر زیر درانی نے خاصے تحیر آمیز لہجے میں کہا۔

”جی ہاں جناب! کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ ”یہاں تو آس پاس بستیاں بھی ہیں، کیا وہاں کے لوگوں نے اپنے طور پر کچھ نہیں کیا ابھی تک؟“ انسپکٹر غلام علی بولا۔

جواباً کمال احمد بولا۔ ”ہو سکتا ہے وہ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ تدارک کر رہے ہوں۔“ ”کیا یہ خونیں دار دامن ایک ہی بستی تک محدود ہیں؟“

”جی سر! وہ سامنے والی بستی، کھجوروں کے باغ والی۔“ کمال نے سامنے اشارہ کیا۔ یہ لوگ چھوٹے اور یوں کے باہر بھی فولڈنگ چیئرز پر بیٹھے تھے۔ کمال احمد نے مزید بتایا۔ ”مگر ہم بھی اس درندے کی بربریت کا نشانہ بنے ہیں۔“

”انسپکٹر صاحب! مجھے تو لگتا ہے یہ کسی پراسرار درندے کا کام نہیں ہے بلکہ یونہی کسی نے دانستہ دہشت پھیلا رکھی ہے۔ آج کل دشمنیاں نکالنے کا یہی ڈھنگ رائج ہے۔ کیا آپ سچ سے کچھ سال پہلے ہتھوڑا گروپ کی ایسی لرزہ خیز اور پراسرار کارروائیاں بھول گئے۔ کسی نے اپنے

ڈکرائے گئے۔ جوان شخص جس کا نام روشن خان تھا وہ بیلوں کو کھدینے کے لیے ان پر چابک مارنے لگا۔
 ”ناپت! نا! اتنے چابک نہ مار، یہ بے زبان ہیں پیارے انہیں کھدیز۔“ اس کے بوڑھے باپ نے بیٹے سے کہا۔
 بیٹا غصیلے مزاج کا تھا۔ جھٹاکر بولا۔ ”بابا! پتا نہیں کیا ہو گیا ہے ان کو آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔“
 ”چل تو ادھر ہو رو شو! میں سنبھالتا ہوں۔“ بوڑھے نے کہا اور بیٹے کی جگہ سنبھال لی۔

دشمن کا سر پھاڑ کر ہلاک کر دیا تو ایسی وارداتیں پے در پے ہونے لگیں اور ہر کوئی اپنی دشمنیاں نکالنے لگا اور جرم ہتھوڑا گروپ کے کھاتے میں ڈالا جانے لگا۔ ”زیر درانی نے کہا۔ اس کی بات سب کو معقول لگی تھی۔

”میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔“ انسپکٹر غلام علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں بستی جا کر لوگوں کے بیانات قلمبند کروں گا پھر متعلقہ تھانے کی پولیس سے ملوں گا۔ اس کے لیے کوئی لائحہ عمل اختیار کرنا پڑے گا۔“

اس کی بات سن کر کمال احمد نے اپنے افسر شمشاد بیگ سے کہا۔ ”سر! آپ ذرا ورکروں اور مزدوروں کو مطمئن کر دیں تاکہ وہ کام تو شروع کر دیں اور میرا خیال ہے اب یہاں سکیورٹی کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔“

شمشاد بیگ اور زیر درانی نے ورکروں اور مزدوروں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے انہیں تسلی بخشی دیتے ہوئے اس بات کا یقین دلایا کہ انہیں اب گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پولیس کو ان کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی انہوں نے مزدوروں سے کام شروع کرنے کی بھی درخواست کی۔

متعلقہ محکمے کے افسروں اور اسپیشل پولیس ٹیم کی آمد سے مزدوروں اور ورکروں میں کچھ حوصلہ ہوا اور رکاب ہوا کام پھر سے شروع کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ تفتیشی ٹیم باقی کام نمٹانے کے لیے پولیس موبائل میں بیٹھ کر بستی کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆.....☆

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل بچھائے ہوئے تھے۔ کچے راستے پر تیل گاڑی چلی آ رہی تھی۔ تیل گاڑی کے چوٹی تختے کے نیچے لائٹیں جھول رہی تھی اور اس میں چار افراد موجود تھے۔ ایک بوڑھا شخص تھا باقی دو میاں بیوی تھے۔ بوڑھے کا بیٹا اور اس کی بیوی جب کہ چوتھا ان کا سات سالہ لڑکا تھا جو اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ یہ لوگ ایک حکیم کے گھر سے دوا لے کر واپس اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔

کھیتوں کے درمیان تل کھاتے کچے راستے پر تیل گاڑی دھبی رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ تیل گاڑی جوان شخص چلا رہا تھا جب کہ چوٹی تختے پر پھونس پھنس رلی پر اس کا بوڑھا باپ اور بیوی بیٹھے تھے۔ نو عمر بیمار لڑکا ماں کی گود میں سر رہے سو رہا تھا۔ اس کے اوپر ایک رلی ڈالی ہوئی تھی۔

اچانک بیلوں نے چلنا بند کر دیا اور وہ بے چینی سے ماہنامہ سرگزشت

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ ایک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو ایک اسٹال کا P.T.C.L یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

33-C فرسٹ فلیئر ڈسٹرکٹ ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مزدوروں کے فون نمبرز پرچا کی فراہمی کے لیے

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

©2015

293

روشن علی اپنی بیوی کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے باگ سنبھال کر بیلوں کو نکارا۔ مگر بے سود۔ انہوں نے تو جیسے آگے نہ بڑھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

بوڑھے کے چہرے پر الجھن سی طاری ہو گئی۔ وہ نیچے اترا اور بیلوں کے قریب جا کر اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا پھر بہ غور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے تجربے نے فوراً بتا دیا کہ یہ معصوم سے جانور کسی نادیدہ شے سے خوف زدہ تھے۔ اس نے تیل گاڑی کے تختے کے نیچے جھولتی ہوئی لائین اتاری اور اسے ہاتھ میں لے کر ذرا آگے بڑھا اور زمین پر روشنی کر کے دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں تیل کسی سانپ کو دیکھ کر رہ گئے ہیں۔

اچانک بوڑھے کو اپنے دائیں جانب کی خود رو جھاڑیوں سے ایک تیز خراٹے دار آواز سنائی دی۔ وہ لائین اٹھائے اس طرف مڑا ہی تھا کہ ایک زوردار غراہٹ کے ساتھ اسے ایک بھاری بھر کم ہولا بھپٹا نظر آیا۔ اس ہیولے نے اپنے ہاتھ کے نوکیلے ناخنوں والا پنجہ اس کی گردن پر اس زور سے رسید کیا کہ بے چارے بوڑھے کی نصف گردن ادھر کر رہ گئی۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کے جوان بیٹے نے باپ کی دلدوز چیخ سنی۔ وہ فوراً کلباڑی سنبھالے تیل گاڑی سے کودا، لائین زمین پر مگر رہی ہوئی تھی۔ وہ ابھی بھی نہیں سمجھتا کہ اس کی لودھب رہی تھی۔ وحشی روشنی میں روشن علی نے اپنے باپ کو بے سدھ زمین پر پڑے پایا۔ اس کی گردن سے تیزی کے ساتھ خون بہہ رہا تھا۔ روشن علی کو اپنے سامنے صرف پندرہ سولہ گز کے فاصلے پر وہ ہولا نظر آ گیا۔ روشن علی ایک بہادر نوجوان تھا۔ اس نے سب سے پہلے لائین اٹھانا چاہی مگر اس ہیولے نے زوردار غراہٹ کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا۔ روشن علی نے دونوں ہاتھوں سے کلباڑی تھام کر اس درندے پر دار کرنا چاہا مگر درندے نے اسے پہلے ہی چھاپ لیا۔ روشن علی کو اپنے نعتوں میں سخت بدبو کا محسوس ہوا محسوس ہوا۔

ہیولے نے اسے اپنے طاقت ور ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ تیل گاڑی میں موجود عورت نے رونا چلانا شروع کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت آسمان پر بادلوں کی زوردار گز گز اہٹ ابھری اور ساتھ ہی بڑے زور سے بجلی چمکی۔ بیلوں نے جھرا کر دوڑ لگا دی۔ عورت نے اس چمکتی ہوئی آسمانی بجلی میں بھیاں بھیاں منظر دیکھا۔

دوڑتی ہوئی تیل گاڑی میں بیٹھی اس عورت نے قریب سے گزرتے ہوئے آسمانی بجلی کی لگائی چمک میں وہ بھیاں بھیاں منظر دیکھا۔ اسے کوئی بھاری بھر کم عجیب و غریب وجود نظر آیا تھا۔

خوف اور بدحواسی کے باعث اس قلیل سی پلک جھپکتی روشنی میں وہ صرف اتنا ہی دیکھ پائی تھی۔ عورت نے اپنے شوہر کا انجام بھی اپنی دہشت کے مارے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ جسے وہ دو ہیروں والی عجیب الخلقیت بلا اپنے لمبے چوڑے بازوؤں میں دبوچے مسل رہی تھی۔ اس کے بعد تیل گاڑی دوڑتے دوڑتے چلی گئی۔

اس بھیاں بھیاں واقعے نے اس بستی کے لوگوں کو بھی لرزا کر رکھ دیا۔ صبح پو پھٹتے ہی لوگوں نے بد نصیب عورت کے ساتھ جا کر جائے وقوعہ کا جائزہ لیا اور عورت سے بھی پوچھا۔ اس بد نصیب عورت نے وہی کچھ بتایا جو وہ بتا چکی تھی۔ وہاں دونوں باپ بیٹوں کی ادھڑی ہوئی لائیں پڑی ملی تھیں۔

کھوجیوں نے ہیروں کے نشانوں سے اس خون خوار درندے کے متعلق وہی اندازہ قائم کیا تھا جو کھجوروں والی بستی کے کھوجیوں نے ان عجیب و غریب بد وضع ہیروں کے نشانات کو دیکھ کر لگا یا تھا کہ یہ کسی ایسے عجیب وضع کے خون خوار درندے کے پاؤں تھے جو دو ہیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا مگر عورت کے بیان کے مطابق یہ جانور چوپایا نہیں تھا۔ لوگوں میں ایک ہراس سا پھیل گیا تھا کہ جانے یہ کیسی بلا تھی۔ اس کا تعلق بہر حال جانوروں اور درندوں کے قبیل سے محسوس نہیں ہوتا تھا۔

اس طرح دوسری اور پھر تیسری واردات بھی اس بستی میں رونما ہوئی۔ عام طور پر یہاں کی بستی کے لوگوں میں بھی خوف و ہراس کی فضا قائم ہو چکی تھی۔

جب اس دوسری اور تیسری وارداتوں کی اطلاع رحمت اللہ تک پہنچی تو اسے پورا یقین ہو گیا کہ ہونا ہو اس پر اسرار بلا کا تعلق وزیر خان سے ہے۔ اب وہ اپنے اس پالتو درندے کے ذریعے پہلے اپنے دشمن کی بستی میں دو تین عام سی وارداتیں کروائے گا اور پھر اس کے بعد یہ حملہ صولت علی یا اس کے خاندان کے کسی فرد پر بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اسی وقت مذکورہ بستی پہنچا اور وہاں کے امیر زمیندار صولت علی سے اوطاق حرج کر ملاقات کی۔

☆.....☆

رحمت اللہ نے وزیر خان کے برعکس منسار اور

ماہنامہ سرگزشت

294

ماہنامہ سرگزشت

خوش اخلاق محسوس ہوا۔ صولت ایک تندرست اور جوان سا شخص تھا۔ وہ اس وقت کڑکڑاتی کلف لگی شلوار، قمیص میں ملبوس تھا۔ رحمت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے پہلے اسے یہی بتایا کہ اس پر اسرار درندے کی خونی وارداتوں کی ابتداء اس کی بستی سے ہوئی تھی۔ رحمت نے ابھی اپنے مطلب کی بات کو محفوظ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”سائیں! ہم سب لوگوں کا یہی خیال ہے کہ وزیر خان نے اپنے ذاتی جنگل ڈیرے میں جو پالتو جانور رکھے ہوئے ہیں ان میں چند خون خوار درندے بھی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان میں کوئی درندہ پاگل ہو کر بھاگ نکلا ہو اور اب وہ خون آشامی پر اتر آیا ہو؟“

صولت علی نے بغور رحمت کی بات سنی اور چند ٹاپے کی پرسوج خاموشی کے بعد بولا۔ ”ممکن ہے..... مگر ہم جب تک اس درندے کو پکڑیں گے نہیں، ہمیں کیسے معلوم ہوگا؟“ تب رحمت نے اس کی تائید پا کر کہا۔ ”سائیں! میں نے سنا ہے کہ آپ کی وزیر خان سے کوئی پرانی دشمنی بھی چلی آرہی ہے؟“

اس کی بات سن کر صولت کے چہرے پر ناگوار تاثرات ابھرے اور وہ اپنے سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں! ہماری اس سے دشمنی کی وجہ بھی یہی تھی کہ سب سے پہلے ہم نے ہی اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنے پالتو جانوروں میں بالخصوص درندوں کو نہ رکھے۔ اس سے پہلے اس کے جنگل ڈیرے کی حدود ہماری جاگیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری مخالفت کی ابتداء اس وقت ہوئی تھی جب اس کے جنگل ڈیرے سے ایک ہاتھی پاگل ہو کر ہمارے کھیتوں میں گھس آیا تھا اور ہماری ساری فصل نہ صرف تباہ کر ڈالی تھی بلکہ ہمارے کسانوں کو بھی بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ ہم نے فوراً اس پاگل ہاتھی کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد اس کے جنگل ڈیرے سے ایک چیتا بھاگ نکلا تھا۔ تب سے ہم نے اس کی مخالفت شروع کر دی تھی اور انتظامیہ کو اس کے خلاف رپورٹ کر دی۔ اس کے بعد وزیر خان نے ہمیں قتل کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں کیوں کہ انتظامیہ نے اس کے خلاف سخت ایکشن لیا تھا اور اسے مجبوراً جنگل ڈیرے کی نصف حدود کو خالی کرنا پڑا تھا۔“

وہ تفصیل بیان کرنے کے بعد خاموش ہوا تو رحمت نے فوراً اصل بات کہہ ڈالی۔ ”سائیں! میرے دل میں اس لیے یہ شک ابھرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنے

جنگل ڈیرے کے کسی درندے کو جان بوجھ کر ان خون آشام وارداتوں پر لگا دیا ہو اور اس کی آڑ میں وہ کوئی اپنا دیرینہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہو؟“

صولت علی پھر بھی اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھا اور بولا۔ ”کیا مطلب؟ ذرا کھل کر بات کرو۔“

”سائیں! آپ برا مت مائیے گا۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ دو ہاتھیوں کی اس سرد جنگ میں ہم بے گناہ لوگ مارے جا رہے ہیں۔“ رحمت نے اتنا کہا اور لمحہ بھر متوقف کے بعد دوبارہ بولا۔ ”شاید آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق ہو کہ مجھے لگتا ہے وزیر خان آپ سے اپنی دشمنی کو بھولا نہیں ہے۔ وہ آپ سے خفیہ اور گھٹاؤ نے طریقے سے دشمنی نکالنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ اپنے اس خون خوار درندے سے چند خونی وارداتیں کروانے کے بعد آپ کو بھی اس پر اسرار درندے کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت اس طرح بھی ملتی ہے کہ اب پچھلے چند روز سے آپ کی جاگیر میں ایسی دو تین لرزہ خیز وارداتیں ہوئی ہیں اور اب آئندہ اس درندے کا کون نشانہ بن سکتا ہے اس کا آپ خود اندازہ کر لیں۔“ رحمت اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا مگر اس کی بھانپتی ہوئی نظریں صولت علی کے چہرے پر مرکوز تھیں جہاں تیزی سے تاثرات تبدیل ہونے لگے تھے۔ پھر اس نے دیکھا ان تاثرات میں غیظ کا تاثر غالب نظر آنے لگا۔ وہ اس لمحے میں رحمت اللہ سے بولا۔

”اگر یہ بات ہوئی تو میں وزیر خان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

رحمت اللہ فوراً بولا۔ ”سائیں! میرا مقصد آپ دونوں کو لڑوانا ہرگز نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ معاملے کا کھوج لگایا جائے اس کے بعد اگر وزیر خان مجرم ثابت ہوا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔“

”شاید یہی طریقہ بہتر رہے گا۔“ بالآخر صولت علی نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ رحمت اللہ کو اس کی افہام و تفہیم والی طبیعت پسند آئی۔

”رحمت اللہ! اب تم ہی بتاؤ کہ اس درندے کا کس طرح کھوج لگایا جائے؟“ صولت علی نے چند ٹاپے خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا۔

”مجھے یقین ہے کہ وہ خونی درندہ ایسی خوف ناک وارداتیں کرنے کے بعد واپس وزیر خان کے جنگل ڈیرے میں پناہ لیتا ہوگا۔ یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ صرف

محتاج رہیں اور بستی والوں کی حفاظت کے اقدامات پر توجہ دیں باقی میں دیکھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت چلائی۔

صولت علی نے گرم جوشی کے ساتھ اسے رخصت کیا اور ساتھ ہی ہر ممکن تعاون کا بھی اسے یقین دلایا۔

☆.....☆

رحمت نے اپنی بیوی امیر زادی کو اپنی اس خطرناک مہم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جس پر وہ آج شام عمل کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا تاہم اپنی غیر موجودگی کے سلسلے میں اسے اپنی بیوی کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔

رحمت کا ارادہ سر شام وزیر خان کے جنگل ڈیرہ کی طرف نکلنے کا تھا۔ رحمت کو چونکہ اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ خونی درندہ اس کی بستی کا رخ نہیں کرے گا تاہم پھر بھی جب شام کے آثار نمودار ہونے لگے تو اس نے اپنی بیوی امیر زادی کو گھر میں محتاط ہو کر رہنے کی تاکید کی اور اسے کسی دوست کے ہاں ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکل پڑا۔

اس نے اپنے ساتھ ایک عدد تارچ رکھ لی تھی چنانچہ وہ اپنی گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر اللہ کا نام لے کر نکل پڑا۔ جنگل ڈیرے کی حدود میں پہنچ گیا۔ کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر گھر سے نکلنے وقت اس نے ایک عدد ریوالتور بھی رکھ لیا تھا جس کے جیب میں چھ گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک عدد کلہاڑی بھی اس نے ساتھ رکھ لی تھی۔

جنگل ڈیرے کے آس پاس کبکڑ کا جنگل اور قد آدم خود رو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ وہ جنگل ڈیرے کے قریب پہنچ کر کھنٹی جھاڑیوں کی اوٹ میں رک گیا۔ آسمان صاف تھا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے جنگل ڈیرے کے بڑے سے چوٹی گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں وہی سن ہزار چوکیدار قریب ہی ایک چارپائی پر نیم دراز ریڈیو کان سے لگائے موسیقی سن رہا تھا۔

دروازہ بند تھا مگر اس پر قفل نظر نہیں آ رہا تھا۔ رحمت چند ثانیے وہاں چھپا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس کے بعد اندھیرا جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔

اپنی گھوڑا گاڑی اس نے تھوڑے فاصلے پر کھڑی کر کے گھوڑے کے منہ پر چارے کا ”توبڑا“ لگا دیا تھا۔ تاکہ وہ زور سے منمنائے نہیں اور اندر ہی چارہ چکنے میں مصروف رہے۔

بہر طور.....! وہ گیٹ سے کافی دور آ گیا تھا۔ یہاں اب خاردار باڑھ نظر آرہی تھی۔ خاردار باڑھ کی یہ دیواریں دس بارہ فٹ بلند تھیں۔ آہنی باڑھ کو اس طرح جالی دار بنا کر لپیٹا گیا تھا کہ کوئی اس میں داخل نہ ہو سکے۔

مگر رحمت نے کسی بھی طرح اندر داخل ہونے کا تہیہ کر رکھا تھا اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک خطرناک کام کر رہا تھا کیوں کہ اگر وہ وزیر خان کے کسی آدمی کی نظروں میں آ گیا تو مصیبت میں پڑ سکتا تھا لہذا اس نے ہر لحاظ سے خود کو محتاط رکھنے کی بھی کوشش کی تھی۔

جنگل ڈیرے کا رقبہ بہت طویل تھا۔ رحمت چلتے چلتے تھک کر رک گیا مگر اسے اندر داخل ہونے کی کوئی چورنگہ یا گوشا نظر نہیں آیا۔ وہ چند ثانیے وہاں ہونٹ بھینچے کھڑا کچھ سوچتا رہا اس کے بعد وہ واپس پھانگ کی جانب پلٹا تو اچانک اسے ایک گھر گھرائی آواز سنائی دی۔

وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ گیٹ سے ابھی خاصا دور تھا لیکن اس نے جب اس گھر گھرائی آواز کی سمت دیکھا تو اسے سامنے کسی گاڑی کی تیز روشنی دکھائی دی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ رکا اور اس طرح تیز تیز قدموں سے جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا پھر جب وہ گیٹ کے تھوڑا نزدیک پہنچ کر رکا تو اس نے دیکھا وہ وزیر خان کی جیب تھی جو اب گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

رحمت بہ غور آنکھیں میکر کر دیکھنے لگا۔ اسے وزیر خان کی جھلک نظر آئی تھی۔ جیب اندر داخل ہوئی تو رحمت نے بھی اپنی جگہ سے حرکت کی وہ ذرا اور آگے بڑھا پھر اس نے چھپ کر جھاڑیوں کی اوٹ سے گیٹ کی طرف دیکھا جس کے دونوں دیوے پیکل پٹ کھلے ہوئے تھے۔ جیب اندر جا چکی تھی جب کہ وہ گمن بردار چوکیدار تن کر کھڑا تھا۔ اس کا چھوٹا سا ریڈیو اب چارپائی پر سرہانے کے قریب رکھا نظر آ رہا تھا۔

رحمت اللہ دھڑکتے دل کے ساتھ وہیں چھپا کھڑا رہا۔ وقت دیرے دیرے گزر رہا تھا۔

ذرا دیر بعد اسے دوبارہ جیب کی آواز سنائی دی۔ اس کے اعصاب تن گئے۔ وزیر خان شاید اپنی جیب میں واپس آ رہا تھا۔ رحمت نے دیکھا جیب گیٹ سے جیسے ہی نمودار ہوئی اسے کسی حلقہ خوار جانور کے غرائے اور وقفے وقفے سے وھاڑنے کی آواز سنائی دی۔ جیب باہر آ کر موڑ کاٹنے

رک گئی تو رحمت اللہ نے دیکھا جیب کے پیچھے دی روں کی آمد ورسد والا ٹرالر بھی تھا اور اس کے اندر اسے شیر نظر آیا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب رحمت نے جیب سے دیکھا تو اس کے عقب میں ٹرالر تھی نہ تھا۔ کسی کے تحت اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تاہم اب بغور اپنی آنکھیں سیکڑے ٹرالر کے اندر اس غراتے رھاڑتے شیر کو نگے جارہا تھا جو انتہائی غضب ناک نظر آ رہا تھا۔

رحمت اللہ جیب ٹرالر سے کم و بیش پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھا۔ جیب ابھی تک رکی ہوئی تھی اس کے بعد رحمت اللہ نے وزیر خان کو جیب سے اترتے دیکھا۔ وہ ٹرالر پر رکھے آگنی بنجرے میں غضب ناک انداز میں شیر کو ادھر ادھر ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وزیر خان چند ثانیے اسے دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ جیب میں سوار ہو گیا۔ اس کے بعد جیب آگے روانہ ہوئی۔

رحمت اللہ سمجھ گیا کہ یہی وہ خون خوار اور پاگل درندہ تھا جس نے پورے علاقے میں دہشت مچا رکھی تھی مگر باوجود اس کے وہ پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ اس کے ذہن میں جس خون خوار پراسرار درندے کا خاکہ تیار تھا اس پر یہ پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ سوچ میں گم اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گیا۔

رحمت اللہ کی مقدور بھرکوشش یہی تھی کہ وہ کم از کم جیب کی سمت کا تعین تو ضرور کر لے کہ وہ کس طرف مڑتی ہے جیب بھاری بھر کم ٹرالر کی وجہ سے وہی رفتار کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ رحمت کو اُمید تھی کہ وہ جیب کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گا۔ پھر اچانک اسے جیب ٹرالر سمیت دائیں جانب ایک چھیل میدان کی طرف مڑتی ہوئی نظر آئی۔ یہاں چھدری چھدری جھاڑیاں لٹکی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ تب پھر اس نے اچانک جیب کو رکے دیکھا تو وہ بھی ذرا دور جا کر رک گیا۔ گھوڑا گاڑی ایک طرف روک کر وہ نیچے اتر آیا۔ اب وہ زمین پر چھدری چھدری جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے قریب چھپ کر بیٹھ گیا۔

اس نے دیکھا وزیر خان جیب سے اترتا تو اس کے دو خدمت گار ساتھی بھی نیچے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں انتہائی طاقت ور رائفلیں تھیں۔ وزیر خان کے ہاتھ میں بھی رائفل نظر آرہی تھی۔

رحمت اللہ اپنی جگہ دم سادھے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے دیکھا کہ وزیر خان اور اس کے دونوں ساتھی

ٹرالر کی چھت پر چڑھ گئے اور پھر ایک نے اوپر سے سلاح دار دروازہ اوپر اٹھالیا۔ شیر غضب ناک غراہٹ کے ساتھ باہر کودا۔

رحمت اللہ کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اسے یہ ڈر ہوا کہ کہیں وہ شیر دھاڑتا غراتا ہوا اس کی بوس گھٹا یہاں نہ آجائے لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ وہ شیر ٹرالر پر رکھے بنجرے سے کود کر ایک طرف بھاگا۔ چھت پر موجود وزیر خان نے اپنی رائفل سے اس کا نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ کان پھاڑو ہما کا ہوا۔ جس سے اس پاس کا علاقہ گونج اٹھا۔

گولی شیر کے کسی ایسے نازک مقام پر لگی تھی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وزیر خان نے احتیاطاً ایک اور گولی داغ دی۔ شیر کے تن مردہ میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی تو وہ تینوں چھت سے نیچے اتر آئے۔

اس کے بعد وزیر خان کے دونوں ساتھیوں نے مردہ شیر کے وجود کو ڈنڈاؤلی کر کے اٹھایا اور واپس ٹرالر پر رکھے بڑے سے آگنی بنجرے کے اندر پھینک دیا اور دوبارہ جیب میں سوار ہو گئے۔ اب جیب واپس جنگل ڈیرہ کی طرف جا رہی تھی۔ رحمت اللہ کو سمجھ میں یہ سب نہ آسکا تھا۔ اس کے چہرے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی الجھن آمیز تاثرات مترشح ہو رہے تھے۔

بہر طور واپس پلٹا۔ اپنی گھوڑا گاڑی میں سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔

شام اب رفتہ رفتہ رات کی تاریکی میں بدلنے لگی تھی۔ شکر تھا کہ آسمان صاف تھا اور چاند کی روشنی سے اطراف کا علاقہ مقدور بھر روشن تھا۔ رحمت اللہ گھوڑا گاڑی کو مناسب رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی جانب تھا۔ اس کا دل و دماغ نہ جانے کیوں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ انجانا خوف تھا جو اسے جکڑے ہوئے تھا۔ وہ شاید اس خونی درندے سے خوف زدہ ہو رہا تھا۔ پھر ابھی وہ اپنے گھر سے ذرا دوری پر تھا کہ اسے کچھ لوگوں کا جھلجھلائی مردار ہجوم نظر آیا۔ وہ دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ گھوڑا گاڑی اس نے ایک قریبی درخت سے باندھ دی تھی۔ اس قریبی درخت پر ایک کھٹکھٹا ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہ خونی درندہ ایک شخص کو ہلاک کر کے بھاگا تھا۔

رحمت اللہ نے ان سب کو اس کا تعاقب کرنے کو کہا۔ ان سب کے ہاتھوں میں بڑے بڑے لٹھے، سونے اور

کلباڑیاں تھیں۔ رحمت اللہ نے بھی اپنی کلباڑی ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

یہ لوگ سب ایک جلوس کی صورت میں دوڑے چلے جا رہے تھے۔ ان کی تعداد چند سو سے زیادہ تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جو رات کو جاگ کر باری باری پہرہ دیتے تھے۔ مرنے والا شخص بھی انہی میں سے ایک تھا۔ غم و غصے کے باعث ان لوگوں کے چہروں سے غیظ مترشح تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج ان لوگوں نے اس خونی درندے کو ہلاک کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

مگر کافی تلاش بسیار کے بعد وہ درندہ انہیں کہیں نظر نہ آیا تو رحمت اللہ نے ان لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے چار چار افراد کی ٹولیاں بنا کر اس خونی درندے کے تعاقب میں جانے کا حکم دیا۔ لوگوں کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ درندہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔

یوں یہ سب لوگ چار چار افراد کی ٹولیوں میں بٹ کر چار مختلف سمتوں کی طرف بڑھ گئے۔ رحمت اللہ بھی اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ چوتھی سمت کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ انہیں ایک تیز لڑہ خیز انسانی چیخ سنائی دی۔ چیخ کی آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی ان چاروں نے یہ چیخ والی سمت کی طرف دوڑ لگا دی۔

دفعتاً انہیں ایک دوسری چیخ بھی سنائی دی۔ اس بار چیخ کی سمت دائیں جانب سے سنائی دی تھی۔ یہ لوگ رکے بغیر دوڑتے رہے۔ اچانک انہیں سامنے سے گرتا پڑتا دوڑتا ہوا ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ چاند کی مدھم روشنی میں یہ لوگ اسے اپنے آدمی کی حیثیت سے پہچان گئے تھے۔ وہ بری طرح حواس باختہ اور خوف زدہ تھا۔

یہ چاروں ٹھٹک کر رہ گئے جب انہوں نے ایک جگر خراش منظر دیکھا۔ دوڑتے ہوئے آدمی کے عقب میں انہیں بد ہیئت سا انسانی ہیولا بھی نظر آیا جس نے چاروں میں اس دہشت زدہ شخص کو دبوچ لیا۔ چاند کی روشنی میں انہیں ایک ایسا انسان نما جانور نظر آیا جو انہوں نے زندگی میں پہلے ہی نہیں دیکھا تھا۔ اس خوف ناک جانور کی ہیئت اس قدر کریہہ انگیز اور ناقابل یقین تھی کہ ان چاروں کو سکتہ ہو گیا۔

ایک ہیئت تھی جو ان پر اس بری طرح طاری تھی کہ وہ اپنے بدنصیب ساتھی کو بھی اس ہیئت ناک درندے سے پہچانا بھول گئے جو اس کے خونی پنجوں میں بری طرح تزیین رہا تھا۔ تب پھر رحمت نے ہی حرکت کی اور اپنی جیب سے تیس

بور کا پستول نکال کر ایک ہوائی فائر کیا۔ دھماکے کی آواز اس خونی درندے نے اپنے شکار کو چھوڑا اور ان کی متوجہ ہوا۔ رحمت کے تینوں ساتھی اس عجیب درندے کو دیکھ کر بری طرح سے دہشت زدہ ہو گئے ان میں آگے بڑھنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی۔

اس درندے کا پورا جسم انسان کی طرح نہ چہرہ..... مگر مجھ کی طرح۔ دونوں ہاتھوں کے پنجے بھی بڑے بڑے نوکیلے ناخنوں والے تھے۔ اس کے جسم کی کھال بھی مگر مجھ کی طرح کھردری اور موٹی تھی۔ اس کے کاندھے ڈھلکے ہوئے تھے۔ وہ ایک وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ رحمت اللہ کی طرف لپکا۔

رحمت اللہ نے اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا اور بے درپے ٹرائیگر دبا تا چلا گیا۔ گولیوں کے دھماکے ہوئے۔ کئی گولیاں اس مگر مجھ نما انسان کی موٹی کھال والے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ اس کے حلق سے ایک زوردار غراہٹ ابھری۔

وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا مگر رکا نہیں اور چشم زدن میں رحمت اللہ کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کے ریوالبور کی گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اس نے پستول پھینک کر اپنی کلباڑی دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی وہ چاہتا تھا کہ اس مگر مجھ والے تھوخنے پروار کرے مگر اس سے پہلے ہی اس عجیب الخلق خونی درندے نے اپنے نوکیلے ناخنوں والا پنجہ اس کے چہرے پر مارا۔

رحمت کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ وہ چیخ مار کر گرا۔ کلباڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اس اثناء میں اس کے ساتھیوں کی غیرت جاگی اور انہوں نے اس درندے پر کلباڑیوں اور لٹھوں سے حملہ کر دیا۔

اس دوران شور شرابے کی آواز پر ان کے دیگر ساتھی بھی وہاں آ پہنچے۔ بس پھر کیا تھا سب نے لٹھیوں اور کلباڑیوں سے اس درندے کو چاروں طرف سے گھیر کر اس پر حملہ کر دیا۔

دو ساتھیوں نے زخمی رحمت اللہ کو تھمیت کر ایک طرف کر دیا۔

اس عجیب و غریب خونی درندے کی لاش بیچ میدان میں رکھی تھی اور ہستی کے لوگ ہی نہیں بلکہ آس پاس کے علاقوں سے بھی جوق در جوق لوگ آ کر حیرت و خوف بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔